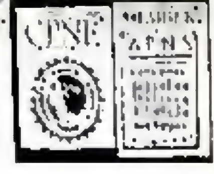
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

دسمبر 2014

جلد 44 • شمارہ 12 دسمبر 2014 • زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021)
E-mail:jdpgroup@hotmail.com



پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

سلامتی کی راہ

صدیوں پہلے کتاب میں لکھا گیا۔

''بدن کا چراغ آنکھ ہے۔ پس اگر تیری آنکھ درست ہو تو سارا بدن روشن ہوگا اور اگر تیری آنکھ خراب ہو تو تیرا سارا بدن تاریک ہوگا۔ پس اگر وہ روشنی جو تجھ میں ہے، تاریکی ہو تو کیسی بری ہوگی۔''

چنانچہ اے شخص! اپنے بدن کے چراغ کو کام میں لا اور اپنے گرد و پیش پر نظر کر۔ دیکھ کہ زمانہ نئی بساط بچھاتا ہے اور نئے رنگ دکھاتا ہے اور اب جبکہ دشنام کی آندھیاں گزر چکیں اور چڑھی ہوئی کمانیں اتر چکیں، اپنی زبان کو اپنے دہن میں سلا دے اور کدورتوں کو دل سے بھلا دے۔

اور اے شخص! کیا تجھے یاد نہیں کہ لکھنے والے نے کتاب میں صدیوں پہلے لکھا تھا۔

''عیب جوئی نہ کر کہ تیری بھی عیب جوئی نہ کی جائے۔''

کیونکہ جس طرح تو عیب جوئی کرتا ہے، اسی طرح تیری بھی عیب جوئی کی جائے گی اور جس پیمانے سے تو ناپتا ہے، اسی سے تیرے واسطے ناپا جائے گا۔

تو کیوں اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ کے شہتیر پر بھی غور نہیں کرتا؟

اور جب تیری ہی آنکھ میں شہتیر ہے تو تو اپنے بھائی سے کیونکر کہہ سکتا ہے کہ لا، میں تیری آنکھ سے تنکا نکال دوں؟

اے شخص! آ...... کہ تو اور میں ایک دوسرے سے بہم ہوں کہ جب ہم بہم ہوں تو ''ہم'' کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ہاں وہی ''ہم'' اپنی کمر کھولیں، اپنی دشمنیوں کو تہ کریں۔ اپنے جھگڑوں کو اندھے کنوئیں میں دھکیلیں اور اپنے قضیوں کو گڑھے میں دفن کریں۔

اے شخص! آ کہ اب ہم اپنے تاکستانوں کی خبر لیں اور اپنی چراگاہوں کو دیکھیں۔ ہم وہ سبیل ڈھونڈیں اور وہ راہ نکالیں کہ ہمارے کھیت فصلوں سے چھلک رہے ہوں اور ہمارے دسترخوان ہر نوع کے تر اور خشک میوؤں سے مہک رہے ہوں۔ ہماری پوشاک سونے کے تاروں سے کاڑھی جائے اور ہماری عورتیں لعل و گہر کی دمک سے شب چراغ ہوں۔ ہماری گلیوں میں خوشبوؤں کے کنڑ انڈیلے جائیں اور ہمارے محلوں میں خوشیاں باریابی پائیں۔

حکمت ہمارے ذہنوں میں جگہ بنائے اور خرد ہمارے فیصلوں کو راہ دکھائے، تاریکیاں ہماری بستیوں سے رخصت ہوں اور روشنیاں ہمارے قریوں کو جگمگائیں۔ ویرانیوں کو موت آئے اور آبادیاں زندگی کو لبھائیں۔ لوٹنے والوں کے ڈیرے برباد ہوں اور انصاف کرنے والوں کے گھروں میں شادیانے بجیں۔

امن ہمارے سروں پر آسمان بنے اور سلامتی ہمارے پیروں کے نیچے زمین ٹھہرے۔ ہمارے بچے بڑھاپے کی دہلیز کو لانگیں اور ہمارے جوان زندگی کو گھونٹ گھونٹ پئیں۔ ہماری کنواریاں اپنے گھروں کی ہوں اور ہماری بیاہیوں کے سہاگ سلامت رہیں۔

اے شخص، اب جبکہ تہمتوں کی چڑھی ہوئی ندیاں اتر چکیں اور طنز کے سارے تیر کند ہو چکے۔ آ..... کہ تو اور میں ایک دوسرے سے بہم ہوں کہ جب تو اور میں بہم ہوں تو ''ہم'' کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

اے شخص! آ کہ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر سلامتی کی راہ چلیں اور ہمارے بعد کی نسلیں اور ان کے بعد ان کی نسلیں......!



عزیز قارئین:

السلام علیکم!

دسمبر 2014ء کا شمارہ جاتے سال کی کسک لیے آپ کی نذر ہے۔کوئی مانے یا نہ مانے دن رات کا یہ گھن چکر ہی زندگی بتانے کا اصول ہے۔گزرنے والے دن چاہے جیسے بھی گزریں، کوئی نہ کوئی یاد چھوڑ ہی جاتے ہیں، جیسے پچھلے دنوں محرم الحرام کے آغاز میں واہگہ بارڈر پر پرچم اتارنے کی تقریب کے دوران دہشت گردی کی کارروائی...... مگر پاک فوج کی طرح پاکستانی عوام کے بھی حوصلے اور عزم کو سلام جنہوں نے بلاخوف وخطر اپنی روایت کو برقرار رکھا اور تقریب میں شمولیت اختیار کی...... محرم الحرام عالی مقام حضرت امام حسینؓ کی عظیم قربانی کی نسبت سے بہت حرمت والا مہینا ہے لیکن یہ کالی بھیڑیں کون ہیں جنہیں کسی حرمت کا خیال نہیں رہتا۔ بہرحال سخت حفاظتی پہرے میں خیروعافیت کے ساتھ یوم عاشورہ بھی گزر گیا...... امتِ مسلمہ پر یہ کیسا عجیب وقت آن پڑا ہے کہ اہم واقعات اور دنوں کی یادگار منانے سے پہلے بھی خوف کی فضا اور بعد میں بھی اس خوف سے سلامتی کے ساتھ چھٹکارے پر شکر...... کاش اس روش میں کوئی خوشگوار تبدیلی بھی آجائے...... ایک تبدیلی تو رونما ہو چکی ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ہائی اوکٹین، پیٹرول، ڈیزل اور مٹی کے تیل کی قیمتوں میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ پیٹرول کی قیمتوں میں اضافے کے بعد جتنی تیزی سے مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے، کیا اس کمی کے بعد متعلقہ افسران اشیائے صرف کی قیمتوں میں کمی بھی کروا سکیں گے...... وزیراعظم کی ہدایت کے مطابق بجلی کی اوور بلنگ کے مسئلے پر بھی اقدامات کا فیصلہ ہوا ہے۔ اگرچہ خشک سالی کے موسم میں یہ بارش کا پہلا قطرہ ہے اور اگر ایسی بوندا باندی جاری رہی تو قوی امید ہے کہ مہنگائی کے ہاتھوں ستائے ہوئے عوام کی زندگی کچھ سہل ہو جائے۔ کھیلوں کی دنیا میں 32 سال بعد ایک خوشگوار جھونکا آیا اور پاکستانی کرکٹ ٹیم نے آسٹریلیا کو ٹیسٹ میچز میں وائٹ واش کر کے اور پوری دنیا میں تیسرے نمبر پر آ کر پاکستان کو ایک اور فخر سے سرفراز کیا۔ اللہ ایسی اور کامیابیاں عطا کرے۔ دسمبر کو قائد کا مہینا بھی کہا جاتا ہے۔25 دسمبر بانیِ پاکستان محمد علی جناح کا یوم پیدائش...... اگرچہ پاکستان کی موجودہ صورتِ حال قائد کے خوابوں کا عکس تو نہیں لیکن پاکستان کی سرزمین آپ کی کاوشوں کا ثمر ضرور ہے۔ اللہ پاک ہمارے ملک کو امن وامان کا گہوارہ بنا دے...... اس میں خوشیوں اور رنگوں کی بہار سجا دے۔ اور ایسے سلجھے ہوئے قائد عطا کرے جو الجھے ہوئے عوام کو خوشحالی کا کوئی ایک سرا ہی دے سکیں (الٰہی آمین) اور جنابِ بیتے دنوں کی یاد میں ان دعاؤں کے سائے سائے ہم چلتے ہیں اپنے مہکتے باغیچے کی جانب جہاں پیغامات کے رنگ برنگے پھول کھلے ہیں۔

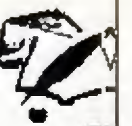
✠ زویا اعجاز، لاہور سے کرسیِ صدارت پر براجمان ہیں" باادب باملاحظہ ہوشیار! تختِ شاہی سے ہماری سواری، باد بہاری تین ماہ کے بعد جلوہ افروز ہونے اور محفل کو سولہ چاند لگانے آئی ہے۔ کیا احوال ہیں سب کے؟ بادی النظر میں تو سب بیبے والے بچے بنے نظر آتے ہیں۔ جن ممبرز نے یاد کیا ان کے ہم صدر پاکستان ہیں۔ جنہوں نے نہیں کیا...... نہیں تے نہ سہی۔ اکیس اکتوبر کو آخری پیپر سے واپسی پر مارکیٹ سے گزرتے ہوئے سسپنس ڈائجسٹ پر نظر پڑی تو چیخ نما پکار سے بھائی کو بائیک روکنے کے لیے کہا اور ایک جست میں نیچے اتر کر بک اسٹال والے سے ڈائجسٹ لیا تو گویا پیپرز کی تمام تر تھکاوٹ اور کوفت یوں ہوا ہوئی جیسے شاہد آفریدی کے سکسر پر بال غائب ہوتی ہے۔ ٹائٹل پر موجود حسینہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں کی عملی تشریح تھی۔ شرم و شرارت سے مبتسم آنکھیں نینوں میں سپنا سپنوں میں سجنا کا تاثر دے رہی تھیں اور بیک گراؤنڈ میں موجود ملٹی فیس والے سجنا کی آنکھیں مغلئی جھلک دے رہی تھیں۔ ہمارے ہم برج بلکہ ہم تاریخ جون ایلیا لاحاصل مسافت کے کرب میں مبتلا نظر آئے۔ محفل سے سعدیہ بخاری، مظہر سلیم، افتخار حسین اور سید اکبر بھی غائب تھے۔ ماہتاب گل جی! ویلکم بیک۔ مہرین ناز کے تبصرے کا آغاز بیسٹ تھا۔ تحاریر کا آغاز ہم ہمیشہ منظر امام کی کہانی سے کرتے ہیں۔ مختصر اور جامع۔ ان کے پاس متنوع موضوعات کی ایک لامتناہی کھیپ موجود ہے جسے ان کا ظریفانہ انداز مزید زیبائش عطا کرتا ہے۔ جنگل کے آدمی نے پاکستان کو تبرک سمجھ کر نوچنے والے درندوں اور حضرتِ انسان کی حیوانیت کی نشاندہی کی۔ کچھ یہی عالم کاشف زبیر کی وحشی کا بھی تھا جو بین الاقوامی تناظر میں تھی۔ مہذب لباس اور انسانی کھال میں موجود حیوان نما انسان کی بربریت کا یہ ایک ہلکا سا ٹریلر تھی۔ اصل پکچر تو کبھی منظرِ عام پر لائی ہی نہیں جاتی۔ ماروی آنٹی کو ہم نے پاکستانی کرکٹ ٹیم کے تناظر میں لینا شروع کر دیا ہے یعنی جو ہوتا ہے ہونے دو سانوں کی۔ ہمارے ٹینشن لینے سے کونسا سدھار آنا ہے ان میں۔ ستاروں پر کمند کا آخری پڑاؤ آن پہنچا۔ آخری قسط میں مغلِ اعظم کے شاہکار ناولز تاوان اور دیوی کی جا بجا جھلک موجود تھی۔ سانوس کا نظریۂ مثلث سرمد صاحب کے روپ میں اور پاؤنڈوں کی بربریت سب کچھ جانا پہچانا تھا لیکن جو بھی ہے مغلِ اعظم کے جادوئی قلم کا ہر لفظ دل میں اتر جاتا ہے۔ اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے انہوں نے سرمد صاحب کو داعیٔ اجل پر لبیک کروا دیا۔ لیکن آپ نے تو نئے ناول کا اعلان ہی نہیں کیا۔ بھئی ہم سے تجسس برداشت نہیں ہوتا۔ رضوانہ ساجد کا معلوماتی مضمون انتہائی شاندار تھا۔ کئی دفعہ تو جی چاہا کاش ان مقدس مقامات کو ان کی اصل شان و شوکت میں دیکھ سکیں۔ جب یہاں نبوت سانس لیتی تھی اور عبدیت اپنے خالص رنگ میں موجود تھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی ملاقات سے ملاقات کر کے اندر سے صدا آئی۔ ڈاکٹر صاحب! اے تسی کی کیتا؟ اتنے اتفاقات اور فلمی وفرسودہ سا پلاٹ یہ ڈاکٹر صاحب کے شایانِ شان تو نہیں تھا۔ کسی ایک کردار نے بھی متاثر نہیں کیا۔ ہمارے کنگ ڈاکٹر شیر شاہ سید اپنی روایت کے عین مطابق حساس، پُرفکر اور انمٹ تاثر قائم کرنے والی کہانی لے کر آئے۔ ایبولا جیسی بیماریوں میں مبتلا ہونے والی خواتین ایٹمی ریس اور جنگی جنون میں مبتلا حکمرانوں کے لیے کہیں دائمی عذاب کا سبب نہ بن جائیں۔ پکار اور

آخری کیل نے بڑی کمزور انٹری پیش کیں، ذرا مزہ نہیں آیا۔ قسمت کا نظر آنا اور وارث زبردست لگا۔ بیٹھے بٹھائے موصوف کو بیس ارب روپے الرزل گئے۔ اعتراف بے حد پیچیدہ، نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کی نشاندہی کرتی ایک آفاقی حقیقت بیان کر گئی کہ شوہر کے منہ سے محبت کے چند الفاظ بیت اہم مسئلہ لیے امرت ثابت ہوتے ہیں۔ تاریخ کے جھروکے میں ملکہ خورم سلطان کا کردار تفصیلی طور پر سامنے لایا جائے تو کیا ہی بات ہے؟ احسان سحر کی کترنیں جبکہ محمد اکبر تارڑ، راجا افتخار علی انی اور روبینہ صدیق کا شعری انتخاب شاہی مزاج کو بہت بھایا۔‘‘

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، جیکم ٹاؤن، خانیوال سے چلے آرہے ہیں ’’مسکراتی حسینہ اور سوچ میں گم صنفِ وجاہت سرورق پر براجمان تھے۔ جون ایلیا راہ نوردی کرتے نظر آئے۔ عیدِ قرباں آئی اور گزر گئی اللہ سب کی قربانی قبول فرمائے۔ محمد خواجہ کرسیٔ صدارت پر رعشہ طاری کیے براجمان تھے۔ کہانیوں پر جامع تبصرہ کیا گیا۔ محمد قاسم رحمان! ایک ننھے تبصرہ نگار کا اضافہ ہوا، خوش آمدید۔ احساس عاجز! آپ کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہیں۔ محمد یوسف ساتول، اللہ آپ کے دوست کو شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ بشریٰ افضل! ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ اصل ناموں سے لکھا جائے۔ سب سے پہلے یہ اصول خود پر لاگو کرنا چاہیے۔ مہرین ناز! آپ نے بجا فرمایا لیکن اپنے حصے کی شمع تو ضروری ہے جلانا۔ محمد جاوید علی پور! بہت عرصے بعد تشریف آوری ہوئی۔ ویلکم بیک۔ شبانہ حسن تیز رفتاری کے ریکارڈ قائم کرتی ہوئی نظر آئیں۔ عاطف شاہین! یہ استاد اور شاگرد آج کل محفل میں زیادہ نظر آرہے ہیں ابھی بھی بچوں کی پہلی ترجیح پڑھائی ہونی چاہیے۔ ماہ تاب گل رانا! واپسی مبارک ہو۔ آپ جیسی بے چور تبصرہ نگار کی شمولیت محفل کی رونق بڑھائے گی۔ شاہین نسیم! سسپنس واقعی ایک معیاری رسالہ ہے آپ کو بھی آیاں نوں۔ مغل انکل نے ستاروں پر کمند میں آخری قسط میں اپنی ہر کہانی کی طرح ایک مرکزی کردار کی قربانی دی۔ سر سر مدجاتے جاتے ماکانے کو بھی جہنم واصل کر گئے۔ شہزادی کی موت کا پڑھا تو بقیہ کہانی بہت بے دلی سے پڑھتے رہے تاہم آخر میں مصنف نے اس بے دلی کا مداوا کر دیا۔ ہمایوں اور کرسٹل کا ملن بھی اچھا لگا۔ ناصر جیسے غدار کی عبرت ناک موت ہی ان کا حق تھا۔ تحریر خوب رہی۔ ستاروں پر کمند کی جگہ کون سا سلسلہ وار ناول شروع ہوتا ہے؟ اس بارے میں ادارہ خاموش ہے۔ ماروی میں مراد کو مرینہ کے قبضے میں دیکھ کر بہت ناگوار کی ہوئی۔ یہ کیا بھئی، ہر سلسلہ وار ناول میں مرد عورتوں کی گرفت میں آئے ہوئے ہیں۔ ساری بے عزتی خراب کر دی مردوں کی۔ (بہت خوب) ڈاکٹر ساجد امجد کی ملاقات آخری صفحات کا تحفہ ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریریں بلاشبہ جھول سے پاک اور دلچسپی کی حامل رہی ہیں۔ آخری کیل مرزا امجد بیگ کے ایک اور کامیاب کیس کی دلچسپ روداد تھی۔ سفیان کی عیاشی اس کو لے ڈوبی۔ فوزیہ اور نورین کا ردعمل فطری تھا۔ کاشف زبیر کی ورآمد وحشی، تھرل ایکشن اور سسپنس سے بھرپور تحریر تھی۔ آدم خور قبائل کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوا۔ انسانوں کے روسٹ کرنے کے بارے میں پڑھ کر عجیب سا خوف اور کپکپی محسوس ہوئی۔ تاہم امریکی مہذب معاشرے کے افراد نے جو کچھ ان قبائل کے ساتھ کیا، وہ ایک طمانچہ ہے۔ نام نہاد مہذب معاشرے کے منہ پر۔ کارل جیسے حساس لوگ واقعی ایسے معاشروں میں نہیں رہ سکتے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر دعا فیسٹولا کے بارے میں آگاہی دیتی تحریر تھی۔ اگرچہ مہلک بیماری نہیں تاہم مریضہ کو زندہ درگور کرنے کے لیے کافی ہے۔ جہاں ڈیلیوری غیر تربیت یافتہ دائیوں کے ہاتھ ہو وہاں ایسے کیس عام ہو جاتے ہیں۔ غلام حسین کی بانو سے بے لوث محبت نے بہت متاثر کیا۔ غلام قادر کی اعتراف کا انجام قطعی غیر متوقع اور سمجھ میں نہ آنے والا تھا۔ مصنف تشنگی چھوڑ کر غائب ہو گئے۔ منظر امام کی جنگل کا آدمی مزاح کے پردے میں معاشرتی برائیوں کو آشکار کرتی ہلکی پھلکی تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں اظہر حسین جتوئی اور ریاض بٹ کا انتخاب سب سے زیادہ پسند آیا۔ کترنیں بھی خوب تھیں۔‘‘

✠ **محمد قاسم رحمان**، ابرار کالونی، ہری پور سے تشریف لائے ہیں ’’8 اکتوبر کو نومبر کا سسپنس ملا۔ بہت حیرت ہوئی کہ اتنی جلدی مل گیا۔ ٹائٹل سسپنس کے شایانِ شان ہے۔ حسینہ کا دوپٹا کرنے کا اسٹائل بہت بھایا۔ آگے بڑھے جہاں جون ایلیا سوئی ہوئی قوم کے جذبات جگانے میں مصروف نظر آئے۔ دوستوں کی محفل میں کرسیٔ صدارت پر محمد خواجہ کو براجمان پایا۔ مبارکاں جی، میرا خط شائع کرنے کا بے حد شکریہ۔ محمد جاوید، شبانہ حسن، قدرت اللہ نیازی اور رمضان پاشا کے تبصرے خوب صورت تھے، بالکل ان کے ناموں کے مانند۔ پھر ستاروں پر کمند کی طرف گیا جہاں آخری قسط دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ خیر مطالعہ شروع کیا جب پتا چلا کہ شہزادی مر گئی ہے تو مجھے یقین تھا کہ مغل انکل آخر میں شہزادی کو بچا لیں گے۔ ہمایوں اور کرسٹل کا ملاپ اچھا لگا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ ہمایوں کو اس کا پیار مل گیا۔ میری بہن عاصمہ کو بھی ستاروں پر کمند بہت پسند ہے۔ لیکن پہلی قسط کے سوا میں نے اس کو قسط پڑھنے نہ دی۔ کیوں نہ دی یہ ایک لمبی داستان ہے۔ ماروی بہت زبردست بالآخر مرینہ نے مراد کو پٹڑی سے اتار لیا اور اب مرینہ کے ارادے جان کر گھبرا دھچکا لگا۔ دوسری طرف محبوب اب خود غرض بن گیا ہے۔ سمیرا کو اس کے کیے کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ایک بار پھر ہمیں دکھی کر گئے۔ تحریر پڑھنے کے بعد ان بیٹوں پر لعنت بھیجی جو بڑھاپے میں بھی ماں باپ کی قدر نہیں کرتے۔ مرزا امجد بیگ نے ایک بار پھر حقدار کو اس کا حق دلوایا۔ نرگس نے جب فوزیہ کو فون کیا اور فوزیہ وہاں جاتی ہے یہ پوائنٹ بالکل ڈرامائی سا تھا۔ امجد رئیس کی سادہ منصوبہ زبردست رہی۔ میری ولسن نے بڑی مہارت سے جو اور اپنے شوہر تام کے ساتھ دو دو ہاتھ کیے۔ بکار مختصری اور بے مقصدی اسٹوری تھی۔ ایک عورت نے ہیلو کو ہیلپ سمجھ لیا۔ بابر نعیم کی قسمت زبردست تحریر ثابت ہوئی۔ ونٹرز معمولی بات پر میک کیولم کی جان لینا چاہتا تھا۔ وہیں اس کا سیکریٹری اسے بے وقوف بنا گیا۔ لاوارث وارث زبردست تھی۔ عبداللہ بے حد لالچی اور بخیل انسان تھا۔ نتیجے میں اس کا بیٹا بگڑ گیا۔ سبق آموز تحریر تھی۔ تمام اشعار بھی زبردست تھے۔ مجموعی طور پر پورا میگزین زبردست تھا۔ اس مرتبہ کترنیں بھی بہت اچھی تھیں۔‘‘

✠ **محمد یوسف ساتول**، نور پور تھل، ضلع خوشاب سے محفل کی زینت بنے ہیں ’’ادارے کا مشکور ہوں کہ خط شائع کرنے کے ساتھ ہی میرے بھائی کی صحت یابی کی دعا بھی شائع کر دی۔ سرورق نہایت ہی دیدہ زیب اور دلفریب تھا۔ روحانی پیشوا جون ایلیا کا روحانی سبق راہ گیر پڑھا۔



ایلیا صاحب ہمیشہ ذہنوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد محفل یاراں میں انٹری دی۔ جہاں ادارے کی جانب سے ملکی حالات پر تبصرہ کیا گیا۔ پڑھا، دل اداس ہوا۔ محفل میں محمد خواجہ صاحب کرسی صدارت پر اٹکھیلیاں کرتے نظر آئے۔ مبارکاں جی مبارکاں۔ تبصرہ نہایت شاندار تھا، سب دوستوں کے تبصرے اچھے لگے۔ رضوان تنولی، محمد قدرت اللہ نیازی صاحب خوش آمدید کہنے پر شکریہ۔ انکل جی، کیا بات ہے ہماری بہنیں محفل سے غائب ہو رہی ہیں۔ اس کے بعد سیدھے طاہر جاوید مغل کی کہانی ستاروں پر کمند پر پہنچے اور سکتے کی کیفیت میں رہ گئے۔ یہ کیا کہانی کا اینڈ کر دیا۔ بہرحال اداس دل سے پڑھی اور اداس ہو گئے۔ عادل کی جادوئی فتح، خاص کر وحشی پاؤنڈوں کا یلغار کرنا۔ سرمد کی موت، عادل، ہمایوں، مدثر کا جنونی کیفیت میں دفاع کرنا بہت ہی سنسنی خیز تھا۔ آخر میں کرسٹل، ہمایوں اور عادل، شہزادی کا ملاپ دل کو تسکین دے گیا۔ ستاروں پر کمند جیسی کہانی سالوں بعد سسپنس کی زینت بنتی ہے۔ ماروی اپنے اعتبار سے اچھی جا رہی ہے۔ اس کے بعد بیگ صاحب کی آخری کیل جہاں بیگ صاحب استغاثہ کے گواہ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکتے نظر آئے، زبردست اسٹوری تھی۔ اس کے بعد ملاقات جو اپنوں کے دھوکوں کو اجاگر کرتی کہانی تھی۔ بالکل حقیقی منظرکشی کی گئی۔ لائبہ اور دانش کمال کا عشق ان کی اولاد نے مکمل کر دیا۔ تاریخی کہانی الیاس سیتاپوری کی کاوش ہے۔ عبداللہ کی خسیس فطرت جہاں اس میں مزاح کا پہلو تھا وہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گئی کنیز خیزران کی آخر میں سمجھ آئی کہ یہ کیا بلا تھی۔ شارٹ کہانیوں میں سادہ منصوبہ میں میری، عورت کے ہاتھوں مار کھا گیا۔ وحشی میں کاشف زبیر نے امریکیوں کے کردار کی واضح منظرکشی کی۔ کرائے دار میں رونی کا کردار خاص پسند نہیں آیا۔ پکار نے بھی کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ محفل شعر و سخن میں رضوان تنولی، ریاض بٹ، اشفاق سیال، شبانہ حسن، صابر علی، ادریس احمد خان، قدرت اللہ نیازی، محمد اسلم، احمد نعمان اور امتیاز احمد کا انتخاب اچھا لگا۔ دعا ڈاکٹر صاحب کی بہت ہی اچھی کہانی تھی۔ واقعی آج کے دور میں بوڑھے ماں باپ اولاد پر بھاری ہوتے ہیں۔ بابر نعیم کی قسمت، اچھی کہانی تھی۔ مسٹر ونٹرز اپنے سیکریٹری کے ہاتھوں لٹ گئے۔ غلام قادر کی اعتراف بھی اچھی کہانی تھی۔ رضوانہ ساجد صاحبہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے جو حالات قلم بند کیے۔ واقعی ایمان افروز واقعات تھے۔ اس بار کربلا کو موضوع بنایا جائے۔ جنگل کا آدمی منظر صاحب نے کس خوش اسلوبی سے حالات حاضرہ کی منظرکشی کی واقعی آج کا انسان مداری ہے اور روپ بدلنے میں ماہر ہے۔ باقی کترنیں اچھی تھیں۔"

✠ **اسد عباس،** سرگودھا سے محفل میں حاضر ہیں "بک اسٹال کے تین چکر لگانے کے بعد سسپنس کا دیدار نصیب ہوا۔ ستاروں پر کمند پہ جا کر پڑاؤ ڈالا۔ خبر متوقع تھی کہ آخری قسط ہوگی اور ایسا ہی ہوا۔ لگتا ہے طاہر صاحب کے پاس مواد ختم ہو گیا ہے۔ کہانی کو نہایت بے ڈھنگے انداز میں ختم کیا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ وہ اس بار کس کی قربانی دیں۔ امجد رئیس صاحب کی سادہ منصوبہ پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ کرائے دار اور پکار نے خاصا کنفوز کیا۔ غلام قادر صاحب کی لمبے عرصے بعد واپسی ہوئی۔ کہانی ابھی تک ہضم نہیں ہوئی۔ بہت پیچیدہ لکھتے ہیں۔ وحشی میں دورِ حاضر کا مہذب انسان شرافت کا لبادہ اوڑھ کر شرافت کا جنازہ نکال رہا ہے۔ امجد بیگ صاحب حسبِ سابق اس بار بھی اپنی مہارت سے اپنے مؤکل کو قانون کی گرفت سے چھڑا لے آئے اور آخر میں علیم الحق حقی صاحب کی وفات کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔"

✠ **راجہ ثاقب محمود جنجوعہ،** پنڈ دادن خان سے محفل کی زینت بنے ہیں "نومبر کے سسپنس ڈائجسٹ کا ٹائٹل ہمارا دل جیتنے میں بہت ہی کامیاب رہا۔ واقعی ٹائٹل دل کو چھو لینے والا تھا۔ جون ایلیا کا انشائیہ "راہ گیر" ہمارے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانی لاوارث وارث بہت ہی سبق آموز اور تجسس سے بھرپور تھی۔ آخری کیل مرزا امجد بیگ کی ٹوٹے پھوٹے حصوں کو جوڑ کر آخری کیل ٹھونکنے والے ایک وکیل کی بہت ہی زبردست جرح تھی۔ ستاروں پر کمند اور ماروی کی اقساط بہت شاندار تھیں۔ حضرت ابراہیم کا آخری حصہ بہت ہی ایمان افروز تھا۔ محفل شعر و سخن کے تمام اشعار معیار کی اعلیٰ بلندیوں پر فائز تھے۔"

✠ **رضوان تنولی کریڑوی،** اورنگی ٹاؤن، کراچی سے حاضر ہیں "نومبر کا سسپنس دیکھتے ہی گنگنا اٹھا۔ جھوم اے دل وہ میرا جانِ بہار آیا۔ سرورق کی کجراری آنکھوں والی حسینہ باریک آنچل سے رخِ روشن کو نصف بے نقاب کرتی نشیمن خرمن پہ بجلیاں گرا گئی۔ دل نشین الفاظ کے خالق جون ایلیا نے انشائیہ "راہ گیر" میں حکمت و دانائی کے سچے موتیوں کی لڑی بکھیر دی۔ اداریے میں آپ کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے عرض کر دوں کہ حکمران تو رہے ایک طرف عوام بھی کسی سے کم نہیں، نفرت، بربریت، منافقت اور نہ جانے کون، کون سے خول حضرت عوام نے خود پہ چڑھا رکھے ہیں۔ بزم پھلواری محمد خواجہ خوب صورت تبصرے کے ساتھ راج سنگھاسن کے تخت پہ تر و تازہ سرخ گلاب کی طرح کھل کھلا کے خوب جگمگائے...... وزارت کا قلمدان محمد قاسم رحمٰن نے عمدگی سے سنبھالا۔ سینٹرل جیل لاہور سے رانا حبیب الرحمٰن نے کافی طویل غیر حاضری کے بعد خوشگوار انٹری دی۔ احسان سحر، قمر تبی، محسن خان، شیر علی خان، صفدر معاویہ، راجا ثاقب، ذیشان بدر منیر کو خصوصی سلام۔ طاہر دلگزار سے بزم دوستاں محفل خطوط میں شامل ہونے کی درخواست۔ کہانیوں کی ابتدا محبوب تحریر تاریخی صفحات مرحوم الیاس سیتاپوری کی لاوارث وارث سے کی۔ دلنشین پیرائے میں لکھی گئی تحریر من میں سما گئی۔ امجد رئیس سادہ منصوبہ لے کر آئے۔ میری نے جو کے ساتھ اپنے شوہر کو بھی قتل کر کے گویا بغیر ویزے پاسپورٹ کے عالم بالا کی جانب پرواز کر دیا۔ سنسنی سے بھرپور کاشف زبیر کی وحشی مہذب ممالک کے کمزور عوام تو رہے ایک طرف، برازیل کے جنگلات کے قبائل بھی امریکیوں کے شر سے محفوظ نہیں۔ محبت کے جذبات سے لبریز فیورٹ رائٹر محبتوں کے نقیب، محبتوں کے لکھاری طاہر جاوید مغل کی ستاروں پر کمند اختتام پذیر ہوئی۔ ریاض کی کرائے دار میں سزا یافتہ مجرم رونی بیک کی دیانت داری نے متاثر کیا۔ مرزا امجد بیگ نے ٹوٹے پھوٹے حصوں کو جوڑ کر آخری کیل ٹھونک دیا۔ محفل شعر و سخن میں زاہد چودھری، محمد کمال انور، محمد اشفاق سیال، مہرین ناز کا انتخاب پسند آیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی دعا بانو کی بیماری کے حالات

رنجیدہ کر گئے۔ بابر نعیم کی قسمت میں وینزا اور فلیٹرز ہیں۔ یہ مثال صادق آتی ہے۔ جب تک بے وقوف زندہ ہے عقلمند بھوکا نہیں مر سکتا۔ سلیم انور کی پکار ہونٹوں کی جنبش ہیلو کو ہیلپ سمجھ لیا مختصر مگر اچھی کہانی۔ کی الدین کی ماروی میں مراد نے سپرمین اور ٹارزن کو بھی شہ مات دے دی۔ غلام قادر کی اعتراف عمدہ رہی۔ تصوف کے صفحات کا خوب صورت تحفہ رضوانہ ساجد نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صورت میں دیا۔ منظر امام کی جنگل کا آدمی اسٹوری آف منتھ رہی۔ سہیل کی بندر تماشا حرکتوں نے خوب محظوظ کیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے آخری صفحات کا عمدگی سے حق ادا کر دیا کستوری لگا کے.....''

✠ علی رحمٰن، سندیلیانوالی سے حاضر ہوئے ہیں ''ماہ شمارۂ نومبر انتظار کے بعد کافی دیر بعد 20 تاریخ کو ملا۔ بار بار اسٹال کے چکر لگانے سے ہمارے نرم پاؤں پر چھالے پڑ گئے۔ میرا ارادہ ہے سسپنس کا رائٹر بنوں۔ اللہ تعالیٰ میرے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرے۔ آمین۔ خیر سرورق کافی بہترین تھا۔ لڑکی اپنے منہ کو دوپٹے میں ایسے چھپائے کھڑی تھی جیسے اسے نظر لگی ہو۔ خطوں کی محفل میں پہنچے جہاں محمد خواجہ صاحب نے لفظوں کی بارش کر دی۔ یہ تو وہی بات ہے میں بارش کر دوں لفظوں کی پھر کرسی صدارت تو ہو جا میری۔ محمد قاسم رحمٰن صاحب خوش آمدید۔ رضوان تنولی بھائی آپ کہاں تھے اتنا عرصہ؟ آپ تو عید کا چاند ہو گئے ہیں۔ تنصیر بابر بھائی آپ کی کمی محسوس ہوئی ہے۔ ماہ تاب آپی بیٹی مبارک۔ میں نے اسٹال سے دیوتا کی 200 اقساط لی ہیں۔ بڑی اچھی کہانی۔ مجھے ٹیلی پیتھی والے فرہاد علی تیمور سے لگاوٹ ہو گئی ہے۔ ماروی عجیب کہانی ہے۔ رانا حبیب الرحمٰن اللہ آپ کو باعزت بری کروائے۔ ایک خوشی کی بات ہمارے اسکول کا امریکی تعاون سے چلنے والی کمپنی نے ٹیسٹ لیا ہے۔ میری پہلی پوزیشن آئی ہے۔ اللہ کے کرم سے۔ وحشی کاشف زبیر کی اچھی کہانی تھی۔ کریس کے ساتھ اچھا ہو گیا۔ یہ کیا بات ہے انکل طاہر جاوید مغل صاحب آپ نے اتنی جلدی ستاروں پر کمند کا اختتام کر دیا۔ عادل کی جیت خوشی کی بات تھی مگر سرمد صاحب کی موت افسردہ کر گئی۔ سسپنس میں اب مریم کے خان یا پھر ناہید سلطانہ اختر سے کوئی سلسلے وار کہانی لکھوائیں پلیز۔ کرسٹل کی شادی ہمایوں سے ہو گئی۔ تنویر ریاض کی کہانی میں روبی نے اچھا کر دیا۔ آخری کیل میں نورین نے سفیان کو قتل کر دیا۔ پکار اچھی کہانی لگی۔ محفل شعر و سخن میں رضوان تنولی، عاطف شاہین اور محمد اقبال کے شعر اچھے تھے۔ ماروی بہترین کہانی نہیں ہے البتہ اس کی یہ قسط اچھی لگی۔ ماروی ٹھیک ہو گئی مراد پھر زخمی حالت میں مرینہ کے پاس پہنچ گیا۔ جنگل کا آدمی منظر امام کی اچھی کہانی تھی۔ ملاقات ڈاکٹر ساجد امجد کی آخری صفحات پر بہترین کہانی تھی۔ اعتراف، دعا اچھی کہانیاں تھیں مجموعی طور پر رسالہ اچھا تھا۔''

✠ ابرار وارث، سندیلیانوالی سے چلے آ رہے ہیں ''ہمیشہ کی طرح کے حالات کے برعکس اس دفعہ شمارہ بہت لیٹ ملا۔ ٹائٹل گرل بس سوسو سی لگی۔ سب سے پہلے طاہر جاوید صاحب کی اسٹوری پڑھی۔ پڑھتے پڑھتے جب ہمایوں نے کہا کہ شہزادی مر گئی ہے تو یکدم دل اتنا خراب ہوا کہ آگے پڑھنا ہی چھوڑ دیا کیونکہ طاہر صاحب نے پس زنداں میں بھی بہت رلایا تھا مگر پھر کچھ یاد آیا اور جلدی سے صفحے الٹے اور یہ دیکھ کر تو ہماری جان ہی نکل گئی کہ ''آخری قسط''؟ خیر دل تھام کر پھر سے پڑھنا شروع کیا کہ شہزادی کے بعد عادل کا حال کیا ہوگا؟ بہت پسند آئی ساری کہانی۔ یہ قسط پچھلی ساری اقساط پہ بھاری لگی۔ وہ جگہ تو بار بار یاد آ رہی جب سروں پہ کفن باندھ کے ہمایوں، عادل اور بدر میدان جنگ میں کود پڑے تھے۔ سر سرمد کی موت پر بہت دکھ ہوا۔ شکر ہے طاہر انکل نے شہزادی کو زندہ کر دیا۔ بہت اچھا اینڈ ہوا اس ناول کا ہاں ایک تشنگی سی رہ گئی کہ وہ منظر کیسے بنا جہاں پہاڑوں پر مردہ شہزادی دکھائی گئی۔ ماروی میں زبردست تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں..... مرینہ نے آخر زیر کر ہی لیا مراد کو اور مراد یقیناً اب ماروی کی طرف سے بے مراد ہی ہوگا۔ سمیرا کی بدقسمتی کہ بے چاری کے پلے کچھ نہیں آ رہا۔ ملاقات ایک زبردست طویل کہانی تھی، پڑھ کے مزہ آ گیا۔ اپنوں کی شکل میں کئی غدار آئے اور گئے۔ شکر ہے شمس الدین باوفا نکلا ورنہ میری نظر میں دانش بھی بے وفا تھا۔ منظر امام نے تو حد ہی کر دی کیا خوب صورت تحریر تھی۔ انسان کب درندہ ہے کب وحشی جانور ہے پتا ہی نہیں چلتا۔ ہر طرف انسانوں کے روپ میں بھیڑیے موجود ہیں۔ سہیل بے چارہ در در ٹھوکریں کھاتا رہا پر کسی انسان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ہاں البتہ جانور (بندر) بن کر جو زندگی گزارنے لگا تھا وہ واقعی انسانوں سے بہتر ہے۔ کاشف زبیر کی وحشی میں بھی انسانیت کی درندگی دکھائی گئی۔ حضرت ابراہیم کی ایمان افروز داستان پڑھی اور کعبۃ اللہ کی تعمیر کے واقعات پڑھنے کو ملے۔ غلام قادر کی اعتراف عجیب بے تکی سی لگی اور پکار ٹھیک تھی۔ بس آخری کیل واقعی آخری کیل ہی ثابت ہوئی۔ ایک بات پوچھنا تھی کہ ہر مجرم وکیل صاحب سے آخری وقت کے دوران پانی کیوں مانگتا ہے۔ عاطف شاہین میرے کلاس فیلو کا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ بس اسے ایک پیغام دینا تھا کہ تعلقات اتنی جلدی توڑنے تھے تو بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ محفل شعر و سخن میں مہرین ناز، ریاض بٹ، احمد حسن عرضی، روبینہ صدیق، محمد اشفاق سیالی اور قدرت اللہ نیازی کے اشعار اچھے تھے۔ کترنوں میں رضوان تنولی کے لطائف سارے مزیدار تھے۔ قسمت ایک بہترین بدیسی کہانی تھی۔ ہر بار کی طرح اس دفعہ بھی معاشرے کے ماحول سے نبرد آزما ہوتے ایک مفلس و بے کس جوڑے کی محبت کی داستان پڑھنے کو ملی۔ فیسٹولا کی بیماری سنی تو تھی لیکن مطلب اب پتا چلا کہ یہ اتنا موذی مرض ہوتا ہے۔ اس جملے نے بہت تکلیف پہنچائی کہ وہی بیٹا اب بانو کو برداشت نہیں کر رہا تھا جس کی خاطر دونوں ماں باپ نے ہزاروں ظلم سہے تھے۔ شاید ہم سب ہی ایسے بے حس اور بے درد ہیں۔ خود پر جب بیتتی ہے تب پتا چلتا ہے۔''

✠ **محمد صفدر معاویہ**، خانیوال سے تشریف لائے ہیں ''نومبر کا شمارہ 20 اکتوبر کو کلر کہار میں ملا۔ سرورق پر ایک ماڈل اور 4 مردانہ عکس سے کئی کتراتے انشائیہ پر جا پہنچے جہاں پر جون ایلیا جی ہمیں زمانے کی کرم نوازی اور زندگی کی سختی جیسے مفہوم کو راہ گیر کے مضمون میں پرو تے نظر آئے۔ آپ کا اداریہ پڑھا یقیناً یہ حکومت کے لیے فکر یہ ہونا چاہیے کہ یوں سرعام شراب چل رہی ہے۔ دوسری بات کہ انسان غلط کام کرتے ہوئے یہ کیوں نہیں سوچتا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہونا ہے تو اس وقت وہ کیا جواب دے گا۔ زندگی اتنی بھی ارزاں نہیں ہے کہ یوں اپنے ہاتھوں

سے ختم کریں۔ پچھلے اپنے حالات ہوئے کہ تبصرہ نہ لکھ سکا۔ ایک تو 24 اگست، ہمارے پڑوسی پانچ بہنوں کے 16 سالہ اکلوتے بھائی کی موٹر سائیکل ایکسیڈنٹ میں وفات اور 30 اگست کو ملتان سے میانوالی ٹرین پر جا رہے تھے کہ ایک لڑکے نے خودکشی کرلی۔ اس کی لاش دیکھ کر اندر سے ہل کر رہ گیا۔ سرتن سے جدا ہو گیا تھا اور پاؤں کی جانب پڑا تھا، صرف 19 سال عمر میں۔ کئی دن سکتے کی کیفیت میں رہا کہ زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ یوں برباد کرلیں کہ نہ دنیا کے رہیں نہ آخرت کے۔ اپنی محفل میں جہاں پر محمد خواجہ صاحب کو صدارت پر قلقاریاں مارتے دیکھا مبارک ہو بھی تبصرہ قابل ستائش تھا۔ لاوارث وارث سے پڑھنا شروع کیا جہاں عبداللہ نے اپنے ساتھ خود برا کیا وہیں بادشاہ کا کردار بھی عجیب لگا۔ کبھی عدل تو کبھی ظلم۔ بات بے بات گردنیں اڑا دیتا تھا۔ اس کے بعد ستاروں پر کمند پڑھی۔ اتنی جلدی ختم ہو گی یقین نہیں آرہا۔ بہرحال اختتام نسبتاً بہتر تھا۔ سرمد صاحب کی موت کا دکھ ہوا، ہمایوں کے غم بھی کچھ ہلکے ہوئے۔ عادل اور شہزادی بھی مل گئے۔ سادہ منصوبہ پہلے بھی شائع ہو چکی ہے۔ کاشف زبیر کی وحشی میں یہ بتایا گیا آدم خور جتنی دہشت رکھتے ہیں تو ہم انسان ان سے بھی بڑھ کر وحشت رکھتے ہیں۔ کرائے دار میں روبی بیک چالاکی سے لوٹی ہوئی دولت لے گیا اور ساتھ میں سوس کا بھی بھلا کر گیا۔ مرزا امجد بیگ اس دفعہ آخری کیل لے کر آئے جس میں بیگ صاحب نے اپنی مؤکلہ کو باعزت بری اور اصل مجرم کو پکڑوایا۔ محفل شعر و سخن بیسٹ ہے۔ ماروی میں عجیب کشمکش والی صورت حال ہو گئی ہے۔ مرینہ جو چاہتی تھی وہ حاصل کرلیا اور ادھر ماروی کی یادداشت واپس آگئی اور اس نے عجیب شرط رکھی جس میں مراد تو ناکام ہو چکا اور محبوب کے پلس پوائنٹ بڑھ گئے۔ اعتراف بھی گزارہ کر گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں پڑھ کر بہت کچھ جاننے کو ملا۔ منظر امام کا جنگل کا آدمی مسلسل لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتی رہی۔ ملاقات ڈاکٹر ساجد امجد کے ہاتھوں لکھی گئی خوب صورت تحریر۔ یہ حقیقت کہ غریب کو غریب سے محبت کرنی چاہیے لیکن کیا کریں محبت کی ٹینشن جانی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح لائبہ اور دانش کو بھی ہو گئی۔ میری پوسٹنگ کلر کہار سے سرور بیس کراچی ہو گئی ہے۔ امید ہے کراچی والے دوست ویلکم کریں گے۔'' (خوش آمدید)

✠ سید عقیل، دبئی سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں ''میں پچھلے دنوں دبئی سے پاکستان آیا ہوا تھا، میں سات سالوں سے جاب کے سلسلے میں ادھر ہوں۔ یہاں جاسوسی اور سسپنس میرے بہترین ساتھی اور غم گسار ہیں۔ پاکستان آنے کا مقصد، رب کریم نے مجھے شادی کے تین سال بعد پیاری سی گڑیا رانی یعنی بیٹی سے نوازا۔ جب میں اس کو گود میں لیتا تھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے پوری کائنات میری گود میں سما گئی ہو۔ اولاد میں بیٹی قدرت کا عظیم تحفہ ہے۔ سسپنس ہمیں 17 اکتوبر کو مل گیا، سوچا اس بار ہم بھی اس کارخیر یعنی پیارے دوستوں کی محفل میں شرکت کریں۔ (خوش آمدید) سرورق سدا کی طرح انمول اور انفرادیت لیے ہوئے تھا۔ ایلیا صاحب اور اداریہ دل لگتی کہیے ایسے ہیں۔ خواجہ صاحب صدارت مبارک۔ مہرین ناز کی پاکستان اور پاکستانیوں کے بارے میں کھری کھری باتیں دل میں کھب گئیں۔ اکبر بھائی، ہارون بیبرس اور اعجاز احمد کے تبصرے شاندار تھے۔ رانا حبیب الرحمٰن اور شاہین تبسم کے تبصرے اچھے لگے۔ انیلہ کی کمی محسوس ہوئی، آپ ہر ماہ حاضر ہوا کریں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے سلسلہ وار کہانیاں پڑھتا ہوں۔ ڈائجسٹ سسپنس کی نمبر ون کہانی ہے ستاروں پر کمند۔ شکریہ طاہر جاوید صاحب۔ ماروی بھی اب اچھے ڈگر پر چل رہی ہے۔ مرزا امجد بیگ صاحب کی آخری کیل واقعی پیچیدہ کیس تھا۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں کہ اب ہمارے روانگی کے دن ہیں۔ محفل شعر و سخن میں محمد کمال انور، اظہر حسین بیچار اور مہرین ناز کے اشعار پسند آئے۔ نومبر کا سسپنس بہت خوب صورت اور جاندار ہے۔'' (بہت شکریہ)

✠ احسان سحر، زاویے خیلانوالہ، میانوالی سے محفل کی زینت بنے ہیں ''سوچیں دماغ میں پیدا ہو کر دل میں بس جاتی ہیں اور یادیں دل سے پیدا ہو کر دماغ میں بسیرا کرلیتی ہیں۔ سسپنس بھی تو ہمارا یار بھی ہے۔ سوچ بھی ہے اور خوشبو بھی ہے جو نہ ملے تو سکون بھی ہمارے دل و دماغ سے رخصت ہو جاتا ہے جیسے دھوپ پڑنے پر شبنم پھول سے (اس محبت کا شکریہ) سسپنس 16 کو ہمارے دل کی نگری میں آیا۔ ٹائٹل سے آغاز کیا۔ نیلا رنگ جو سوچ کی علامت بھی ہے۔ ہم بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے آخر دلنشین نیلے رنگ میں ہماری طرف دیکھ کر کیا سوچ رہی ہے۔ جون ایلیا کا راہ گیر پڑھا۔ ہم سب ہی راہ گیر ہیں...... چلتے ہیں پر پھر بھی کھڑے ہیں۔ کبھی ہمیں ڈگڈگی پر نچایا جاتا ہے تو کبھی فرقوں اور نسلوں میں بانٹا جاتا ہے۔ پتا نہیں ہم ظالم اور خود غرض بن کر ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں۔ خلوط کی دوڑ میں شامل ہوئے۔ جہاں پر صرف ہم نے خود اپنا استقبال کیا۔ سب سے آگے جو دوڑتے نظر آئے وہ جناب تھے محمد خواجہ کورنگی سے اور جناب نے ایک ہی سانس میں کہانیوں پر بھی تبصرہ جاری رکھا۔ ستاروں پر کمند سے اسٹارٹ لیا اور آخری پڑاؤ۔ اختتام اختتام ہی ہوتا ہے۔ ختم ہو جانا ہی ہے۔ محبت جتنا لفظ میٹھا ہے اس میں اتنی ہی کڑواہٹ چھپی ہوتی ہے۔ سرمد صاحب نے محبت میں وہ کیا...... جس کی مثال لفظوں میں ممکن نہیں۔ وحشی...... گندگی میں گر کر صاف سے صاف چیزیں بھی گندی ہی ہو جاتی ہیں جدید دنیا میں انسان نے خود کو مہذب تو بنا لیا لیکن اپنے اندر کے وحشی کو کبھی مار نہیں سکا۔ پکار، کبھی جو دکھائی دے وہ ہوتا نہیں اور جو سنائی دے وہ بھی نہیں ہوتا...... یہاں بھی ایسا ہی معاملہ پڑھنے کو ملا۔ دعا، چاہت ملاوٹ سے پاک ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ آج وہ چاہت اور محبت بہت مشکل سے ملتی ہے۔ آخری کیل مرزا امجد بیگ صاحب پھر سے گھریلو مسئلے کو سلجھاتے نظر آئے۔ حضرت ابراہیمؑ کے سحر انگیز واقعات پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ کرائے دار تنویر ریاض کی بھی اچھی کاوش تھی۔ ماروی دھوم مچاتی جارہی ہے۔ اپنا رنگ آخر مراد نے دکھانا شروع کر ہی دیا۔ بہت خوب۔ تاریخی کہانی اس دفعہ بھی دل کے تاروں کو چھیڑ گئی۔ بہت ہی خوب صورت انداز ہے جناب الیاس سیتاپوری کا۔ آخری صفحات پر ملاقات ناول پڑھا۔ اپنے دکھ بھی دیتے ہیں اور سکھ بھی۔ دکھ تب دیتے ہیں جب خود غرض بن جاتے ہیں۔ اپنے سوا کسی کو بھی عزیز نہیں سمجھتے، کرم نواز اپنے انجام کو پہنچا۔''

✠ **مہرین ناز**، حیدرآباد سے چلی آرہی ہیں ”سسپنس نومبر اپنی تمام سحر سامانیوں سمیت 15 تاریخ کو ہاری نظروں کی بلکہ ……ان پہلے ہی موسم نے کروٹ بدلی تھی۔ یوں زندگی کی خوشگواریوں میں اضافہ ہوگیا۔ سرورق بس واجبی سا تھا۔ جون ایلیا کی طرح ہم سب راہ گیر ہی ہیں۔ بس چلتے ہی جا رہے ہیں سمت کا کوئی تعین نہیں۔ اداریہ حسبِ معمول یعنی پاکستان کے حالات کا نوحہ… بس دعا سے خیر ہی کی جا سکتی ہے۔ محمد خواجہ صاحب کو صدارت مبارک۔ اعجاز احمد راحیل، محمد اکبر، ہارون بہرس اور رانا حبیب اچھے تبصروں کے ساتھ محفل کی رونق بڑھا رہے تھے۔ زویا اعجاز کی محفل میں کمی محسوس ہورہی ہے۔ سید شکیل کاظمی جی آپ بھی اس محفل میں آیا کریں۔ بابر عباس بھائی تو اس محفل کو بھول ہی گئے۔ شبانہ ایزد یر آباد درست آیئے۔ خیر اپنی محفل سے فارغ ہوکر کہانیوں کا رخ کیا۔ اس بار ابتدا مختصر کہانیوں سے کی۔ منظر امام اس بار جنگل کا آدمی کی صورت میں منفرد اسٹوری لائے۔ تقریباً زندگی کے تمام پہلو کا احاطہ کرتی ہوئی۔ آج کے دور میں انسان بے وقعت ہوکر رہ گیا ہے۔ جنگلوں میں بھی جانوروں سے بڑے انسان جانور بسیرا کیے ہوئے ہیں۔ بیچارہ سہیل اور دل نشین وردینا والی، اچھے کردار رہے۔ دعا، ڈاکٹر شیر شاہ سید کی متاثر کن حقیقت پر مبنی تحریر تھی۔ آخری کیل، مرزا امجد بیگ کا کیس اس بار کافی پیچیدہ تھا مگر بیگ صاحب کے پاس ایک جادو کی چھڑی ہے جو تمام معاملات سلجھا لیتی ہے۔ سفیان جیسے مکروہ، بدذات بندے کا انجام یہی ہونا تھا۔ فوزیہ کو پھنسانے والی ملازمہ فہمیدہ خود پھنس گئی۔ امجد رئیس کا سادہ منصوبہ۔ واقعی میرس ولسن کا منصوبہ تھا سارا مگر جانداد، چور جو کے ذریعے اپنے شوہر ٹام سے جان چھڑائی۔ پکار میں سلیم انور نے ایک ہلکے پھلکے تانک پر قلم اٹھایا کہ ہونٹوں کی جنبش کو سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ وحشی میں کاشف زبیر نے امریکیوں کا وحشی پن اجاگر کیا ہے۔ ریناولسن نے خود اپنی آنکھوں سے جان، کرس اور روجر کا وحشیانہ کھیل دیکھ لیا تھا۔ جس کی سزا میرن کو ملی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آخری حصہ ہمارے لیے تسکینِ روح ثابت ہوا۔ محی الدین نواب ماروی کو آخرکار شاندار تحریک پر لے ہی آئے۔ نومبر کی قسط تو لاجواب رہی۔ محبوب چانڈیو کو اپنی بے لوث محبت کا صلہ مل ہی گیا کہ ماروی کے دل میں جگہ مل گئی۔ ستاروں پر کمند کی آخری قسط آخر میں پڑھی۔ طاہر جاوید مغل صاحب نے اس بار تو دل خوش کردیا ہم سب قارئین کا کہ حاصلِ محبت ہوئی۔ سرمد کی موت کا افسوس ہوا۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو اچھا ہوتا۔ محفل شعر و سخن میں اعجاز احمد راحیل، محمد اکبر بانج، محمد کمال انور، زاہد چودھری اور عاطف شاہین کے انتخاب بہترین رہے۔“

✠ **ثنا ڈار**، لالہ موسیٰ سے محفل میں شریک ہیں ”گزشتہ 5 ماہ سے ڈائجسٹ تاکید سے خریدنا شروع کیا ہے۔ اس سے پہلے کبھی کبھار ہی خریدا کرتی تھی۔ سب سے اچھی بات زیادہ قسط وار کہانیوں کا نہ ہونا اور تاریخی کہانی کے علاوہ جون ایلیا کا انشائیہ۔ کسی بھی ڈائجسٹ میں پہلا خط ہے اور اس امید پر لکھ رہی ہوں کہ کمل خطوط میں جگہ مل پائے گی۔ خط لکھنے کی اکلوتی وجہ نومبر کے شمارے میں شامل کہانی اعتراف ہے جو کہ غلام قادر صاحب کی تحریر ہے۔ نادیہ اور احتشام دونوں ہی خواہشوں کے جال میں تھے اور بے خبر بھی تھے اپنی اسیری سے۔ کہانی ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ جذبات، تفرقات اور تغیرات سے بھرپور کہانی نے زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے روشناس کروایا۔ غلام قادر صاحب کو اتنی جامع تحریر کے لیے شکریہ۔ باقی کہانیوں کی خصوصیات سے بھی انکار ممکن نہیں۔“

✠ **انجم فاروق ساحلی**، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور سے حاضر ہیں ”نومبر کا سسپنس آنچل سے چہرہ چھپائی حسینہ کے منظر کے ساتھ مارکیٹ میں آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے شوخ رنگ استعمال نہ کیے۔ کہانیوں میں لاوارث وارث، سادہ منصوبہ، وحشی، ستاروں پر کمند، کرائے دار کا اختتام۔ آخری کیل، ملاقات اچھی تحریریں معلوم ہوئیں۔ ستاروں پر کمند جلد اختتام پذیر ہوگئی۔ زیادہ خیال تھا کہ لمبی چلے گی۔ سادہ منصوبہ ان کہانیوں میں سے ہے جن میں اصل پلاٹ فوراً شروع ہوجاتا ہے اور معلومات اور لمبی تمہید کے بجائے مکمل دلچسپی برقرار رہتی ہے ایسی ہی کہانیوں کی ضرورت ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کاوش بھی خوب تھی۔ محفل شعر و سخن میں اشعار ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔“

✠ **آمنہ ضیا احمد**، حیدرآباد سے شریکِ محفل ہیں ”اگست 2014ء میں ایک کہانی ارسال کی تھی۔ فی الحال اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں کہ کہانی کا مسودہ واپس نہیں آیا تو شاید میری کہانی قابلِ اشاعت قرار پائی ہے۔ اس ماہ پھر ایک کہانی لے کر دستک دے رہی ہوں اور دعا گو ہوں کہ اس کا مسودہ اب میرے دروازے پر دستک نہ دے بلکہ مجھے سسپنس پر چمکتے دمکتے صفحات پر میری تحریر نظر آجائے۔ آپ کو یقیناً اس بات کا اچھی طرح علم ہوگا کہ ایک تخلیق کار اپنی تخلیق ارسال کرنے کے بعد کس قدر ذہنی انتشار کا شکار رہتا ہے۔“ (مزید انتظار کریں، آپ کی تجویز قابلِ غور ہے)

✠ **عبدالجبار رومی انصاری چوہنگ**، ملتان روڈ، لاہور سے چلے آرہے ہیں ”پہلی دفعہ آپ کی محفل میں شریک ہورہے ہیں امید ہے حوصلہ افزائی کرکے شکریہ کا موقع دیں گے۔ (خوش آمدید) باقی سبھی لکھنے والے مبارک باد کے مستحق ہیں جو اتنی پیاری پیاری تحریریں سسپنس کی زینت بناتے ہیں۔ دل تو چاہتا ہے تبصرہ کروں لیکن چونکہ پہلا خط ہے اس لیے اتنا ہی کافی ہے یقیناً حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ سب قارئین سسپنس کو دل کی گہرائیوں سے سلام۔ ہمیشہ پاکستان کی ترقی کے لیے کوشاں رہیں۔“

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے تبصرہ کررہے ہیں ”سرورق خوبصورت رنگوں سے سجا ہوا تھا۔ انشائیے میں علم و حکمت کے موتی آگہی کا سبب بنے۔ اپنی محفل میں محمد خواجہ سرِفہرست تھے، سو مبارکباد قبول ہو۔ دیگر دوستوں کی حاضری بھی نظر آرہی تھی۔ لاوارث وارث، الیاس سیتاپوری تحریروں میں جان ڈال دیا کرتے تھے۔ ایک ایک لفظ چنا ہوا اور مستند روایات سے مزین، یہ ان کے قلم کے اوصاف تھے۔ سادہ



منصوبہ میں لیبری ولسن نے ایسا بے داغ منصوبہ بنایا کہ اس میں حقیقت کا گمان ہو۔ وحشی میں آدم خور قبائل کا احوال بیان کیا گیا۔ حیرت انگیز تھا۔ ستاروں پر کمند طاہر جاوید مغل کی بہترین کہانی ثابت ہوئی جس میں دلچسپی کے سارے لوازمات تھے مگر اتنی جلدی تحریر کا اختتام توقع کے برخلاف تھا۔ مرزا امجد بیگ کی آخری کیل بھی بہتر رہی۔ اگرچہ زیادہ تر تحریروں میں گمان ہوتا ہے کہ کئی مرتبہ تحریر پڑھ چکے ہیں۔ پکار میں غلط فہمی کی وجہ سے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ محفل شعر و سخن میں معیاری اور منتخب اشعار نے مزہ دیا۔ اقوالِ زریں و لطائف پر مبنی کترنوں نے لطف دیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی دعا نے بھی بہت متاثر کیا۔ ایسے مریض کی کربناک زندگی کا احاطہ کیا گیا۔ تصور سے بھی زیادہ ایسے انسان کا درد محسوس ہوتا ہے۔ قسمت میں چالاکی سے منصوبہ بنایا گیا جس سے قتل بھی نہیں کرنا پڑا اور بیس لاکھ ڈالرز بھی مٹھی میں آ گئے۔ ماروی میں مزہ نہیں آ رہا ہے۔ توقع ہے نواب محی الدین کچھ چینج لائیں گے۔ اعتراف نے بھی اچھا تاثر دیا، واقعی حقیقت ہے کہ محبت اظہار چاہتی ہے جو اظہار نہیں کرتے وہ خسارے میں رہتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ ہو جاتا ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ عورت محبت کے دو میٹھے بول کی بھوکی ہے۔ روحانی سلسلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات و واقعات نے روح کی بالیدگی کا سبب بنایا۔ رضوانہ ساجد زورِ قلم اور زیادہ۔ منظر امام کی جنگل کا آدمی نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ تحریر کافی دلچسپ رہی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی ملاقات آخری صفحات کا خاصہ رہی۔ بہترین کہانی تھی۔ مجموعی طور پر سسپنس بہت عمدہ رہا۔"

☩ **ذاکم علی گور چانی**، واجل سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "ماہ نومبر کا شمارہ تمام تر تابانیوں کے ساتھ 21 تاریخ کو ملا۔ کیا بات ہے ذاکر انکل صاحب کی۔ دیسی اسٹائل کی حسینہ معصوم اداؤں سے گھونگھٹ کی آڑ میں کہیں نظریں جمائے ہوئے تھی۔ جون ایلیا کا انشائیہ بلاشبہ بہت ہی اعلیٰ و ارفع خیالات کا عکاس تھا۔ محفل صدارت محمد خواجہ صاحب کے حصے میں آئی۔ رضوان تنولی کریڑوی صاحب! آپ کے تبصرے میں میرا نام غلط لکھ دیا گیا۔ اب ہم اسے کس کی غلطی گردانیں..... کہیں آپ نے کستوری لگا کر تو خط نہیں لکھا۔ محمد یوسف سانول، خدا آپ کے دوست کو شفائے کاملہ نصیب فرمائے (آمین) بشریٰ افضل صاحبہ! میرا شعر پسند کرنے پر بے حد شکریہ۔ قدرت اللہ نیازی صاحب! میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ واقعی کئی ایسے خاموش قاری ہوں گے جو اپنی محبت سرِ دیوار نہیں لاتے۔ باقی تمام ساتھیوں کے تبصرے خوب تھے۔ ستاروں پر کمند کی آخری قسط دیکھ کر سخت دھچکا لگا۔ بہرحال اتنی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے بعد عادل کو شہزادی تو مل گئی۔ ماروی بھی بہت زبردست جا رہی ہے۔ مرینہ کی گھٹیا حرکات اسے اور بھی گھٹیا بنا رہی ہیں اور عورت کے منفی رخ کو اجاگر کر رہی ہیں۔ مرزا صاحب کی آخری کیل بھی شاندار اسٹوری تھی۔ آخرکار فوزیہ کو ذلیل آدمی کے قتل میں ملوث کرنے والی بلی، نورین تھیلے سے باہر آ گئی۔ لاوارث وارث، بھی ایک اہم تحریر تھی تاریخی اعتبار سے۔ میں تو ان کہانیوں کو غور سے پڑھتا ہوں کہ بی اے میں، میرا خاص سبجیکٹ تاریخ اسلام ہی ہے۔ محفل شعر و سخن میں ایم کامران خالد، مہرین ناز، رضوان تنولی کریڑوی، ریما رضوی اور عمران علی کے اشعار بہت پسند آئے۔ کترنوں میں ریاض بٹ، رضوان تنولی کریڑوی، سوہا مِنی فرام لاہور اور احسان سحر فرام میانوالی کا انتخاب پسند آیا۔"

☩ **آغا فرید احمد خان**، سکھر سے خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں "طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر اپنی محفل میں شامل ہونے کی غرض سے خط لکھ رہا ہوں لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ اس عرصے میں ہم سسپنس سے دور رہے۔ ہم تو سسپنس تک رسائی میں بھی ایک دن کی تاخیر کے متحمل نہیں ہوئے۔ حسبِ سابق ٹائٹل جاذب نظر مشرقی رنگوں سے مزین تھا۔ جون ایلیا مرحوم کی کلاس اٹینڈ کی جس میں موضوعِ بحث "راہ گیر" تھا۔ بہت ہی مشکل کلاس تھی۔ پھر آئے اپنی پیاری سی محفل میں جو نوک جھونک کے بغیر پھیکی پھیکی رہی۔ آج محفل کا تاج محمد خواجہ کے سر سجا۔ شبانہ حسن کا شکریہ کہ مجھے یاد کیا۔ کہانیوں کی ابتدا الیاس سیتاپوری کے تاریخی شاہکار لاوارث وارث سے کی۔ تاریخی معلومات میں اضافہ ہوا۔ اس کے بعد ستاروں پر کمند کی آخری قسط کو پڑھا۔ دورانِ مطالعہ جب پڑھا کہ شہزادی مر گئی ہے تو کہانی کو وہیں چھوڑ کر مغل صاحب کو ایک بھرپور تنقیدی خط لکھنے کو سوچا لیکن تنقید کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ کہانی کو پورا پڑھا جائے لیکن جیسے جیسے آگے بڑھا، کہانی نے یوٹرن لیا اور کہانی کو پورا کرتے کرتے ہماری تنقید تعریف میں بدل گئی، شہزادی زندہ نکلی۔ عادل کی کامیابی رنگ لائی اور محبت کی جیت ہوئی۔ ایک خلش دل میں رہی وہ یہ کہ سرمد صاحب کی موت ہو گئی لیکن سرمد صاحب کے گھر میں ہمایوں کے آنے سے سرمد صاحب کی کمی کو پورا کیا گیا۔ بہت ہی ہیپی اینڈ ہوا ہے۔ مغل صاحب کو ڈھیروں مبارک باد۔ آخری صفحات کی سوغات ڈاکٹر ساجد امجد کی ملاقات پڑھی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ آخری صفحات پر ایسی لازوال تحریر دے کر آخری صفحات کا حق ادا کیا گیا۔ راحیلہ کی سازشوں کی وجہ سے لائبہ اور دانش تو ایک دوجے کو حاصل نہ کر سکے پر یہ کام ان کی اولاد نے کر دکھایا۔ بہت عرصے بعد آخری صفحات پر لازوال تحریر دی گئی۔ منظر امام کی جنگل کا آدمی، بہ ظاہر مزاحیہ لیکن سبق آموز اور دورِ حاضر کی ترجمانی کرتی تحریر تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آخری حصہ معلومات میں اضافہ کر گیا۔ غلام قادر اعتراف لائے اور کیا خوب لائے، بہت ہی خوب صورت تحریر تھی۔ سمجھنے والوں کے لیے تو سوغات تھی اور نہ سمجھنے والے ابھی تک سوچتے ہوں گے کہ معاملہ کیا ہے۔ سلیم انور کی پکار پڑھ کر سوچنے لگے کہ ایسی کہانی جس کا نہ سر ہو نہ پیر، دی ہی کیوں گئی۔ بیگ صاحب اس بار آخری کیل لائے۔ بہت ہی خوب صورت کہانی تھی کیونکہ میں بھی قانون کا طالب علم ہوں اور اسی پیشے سے وابستہ ہوں۔ اس لیے تھوڑا بہت سمجھتا بھی ہوں کہ کہانی کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے کبھی ایسی باتیں بھی آ جاتی ہیں جس کا عدالتی کارروائی سے تعلق نہیں ہوتا۔ بہت ہی عمدہ اور دلچسپ تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں عبرنا کج، اعجاز راحیل، روبینہ اشرف اور مدحت کا انتخاب اچھا تھا۔"

☩ **ہارٹ کیچر**، علی پور، جتوئی سے چلے آ رہے ہیں "حسنِ مشرقی حیا کے نیلگوں آنچل کی آڑ میں خود کو چھپانے کی شرمیلی کوشش میں کوشاں



مگر نگاہِ عشق پاکیزہ آنچل کے آر پار سرخ عکس سے ترائے ہوئے متبسم لب تاڑ گئی۔ کمبخت پگلی آنکھوں سے اترتی نہیں دوسری سامنے آجاتی ہے۔ مجذوب دانا جون ایلیا کا سنگین انشائیہ چشمۂ حکمت سے سیراب ہوئے ابتدائیہ محترم ایڈیٹر، عوام ہوں یا حکمراں کوئی بھی اپنی روش بدلنے پر تیار نہیں۔ ہم سب کی آنکھیں اپنے اندر سے زیادہ دوسروں کے عیب دیکھنے کی عادی ہیں۔ میر بزم محمد خواجہ صاحب مبارک باد کا پھول دستہ قبول فرمائیں اور وعدہ تو کیا ہوتا میں حسن و عشق دونوں اپنی اپنی جگہ انا پرست تھے۔ حسن نے انکار حسن توہین جانی اور عشق نے جھوٹا وعدہ توہین عشق سمجھی، سوچیے اگر وعدہ وفا نہ ہوتا تو پھر کیا ہوتا۔ ستاروں پر کمند طاہر جاوید مغل نے جس طرح عادل کو نہایت مشکل سچویشن سے 2.4 (دو چار) کر کے ایک جست میں ونگ پوائنٹ پر پہنچا دیا بالکل بھی ہضم نہیں ہوا۔ دماغی بدہضمی دفع دور کرنے کے واسطے خیالی سوڈا واٹر نوش کرنا پڑا۔ طاہر صاحب نے شہزادی کو زندہ جاوید چھوڑ کر اچھا کیا ورنہ قسم سے ہماری تو خیر نہیں تھی۔ کرایہ دار میں سوچ کو اس بات کا اور اک روئی بیک کے منصفانہ عمل سے ہو گیا۔ پکار بھی ٹھیک ٹھاک رہی۔ پہلو میں حسین عورت ہو دسترس میں پرائی دولت ہو تو عورت کو چھونے اور دولت کو ہتھیانے کا خیال ابن آدم کے دل میں آ ہی جاتا ہے۔ پس بابر نعیم کی تلاش...... قسمت میں مقدر نے یاوری کی اور بہترین منصوبہ بندی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ڈیل کلیرنس پرائی دولت ہتھیانے میں کامیاب ہو گیا۔ مرزا امجد بیگ انگشت ذہانت سے کیس جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ بالآخر زیرے نے زبر کو زیر کر ہی لیا یعنی میم کی تکرار ماروی میں مکار سرینہ نے مردِ میدان مراد کو مات دے کر میدان مار ہی لیا۔ چلو کوئی گل نئیں خربوزہ چھری پر گرے یا چھری خربوزے پر، نقصان میں ہمیشہ خربوزہ ہی رہتا ہے۔ تیقن کی حدوں کو بوسے لیتا ہوا شک اس وقت یقین کے سانچے میں ڈھل گیا جب لائبہ اور دانش کمال کی اولادوں کو ازدواجی ڈوری میں بندھے دیکھا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحقیقی ملاقات کا سب سے خوشنما منظر جب شوہر پرست لائبہ نے غیر مرد کے بوسے کے ان دیکھے نشان والی کلائی کو جلا ڈالا۔ اثاثہ ماضی لاوارث ہنوز بوسۂ چشم سے محروم۔ اسلامی تاریخ کا پرنور سفر چشم عبرت سے ملتے کیا ہی تھا کہ ہچکیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ فوراً منظر امام کی جانب لپکے۔ ترش تلخ موضوعات میں مزاح کی چاشنی حقیقت کا چٹخارہ تلخیوں کا تیکھا پن بھرنے میں ماہر وحاذق مصنف منظر امام جنگل کا آدمی میں بیمار معاشرے کے کئی رستے ناسوروں پر نشتر زنی کرتے رہے۔ کاشف زبیر کی کہانی وحشی ہمیشہ کی طرح بیسٹ ترجمہ...... سب کہانیوں پر سبقت لے گئی۔“

✠ **سید محی الدین اشفاق**، فتح پور، لیہ سے محفل میں شریک ہیں ”تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد محفل میں حاضر ہوں، مگر یہ غیر حاضری صرف محفل میں تھی سسپنس سے نہ تھی۔ انشائیہ میں جون ایلیا ”راہ گیر“ کے ذریعے راہِ راست پر لاتے نظر آئے۔ رومان انگیز طویل سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کے ہاتھ کہاں ہیں، میں ان کو چومنا چاہتا ہوں۔ ستاروں پر کمند ان کا ایک ایسا شاہکار تھا کہ اس کو مدتوں بھلایا نہیں جا سکتا۔ سرمد صاحب کی باتیں جس طرح عادل کو مضبوط کرتی تھیں، وہاں اس سے پڑھنے والوں کو بھی حوصلہ ملتا ہے۔ آپ کے قلم سے کوئی طویل داستان جلد از جلد ہونی چاہیے۔ ماروی ابھی تک اس درجے پر نہیں ہے جہاں نواب صاحب کے قلم کی تاب ہے۔ بار بار ماروی کی یادداشت کا آنا جانا بوریت پیدا کرتا ہے۔ مراد اور سرینہ ایک ہوتے جا رہے ہیں۔ محبوب کو بہ ظاہر کچھ ملتا نظر نہیں آ رہا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی سوانح حیات اور نمرود سے ٹکراؤ سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ رضوانہ ساجد صاحبہ آپ پیر مہر علی شاہ صاحب کے بارے میں بھی لکھیں۔ باقی ڈائجسٹ زیر مطالعہ ہے۔ سرورق کی حسینہ رضوان تنولی سے پردہ کرتی نظر آئی۔ محمد خواجہ ایک بہترین تبصرے کے ساتھ ونگ سیٹ پر براجمان تھے۔ مہرین ناز، قدرت اللہ نیازی اور اعجاز احمد راحیل کے تبصرے اچھے لگے۔ شبانہ حسن کی خیر ہے ایسی کون سی مصروفیات ہیں کہ ان کو ڈائجسٹ کے لیے بھی مشکل سے وقت نکالنا پڑتا ہے؟ محمد جاوید اپنی تعریف کرتے نظر آئے۔“

✠ **طلحہ رحمان**، لاہور سے چلے آ رہے ہیں ”سرورق اس دفعہ نجانے کیوں اچھا نہیں لگا۔ اس کے پھیکے پن کا اثر جون ایلیا صاحب کے انشائیے ”راہ گیر“ پر بھی پڑا۔ خطوط کی محفل میں پہنچے۔ محمد خواجہ صاحب کرسیٔ صدارت پر متمکن تھے۔ تبصرہ خاصا جامع تھا۔ محمد قاسم رحمان آپ بھی میرے کلاس فیلو ہیں سید اکبر شاہ کی طرح۔ رضوان تنولی صاحب نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار عمدگی سے کیا۔ اعجاز احمد راحیل صاحب کیا آپ سے بھی زیادہ کوئی مغل انکل کا دیوانہ ہوگا۔ آپ کا تبصرہ پڑھنے سے پہلے تک میں اس خوش فہمی میں رہا کہ شاید مجھ سے زیادہ مغل صاحب کا دیوانہ کوئی نہ ہوگا۔ مگر اب پتا چلا ہے کہ آپ مجھ سے بھی دو چار ہاتھ آگے ہیں۔ کہانیوں میں حسب معمول سب سے پہلے مغل صاحب کی ستاروں پر کمند پڑھی۔ جس نے اس دفعہ بہت مایوس کیا۔ مغل انکل سے اس قسم کے اختتام کی توقع نہیں تھی۔ عادل کی کامیابی نے خوش کر دیا۔ اب پتا نہیں آنے والی سلسلہ وار کہانی کون قلم بند کرے گا۔ میری دعا ہے کہ یہ بھی مغل انکل کا شاہکار ہو۔ ماروی اب مکمل طور پر ٹھپ اور بور اسٹوری ہو چکی ہے۔ جنگل کا آدمی، منظر امام صاحب کی ایک طنزیہ کہانی تھی جو اپنے مزاح کو سموئے ہوئے ہمارے ملک کے موجودہ حالات کی عکاسی کرتی ہے۔ رضوانہ ساجد نے حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں مجھ ناچیز کو خاصی معلومات فراہم کی ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی تحریر دعا، خاصی الم ناک تھی۔ بانو کی بیماری نے آنکھوں سے آنسو چھلکا دیے۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

زاہد چودھری، چھورکینٹ۔ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی۔ بشریٰ افضل، بہاولپور۔ احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل، کراچی۔ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی۔ قیصر اقبال گچ، کلول، ضلع بھکر۔ الیلی، کراچی۔ بوم بوم آفریدی، سرگودھا۔ بابر عباس، حسنین عباس، کمیل عباس، نگیانہ روڈ کھاریاں۔ حسنین نواب، لاہور۔ رانا حبیب الرحمٰن، سینٹرل جیل کوٹ لکھپت، لاہور۔

عشق تمام

ایس ایس سیتاپوری

اگر کتابیں لکھنے کا رجحان مفقود نہ ہوتا تو آج کوئی تاریخ سے واقف بھی نہ ہوتا... اوراق کتاب کے ہوں اور واقعات ماضی کے... تو پڑھنے والا مستقبل کی سوجھ بوجھ بھی پالیتا ہے... تاریخ صرف بادشاہت کے اصول یا سیاست کی نیرنگی سے ہی واقف نہیں کراتی بلکہ دلوں کے بھید اور خوابوں کی تعبیر بھی بتاتی ہے... اس کی آنکھوں میں بھی کچھ خواب تھے مگر وہ رشتوں کے گرداب میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ کسی ایک سمت جانے کا فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا... کیونکہ ہر رشتہ اس کے پیروں کی زنجیر تھا۔ اس کے کاندھوں پر اگرچہ ایک اہم عہدے کی ذمے داری تھی لیکن مشکلات کے باوجود وہ کسی رشتے کو چھوڑنے کے لیے تیار بھی نہ تھا۔ دولت کی ریل پیل نے اپنوں کو دشمن اور دشمنوں کو اپنا تو بنا دیا تھا مگر قسمت کا یہ فیصلہ اسے منظور نہ تھا۔ اسے تو بس اصل چہرے دیکھنے کی تمنا تھی... کیونکہ وہ ایسا نہ کرتا تو اپنے لختِ جگر کو کھو دیتا جو اصل میں اس کا وارث تھا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

عامر ابھی دو سال کا تھا کہ ماں کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت اس کا باپ ہارون خراسان کی مہمات میں الجھا ہوا تھا۔ عامر کے آس پاس اس کے ننھیالی رشتے دار موجود تھے۔ انہوں نے عامر کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور ہارون کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ خراسان میں ہارون کو عین میدانِ جنگ میں اس وقت اپنی بیوی کی موت کی خبر پہنچی جب وہ دشمنوں سے فیصلہ کن مقابلہ کررہا تھا اور یہ افسوس ناک خبر خلیفہ کی طرف سے بھیجے گئے کمکی دستے نے پہنچائی تھی۔ اس کا زندگی سے دل اٹھ گیا اور وہ خود بھی مرنے کی آرزو کرنے لگا۔ اسے اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہارون خراسان کی خطرناک مہم پر چلا گیا اور وہاں ایسا الجھا کہ بیوی بچے کا ہوش نہ رہا۔ وہ عامر کو دو ماہ کا چھوڑ کر خراسان چلا گیا تھا۔ یہاں تک کہ دو ماہ کا بیٹا دو سال کا ہوگیا اور محبوب بیوی اللہ کو پیاری ہوگئی۔

ہارون پژمردہ و افسردہ خراسان کے والی سے رخصت لے کر دمشق واپس ہوا۔ دمشق کے باہر دور تک پھیلے ہوئے باغات اور میدانوں نے ہارون کو زبانِ حال سے خوش آمدید کہا۔ دمشق کے مضافات سے آنے جانے والوں کے بے ترتیب قافلوں اور تنہا یا دو چار مل کر چلنے والوں سے اٹھنے والی گرد و غبار سے فضا دھواں دھواں ہو رہی تھی۔ ہارون کو وہ وقت یاد آرہا تھا جب وہ دو سال پہلے اموی فوج میں شامل ہوکر خراسان جارہا تھا تو اس نے ایک زیتون کے سائے میں کھڑے ہوکر اپنے اعزا کو الوداع کہتے دیکھا تھا۔ ان اعزا میں اس کی بیوی بھی موجود تھی۔ رشتے داروں کے ہجوم میں اس کی نظروں نے اپنی بیوی کو بڑی آسانی سے دیکھ لیا تھا۔ دو ماہ کا بچہ اس کی گود میں تھا۔ وہ بے قراری سے بیوی کے پاس پہنچ گیا تھا اور بچے کو گود میں لے کر خوب پیار کیا تھا۔ اس وقت اس کی بیوی نے دھیرے سے... کہا تھا۔ ”ہارون! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تو اس مہم میں شریک نہ ہو، علیحدگی اختیار کرلے؟“



ہارون نے جواب دیا۔ ''تو کیسی عورت ہے جو اپنے شوہر کو میدانِ جنگ کی طرف جاتے دیکھ کر ملول ہو رہی ہے۔ میں خراسان کی مہم سے مال و زر کا ذخیرہ لے کر واپس لوٹوں گا اور پھر تیرے ساتھ عیش کروں گا۔ تو فکر کیوں کرتی ہے؟''

جواب میں بیوی نے سراپا مایوسی سے کہا تھا۔ ''معلوم نہیں تو میری بات پر یقین کرے گا یا نہیں، ورنہ میں نے خواب میں تجھ کو بالکل بوڑھا دیکھا ہے۔ تیرے سر اور ڈاڑھی کے بال برف کی طرح سفید ہو گئے تھے اور تیرے چہرے اور ہاتھ پاؤں کی کھال میں جھریاں یوں نمودار ہو گئی تھیں جس طرح دھلے ہوئے کپڑے میں شکنیں پڑ جاتی ہیں۔''

ہارون نے دریافت کیا تھا۔ ''پھر تو نے اس خواب کی کیا تعبیر لی؟''

بیوی نے جواب دیا تھا۔ ''میرا خیال ہے ہم دونوں میں سے کسی ایک کو کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جانا پڑے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک مر جائے۔''

ہارون نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ یہ تیرا واہمہ ہے جو خواب میں نظر آ گیا۔''

اس گفتگو کے بعد وہ چلا گیا تھا۔ اس وقت وہ اسی درخت کے نیچے کھڑا ماضی کو حسرت و یاس سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے آس پاس بیوی کی روح کو محسوس کر رہا تھا جو اسے دیکھ کر شاید طنزاً کہہ رہی تھی۔ ''دیکھ لی میرے خواب کی تعبیر! اب تو تنہا عیش کر اپنے کمائے ہوئے مال و زر سے۔''

وہ زیتون کی جڑ میں بیٹھ گیا اور تقریباً روہانسا ہو کر بڑبڑایا۔

''میں تجھ کو اپنے آس پاس محسوس کر رہا ہوں اور شرم و ندامت سے میں اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں محسوس کر رہا کہ تجھ سے آنکھیں چار کر سکوں۔ کاش کہ میں نے تیری بات مان لی ہوتی۔''

زیتون کے تنے میں ایک جگہ کلہاڑی کی ضرب کا نشان لگا ہوا تھا۔ اس کی بیوی اسی زخمی حصے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے اس زخمی حصے کو فرطِ محبت سے چوم لیا اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ دریائے بردا کو عبور کرنے کے بعد وہ قیساریہ (تاجروں کا بازار) میں داخل ہو گیا۔ جس کے اس پار ہارون کا گھر تھا۔ گھر کی گلی کے نکڑ پر محلے کے لڑکوں نے ہارون کو دیکھ کر خوشی سے چلانا شروع کر دیا۔ آناً فاناً محلے بھر کو خبر ہو گئی کہ ہارون واپس آ چکا ہے۔ ہارون کے گھر والے بھی بے چینی سے باہر نکل آئے اور ہارون کو تسلیاں دینے لگے۔ وہ سب ایک ہی بات لفظوں کے الٹ پھیر سے کہہ رہے تھے۔

باپ نے کہا۔ ''ہارون! تیری بیوی اتنی ہی عمر لے کر آئی تھی۔''

بڑی بہن جو تعزیت میں آئی ہوئی تھی، بولی۔ ''مشیت ایزدی میں کسی کو کیا دخل؟ نوجوانی کی موت تو اللہ کے گھر سے لکھ کر لائی تھی۔ بھائی! صبر کر۔''

کسی اور بزرگ نے کہا۔ ''موت کا کوئی علاج نہیں۔ جو ہونا تھا ہو گیا، اب اس کا ملال کیوں؟''

ہارون کو اپنے بچے عامر کی فکر تھی۔ وہ پھوپی کی انگلی پکڑے کھڑا اپنے باپ کو تجسس سے دیکھ رہا تھا۔ باپ نے بے ساختہ اسے گود میں اٹھا لیا اور خوب بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگا۔ دونوں رخسار ہونٹوں کی نمی سے بھیگ گئے اور سینے سے بھینچنے کی وجہ سے عامر کی سانس رکنے لگی۔

ہارون کو گھر کی ایک ایک شے سے اپنی مرحوم بیوی کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس کا دل بھر آیا، وہ رونا چاہتا تھا مگر مضبوط دل بس الڈ کر رہ جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ جو کچھ لے کر آیا تھا وہ عزیزوں اور مہمانوں پر خرچ ہونے لگا۔ ایک پڑوسی بزرگ اس کا بہت ساتھ دے رہے تھے۔ وہ ہارون کی بڑی دل جوئی کرتے رہتے تھے۔ ان کی نوجوان بیٹی منیزہ بھی ہارون کے گھر ہی میں موجود رہتی۔ وہ ننھے عامر پر بڑی توجہ دیتی رہتی۔ ہارون نے منیزہ کو پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ مرحوم بیوی کی موجودگی میں بھی آتی رہتی تھی لیکن اس وقت وہ کھنچی کھنچی اور بے تعلق سی رہتی تھی اور ہارون جیسے ہی گھر میں داخل ہوتا منیزہ اپنے گھر چلی جاتی تھی لیکن اب وہ کوئی دوسری ہی منیزہ تھی۔ ہارون کی موجودگی اور عدم موجودگی کی پروا کیے بغیر وہ عامر کا دل بہلاتی رہتی۔ عامر بھی اس سے بہت مانوس ہو چکا تھا۔ ہارون کا باپ اور بڑی بہن دونوں ہی منیزہ کے طرزِعمل سے اس کا مقصد پا چکے تھے اور خاموش تھے۔ بہن خوش تھی کہ اگر منیزہ اس گھر میں آ گئی تو اس کا بھائی ہارون بہت جلد اپنے دل سے مرحومہ کا غم نکال دے گا اور عامر ماں کی محرومی کے احساس سے نجات پا جائے گا لیکن باپ کو اس سے اختلاف تھا، وہ منیزہ کو نیک لڑکی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ منیزہ میں چھپی ہوئی اس بھیانک عورت کو دیکھ چکا تھا جو جذبۂ رحم و ہمدردی سے عاری تھی۔ اس نے منیزہ میں مطلب پرستی اور خودغرضی کو بے نقاب دیکھ لیا تھا، کس طرح؟ یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

چند دنوں بعد بہن اپنے گھر جانے لگی تو ہارون نے اسے روکنا چاہا مگر بہن نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''بھائی! میں تیرے گھر میں رہ جاتی مگر میرے رہ جانے سے تیرا کوئی

مسئلہ حل ہونے سے رہا۔"

ہارون نے کہا۔ "بہن! تو اس وقت تک اسی گھر میں رہ جب تک عامر سیانا نہیں ہو جاتا۔ میں اس کو کس طرح پالوں گا اور کہاں کہاں لیے پھروں گا۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ اس کو تو پال لے۔"

بہن نے جواب دیا۔ "بھائی ہارون! مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ میں منیزہ سے زیادہ اچھی طرح عامر کی دیکھ بھال نہیں کرسکوں گی۔"

ہارون نے کہا۔ "بہن! تم لوگ خوش فہمی میں معلوم نہیں کیا کچھ سوچ کر الٹے سیدھے فیصلے کر دیتے ہو لیکن جب نتائج توقع کے خلاف نکلتے ہیں تو حیران اور پریشان رہ جاتے ہو۔"

بہن نے جواب دیا۔ "بھائی ہارون! میں عورت ہوں اور عورت کی نظر پہچانتی ہوں۔ میں دو ایک دن میں یہاں سے چلی جاؤں گی لیکن میری عدم موجودگی میں منیزہ اس گھر میں مستقلاً داخل ہو چکی ہو گی۔"

ہارون نے بے پروائی سے کہا۔ "میرا خیال ہے شاید ایسا نہ ہو۔"

لیکن جب باپ کو اپنی بیٹی کے خیالات کا علم ہوا تو وہ گرم ہو گیا اور صاف صاف کہہ دیا۔ "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ منیزہ دو دلوں کو ملانے والی نہیں جدا کر دینے والی ہے۔"

ان باتوں کا علم منیزہ کو بھی ہو چکا تھا لیکن وہ کسی سے بھی ناراض نہیں تھی۔ ہر ایک سے اس طرح پیش آتی رہی گویا وہ کچھ بھی نہیں جانتی۔ ویسے منیزہ کو ہارون کی بہن زیادہ اچھی لگتی تھی۔ اسے ہارون کا باپ اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ عامر کو بھی بے حد پسند کرتی تھی۔

بہن چلی گئی تو باپ نے ہارون سے پوچھا۔ "ہارون! تو دو سال خراسان میں رہا۔ کیا وہاں بس اتنا ہی کمایا جو تو اپنے ساتھ لے کر آیا ہے یا....."

ہارون نے مسکرا کر جواب دیا۔ "بابا جان! میرا مال وزر خراسان سے بس آنے ہی والا ہے۔ میرے بعد خلافت کا ایک فوجی دستہ واپس آئے گا، بس اس دستے کے پاس میرا مال وزر بھی ہے۔ میں عجلت میں آ گیا ہوں۔"

باپ نے ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ "خبردار! جو تو نے اس مال وزر کا کسی اور کے سامنے ذکر کیا اور خاص کر منیزہ اور اس کے باپ کے سامنے۔"

ہارون چپ ہو گیا لیکن وہ صاف صاف یہ بات محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کا باپ منیزہ اور اس کے باپ کے سلسلے میں انصاف سے کام نہیں لے رہا تھا۔ وہ ان دونوں سے بدگمان رہ کر جو اکھڑا اپنے پن میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کو حاسد اور لالچی سمجھنے پر مجبور ہو چکا تھا۔ چند دنوں بعد ہارون کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اب منیزہ اسے بہت زیادہ اچھی لگنے لگی ہے مگر وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف کوئی بڑا قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اب وہ غیر ارادی طور پر منیزہ کا انتظار کرنے لگا تھا اور عامر کا یہ حال تھا کہ اس کو منیزہ کے بغیر چین ہی نہ آتا تھا۔

اسی دوران خراسان سے فوج کا وہ دستہ بھی آ گیا جس کے پاس ہارون کی چیزیں تھیں۔ مال وزر اور طرح طرح کی اشیا۔ ہارون قافلے والوں سے اپنا سامان لے کر گھر واپس آیا تو گھر میں منیزہ کو دیکھ کر بدحواس ہو گیا۔ وہ جھینپ سی گئی۔

ہارون بولا کچھ بھی نہیں۔ باپ نے شکایتاً کہا۔ "ہارون! میں تو تجھے سامان اور مال وزر کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ واللہ تو میری بات پر یقین کر یہ منیزہ اور اس کا باپ، دونوں ہی بڑے حریص اور مطلبی ہیں جب تک میں زندہ ہوں، تجھ کو ان دونوں سے محفوظ رکھوں گا۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "بابا جان! کسی کے بارے میں غلط سوچنا اچھی بات نہیں....."

باپ ایک دم برہم ہو گیا، بولا۔ "میرا خیال ہے منیزہ کا جادو چل چکا۔ کیا تم دونوں نے بالا ہی بالا کوئی فیصلہ کر لیا ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "نہیں، ابھی تو کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا، ویسے منیزہ عامر سے بڑی محبت کرتی ہے۔"

باپ نے جوش میں کھڑے ہو کر کہا۔ "عامر سے نہیں اس کے باپ کے مال وزر سے۔ تو نے منیزہ کو سمجھنے میں وہی غلطی کی ہے جو عام طور پر نوجوان کسی نوجوان لڑکی کو سمجھنے میں کرتے رہتے ہیں۔ بہرحال میں ایک بار پھر یہ اعلان کر رہا ہوں کہ میری زندگی میں منیزہ تیری بیوی نہیں بن سکتی۔"

ہارون مزید کوئی بات کیے بغیر گھر سے باہر چلا گیا۔

ہارون کی خاموشی کا باپ نے یہ مطلب لیا کہ ہارون اپنے باپ کی مرضی کے خلاف جو فیصلہ کر چکا ہے، فی الحال اس کو بدلنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اسی وقت عامر نے رونا شروع کر دیا۔ دادا غصے میں کانپتا ہوا اٹھا اور عامر کو گود میں اٹھالیا بولا۔ "عامر! میرے ننھے پوتے، ابھی تک تو، تو یتیم ہونے کے باوجود بدقسمت نہیں ہے لیکن تیرے باپ نے جو فیصلہ کر لیا ہے جس دن اس پر عمل کر گزرے گا، اسی دن سے تیری بدقسمتی اور بدنصیبی کا آغاز ہو جائے گا۔"

عامر نے اور زیادہ زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

دادا نے اس کو چپ کرانے کی کوشش کی تو وہ اور زیادہ زور زور لگا کر رونے لگا۔ وہ اس کو گود میں لے کر ٹہلنے لگا لیکن عامر ذرا بھی نہیں پسیجا۔ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ دادا کو غصہ آ گیا چیخ کر بولا۔ ''میں تجھے بھی سمجھ گیا تو بھی اپنے باپ کی طرح اس حریص اور خود غرض منیزہ کو یاد کر رہا ہے جس کی منحوس ذات عنقریب تیری میری، تیرے باپ اور اس گھر کی تباہی اور بربادی کا سبب بننے والی ہے۔ تو روتا ہے تو روتا رہ، تیرا باپ فکرمند ہے تو فکر کرتا رہے، میں اس منحوس لالچی لڑکی کو اس گھر میں ہرگز نہیں آنے دوں گا۔''

لیکن عامر روتا رہا، اسے منیزہ یاد آ رہی تھی۔

☆☆☆

کئی دن گزر گئے منیزہ نہیں آئی، عامر بیمار پڑ گیا۔ وہ کسی کسی وقت منیزہ کو یاد کر لیتا۔ ہارون بیٹے کی بیماری سے پریشان رہنے لگا۔ وہ عامر کی بیماری کا سبب اچھی طرح جانتا تھا لیکن اپنے باپ کے خیال سے خاموش تھا۔ تین دن تک عامر اس طرح خاموش پڑا رہا کہ بس کسی کسی لمحے منیزہ کا نام لے کر خاموش ہو جاتا۔ اس کی نظریں بار بار دروازے کی طرف جاتیں اور مایوس واپس آ جاتیں۔ ہارون اس کے پاس بیٹھا پیاری پیاری باتیں کرتا رہتا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی طفل تسلیوں سے عامر کا غم غلط کر دے گا لیکن پانچویں دن اس کو احساس ہو گیا کہ عامر کی حالت بہت غیر ہو چکی ہے اور اگر اس کی حالت یوں ہی بگڑتی رہی تو ہفتے عشرے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کو اپنے باپ پر غصہ آ رہا تھا جس کی وجہ سے منیزہ نے آمدورفت بند کر دی تھی۔ وہ عامر کو بار بار آوازیں دے کر بیدار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن عامر اس کی کسی آواز، کسی بات پر کوئی توجہ ہی نہ دیتا تھا۔ آخر اس نے عامر کو چت لٹا دیا۔ اس کی کمزور نبضوں پر ہاتھ رکھ کر دریافت کیا۔ ''عامر بیٹے! تو بولتا کیوں نہیں؟ تو چپ کیوں رہتا ہے؟''

عامر نے بڑی بے بسی سے آنکھیں کھول کر لمحہ بھر کے لیے باپ کو دیکھا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ باپ اس کے چہرے پر نظریں جمائے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عامر کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ رخساروں کا گوشت گھل چکا تھا۔ ہارون کو عامر کے سر پر موت کا سایہ نظر آ رہا تھا۔ وہ بلبلایا ہوا اپنے باپ کے پاس گیا اور غمزدہ آواز میں کہا۔ ''بادا جان! آپ عامر کی حالت تو دیکھیے چل کر، اس صورت میں وہ کتنے دن جیے گا؟''

باپ نے ہارون کو خشم ناک نظروں سے دیکھا۔ ''عامر کو کیا ہو گیا؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''آپ یہ سوال مجھ سے نہ کیجیے بلکہ اپنی آنکھوں سے خود اس کا حال دیکھ لیجیے چل کر۔''

باپ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں تیرا مطلب سمجھ رہا ہوں مگر پھر بھی عامر کو دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ چل، دیکھوں تو بھلا اس کا کیا حال ہو گیا ہے۔''

ہارون اپنے باپ کو لیے ہوئے عامر کے پاس چلا گیا۔ دادا نے پوتے کو غور سے دیکھا تو اسے بھی یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑی کہ عامر نازک ترین لمحوں سے گزر رہا ہے۔ ہارون سے پوچھا۔ ''پھر اب کیا ہونا چاہیے؟ اس کی حالت تو واقعی بہت خراب ہو رہی ہے۔''

ہارون نے باپ کو پسیجتے دیکھا تو جلدی سے بولا۔ ''بادا جان! اگر ہم نے اب بھی بے جا ضد سے کام لیا تو ناقابلِ تلافی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ عامر بھڑک گیا ہے۔''

بوڑھے نے قہر کی نظروں سے گھورا۔ ''تو، تو اس بہانے اس منحوس لڑکی کو اس گھر میں دوبارہ داخل کرنا چاہتا ہے؟ حالانکہ اس کی جگہ اگر تو اس کی پھوپی کو بلوا لے تو بھی کام بن جائے گا۔''

ہارون نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''بادا جان! آخر آپ کو یہ ہو کیا گیا ہے؟ عامر کس کو یاد کر رہا ہے اور کس کی محبت میں ہڑکا ہے، آپ خوب جانتے ہیں۔ اس کی بیماری کا علاج اس کی پھوپی ہرگز نہیں۔''

باپ نے کہا۔ ''جب تو اس کے علاج سے واقف ہے تو مجھ سے مشورہ کیوں لے رہا ہے۔ جا اپنی مرضی سے علاج کر۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''بادا جان! میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے یہ اجازت دے دیں کہ اس کی صحت یابی اور علاج کے لیے میں جو مناسب سمجھوں کروں، آپ اعتراض نہیں کریں گے۔ پھر میں سب کچھ کر لوں گا۔''

باپ نے کہا۔ ''جا، میں نے تجھے یہ اختیار دیا لیکن اگر تو نے منیزہ کو اس گھر میں دوبارہ لانا چاہا تو میں خوش نہیں ہوں گا۔ یہ میری انا کی بات ہے۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''لیکن میں بھی آپ کی انا پر اپنے بیٹے کو قربان نہیں کر سکتا۔ منیزہ اس گھر میں ایک بار پھر آ جائے گی اور عامر کی خاطر آئے گی، آپ مداخلت نہیں کریں گے اور اگر آپ کی انا نے کوئی ہنگامہ کرنا چاہا تو میں عامر کو لے کر کہیں اور چلا جاؤں گا اور وہاں منیزہ کو ہمارے پاس آنے سے کوئی بھی نہیں روک سکے گا۔''

باپ بیٹے کی صاف گوئی پر حیران رہ گیا۔ وہ چند لمحے ہارون کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے کہا۔ ''جو جی میں

آئے کرتا رہ۔ مجھ سے مشورہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چاہے تو اسے اس گھر میں بلا یا کہیں اور۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں اپنا کہیں اور ٹھکانا کرلوں گا۔''

ہارون کچھ کہے بغیر گھر سے باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی بڑے میاں اپنی جگہ سے اٹھے اور پوتے کے سرہانے جابیٹھے۔ انہوں نے پوتے کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا، پوچھا۔ ''بیٹے عامر! تیری طبیعت کیسی ہے؟''

عامر چپ چاپ خاموش پڑا رہا، جواب میں کچھ نہیں بولا۔

دادا نے اس کے سر کو محبت سے سہلایا اور کہا۔ ''بیٹے عامر! آنکھیں تو کھول۔ میں تیرا دادا تیری بیماری کو روکنا چاہتا ہوں۔ اپنی تکلیف تو بتا؟''

عامر نے کروٹ بدلی اور اپنا منہ دیوار کی طرف کرلیا۔ دادا نے اس کا چہرہ زبردستی اپنی طرف کرلیا۔ ''عامر! کیا تو بھی مجھ سے ناراض ہو گیا؟''

لیکن عامر کو تو چپ لگی ہوئی تھی، اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

دادا نے جھنجلا کر کہا۔ ''نہیں بولتا اپنے دادا سے تو نہ بول۔ تو زیادہ پریشان نہ ہو تیرا باپ اس منحوس کو لینے چلا گیا ہے جس کی یاد نے تجھے لبِ دم کر دیا ہے۔'' بوڑھا غصے میں اٹھا اور پوتے کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنی جگہ واپس چلا گیا۔

مغرب سے ذرا پہلے ہارون منیزہ کے ساتھ واپس آگیا۔ بوڑھے نے ان دونوں کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو خود باہر نکل گیا۔ منیزہ دیوانہ وار آگے بڑھی اور بڑی محبت سے آواز دی۔ ''عامر! آنکھیں کھول، دیکھ میں آگئی۔''

عامر نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ہارون اس منظر کی تاب نہ لاسکا اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

عامر نے اٹھنے کی کوشش کی مگر منیزہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی، بولی۔ ''لیٹا رہ۔ میں تیرے پاس ہی بیٹھ جاتی ہوں۔''

لیکن عامر نہیں مانا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ منیزہ نے اسے گود میں لے لیا۔

ہارون نے آہستہ سے کہا۔ ''منیزہ! تجھے عامر کو اس حد تک اپنی محبت میں گرفتار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آخر تو اس کی کب تک دل جوئی کرے گی؟''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''اگر عامر کا خیال نہ ہوتا تو میں اس گھر میں کبھی قدم ہی نہ رکھتی۔ تیرے باپ نے مجھے بہت ذلیل کیا ہے۔''

ہارون نے کہا۔ ''لیکن بڑی منت کرکے لایا ہوں۔ میں اپنے باپ کی مرضی کے خلاف تجھے اس گھر میں لے آیا۔''

منیزہ نے تلملا کر ہارون کو دیکھا، بولی۔ ''تو مجھے لے آیا اس گھر میں؟ بالکل غلط۔ میں عامر کی وجہ سے آگئی ہوں۔ ورنہ اپنی عزت آبرو کسے عزیز نہیں۔ ہر شخص انا رکھتا ہے۔ اب میرا مشورہ یہ ہے کہ تو اپنی بہن کو واپس بلا لے اور کوشش کر کہ عامر اپنی پھوپی سے مانوس ہو جائے۔''

ہارون نے کہا۔ ''میں ایسا کر تو سکتا ہوں مگر میری بہن میرے ساتھ زیادہ دنوں تک تو نہیں رہ سکتی۔ میری یا عامر کی خاطر وہ اپنا گھر تو چھوڑنے سے رہی۔''

منیزہ نے کہا۔ ''پھر میں کب تک خوار ہوتی رہوں گی؟''

ہارون نے کہا۔ ''میں تجھے خوار نہیں ہونے دوں گا۔ میں اس مسئلے کو دوسری طرح حل کرنا چاہتا ہوں مگر اس میں تیرا تعاون بہت ضروری ہے۔ تیرے تعاون کے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔''

منیزہ نے کہا۔ ''میرا تعاون؟ کیسا تعاون؟ ذرا صاف صاف بات کرو۔''

ہارون سٹپٹا گیا، ہکلا کر بولا۔ ''ہاں، تیرا تعاون...... اس طرح کہ ہم دونوں شادی کرلیں۔ اس مسئلے کا یہی ایک حل ہے۔''

منیزہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''شادی کرلیں...... تو نے یہ بات سوچی کس طرح؟ شاید تو مجھ سے کسی قسم کا بدلہ لینا چاہتا ہے ورنہ ایسی بات کبھی نہ کرتا۔''

ہارون نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ''منیزہ! بات سمجھنے کی کوشش کر۔ اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ اس میں تیری مرضی بھی شامل ہے تو میں ایسی بات کبھی بھی نہ کرتا۔''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''اس گھر اور تیرے مزاج میں تیرا باپ بہت زیادہ دخیل ہے اس لیے میں کوئی غلط فیصلہ کرکے پریشان نہیں ہونا چاہتی۔ میں کسی ایسے نوجوان کو پسند کروں گی جو آزاد اور خودمختار ہو۔''

ننھا عامر ان دونوں کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کبھی باپ کی شکل دیکھتا کبھی منیزہ کی، پھر منیزہ سے پوچھا۔ ''اب تو آپ نہیں جائیں گی؟''

ہارون نے مسکرا کر منیزہ سے کہا۔ ''اس سوال کا جواب بہت ضروری ہے۔''

منیزہ نے عامر کو سینے سے لگا لیا، بولی۔ ''تو فکر نہ کر، میں تیرے پاس آتی جاتی رہوں گی۔''

اسی وقت بوڑھا داخل ہوا اور ماحول پر تیز تیز نظریں

ڈال کر واپس چلا گیا۔ منیزہ نے کہا۔ ''میں یہ نظریں برداشت نہیں کرسکتی۔''

ہارون نے کہا۔ ''منیزہ! بس چند دن اور، میں اس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لوں گا۔''

بوڑھا وہاں سے نکل کر سیدھا منیزہ کے باپ کے پاس پہنچا اور اس پر گرم ہوگیا۔ ''تو کیسا عرب ہے کہ اپنی کنواری لڑکی کو بار بار میرے بیٹے کے پاس بھیج دیتا ہے؟''

منیزہ کا باپ بھی غصے میں کھڑا ہوگیا۔ ''زبان سنبھال کر بات کر احمق انسان۔ جا، اپنے بیٹے سے پوچھ کہ وہ میری کیسی خوشامدیں کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر منیزہ اس کے ساتھ نہ گئی تو تیرا پوتا عامر مر جائے گا۔''

ہارون کے باپ نے حسب عادت بے مروتی سے کہا۔ ''چل میں نے اسے بھی گوارا کیا مگر تجھے مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

منیزہ کے باپ نے پوچھا۔ ''کیسا وعدہ؟''

بوڑھے نے کہا۔ ''منیزہ میرے گھر آتی جاتی رہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن تو یہ وعدہ کر کہ وہ میرے لڑکے سے شادی نہیں کرے گی۔''

منیزہ کا باپ ہنس دیا۔ ''میں حیران ہوں تو یہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔ یہ بات تو تجھے اپنے بیٹے سے کرنا چاہیے۔''

بوڑھے نے جواب دیا۔ ''تیری بیٹی میرے بیٹے کو ورغلا رہی ہے۔''

''نہیں، یہ بات نہیں۔ یہ شکایت تو مجھے کرنا چاہیے۔ تیرا بیٹا میری بیٹی کو ورغلا رہا ہے۔''

بوڑھے نے کہا۔ ''اس فضول بحث میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر عامر کی موت زندگی کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں تیرے پاس ہرگز نہ آتا۔ ویسے ایک صورت اور بھی ہے۔''

''کون سی صورت؟''

''یہ کہ اگر تیری بیٹی کو عامر سے اتنی ہی محبت ہے اور تو خود بھی یہی سمجھتا ہے کہ کسی عورت کے بغیر اس کی پرورش ممکن نہیں تو میں عامر کو تیرے حوالے کرسکتا ہوں۔ تم دونوں اس کی پرورش کرسکتے ہو۔''

منیزہ کے باپ نے حیرت سے بوڑھے کو دیکھا۔ ''اور اس کی پرورش و پرداخت کے اخراجات کون برداشت کرے گا؟''

بوڑھے نے جواب دیا۔ ''اخراجات کیسے۔ جب میں اپنی اولاد تیرے حوالے کر رہا ہوں تو اس کے بعد تجھے اخراجات کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے۔ اپنی اولاد کسی کو دے دینا بہت بڑی قربانی ہے۔ تجھے اس ایثار کی قدر کرنا چاہیے۔''

منیزہ کے باپ نے بوڑھے کی چالاکی پر اسے دل ہی دل میں داد دی، بولا۔ ''تیری اولاد تجھ ہی کو مبارک۔ تو کچھ اور سوچ رہا ہے، وقت اور زمانے نے کوئی اور فیصلہ کر رکھا ہے۔ تو کچھ چاہتا ہے مشیت ایزدی کو کچھ اور ہی منظور ہے۔''

ہارون کے باپ نے تجسس انداز میں ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا تو میری باتوں کا کوئی معقول جواب نہیں دے گا؟''

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ''میرے پاس تیری تمام باتوں کا ایک ہی جواب ہے۔ وہ یہ کہ تیرے بیٹے نے جو فیصلہ کرلیا ہے، اس میں تیرا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ وہ تیری اجازت اور مرضی کے بغیر ہی شادی پر آمادہ ہوگیا ہے۔''

بوڑھا جھنجلا کر اکھڑ گیا۔ ''تو جھوٹا ہے، میرا بیٹا ایسا نہیں کرسکتا۔''

منیزہ کے باپ نے بیزاری سے جواب دیا۔ ''اب تو گھر واپس جا، میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔''

بوڑھا غصے میں کھڑا ہوگیا۔ ''میں جا رہا ہوں۔ میرے گھر میں منیزہ یا تیرے قدم نہیں آئیں گے، اگر آئیں گے تو اس سے ایک بڑے قبائلی جھگڑے کا آغاز ہوجائے گا اور میں نہیں جانتا کہ یہ جھگڑا کب تک ہوتا رہے گا۔'' بوڑھا پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

منیزہ آتی رہی، عامر صحت یاب ہوتا چلا گیا۔ اب وہ منیزہ سے اور زیادہ مانوس ہوچکا تھا۔ ہارون کی خواہش تھی کہ کسی طرح منیزہ سے جلد از جلد شادی ہوجائے لیکن باپ اب بھی اپنی ضد پر قائم تھا۔ وہ اب بھی اپنے اس خیال پر قائم تھا کہ منیزہ اور اس کا باپ دونوں ہی لالچی ہیں اور ان دونوں کی نظریں ہارون کے مال و زر پر لگی ہوئی ہیں۔ اس نے اپنی بیٹی کو بلوالیا۔ چلچلاتی دھوپ میں اس وقت بیٹی کا اونٹ دروازے پر آکر بیٹھ گیا، جب منیزہ گھر سے نکل رہی تھی۔ ایک نے کل سے اترتے ہوئے اور دوسری نے دروازے کی دہلیز کو پھلانگتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں لیکن اجنبیوں کی طرح منیزہ رکے بغیر چلی گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ہارون تھا۔ ہارون نے اپنی بہن کو اپنے سامنے غیر متوقع جو دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا، پوچھا۔ ''بہن! خیریت تو ہے؟ یہ تم کسی اطلاع کے بغیر کیسے آگئیں؟''

بہن نے بے رخی سے جواب دیا۔ ''میں عامر کی بیماری کی خبر سن کر اسے دیکھنے آئی ہوں۔''

ہارون نے کہا۔ ''لیکن اب تو وہ ٹھیک بھی ہو چکا۔''

بہن نے کہا۔ ''اندر چلو، میں بات کروں گی۔''

منیزہ کچھ دور جا کر کھڑی ہو گئی اور ہارون کا انتظار کرنے لگی۔ وہ ہارون کی بہن کی آمد سے دل برداشتہ ہو رہی تھی۔ دور ہی سے آواز دی۔ ''ہارون! تو آئے گا یا میں جاؤں؟''

ہارون نے بھی اونچی آواز میں جواب دیا۔ ''ایک ذرا توقف کر، میں ابھی آتا ہوں۔ بہن سے چند باتیں کرلوں۔''

بہن نے کہا۔ ''میں نے ایک بار کہہ جو دیا کہ میں دروازے پر بات نہیں کروں گی۔ اندر چلو، وہاں بیٹھ کر باتیں کروں گی۔''

منیزہ نے پھر آواز دی۔ ''ہارون! میں زیادہ انتظار نہیں کروں گی۔''

ہارون سے پہلے بہن بول اٹھی۔ ''ہارون! اس سے کہہ دے کہ تیرا انتظار نہ کرے، چلی جائے۔ میں جو اتنی دور سے آئی ہوں، تیرے ہی پاس آئی ہوں۔''

ہارون نے پہلے تو منیزہ کو جواب دیا۔ ''منیزہ! بس چند لمحے اور میں ابھی آیا۔'' بہن سے کہا۔ ''بہن! تم اندر چلو، میں منیزہ کو اس کے گھر چھوڑ کر فوراً ہی واپس آتا ہوں۔ اس لڑکی نے میرا بہت ساتھ دیا ہے اس لیے میں اس کی بہت عزت کرتا ہوں۔''

بہن چپ چاپ اندر چلی گئی اور ہارون منیزہ کے پاس پہنچ گیا۔ منیزہ اس سے بہت ناراض تھی۔ ''اپنی بہن کے پاس واپس جا، میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔''

ہارون نے عاجزی سے کہا۔ ''منیزہ! بات سمجھنے کی کوشش کر، بہن خود سے نہیں آئی ہے بلکہ بلوائی گئی ہے۔''

منیزہ نے کہا۔ ''اچھا پھر مجھے میرے گھر پہنچا دے، بقیہ باتیں پھر بھی ہو جائیں گی۔''

ہارون خاموش ہو گیا اور منیزہ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ یہاں تک کہ منیزہ کا گھر آ گیا اور اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہارون! جو کچھ کرنا ہے، جلدی کر گزر۔ وقت ضائع کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''منیزہ! میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں، وہ تیری مرضی کے بغیر ناممکن تھا لیکن اب جبکہ تیری مرضی معلوم ہو چکی ہے، میں اس کام کو نمٹانے کی کوشش کروں گا۔''

منیزہ نے کہا۔ ''میرا باپ بھی اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ اس کو بھی یہ بات بالکل پسند نہیں کہ میں کسی تعلق یا رشتے کے بغیر ایک ایسے گھر میں جاتی آتی رہوں جو مجھے پسند نہیں کرتا۔''

ہارون نے تسلی دی۔ ''بس دو چار دن انتظار کر، ہر کام ہو جائے گا۔''

منیزہ اندر چلی گئی، ہارون واپس ہوا۔ بازار سے گزرتے ہوئے اس نے ایک راہب کو چبوترے پر وعظ کرتے دیکھا۔ یہ نسطوری راہب حضرت مسیحؑ کے فضائل بیان کر رہا تھا۔ اس کے وعظ کا موضوع عورت اور معصیت تھی اور وہ دلائل اور براہین سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ عورت ہی معصیت اور فتنوں کی جڑ ہے۔ یہ جہاں بھی ہوگی، وہیں معصیت بھی ہوگی اور فتنے بھی۔ اس نے پورے اعتماد اور یقین سے کہا۔ ''لوگو! عورت سے بچو تاکہ معصیت سے بچے رہو۔''

ہارون کو وعظ میں مزہ آیا۔ وہ کھڑے ہو کر سننے لگا۔ آخر میں جب اس نے کہا۔ ''لوگو! مسیح، بزرگ، متقی اور پرہیزگار ہے اور خدا کی جناب میں انہیں جو مقام حاصل ہوا، اس میں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ مسیح نے اپنی پوری زندگی معصیت سے دور رہ کر گزاری اور معصیت سے اس لیے دور رہنے میں کامیاب ہوئے کہ وہ عورتوں سے دور رہتے تھے۔''

ہارون نے... سوچا یہ راہب سچ بول رہا ہو یا جھوٹ لیکن اس میں یہ صداقت ضرور پائی جاتی ہے کہ مسیح عورت اور معصیت کو لازم و ملزوم قرار دیتے تھے۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو اب ماحول ہی بدل چکا تھا۔ اس کا باپ اپنی بیٹی سے باتیں کر کر کے ہنس رہا تھا۔ بیٹی بھی خوشگوار کیفیت میں تھی، عامر اپنی پھوپی کی گود میں تھا۔

باپ نے ہارون کو اندر داخل ہوتے دیکھا تو منہ پھیر لیا اور اپنے پوتے سے فضول قسم کی باتیں کرنے لگا۔

بہن نے بے پروائی سے پوچھا۔ ''بھائی ہارون! منیزہ کو کہاں چھوڑ آیا تو؟ راستے ہی میں چھوڑ دیا تھا یا گھر کے اندر تک پہنچا آیا؟''

ہارون لہجے اور انداز سے یہ بات سمجھ چکا تھا کہ ہر شخص اس سے بیزار اور نالاں ہے لیکن اس نے اس سرد مہری اور بے پروائی کا کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا کیونکہ اس نے جو فیصلہ کر لیا تھا اب وہ اس سے منحرف نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے بہن کو کڑوے کسیلے لہجے میں جواب دیا۔ ''بہن! میں نے تم کو پہلے ہی یہ بات بتا دی ہے کہ منیزہ نے ہم پر احسان کیا ہے اور میں اس کی عزت کرتا ہوں۔ اس لیے منیزہ کو موضوعِ گفتگو نہ بنایا جائے۔''

بہن نے بھی تلخ و ترش لہجے میں بات کی۔ ''کیا منیزہ

اور کیا اس کا احسان... وہ کیا کسی پر احسان کرنے کی۔ کیا تیرے باپ کے احسانات تجھ پر نہیں ہیں؟ تو منیزہ کے مقابلے میں اپنے باپ کو کیوں نظر انداز کر رہا ہے؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''میں کسی کو بھی نظر انداز نہیں کر رہا لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ مجھے بچے کی طرح اپنی انا کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے۔ میں نے ایک مرد کی طرح کسی کو زبان دے دی تو دوسرے مرد کا یہ فرض ہے کہ وہ میری زبان کا پاس کرے لیکن جب وہ میری زبان کا پاس نہیں کر رہا تو پھر مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اس کا خیال کروں؟''

باپ خاموش نہیں رہ سکا، مشتعل ہوکر بولا۔ ''بیٹی! تو اس کی باتیں سن رہی ہے؟ اگر سحر کوئی چیز ہے تو میں شبہ کرسکتا ہوں کہ اس پر سحر کردیا گیا ہے ورنہ کیا بات ہے کہ یہ ایک معمولی لڑکی پر اپنا سب کچھ قربان کردینے پر آمادہ ہوگیا ہے۔''

بہن نے کہا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی۔ میں منیزہ کو بھی نہیں جانتی۔ اگر اس نے عامر پر یا اس گھر پر کوئی احسان کیا ہے تو اس احسان کو کسی بڑے احسان سے اتارا جاسکتا ہے۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''تم لوگ میری باتوں کا مذاق اڑانا چاہتے ہو لیکن میں کسی پس و پیش کے بغیر یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں نے منیزہ سے شادی کرنے کا جو عہد کیا تھا، اس کو عنقریب پورا کرنے والا ہوں۔''

بہن نے کہا۔ ''بھائی ہارون! جو تیری سمجھ میں آئے کرتا رہ، میں عامر کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی تاکہ لوگوں کو گھر میں داخل ہونے کا جواز نہ مل سکے۔''

باپ نے تائید کی۔ ''میں تجھ سے اتفاق کرتا ہوں۔''

ہارون مخالفت نہیں کرسکا، بولا۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ لوگ بہ ظاہر میری مخالفت نہیں کر رہے عملاً حکمتِ عملی سے مجھ کو منع کر رہے ہیں کہ میں منیزہ سے شادی نہ کروں۔''

بہن نے کہا۔ ''میں مطلب وطلب تو جانتی نہیں... عامر ہم سب کے لیے مسئلہ بن گیا ہے اس لیے میں اس کو حل کردینا چاہتی ہوں۔''

عامر نے بھی ان کی باتوں کا مطلب سمجھ لیا، بولا۔ ''میں اپنی نئی ماں کے پاس رہوں گا۔''

باپ نے ڈانٹ دیا۔ ''ہارون! عامر کو اپنی پھوپی کے ساتھ جانا پڑے گا۔ اسے سمجھادے۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''بادا جان! عامر میرے پاس رہے گا کیونکہ یہ منیزہ کے بغیر پھر بیمار ہوجائے گا۔''

بہن نے سختی سے کہا۔ ''بھائی! تم اصرار نہ کرو۔ میں نے عامر کو اپنے ساتھ لے جانے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ بہت مناسب ہے۔ میری بات مانو اور بادا جان کو ناراض نہ کرو۔ منیزہ اس گھر میں نہیں آسکتی۔''

ہارون نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''بہن! تم عامر کو اپنے ساتھ لے جاؤ لیکن اگر اسے کچھ ہوگیا تو اس کی ساری ذمے داری تم پر ہوگی اور میں شادی منیزہ سے کرکے رہوں گا کیونکہ میں نے اس شریف لڑکی سے شادی کا وعدہ کرلیا ہے۔''

اس کے بعد ہارون ناراض ہوکر چلا گیا۔

بہن نے عامر کو گود سے اتار دیا اور باپ سے بولی۔ ''بادا جان! ہارون کو اس کے حال پر چھوڑ دو، وہ منیزہ سے شادی کرکے رہے گا۔''

ہارون سیدھا منیزہ کے پاس پہنچا۔ منیزہ نے اتنی جلدی اسے واپس آتا دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ ''ہارون! میرا خیال ہے اب اس مسئلے کو یوں ہی رہنے دیا جائے۔''

منیزہ کا باپ بھی اس کے پاس آگیا۔ بے رخی سے بولا۔ ''ہارون! میں نہیں چاہتا کہ تو اپنے باپ کی رضامندی کے خلاف کوئی قدم اٹھائے۔ میں نے منیزہ کو بھی سمجھا دیا ہے کہ وہ عجلت اور جذباتیت سے کام نہ لے۔''

ہارون نے بے زاری سے دونوں کو دیکھا۔ ''میں یہاں سکون کی تلاش میں آیا تھا۔ خدا کے لیے آپ دونوں اس متنازعہ موضوع کو نہ چھیڑیں ورنہ میں یہاں سے بھی چلا جاؤں گا۔''

منیزہ کے باپ نے ہارون کو اپنے ساتھ لیا اور اپنے کمرے میں لیے چلا گیا، بولا۔ ''اگر تو واقعی سکون کی تلاش میں آیا ہے تو یہاں میرے کمرے میں آرام کر۔ میں منیزہ کے کمرے میں چلا جاؤں گا۔''

ہارون کمرے میں بچھے ہوئے تخت پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرکے سوچنے لگا۔ اس کا مال وزر اس کے حق میں مصیبت بن گیا تھا کیونکہ اگر یہ اس کے پاس نہ ہوتا تو اس کا باپ منیزہ سے شادی کرنے پر اعتراض بھی نہ کرتا۔ اسے اپنے باپ کے حرص وطمع پر افسوس ہو رہا تھا۔ بہن بھی باپ ہی کا ساتھ دے رہی تھی۔ دوسری طرف عامر تھا جو منیزہ کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا باپ منیزہ اور اس کے باپ کو حریص کہہ رہا تھا حالانکہ شاید یہ دونوں ایسے نہیں تھے کیونکہ ابھی تک ایک بھی ایسی بات مشاہدے یا تجربے میں نہیں آئی تھی جس سے ان دونوں کے حرص وطمع کا شبہ بھی کیا جاتا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا تو اس نے منیزہ کی محبت کی کسک محسوس کی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ منیزہ سے شادی نہ کرے تو وہ کیا محسوس

کرے گا؟ یہ سوال سوہان روح تھا کیونکہ ناکامی کے خیال ہی سے وہ عجیب سی اذیت محسوس کرنے لگا تھا۔

انہی خیالوں میں اسے خراسان کا خیال آ گیا۔ وہ خراسان میں دس عریفوں کا سردار تھا۔ ایک عریفہ کے ماتحت سات سات سپاہی ہوتے تھے، اس طرح ہارون ستر سپاہیوں یا دس عریفوں کا سردار تھا۔ فوج میں اس کی ہوشیاری، تدبر اور بہادری کا خاص چرچا تھا۔ اس نے حسنِ کارکردگی کے عوض کئی بار انعامات بھی حاصل کیے تھے۔ اس کے علاوہ میدانِ جنگ میں اس نے دوبار اپنے امیر کی جان بھی بچائی تھی۔ امیر نے اس کے صلے میں جو کچھ دیا تھا، اس سے اس نے خاصا مال وزر بنالیا تھا۔ اس کے علاوہ کسی خاص علاقے کو فتح کرنے کے بعد جب وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ لوٹ مار میں مشغول ہوتا تو اس میں بھی ایسا مال ہاتھ آ جاتا جو کسی اور کو بتائے بغیر اس کا اپنا ہو جاتا۔ اس نے چند سالوں میں اتنا مال بنالیا تھا کہ اب وہ اپنے محلے کے متمول لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ سوچتے سوچتے اچانک یہ خیال آیا، وہ کس موضوع پر سوچ رہا تھا اور بہک کر کہاں چلا گیا۔ وہ ایک بار پھر منیزہ اور شادی کے بارے میں سوچنے لگا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ دمشق میں جو کچھ بھی مال وزر رکھتا ہے، اسے اپنے باپ ہی کے پاس رہنے دے گا اور منیزہ کے لیے خراسان واپس جا کر دوبارہ کمائی کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر درمیان سے مال وزر کو نکال دیا جائے تو شاید اس کا باپ اس شادی کی مخالفت نہ کرے۔ اس خیال نے اس کا سارا دکھ، ساری سوچ اور ساری اذیت کو دور کر دیا۔ وہ خود کو ہلکا اور بےفکر محسوس کرنے لگا۔

شام کو جب کمرے سے نکل کر منیزہ کے باپ کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ باپ کہیں گیا ہوا ہے اور منیزہ تنہا کسی کام میں مشغول تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''منیزہ! تیرا باپ کہاں چلا گیا؟''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''وہ یہیں کہیں ہوگا، کیا اس سے تیرا کوئی کام ہے؟''

ہارون نے کہا۔ ''ہاں، اس سے ایک ضروری کام ہے لیکن اگر وہ گھر میں موجود نہیں ہے تو کوئی بات نہیں اور جو بات میں تیرے باپ سے کرنا چاہتا ہوں، اس کو پہلے تیرے علم میں لے کر آنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد تجھ سے مشورہ لوں گا کہ اگر تو میری جگہ ہوتی یعنی تو مرد ہوتی اور کسی کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہوتی تو ان حالات میں تو کیا کرتی؟''

منیزہ نے بڑی توجہ سے اس کی طرف دیکھا، بولی۔ ''میں تیرا مطلب نہیں سمجھی؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''اگر تو مرد ہوتی یعنی ہارون اور میں عورت یعنی منیزہ ہوتا تو ان حالات میں تو کیا کرتی؟''

منیزہ نے کہا۔ ''میں وہی کرتی جو حق اور انصاف کا تقاضا ہوتا۔ میں ایک حد تک تو بڑوں کا ادب اور چھوٹوں کا لحاظ کر سکتی ہوں لیکن اس نام پر ظلم اور زیادتی نہیں برداشت کر سکتی۔''

ہارون نے پوچھا۔ ''مال وزر کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''میں مال وزر کو انسان کی آزمائش سمجھتی ہوں اور ہرجائی بھی۔ کل کسی کے پاس تھا، آج میرے پاس آ گیا، کل کسی اور کا گھر دیکھے گا۔ اس لیے اس ہرجائی کے بارے میں، میں کیا رائے دوں۔ مال وزر ہاتھوں کا میل ہے اگر یہ انسان سے چھن بھی جائے تو اس کا ملال نہیں کرنا چاہیے۔ انسان ہمت سے کام لے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔''

ہارون خوشی سے کھل اٹھا۔ ''آفرین، منیزہ صد آفرین۔ میں بھی تیرے ہی جیسے خیالات رکھتا ہوں۔ اس لیے ہم دونوں کی خوب نبھے گی۔ منیزہ! سن، میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جو چیز ہم دونوں کے درمیان رکاوٹ بن رہی ہے میں اس پر فاتحہ پڑھ دوں......''

منیزہ نے گھبرا کر کہا۔ ''یعنی کیا؟ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مال وزر نے میرے باپ اور بہن کو میرے خلاف کر رکھا ہے۔ میں نوجوان ہوں اس لیے میں اب بھی اس سے زیادہ کما سکتا ہوں۔ میں اپنا سارا مال وزر اپنے باپ کے حوالے کر دوں گا۔ اس طرح میرا باپ تیری مخالفت نہیں کرے گا اور ہم دونوں باپ کی رضامندی سے شادی کر سکیں گے۔ پھر میں تجھ کو لے کر خراسان چلا جاؤں گا اور وہیں رہ بس جاؤں گا۔ پھر بھی دمشق کا رخ ہی نہ کروں گا۔ میرا خیال ہے اس طرح میرے باپ اور بہن کو ان کی حرص وطمع کا بدلہ بھی مل جائے گا۔''

منیزہ نے ہارون کی باتیں بڑی مایوسی اور بےدلی سے سنیں، بولی۔ ''میرا خیال ہے تو اپنے باپ اور بہن کی مخالفت سے تنگ آ چکا ہے اور غم نے تیرے ہوش وحواس کو زائل کر دیا ہے۔ میں تو اپنے مال وزر سے دست برداری کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتی۔ میں تجھ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتی کہ بنا سوچے سمجھے، بدحواسی میں تو کوئی ایسا قدم اٹھا بیٹھے جس سے زندگی بھر پچھتانا پڑے۔''

ہارون نے چونک کر کہا۔ ’’لیکن ابھی ابھی تو تو یہ کہہ رہی تھی کہ مال وزر ہاتھوں کا میل ہے، ہمیں اس کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔‘‘

پیچھے سے منیزہ کے باپ نے کہا۔ ’’بے شک مال وزر ہاتھوں کا میل ہوتا ہے لیکن اگر یہ میل ہے تو سب کے لیے میل ہے۔ اس میل سے دوسروں کو بھی محفوظ رکھنا چاہیے، یہ جہاں ہے اس کو وہیں رکھنا چاہیے۔‘‘

ہارون اور منیزہ نے ایک ساتھ آواز کی طرف دیکھا۔ منیزہ کا باپ بڑی سنجیدگی سے ہارون کو دیکھ رہا تھا۔ اب جو ہارون کو بھی اپنی طرف دیکھتے دیکھا تو کہا۔ ’’ہارون! میں نے تیری ساری باتیں سن لی ہیں۔ میں تو تجھ کو عقل مند سمجھتا تھا لیکن اس وقت کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ تو عاقبت نااندیش اور بے وقوف بھی ہے۔ لوگ تو اپنے مال وزر میں اضافے کی فکر میں لگے رہتے ہیں مگر تو ہے کہ جو پاس ہے، اس کو بھی گنوا دینا چاہتا ہے۔ اگر تو نے منیزہ سے شادی کا فیصلہ کرلیا ہے تو تیرے پاس جو کچھ بھی ہے کل منیزہ اس میں برابر کی شریک ہوگی اس لیے تیرا یہ فرض ہے کہ اپنے مال وزر کے سلسلے میں تو کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جو منیزہ کی مرضی کے خلاف ہو۔‘‘

ہارون نے سٹپٹا کر جواب دیا۔ ’’لیکن منیزہ تو خود بھی یہی چاہتی ہے کہ جو چیز ہم دونوں کے درمیان رکاوٹ بنی ہوئی ہے، اس کو اپنی راہ سے ہٹا دینا چاہیے۔‘‘

منیزہ نے فوراً کہا۔ ’’لیکن اس کوئی چیز میں مال وزر کو شامل قرار دینا پڑے گا۔‘‘

ہارون نے افسوس سے کہا۔ ’’تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میرا باپ تم دونوں کے بارے میں جو رائے رکھتا ہے، کسی حد تک درست ہے؟‘‘

منیزہ کے باپ نے پوچھا۔ ’’تیرا باپ ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے؟‘‘

منیزہ بڑی بے بسی اور خوف سے ہارون کی صورت دیکھ رہی تھی۔ ہارون کے دل میں منیزہ کی نظریں تیر کی طرح اتر گئیں، ہارون نے کہا۔ ’’میرا باپ کہتا ہے تم دونوں حریص ہو اور مال وزر کے لالچ میں یہ شادی کرنا چاہتے ہو۔‘‘

منیزہ کا باپ گرم ہوگیا۔ ’’تیرا لالچی اور خود غرض باپ ہمیں لالچی کہتا ہے، یعنی وہ ہمیں حریص سمجھتا ہے؟ بخدا اگر یہ بات ہے تو تو اب اس گھر میں نہیں آئے گا۔ میں تجھ پر اس گھر کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کردوں گا۔‘‘

ہارون نے منیزہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ’’منیزہ! تو کیا کہتی ہے؟‘‘

منیزہ نے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’ہمیں اپنے فیصلوں میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہیے۔‘‘ پھر ہارون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’میں اپنے باپ کا احترام کروں گی اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گی جس سے میرے باپ کو دکھ پہنچے۔‘‘

ہارون نے کہا۔ ’’تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں تجھ سے مایوس ہوجاؤں؟‘‘

منیزہ نے جواب دیا۔ ’’میں نے تو یہ بات نہیں کہی۔ ہارون! میری بات سمجھنے کی کوشش کر اور یہ بھی سوچ کہ تیرے باپ نے ہمیں حریص کہہ کر کتنی زیادتی اور دل آزاری کی ہے۔‘‘

ہارون نے کہا۔ ’’منیزہ! میں زیادہ باتیں نہیں سننا چاہتا۔ مجھ کو تو تو یہ بتا دے کہ آئندہ کے بارے میں تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ کیا اس گھر کے دروازے مجھ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہوسکتے ہیں؟‘‘

منیزہ بہت غمزدہ تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنے باپ کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ’’اس گھر کے دروازے کھولنا یا بند کرنا جس کے اختیار میں ہے، اس سے یہ سوال بھی کر لیکن میں نے اپنے دل کے دروازے اگر تیرے لیے وا کیے تھے تو یہ ہمیشہ ہی کھلے رہیں گے۔ ان میں کوئی اور نہیں داخل ہوسکے گا۔‘‘

منیزہ کے باپ نے درشتی سے کہا۔ ’’ایسی بات نہ کر۔ میں سادہ لوحی کو حماقت سمجھتا ہوں اور کوئی سادہ لوح نوجوان میری بیٹی کا شوہر نہیں ہوسکتا۔‘‘

منیزہ روہانسی ہوکر اٹھ گئی۔ اس کے جاتے ہی ہارون کھڑا ہوگیا، بولا۔ ’’میں جارہا ہوں، منیزہ چلی گئی ورنہ میں اس کو نصیحت کرتا کہ وہ اپنے باپ کا حکم مانے جس طرح میں اپنے باپ کی تابع داری کررہا ہوں۔‘‘

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ’’منیزہ کو تیری نصیحتوں کی نہیں مال وزر کی ضرورت ہے کیونکہ نصیحتوں کے بغیر خوشحال زندگی ممکن ہے جبکہ مال وزر کے بغیر اس کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔‘‘

ہارون نے جاتے جاتے کہا۔ ’’میں جارہا ہوں۔ میرا خیال ہے اس گھر کے دروازے میرے لیے اس وقت تک بند نہ ہوں گے جب تک میں خود اپنی ہزیمت کا اعلان نہ کردوں۔ میں کوشش کروں گا کہ میرا باپ مال وزر کی آرزو نہ کرے اور میں یہ سب منیزہ کے قدموں میں ڈال دوں۔‘‘

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ''منظور... میں تیرے قطعی جواب کا انتظار کروں گا۔''

ہارون گھر میں داخل ہوا تو بہن نے نرمی سے سمجھانا شروع کیا اور تجویز پیش کی۔ ''بھائی! عامر کے ساتھ چند دنوں کے لیے تم بھی میرے ساتھ چلے چلو۔ ماحول بدلے گا تو امکان ہے سوچ بھی بدل جائے گی۔''

ہارون نے انکار نہیں کیا اور بولا۔ ''بہن! میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ میں بہت پریشان ہوں، سکون چاہتا ہوں۔''

دو دن رہ کر بہن، ہارون اور عامر کو اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ بہن کا گھر دمشق سے دور بعلبک میں تھا۔ یہ بعلبک بھی دمشق کی ولایت میں داخل تھا۔ یہ پہاڑیوں میں گھرا ہوا شہر قدرتی مناظر اور خوبصورتی میں دمشق کا حریف تھا۔ یہاں نہروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ہارون یہاں ایک بار پہلے بھی آچکا تھا۔ درختوں کے بیچ چشموں اور نہروں کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ چند دنوں کے لیے منیزہ کو بھول گیا۔ پتھر کی شاندار اور پُرشکوہ عمارتوں نے اسے حیرت زدہ کر دیا۔ یہاں انگور کی بیلوں کے سائبان سایہ کیے ہوئے تھے۔ دوسرے میوہ دار درختوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ شہر کو پتھر کی فصیلوں میں قید کر دیا گیا تھا۔ جب وہ ایک دروازے سے شہر میں داخل ہوا تو اس کے سامنے دنیا ہی بدل چکی تھی۔ پن چکیوں اور پانی نکالنے والی چرخیوں نے اس کی پوری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ بہن نے بھائی کو بعلبک کے مناظر میں کھویا ہوا دیکھا تو بہت خوش ہوئی۔ وہ اپنی کامیابی پر نازاں تھی اور اس کو یقین ہو گیا کہ وہ اب اپنے بھائی کا منیزہ سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ یہاں پتھریلی عمارتوں کے کھنڈرات بھی اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ ہارون ان پتھروں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا جو حجم میں اتنے بڑے تھے کہ آدمیوں کی بڑی تعداد بھی انہیں اٹھا کر بلندی پر نصب نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ انہیں عمارتوں کی بلندی تک کس طرح لے جایا گیا ہوگا؟

بہن نے ازراہِ مذاق بھائی کو چھیڑا۔ ''بھائی ہارون! سچ سچ بتانا دمشق اچھا ہے یا بعلبک؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''اپنی اپنی جگہ دونوں ہی خوب صورت ہیں۔ بعلبک بھی اچھا ہے لیکن اسے میں اپنے دمشق پر ترجیح نہیں دے سکتا۔''

بہن نے کہا۔ ''بھائی! انصاف کی بات کرو اور تعصب سے کام نہ لو۔ مجھ کو تو بعلبک دمشق سے زیادہ حسین لگتا ہے۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''تو یہ بات اس لیے کہہ رہی ہے کہ بعلبک تیرے شوہر کا شہر ہے ورنہ تو مجھ سے پوچھ تو بعلبک میں دمشق کے مقابلے میں ایک کمی ہے۔''

بہن نے پوچھا۔ ''وہ کیا؟ کون سی کمی؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''بعلبک میرا وطن نہیں ہے جبکہ دمشق میرا وطن ہے۔''

جب وہ یہ بات کہہ رہا تھا تو اسے اچانک منیزہ یاد آگئی۔ اس کو یوں لگا کہ گویا کسی نے اس کا دل مسل دیا ہے۔ اس نے سوچا۔ 'اے کاش اس سفر میں منیزہ بھی اس کے ساتھ ہوتی۔'

بہن نے بھائی کو فکر مند دیکھ کر سوال کیا۔ ''بھائی! کیا بات ہے؟ کیا سوچنے لگے؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''کچھ نہیں۔ بس یہ کہ میں تیری باتوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاید تو اپنے شوہر سے بے حد محبت کرتی ہے۔''

بہن نے پشیمان ہو کر کہا۔ ''واہ، میں نے تو اپنے شوہر کا نام تک نہیں لیا۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''بے شک تو نے اپنے شوہر کا نام نہیں لیا مگر جب تو نے دمشق پر اپنے شوہر کے وطن بعلبک کو ترجیح دے دی تو میں خود بخود اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ تیرے دل میں جاگزیں شوہر کی محبت نے بعلبک کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔'' پھر سرد آہ بھر کر کہا۔ ''افسوس کہ یہی بات میں اپنے بارے میں نہیں کہہ سکتا۔''

بہن بہت پشیمان بھی اور خوش بھی وہ بے خیالی میں بولی۔ ''ہاں، ہاں بھائی! کہو اس میں شرم کس بات کی؟ جو کچھ کہنا ہے ضرور کہو۔''

ہارون نے کہا۔ ''دمشق اس لیے بھی حسین ہے کہ وہاں منیزہ رہتی ہے اور بعلبک میں یہ کمی ہے کہ یہ منیزہ کا وطن نہیں ہے۔''

بہن کا چہرہ اتر گیا، بولی۔ ''اس منحوس اور لالچی لڑکی کا ذکر میرے سامنے مت کیا کرو بھائی۔ اس سے بابا جان بھی خوش نہیں ہیں۔''

عامر ان دونوں کی باتیں توجہ سے سن رہا تھا۔ منیزہ کا نام جو آیا تو بے چینی سے پوچھا۔ ''میری نئی ماں کہاں ہے؟ کیا وہ نہیں آئے گی؟''

ہارون کو اپنی غلطی کا فوراً احساس ہو گیا۔ بہن سے کہا۔ ''اچھا بہن! اب یہ ذکر موقوف...... مجھے یہاں اس کا

نام نہیں لیتا تھا۔"

بہن نے نفرت سے کہا۔ "بھائی! تم مانو یا نہ مانو۔ جب میں ننھے عامر کی زبان سے اس قسم کی باتیں سنتی ہوں تو خواہ مخواہ یہ سوچنے لگتی ہوں کہ آخر اس ساحر زادی نے اس معصوم پر کون سا سحر کر دیا ہے کہ یہ اس کو نہیں بھولتا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "محبت کا سحر، چاہت کا سحر۔ اس نے خلوص اور خدمت سے عامر پر جادو کر دیا ہے اس لیے اس سحر کا کوئی توڑ بھی نہیں۔"

بہن نے کہا۔ "بھائی! میں تمہاری بات نہیں مانتی۔ میں نے سنا ہے کہ مدائن کے آس پاس قدیم خانہ بدوش سحر میں لاجواب ہیں۔ انہیں دل کو قابو میں کرنے اور پھیر دینے کے حیرت انگیز سحر معلوم ہیں۔ منیزہ نے یہ سحر انہی سے سیکھ لیا ہوگا۔"

ہارون نے منیزہ کی پُرزور وکالت کی۔ "نہیں بہن! اس معاملے میں تجھ سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ منیزہ کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس بھولی بھالی لڑکی کو سحر نہیں آتا۔"

عامر نے پھر پوچھا۔ "نئی ماں کب آئے گی؟ وہ کہاں چلی گئی؟"

بہن نے ہارون سے کہا۔ "کسی بھی لڑکی کے لیے یہ بڑی شرمناک بات ہے کہ وہ شادی سے پہلے ہی ماں کہلائی جانے لگے۔"

ہارون نے ندامت سے جواب دیا۔ "میں خود شرمندہ ہو رہا ہوں۔ معلوم نہیں عامر ایسی باتیں کیوں کرنے لگا ہے۔"

بہن نے کہا۔ "عامر ایسی باتیں اس لیے کر رہا ہے کہ ایسی باتوں کے لیے ماحول مل گیا ہے۔ اس کے ننھے ذہن نے ٹھیک اندازہ لگایا کہ اس کے باپ سے اتنی زیادہ توقع لگانے والی اس کی ماں ہی ہو سکتی ہے۔"

اب یہ لوگ تاکستان کے سائے سے گزر کر ایک حویلی نما مکان میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ اس کی بہن کا گھر تھا۔ یہ لوگ بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے آرام کرنے لگے۔ بڑا خوشحال گھرانا تھا۔ بہنوئی کے گھر والے بھی پڑوس ہی میں تھے۔ وہ لوگ بھی آگئے اور انہوں نے عامر کو ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن عامر اکھڑا اکھڑا ہوا تھا۔ اس کو منیزہ یاد آرہی تھی۔

بہن کے سسرالی رشتے داروں میں کئی لڑکیاں ایسی تھیں جو ہارون کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھیں اور بہن کی منشا بھی یہی تھی مگر ہارون نے ان میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ بہن کو ہارون سے زیادہ عامر کی فکر تھی اور وہ اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح عامر کے دل و دماغ سے منیزہ کے نقوش مٹا دے لیکن عامر کو یہاں بھی منیزہ ہی یاد آرہی تھی۔

ہارون کا سارا وقت گھر ہی میں گزر جاتا تھا۔ ہارون کا بہنوئی حیران تھا کہ کوئی مرد اپنا سارا وقت گھر میں قید رہ کر کس طرح گزار سکتا ہے۔ دوسری طرف بہن بھی اپنے شوہر کو اکسا رہی تھی کہ وہ ہارون کو بدلنے کی کوشش کرے۔

ہارون کا بہنوئی بھی فوجی تھا اور اس نے بنوامیہ کے لیے آذربائیجان کی مہمات میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اس نے ہارون کی بیوی کی قبل از وقت موت پر افسوس کا اظہار کیا اور اس پر مزید افسوس کیا کہ ان المناک لمحوں میں وہ بعلبک سے دور آذربائیجان کی بغاوتوں میں الجھا ہوا تھا جس سے سوگوار خاندان کے غموں میں شریک نہ ہو سکا۔ اس نے ہارون کو مشورہ دیا کہ مرنے والی کا زیادہ غم کرنا مناسب نہیں اور کسی اچھی لڑکی سے شادی کر کے غم غلط کر لینا چاہیے۔

ہارون کو بہنوئی کی باتوں میں غم گساری کی بو محسوس ہوئی، بولا۔ "بھائی! میں بھی یہی چاہتا ہوں لیکن میری بہن اور باپ میری مخالفت کر رہے ہیں۔"

بہنوئی نے کہا۔ "ہارون! تو نے یہاں کئی لڑکیاں دیکھی ہوں گی۔ اگر ان میں سے کوئی پسند ہو تو مجھے بتا دے، میں کام کرا دوں گا اور اگر ان میں کوئی بھی تجھے پسند نہیں تو میں تجھے اپنے ساتھ کئی ایسے گھروں میں لے چلوں گا جہاں ان سے زیادہ خوب صورت اور طرح دار لڑکیاں موجود ہیں اور مجھے یقین ہے کہ تو ان میں سے کسی نہ کسی کو ضرور پسند کر لے گا۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "بھائی! میں حیران ہوں کہ تم ابھی تک اس سے لاعلم ہو کہ میں نے اپنے لیے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔ لیکن افسوس کہ بہن اور باپ دونوں ہی اس کی مخالفت کر رہے ہیں، حالانکہ وہ بڑی اچھی لڑکی ہے اور میرا بیٹا عامر اس سے بے حد محبت بھی کرتا ہے۔"

بہنوئی نے کہا۔ "میں نے بھی ایسی کوئی بات سنی تو تھی لیکن اب تجھے نہایت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا اور اپنے لیے کسی ایسی لڑکی کا انتخاب کرنا ہے جو صورتاً زیادہ حسین ہو یا نہ ہو لیکن اس کا اندر ضرور حسین ہو۔ کوئی حسین مگر بدباطن لڑکی تیرے عامر کے لیے مصیبت بن جائے گی۔ میں نہیں جانتا کہ تو نے جس لڑکی کو اپنے لیے پسند کر لیا ہے، اس کا باطن کیسا ہے اور وہ عامر کے حق میں کیسی ثابت ہوگی؟"

ہارون نے بڑے جوش میں جواب دیا۔ "اس کا باطن

بہت حسین ہے اور یہ کہ وہ عامر سے بے حد محبت کرتی ہے۔''

بہنوئی نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ''میں نے اس لڑکی کو نہیں دیکھا لیکن اس کی بابت جو کچھ میں نے سنا ہے اس کی روشنی میں، میں اس کو تیرے لائق نہیں سمجھتا کیونکہ جس لڑکی کی محبت کے پیچھے مال وزر کی ہوس بھی کام کر رہی ہو، اس کے خلوص اور ظاہر پر کس طرح یقین کیا جاسکتا ہے؟ اور پھر میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ اس لڑکی کو سحر بھی آتا ہے اور اس نے ساحری مدائن کے قدیم خانہ بدوش لوگوں سے سیکھی ہے۔''

ہارون ایک دم چیخ پڑا۔ ''بھائی! یہ بھولی بھالی منیزہ پر تہمت ہے۔ وہ ایسی ہرگز نہیں۔ وہ ایک شریف اور ہمدرد لڑکی ہے۔ ہاں اس کا باپ البتہ حریص ہے لیکن میرا باپ بھی تو حریص ہے اور اس پر یہ الزام بے بنیاد ہے کہ وہ ساحرہ ہے اور اس نے یہ علم خانہ بدوشوں سے سیکھا ہے۔''

بہنوئی نے بے دلی سے کہا۔ ''اپنا بھلا برا تو بہتر سوچ سکتا ہے، میں تو بس مشورہ ہی دے سکتا ہوں۔''

ہارون نے دل برداشتہ لہجے میں کہا۔ ''منیزہ کے بارے میں جو غلط تشہیر ہو رہی ہے، اس کو میں اب برداشت نہیں کر سکتا۔ اب میں یہاں رکوں گا بھی نہیں۔ میں عامر کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔''

بہنوئی نے ہنس کر کہا۔ ''نہیں ہارون! تم اس طرح نہیں جاؤ گے۔ مسئلے کو الجھانے سے کچھ حاصل ہے؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''تب پھر میں ایک ہی شرط پر رک سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ اب یہاں منیزہ کے خلاف کوئی بات نہیں کی جائے گی۔''

بہنوئی نے کہا۔ ''کیا میں اس لڑکی کو دیکھ سکتا ہوں؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''شاید نہیں کیونکہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ یہاں سے واپس جا کر اپنے مال وزر کا کثیر حصہ باپ کے حوالے کر دوں گا اور منیزہ سے شادی کر کے خراسان چلا جاؤں گا۔''

بہنوئی نے پوچھا۔ ''اور عامر کا کیا بنے گا؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''عامر میرے ساتھ ہی جائے گا۔ میں اسے اپنے پاس ہی رکھوں گا۔''

بہنوئی نے کہا۔ ''میں تیرے ساتھ دمشق چلوں گا اور اس لڑکی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کوئی فیصلہ کروں گا۔ اگر تیری منیزہ وہ نہ نکلی جو مشہور کر دی گئی ہے تو میں تیرا ساتھ دوں گا اور تیرے باپ کو رضامند کرنے کی کوشش کروں گا۔''

ہارون نے کہا۔ ''افسوس کان بھرنے والوں کی باتیں اچھے بھلوں کو ورغلا دیا کرتی ہیں اور لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ بھائی! مجھے معلوم نہیں کہ منیزہ کے خلاف کی جانے والی باتوں نے تم کو کس حد تک گمراہ کر دیا ہے؟!''

بہنوئی نے کہا۔ ''ہارون! میں عورتوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا، یہ ناقص العقل ہوتی ہیں۔ تیری بہن نے منیزہ کی بابت جو کچھ کہہ سن رکھا ہے، میں اس پر اس وقت تک یقین نہیں کروں گا جب تک وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ اور عقل سے سمجھ نہ لوں۔''

ہارون نے بوئے ہمدردی محسوس کی، خوش ہو کر بولا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ منیزہ سے مل کر تم بھی خوش ہو گے۔''

بہنوئی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''پھر بھی میں چند باتیں قبل از وقت تیرے گوش گزار کیے دیتا ہوں۔ اگر تو نے ان باتوں پر سنجیدگی سے غور اور ہوشیاری سے عمل کیا تو، تو بہت سے دکھوں سے محفوظ رہے گا لیکن اگر ان پر غور اور عمل نہ کیا تو پوری زندگی مشکلات اور مصائب میں مبتلا رہے گا اور یہ دنیا اور زندگی جہنم بن جائے گی۔''

ہارون نے بہنوئی کو شک وشبے سے دیکھا، بولا۔ ''کہو، خلوص اور سچائی تو خود بخود دل میں اتر جاتے ہیں۔ اگر تمہاری باتوں میں سچائی اور خلوص ہو گا تو میری مجال نہیں کہ میں ان پر غور اور عمل نہ کروں۔''

بہنوئی نے کہا۔ ''اگر تیری، منیزہ سے شادی ہو جائے اور عامر کو تو اپنے پاس ہی رکھنا چاہے تو اس صورت میں تو حتی الامکان منیزہ کو اولاد سے محروم ہی رکھے گا۔''

ہارون نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

بہنوئی نے جواب دیا۔ ''یہ اس لیے کہ جب تک منیزہ کے خود اولاد نہ ہو گی، یہ عامر سے محبت کرتی رہے گی اور اس کی ممتا محض عامر کے لیے مختص رہے گی لیکن جس دن وہ خود صاحب اولاد ہو جائے گی اسی دن سے حقیقی اور غیر حقیقی کا رشتہ قائم ہو جائے گا۔ عامر کسی حد تک غیر اور اس کی اپنی اولاد اپنی ہو جائے گی۔ پھر آہستہ آہستہ یہ خلیج بڑھتی چلی جائے گی اور دونوں کے ساتھ امتیازی سلوک تیرے اور عامر کے لیے سوہان روح بنتا چلا جائے گا۔ عامر پر وہ اپنے بچے کو ترجیح دینے لگے گی اور عامر نظر انداز کیا جانے لگے گا۔ اس طرح عامر میں احساس محرومی پیدا ہونے لگے گا اور جب یہ احساس پوری طرح ہمیشہ کے لیے اس کے کردار کا ایک جزو بن جائے گا تو تیرے لیے دکھوں کی ایک ایسی خندق کھد چکی ہو گی جس کو تو زندگی بھر نہیں پاٹ سکے گا اور جیسے جیسے اس کو پاٹنا چاہے گا، خندق کی گہرائی بڑھتی چلی جائے گی۔''

ہارون نے اس مشورے کو بھی اپنے اور منیزہ کے خلاف ایک سازش سمجھا۔ بہ ظاہر بہنوئی کی مخالفت بھی نہیں کی مگر دل سے اس مشورے کو مانا بھی نہیں۔

بہنوئی کا خیال تھا کہ ہارون نے اس کا مشورہ قبول کرلیا ہے۔ اس نے خوش ہوکر ہارون کو سیر و تفریح پر آمادہ کرلیا اور وہ پہلی بار بعلبک کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے باہر نکلا۔

☆☆☆

بہنوئی اس کو بعلبک کی قدیم عبادت گاہوں کے کھنڈرات کی سیر کراتا رہا۔ اس نے دنیا کی دو عظیم عبادت گاہوں کے ان کھنڈرات میں کافی دیر تک گھمایا پھرایا جس کے پتھروں کی بڑی بڑی چٹانیں تقریباً سات گز بلندی پر نصب کی گئی تھیں اور ان کی ایک ایک چٹان سے ایک ایسا مکان تعمیر کیا جاسکتا تھا جو بیس مربع گز پر تقریباً تیرہ گز بلند بنایا گیا ہو۔ پتھروں کے حجم اور ستونوں کی عظمت ایک طرف، اس کی آرائشی پٹیوں میں جو باریک کام ہوا تھا، اس نے معبد کی عظمت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ ہارون گویا جنوں کی تعمیر کی ہوئی معبدی عمارت میں سب کچھ بھلا چکا تھا۔ اس وقت حیرت کے سوا اس کے دل و دماغ میں کوئی بھی جذبہ نہ تھا۔ آرائشی پٹیوں میں گیہوں کے خوشے اور پوست کے ڈوڈے دور سے پہچانے جاتے تھے۔ گیہوں زندگی اور پوست موت کی علامت تھی۔ ان آرائشی پٹیوں میں جنوں کی شکلیں بھی بنی ہوئی تھیں جو اپنے پروں پر پردے اٹھائے ہوئے تھے۔ ان کے قریب عشق و محبت کا دیوتا تیر کمان لیے کھڑا تھا۔ اس شکل نے منیزہ کی یاد تازہ کردی اور وہ خیالوں میں دمشق پہنچ گیا۔ جہاں اداس منیزہ ہارون کے بغیر بتائے بعلبک چلے جانے کی شکایت کررہی تھی۔ ہارون ایک دم بول اٹھا۔ ”منیزہ! میں مجبور تھا، بہن کے اصرار پر بعلبک چلا آیا اور افسوس کہ تجھے اس کی اطلاع بھی نہ دے سکا۔“

بہنوئی نے ہارون کو اس طرح دیکھا گویا وہ صحیح الدماغ نہیں رہا تھا۔ ہارون کو بھی بہت جلد اپنی حماقت کا احساس ہوگیا۔ اپنی خفقانی کیفیت کو چھپانے کی خاطر بولا۔ ”بھائی! میں کل ہی دمشق واپس جاؤں گا کیونکہ میں محسوس کر رہا ہوں کہ عامر یہاں خوش نہیں ہے اور اس کے بیمار پڑ جانے کا احتمال پیدا ہوگیا ہے۔“ پھر اصرار سے کہا۔ ”میری خواہش ہے کہ میرے ساتھ تم بھی چلو اور منیزہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کوئی رائے قائم کرو۔“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”میں تیرے ساتھ ضرور چلوں گا اور ایک بات تو اس وقت بھی سمجھ میں آرہی ہے۔ منیزہ میں کوئی ایسی بات ہے ضرور جس نے تجھے سرشار اور مدہوش کررکھا ہے۔“

بہنوئی ہارون کے ساتھ بدمزگی اور بے کیفی محسوس کر رہا تھا اور ہارون محبت کے دیوتا کی ابھرواں مورتی میں کھویا ہوا تھا۔ وہ اس ذہن کی داد دے رہا تھا جس نے محبت کے دیوتا کے ہاتھوں میں تیر کمان دے کر نابینا کردیا تھا۔ بہنوئی نے کہا۔ ”ہارون! شاید یہاں تیرا دل نہیں لگ رہا، ہمیں گھر واپس چلنا چاہیے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”ہاں، میرا یہاں دل نہیں لگ رہا۔“

وہ دونوں معبد کے کھنڈرات سے باہر نکلے اور گھر کی طرف چل دیے۔

بہن ہارون کے واپسی کے اعلان پر چونک پڑی اور جب یہ معلوم ہوا کہ وہ عامر کو اپنے ساتھ ہی لے جائے گا تو تلملا کر رہ گئی۔ اس نے مخالفت کی، کہا۔ ”بھائی! اگر تو جانا چاہتا ہے تو چلا جا لیکن عامر کو یہیں رہنے دے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”بہن! عامر میرے ساتھ ہی جائے گا کیونکہ میری موجودگی میں یہ کچھ بہل گیا تھا لیکن شاید یہ میری عدم موجودگی برداشت نہ کرسکے۔“

بہن نے کہا۔ ”میں عامر کو اس طرح روک رہی ہوں کہ اس کو بادا جان نہیں سنبھال سکیں گے اور پھر... تیرا بھی کوئی بھروسا نہیں۔ آج تو دمشق میں ہے، کل تو کسی مہم پر جاسکتا ہے۔ تیری عدم موجودگی میں عامر کو کون سنبھالے گا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”بہن! عامر کی بابت سوچنا میرا کام ہے چنانچہ جب بھی کہیں جاؤں گا، عامر کا بندوبست کرکے جاؤں گا۔“

بہن نے طنز کیا۔ ”تو کیا بندوبست کرے گا۔ لے دے کر منیزہ ہی تیرے دل و دماغ میں بسی ہوتی ہے۔ تو عامر کو اس کے حوالے کرکے چلا جائے گا۔ کیوں ہے نا یہی بات؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”بات تو یہی ہے لیکن میں عامر کو منیزہ کے حوالے کسی اجنبی کی طرح نہیں چھوڑوں گا، پہلے میں اس سے شادی کروں گا۔ اس کے بعد عامر کو اس کے حوالے کردوں گا۔“

بہن پھر برہم ہوگئی۔ ”جب اس منحوس اور حریص لڑکی کو بادا جان نے سختی سے ناپسند کردیا ہے تو، تو اس کا بار بار میرے سامنے کیوں نام لیتا ہے؟ اگر تو نے ہم سب کو ناراض کرکے یہ شادی کرلی تو ہم سب احتجاجاً تجھ سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائیں گے۔“

ہارون نے بہنوئی کی طرف دیکھا۔ بہنوئی نے کہا۔ "میں ہارون کے ساتھ دمشق جارہا ہوں کیونکہ اس لڑکی کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

ہارون کی بہن نے شوہر کی مخالفت کی۔ "تم دمشق نہیں جاؤ گے کیونکہ تمہاری پسند یا ناپسند سے بادا جان کا فیصلہ نہیں بدل جائے گا۔"

شوہر کو غصہ آگیا۔ "تو میری مخالفت نہ کر۔ میری جو سمجھ میں آئے گا کروں گا۔ میں ہارون ہی کی طرح ایک سپاہی ہوں اور سپاہی، سپاہی کا ساتھ دے گا۔ اگر وہ لڑکی میرے معیار پر پوری اتری تو میں ہارون کا ساتھ دوں گا اور اگر اس میں وہ برائیاں موجود ملیں جن کا تو بار بار ذکر کرتی رہی ہے یعنی منحوس، حریص، طامع تو میں تیرا اور تیرے باپ کا ساتھ دوں گا اور اگر وہ نہ تو میرے معیار پر پوری اتری اور نہ ہی حریص اور طامع ثابت ہوئی تو میں کسی کا بھی ساتھ نہیں دوں گا۔ غیر جانبدار ہو جاؤں گا۔"

ہارون عامر کو ساتھ لے کر دمشق روانہ ہو گیا۔ بہنوئی بھی اس کا ہم سفر تھا۔ یہ لوگ جب دمشق کے شمالی دروازے سے شہر میں داخل ہوئے تو دروازے سے ملحق سرائے کے سامنے لوگوں کا اژدحام نظر آیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو دور دراز سے آنے والے عزیزوں اور رشتے داروں کے استقبال کو حاضر ہوتے تھے۔

ہارون نے ہجوم پر رشک کی نظریں ڈالیں اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ "کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کی پیشوائی کو یہ ہجوم انتظار کی تلخیاں برداشت کر رہا ہے۔"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "خوش قسمت اور خوش نصیب ہم بھی ہیں۔ اگر بادا جان کو ہماری آمد کا علم ہو گیا ہوتا تو میرا خیال ہے کہ وہ بھی یہاں موجود ہوتے۔"

یہ دونوں اس ہجوم پر نظریں ڈالتے ہوئے جیسے ہی آگے بڑھے، ایک لڑکی جسم اور چہرے کو نقاب میں چھپائے آگے بڑھی۔ اس کی دونوں آنکھوں سے پیشانی تک چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اس لڑکی نے عامر کو پکڑ لیا، ہنستی ہوئی بولی۔ "آج مجھے یقین تھا کہ تو ضرور واپس آجائے گا چنانچہ میں پڑاؤ پر آگئی اور یہاں اچانک تجھے دیکھ کر خوشی سے پاگل ہوئی جارہی ہوں۔"

ہارون نے منیزہ کی آواز پہچان لی تھی۔ بہنوئی کے کان کے پاس منہ لے جا کر سرگوشی میں کہا۔ "بھائی! یہی وہ لڑکی ہے منیزہ، جس کا میں بار بار ذکر کر چکا ہوں۔"

بہنوئی نے منیزہ کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن نہیں دیکھ سکا۔ ہارون نے ایک طرف سے منیزہ کے باپ کو نمودار ہوتے دیکھا۔ اس نے کسی قدر جھجک کے ساتھ ہارون سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ "ہارون! اچھا ہوا کہ تو مل گیا ورنہ میں منیزہ کو لے کر حمص جارہا تھا۔ یہ ملاقات تو اتفاقیہ ہو گئی۔"

ہارون کے دل پر چوٹ لگی، بولا۔ "لیکن ابھی ابھی منیزہ تو یہ کہہ رہی تھی کہ وہ یہاں عامر کو دیکھنے آئی تھی کیونکہ آج اسے یقین تھا کہ عامر ضرور واپس آجائے گا۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "منیزہ بھی صحیح کہہ رہی ہے۔ یہ جانے سے پہلے عامر سے ملنا چاہتی تھی۔ چنانچہ کچھ دیر پہلے منیزہ کہہ رہی تھی کہ اے کاش، عامر آج آجاتا تو ملاقات ہو جاتی۔ چنانچہ اس کی دعا قبول ہوئی اور عامر سے ملاقات ہو گئی۔"

بہنوئی نے کہا۔ "ہارون! میرا تعارف تو کراؤ، مجھے بے تعلق کیوں رکھا ہے؟"

ہارون نے جلدی جلدی منیزہ کے باپ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "بھائی! یہ منیزہ کے باپ ہیں۔" اس کے بعد اپنے بہنوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منیزہ کے باپ سے کہا۔ "اور یہ میری بہن کے شوہر ہیں۔"

دونوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ بہنوئی نے کہا۔ "جناب! میں تو آپ ہی کے پاس آیا تھا اور آپ ہیں کہ حمص جارہے ہیں۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "ہاں مجھے حمص اس لیے جانا پڑ رہا ہے کہ چند ہفتوں بعد مجھ کو بصرہ جانا ہے۔ وہاں خارجیوں نے ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے۔ مجھے ان سے خلافت کی طرف سے جنگ کرنا ہے۔ میری عدم موجودگی میں منیزہ تنہا رہ جاتی اس لیے میں اسے اس کے نانا کے پاس چھوڑ دوں گا۔"

ہارون نے کہا۔ "اب میں آگیا ہوں۔ کیا چند دنوں کے لیے یہ سفر ملتوی نہیں کیا جاسکتا؟"

منیزہ کے باپ نے بے مروتی سے کہا۔ "نہیں، سفر ملتوی کرنے کا کوئی معقول جواز نہیں ہے۔"

ہارون کے بہنوئی نے کہا۔ "جناب! میں ہارون کے مسئلے کو طے کرنے آیا ہوں۔ آپ سفر ملتوی کر دیجیے، بعد میں چلے جائیے گا۔"

منیزہ کے باپ نے کہا۔ "نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں نے اپنے ذہن سے ہارون کا خیال ہی نکال دیا ہے۔ اب یہ رشتہ نہیں ہوسکتا۔"

اس کے بعد منیزہ سے کہا۔ "منیزہ! تو نے عامر کو دیکھ

لیا، اس سے ملاقات کرلی۔ اب اسے اس کے باپ کے حوالے کردے اور چلنے کے لیے تیار ہو جا کیونکہ ہمارا قافلہ بھی پابہ رکاب اور چلنے ہی والا ہے۔''

لیکن اب منیزہ کا دل سفر پر آمادہ نہیں تھا۔ اس نے تذبذب سے کہا۔ ''کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم لوگ چند دن دمشق ہی میں رہیں؟ اس دوران میں اپنا زیادہ وقت عامر کے ساتھ گزار سکوں گی۔''

لیکن باپ نے سختی سے کہا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ تجھے اسی وقت چلنا ہے۔''

بہنوئی نے منیزہ کے بارے میں اندازہ لگایا کہ معقول لڑکی ہے لیکن اس کے باپ کے بارے میں اس کی رائے اچھی نہیں تھی۔ اس نے برا مان کر ہارون سے کہا۔ ''ہارون! مجھے جو کچھ دیکھنا تھا، دیکھ لیا۔ انہیں... جانے دے اور فکر نہ کر۔''

ہارون نے بہنوئی کے کان میں کہا۔ ''بھائی! اگر تم منیزہ کے باپ کو روک لو تو میرا کام ہوسکتا ہے۔''

بہنوئی نے جواب دیا۔ ''ہارون! غرض مند بننے سے کام نہیں ہوگا۔ منیزہ کے علاوہ بھی لڑکیاں ہیں، یہ کام مجھ پر چھوڑ دے۔ میں زیادہ باوقار طور پر تیرا کام کرادوں گا۔''

منیزہ کے باپ نے بیٹی سے کہا۔ ''منیزہ! اب وقت نہ ضائع کر۔ عامر سے مل لی، اب چل۔''

منیزہ نے عامر کو ہارون کے سپرد کیا، بولی۔ ''خدا حافظ۔''

اس کی آواز بھرا گئی۔ ہارون کے جی میں آئی کہ وہ ہمت کرکے اعلان کردے کہ وہ منیزہ سے غیر مشروط طور پر شادی کرنے کو تیار ہے اور وہ اپنے مال و زر سے باپ کو محروم کردے گا لیکن اس طرح یہ خیال آیا کہ لوگ کیا نہیں کہیں گے؟ یہی کہ ہارون نے ایک لڑکی کی خاطر اپنے باپ، بہن اور بہنوئی کو نظرانداز کردیا۔ اسے یہ خیال آیا کہ منیزہ کا باپ کیا سوچے گا؟ وہ اپنی بیٹی کی فتح اور ہارون کی شکست سے خوش ہوگا اور شاید وہ منیزہ کے باپ کی نظر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گر جائے گا۔

منیزہ کو جاتے دیکھ کر عامر رونے لگا۔ ہارون نے اسے گود میں لے کر اس طرح سینے سے لگالیا کہ منیزہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس کے بہنوئی نے منہ بنا کر کہا۔ ''یہ دونوں اس تاجر کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں جس کے سامنے کسی گاہک کا بچہ کسی چیز کے لیے مچل رہا ہو اور تاجر گاہک کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر چیز کی زیادہ قیمت وصول کررہا ہو۔ منیزہ اور اس کے باپ کو تیری اس کمزوری کا شدید احساس ہے کہ عامر منیزہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

ہارون کا دل بھر آیا لیکن اس نے چہرے پر غم کی کیفیت نہیں پیدا ہونے دی، بولا۔ ''بھائی! لیکن میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ عامر کو کچھ بھی ہوجائے مگر اب میں منیزہ سے شادی نہیں کروں گا۔''

عامر اب بھی رو رہا تھا۔ بہنوئی نے جواب دیا۔ ''عامر کا غم دائمی یا دیرپا نہیں ہے۔ آخرکار بھول جائے گا۔ میں اس کو بہلانے کی کوشش کروں گا۔ میں تیری بہن کو دمشق ہی میں بلالوں گا۔ وہ اس کو بہلانے اور منیزہ کو بھلانے کی کوشش کرے گی اور اللہ نے چاہا تو اس میں ضرور کامیاب ہوجائے گی۔''

ہارون نے ڈرتے ڈرتے منیزہ اور اس کے باپ کو ایک بار پھر دیکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا کیونکہ وہ دونوں مسافروں کے ہجوم میں غائب ہوچکے تھے۔ ہارون اپنے بہنوئی اور عامر کے ساتھ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

ہارون کے بہنوئی نے اپنے قول کے مطابق اپنی بیوی کو دمشق ہی میں بلالیا اور عامر کو بہلانے کی نہایت ہوش مندانہ تدبیریں کیں۔ کچھ دنوں تک تو عامر کی حالت غیر رہی اور وہ منیزہ کو یاد کرتا رہا لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ بہلنے اور منیزہ کو بھولنے لگا۔ ہارون کی بہن نے عامر کو زبردست پیار دیا۔ ہارون کا باپ بھی بے حد خوش تھا اور اپنے پوتے کے دل کو جیتنے کے لیے بیٹی کا پورا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ ہارون... بہ ظاہر تو یہی چاہتا تھا کہ عامر منیزہ کو بھول جائے لیکن جب اس کو یہ محسوس ہونے لگا کہ عامر منیزہ کو بھولتا جارہا ہے تو اسے اذیت پہنچی کیونکہ وہ خود منیزہ کو بھلانے میں ناکام رہا تھا اور جب تک عامر منیزہ کو بھولا نہیں تھا، ہارون خود کو تنہا نہیں سمجھتا تھا لیکن جیسے ہی یہ انکشاف ہوا کہ اس کا بیٹا منیزہ کو بھلائے دے رہا ہے، وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگا۔

اسی دوران اس کا بلاوا آگیا اور خلافت کی طرف سے ایک پروانہ موصول ہوا جس میں اس کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ جلد از جلد خراسان واپس چلا جائے کیونکہ وہاں سپاہیوں کی بڑی کمی ہے۔ ہارون نے اس طلبی کو اپنے حق میں رحمت جانا کیونکہ محاذ جنگ پر منیزہ کو بھول جانے کا امکان پیدا ہوگیا تھا۔ بہن کو اس خبر نے ملول کردیا کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ جس عامر کے دل سے منیزہ کی محبت کو نکالنے میں اتنی محنت کرنا پڑی تھی، اب وہی عامر اپنے باپ کی محبت میں بے چین اور پریشان رہنے لگے گا اور وہ سابقہ مصیبت میں ایک

بار پھر گرفتار ہو جائے گی۔" اس نے بھائی سے کہا۔ "ہارون! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ فی الحال تو محاذ پر نہ جائے اور عامر کے پاس ہی رہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "بہن! خراسان باغیوں کا گڑھ بنتا جا رہا ہے اور وہاں فوج کی بڑی کمی ہے۔ مجھے اور میرے جیسے جتنے بھی ہیں، انہیں خراسان کی مہم پر جانا ہی پڑے گا۔"

بہن نے افسوس سے کہا۔ "لیکن تیری عدم موجودگی عامر کے حق میں مصیبت ثابت ہوگی۔ وہ منیزہ کی طرح تجھے یاد کرنا شروع کر دے گا اور میں ایک بار پھر اس مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں گی جس میں کچھ دن پہلے مبتلا رہ چکی ہوں۔"

لیکن ہارون اپنی بہن کی بات نہیں مان سکتا تھا۔ وہ عامر کی پروا کیے بغیر خراسان روانہ ہو گیا۔ وہاں اموی حکام بڑی مصیبت میں پھنسے ہوئے تھے۔ خراسان کے والی سفیان کو معزول کر کے امیہ بن عبداللہ کو والی مقرر کیا جا چکا تھا۔ ان دنوں مرو کی حکومت بکیر بن وشاح کے سپرد تھی۔ بکیر کی خلافتِ اموی سے وفاداری مشہور تھی لیکن کچھ لوگوں نے امیہ اور بکیر میں اختلافات پیدا کر دیے چنانچہ بکیر، مرو میں جم کر بیٹھ گیا اور والی خراسان کے خلاف منصوبے بنانے لگا۔

دوسری طرف امیہ، بکیر سے نمٹنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا اور دونوں طرف کے درباری اور خوشامدی دونوں کو بھڑکا رہے تھے۔ ہارون سیدھا امیہ بن عبداللہ کے پاس پہنچا تو اسے مطلع کیا گیا کہ اسے بکیر سے مقابلے پر مرو روانہ ہونا ہے لیکن وہ بکیر سے نہیں لڑنا چاہتا تھا کیونکہ بکیر نے اس پر چند احسان کیے تھے اور اسے اس وقت زر و مال سے نوازا تھا جب وہ اپنی بیوی کی موت کی خبر سن کر دمشق واپس جا رہا تھا۔ اس نے امیہ بن عبداللہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ بکیر کے مقابلے پر نہیں جائے گا کیونکہ بکیر اس کا محسن ہے۔

امیہ نے سختی سے کہا۔ "لیکن اب وہ خلافت کا دشمن ہے اور تو خلافت کا ملازم ہے۔ تجھے بکیر سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "میں خلافت کا ہر حکم ماننے بجا لانے کو تیار ہوں لیکن بکیر کے مقابلے پر بھیجنے کے بجائے اگر مجھ کو قتل کر دیا جائے تو یہ اچھا ہے۔ اس لیے کہ میں بکیر کا مقابلہ کروں اور کسی مزاحمت اور مدافعت کے بغیر خود کو بکیر کے آدمیوں سے قتل کرا لوں۔"

امیہ نے کہا۔ "کیا تو جانتا ہے کہ تیرے اس جواب کا نتیجہ کیا نکلے گا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "امیر! میں زندگی سے بیزار ہوں اور میرے لیے اس میں کوئی فرق نہیں کہ آپ قتل کرا دیں یا بکیر قتل کر دے۔"

امیہ طبعاً منصف اور رحم دل تھا۔ مسکرا کر بولا۔ "اچھا، میں تجھ کو چند دن کا موقع دیتا ہوں، تو سوچ لے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تو اپنی نیک نامی اور بہادری کو داغ لگا لے۔"

ہارون سامنے سے ہٹ گیا۔ کئی دن بعد جب وہ بکیر کے مقابلے پر جانے کے لیے تیار نہیں ہوا تو اس کو خراسان سے نکل جانے کا حکم ملا۔ امیہ بن عبداللہ نے کہا۔ "ہارون! اب ہمیں تیری ضرورت نہیں رہی کیونکہ میں اپنے آس پاس رہنے والوں کو یہ نہیں بتانا چاہتا کہ تو نے میری حکم عدولی کی ہے۔ اگر یہ راز میرے دوسرے سپاہیوں اور بہادروں پر کھل گیا تو وہ بھی حکم عدولی کریں گے جس سے میں مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ کیونکہ یہاں کون ایسا ہے جس پر بکیر کا کوئی نہ کوئی احسان نہ ہو۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "امیر! اگر یہ بات ہے تو اس شریف انسان سے جنگ ہی کیوں کی جائے۔ بکیر نے بہتوں پر احسان کیے ہیں، ایسا شریف انسان غدار نہیں ہو سکتا۔"

امیر نے غصے میں ہارون کے تھپڑ رسید کیا۔ "تو میرا مشیر یا ناصح کب سے بن گیا؟ میں تیرے ساتھ زیادہ سے زیادہ اور بڑی سے بڑی جو بھلائی کر سکتا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں تجھے ملازمت سے سبکدوش کر دوں۔ آج سے تو خلافت کا ملازم نہیں رہا۔ تو جا سکتا ہے۔"

امیہ کا طمانچہ اتنا زوردار تھا کہ ہارون کا گال سرخ ہو گیا اور اسے چکر سا آ گیا۔ وہ اٹھا اور چپ چاپ اپنی قیام گاہ پر پہنچا اور اپنا سامان لے کر مرو، بکیر کے پاس روانہ ہو گیا۔ بکیر نے اس کو گرم جوشی سے قبول کیا۔ ہارون نے کہا۔ "بکیر! میری بڑی خواہش یہ ہے کہ جس طرح امیہ نے میرے گال پر طمانچہ رسید کیا ہے، میں بھی اس کے گال پر رسید کروں۔"

بکیر نے جواب دیا۔ "ہارون! یہ تقریباً ناممکن ہے کیونکہ امیہ نسبتاً شریف امیر ہے۔ اگر وہ شریف نہ ہوتا تو صحیح سلامت میرے پاس تک نہ آتا۔"

ہارون نے بھی امیہ کی شرافت اور رحم دلی کا اپنے دل میں اعتراف کیا۔ دونوں طرف جنگ کی تیاریاں جاری تھیں۔ امیہ بن عبداللہ مرو کے محاصرے کی تیاریاں کر رہا تھا اور بکیر اس کی حفاظت اور امیہ کے مقابلے کی تیاری میں

لگا ہوا تھا۔ ہارون اس فکر میں تھا کہ بکیر کا زیادہ سے زیادہ ساتھ دے کر اس کے دل کو مٹھی میں لے لے اور اس سے انعام واکرام حاصل کرے کیونکہ اب وہ جو کچھ بھی کمانا چاہتا تھا، اسے اپنے پاس رکھ کر منیزہ سے شادی کرنا چاہتا تھا حالانکہ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ شاید منیزہ اسے نہ مل سکے۔ کیونکہ منیزہ حمص بھیجی جا چکی تھی اور منیزہ کا باپ بصرہ میں خارجیوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ دل کے کسی گوشے میں یہ تمنا بھی کلبلا رہی تھی کہ اے کاش وہ بصرہ پہنچ جاتا اور وہاں منیزہ کے باپ کو تلاش کر کے تعلقات دوبارہ استوار کرتا۔ اس کے مزاج میں جھنجلاہٹ اور افسردگی آ گئی تھی۔

مرو کے حسین مناظر اسے ذرا بھی اچھے نہ لگتے، چاندنی راتیں بے کیف تھیں اور لذیذ کھانے بے مزہ کیونکہ ان سب میں ایک ہی کمی تھی، منیزہ کی موجودگی کی۔ بکیر اس کی وفاداری اور احسان شناسی سے خاصا متاثر ہوا تھا۔ اس نے ہارون کو فوری طور پر دس ہزار درہم دیے اور وعدہ کیا کہ اگر وہ امیہ کے مقابلے میں کامیاب ہو گیا تو اسے مال وزر سے مالا مال کر دے گا۔ بکیر اسی طرح اپنے ساتھیوں کی وفاداریاں خرید رہا تھا اور جو اس کے پہلے ہی احسان مند تھے، ان کے جذبہ احسان مندی کو اور زیادہ مضبوط اور پختہ کر رہا تھا۔

امیہ بن عبداللہ فوج لے کر مرو کے سامنے نمودار ہوا۔ بکیر قلعہ بند ہو گیا۔ امیہ قلعے کی دیواروں کے نیچے کچھ فاصلے پر کھڑا فصیلوں پر کھڑے ہوئے بکیر کے سپاہیوں کو دیکھتا رہا۔ امیہ بن عبداللہ، بکیر سے جنگ کرنے کے لیے بڑھا تو تھا لیکن حالات کا اندازہ کر کے ارادہ بدل دیا اور بکیر کو پیغام دیا۔ ”میں جنگ نہیں کرنا چاہتا تو بھی جنگ سے گریز کر۔“

بکیر نے جواب میں کہلا دیا۔ ”جب تک تمہارے پاس میرے حاسد اور مخالف موجود ہیں، میں کس طرح یقین کر لوں کہ مجھ سے دھوکا نہیں کیا جائے گا؟“

امیہ بن عبداللہ نے بکیر کو یقین دلایا۔ ”میں ان میں سے نہیں ہوں جو وعدے اور معاہدے کر کے پھر جاتے ہیں۔ میں اگر جنگ نہ کرنے کا وعدہ کر رہا ہوں تو اس پر سچائی اور استقلال سے قائم بھی رہوں گا۔ میں تیری طرف سے مطمئن ہو کر بخارا جانا چاہتا ہوں۔ وہاں غیر مسلموں سے جہاد کر کے خلافتِ اسلامیہ کو وسیع کرنا چاہتا ہوں۔“

بکیر نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ چند خاص خاص سرداروں نے مشورہ دیا۔ ”امیہ بن عبداللہ کے وعدوں پر اعتبار کرنا چاہیے اور جنگ سے باز آجانا چاہیے۔“

ہارون نے کہا۔ ”لیکن معاہدے میں یہ بات بھی شامل ہونا چاہیے کہ جن لوگوں نے اس دوران امیہ بن عبداللہ کا ساتھ چھوڑ کر بکیر کا ساتھ دیا ہے، ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جائے گا۔“

امیہ نے بکیر کی ساری باتیں مان لیں اور مرو کے دروازے کھل گئے۔ امیہ اور بکیر بڑے تپاک سے ملے۔ امیہ نے بکیر کو اپنے پاس احترام سے بٹھایا اور بخارا چلنے کی دعوت دی۔ بکیر نے ہامی بھر لی۔ بکیر کے کچھ... ساتھی امیہ اور بکیر کی مفاہمت سے خوش نہیں ہوئے۔ ان میں ہارون بھی شامل تھا۔ وہ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ بکیر سے درخواست کی کہ اسے دمشق واپس جانے کی اجازت دی جائے۔

بکیر نے کہا۔ ”تو میرے ساتھ بخارا چل کیونکہ وہاں کی غنیمت سے تو مالا مال ہو جائے گا۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”میرا بچہ عامر، دمشق میں مجھے یاد کر رہا ہوگا اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں زیادہ دنوں تک اس سے دور نہیں رہ سکتا۔“

بکیر نے پوچھا۔ ”وہ کس کے پاس رہ رہا ہے؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”میری بہن کے پاس جو ان دنوں میرے باپ کے ساتھ رہ رہی ہے۔“

بکیر نے مشورہ دیا۔ ”جب اتنی نازک صورت تھی تو تجھے شادی کر لینا چاہیے تھی کیونکہ بہن کب تک اپنے باپ کے گھر رہے گی اور وہ کب تک تیرے بچے کی ذمے داری سنبھالے گی۔“

ہارون نے ایک سرد آہ بھری، بولا۔ ”افسوس کہ میں شادی اس لیے نہیں کر سکا کہ میرے باپ نے میرے مال وزر پر قبضہ کر لیا تھا اور جس لڑکی سے میں شادی کرنا چاہتا تھا، اس کا باپ مال وزر کا لالچی تھا اور وہ اس شرط پر شادی کرنا چاہتا تھا کہ میں اپنا مال وزر باپ سے لے کر اس کی لڑکی کے حوالے کر دوں۔“

بکیر نے تسلی دی۔ ”تو فکر نہ کر اور میرے ساتھ رہ۔ میں تجھ کو مالا مال کر کے واپس کروں گا۔ تو لڑکی کے باپ کو مطلع کر دے کہ وہ تیرا انتظار کرے۔ بس زیادہ نہیں ایک سال کے اندر تو اتنا مالدار ہو جائے گا کہ لڑکی کے باپ کے منہ میں پانی آجائے گا۔“

ہارون نے کہا۔ ”امیر مشکل تو یہ ہے کہ وہ دونوں دمشق سے کہیں اور چلے گئے ہیں۔ اگر میں کسی طرح بصرہ پہنچ جاؤں تو اس کے باپ کا پتا چلا لوں گا۔ اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔“ ایک بار پھر سرد آہ بھری بولا۔ ”امیر! میں

اس لڑکی کو بہت چاہتا ہوں۔ اس لڑکی کا نام منیزہ ہے۔ اگر میں اسے حاصل نہ کرسکا تو پھر معلوم نہیں میرا کیا انجام ہو۔ اس کے بعد مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔''

بکیر اس کی سرد آہوں پر ہنس پڑا، بولا۔ ''بہادر نوجوان! کسی لڑکی کے غم میں آنسو بہانا مرد پر زیب نہیں دیتا۔ تو میرے ساتھ رہ اور بخارا چل۔ وہاں جتنی لڑکیاں ملیں گی میں ان میں سے کسی منتخب لڑکی کو تیرے حوالے کردوں گا۔ تو خود کو کسی خاص لڑکی کا پابند نہ کر ورنہ زندگی بھر پچھتائے گا اور پریشان رہے گا۔''

ہارون کے دل نے وقتی طور پر بکیر کے قول کی تائید کی مگر لمحہ بھر میں ہی منیزہ کی محبت اس قول پر غالب آگئی اور اس نے صاف صاف اعلان کردیا۔ ''امیر! اگر منیزہ نہیں تو پھر کوئی لڑکی نہیں۔''

بکیر نے کہا۔ ''ہارون! کسی بھی امیر کو اپنے ماتحتوں اور زیردستوں کے ذاتی معاملات میں نہ تو دلچسپی لینا چاہیے اور نہ دخل دینا چاہیے لیکن میں تیرے ذاتی معاملات میں دلچسپی بھی لے رہا ہوں اور دخل بھی دے رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنے آدمیوں کو خوش رکھنا چاہیے اور انہیں خوش رکھنے کے لیے مجھے ان کے ذاتی معاملوں میں دلچسپی بھی لینا پڑے گی اور دخل بھی دینا پڑے گا۔''

ہارون بکیر کی دل جوئی سے خوش بھی ہوا اور متاثر بھی اور بخارا جانے پر رضامند ہوگیا۔ دریا کو عبور کرنے کے لیے کشتیاں یکجا کی گئیں اور مزید کشتیوں کا انتظام کیا گیا۔ امیہ بن عبداللہ اپنی فوج کے ساتھ دوسری طرف اتر گیا۔ بکیر سب سے پیچھے تھا۔ دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کا منظر بڑا حسین لگ رہا تھا۔ امیہ کو اپنی افواج اور گھوڑوں کو اس پار لے جانے میں کئی دن لگے۔ دریا کے اس پار گھڑسواروں اور پیدل دستوں کی روانگی کا منظر بڑا جوش انگیز تھا۔ امیہ کی فوج کے چند سو سپاہی اس پار جانے کی باری کا انتظار کررہے تھے کہ بکیر کے بعض ساتھیوں کی نیتیں بدل گئیں۔ ایک نے کہا۔ ''بکیر! میرے دوست...... یہ بہترین موقع ہے کہ تو اپنا سابقہ وقار بحال کرلے۔''

بکیر نے پوچھا۔ ''میں تیرا مطلب نہیں سمجھا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''خراسان کی امارت تیرا انتظار کررہی ہے۔''

بکیر نے حیرت سے پوچھا۔ ''وہ کس طرح...... صاف صاف کہہ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

ساتھی نے جواب دیا۔ ''امیہ اپنی فوج کے ساتھ دریا کے اس پار بخارا کی طرف روانہ ہوچکا ہے۔ تو اس کی عدم موجودگی میں خراسان پر قبضہ کرلے۔''

بکیر اس مشورے پر پھولا نہ سمایا، آنکھوں میں خوشی اور کامرانی کی چمک پیدا ہوگئی اور بولا۔ ''پھر بھی مجھے اپنے ساتھیوں پر اعتبار نہیں۔ معلوم نہیں وہ میرا ساتھ دیں گے یا نہیں؟''

بکیر اپنے دوست کی اس شاندار تجویز سے بے حد پُرامید اور خوش تھا۔ اس نے اپنے قابلِ اعتماد دوستوں کو یکجا کیا اور ان کے سامنے یہ تجویز رکھ دی۔ دوستوں کو اس تجویز کی کامیابی میں اپنا روشن مستقبل نظر آیا۔ ایک دوست نے مشورہ دیا۔ ''تجویز بہت اچھی ہے لیکن اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ امیہ کو ہمارے ارادوں کی خبر ہوجائے اور وہ بخارا کی مہم سے فوراً ہی واپس آجائے، اس لیے اس کا تدارک پہلے کرلینا چاہیے۔''

ہارون نے کہا۔ ''اس کے لیے ہمیں ان چند سو آدمیوں کو قید کرلینا چاہیے جو ابھی دریائے آمو کو پار نہیں کرسکے ہیں کیونکہ یہی لوگ ہمارے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔''

اس آخری تجویز اور مشورے نے بکیر اور اس کے ساتھیوں کو خوشی کا وہ سرمایہ بخشا کہ سب مل کر دیر تک اس تجویز کنندہ کو داد دیتے رہے۔ بکیر نے اسی وقت اپنی سپاہ کو یکجا کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ نہایت ہوشیاری سے امیہ کے چند سو سپاہیوں کو اپنے گھیرے میں لے لیں۔ اگر وہ مقابلہ کریں تو انہیں بے دردی سے قتل کردیا جائے۔

بکیر یہ حکم دے کر اپنے محافظوں اور دوستوں کے ساتھ دریائے آمو میں تیرتی ہوئی کشتیوں پر پہنچ گیا اور انہیں نذرِ آتش کرنا شروع کردیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دریا کی سطح پر آگ کے شعلے بلند ہوگئے۔ امیہ کے ساحل پر موجود چند سو سپاہیوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ کشتیوں میں آگ کس طرح لگ گئی لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ بکیر اپنے آدمیوں کو چلا چلا کر کشتیوں کو جلا دینے کا حکم دے رہا ہے اور دوسری طرف، اپنے چاروں جانب بکیر کے سپاہیوں کو محاصرہ کرتے دیکھا تو بات کسی حد تک سمجھ میں آگئی۔ اس محاصرہ کرنے والی سپاہ میں ہارون بھی شامل تھا۔ اس نے چیخ چیخ کر امیہ کے فوجیوں کو حکم دیا کہ وہ خود کو گرفتار سمجھیں اور مقابلے کا ارادہ بھی نہ کریں ورنہ سب قتل کردیے جائیں گے۔

لیکن امیہ کے چند پرجوش سپاہیوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کردیا۔ اور اعلان کردیا۔ ''ہمیں دھوکا دیا گیا ہے، ہم اس دھوکے کا اپنی شمشیروں سے جواب دیں گے۔''

ہارون نے جواباً اعلان کیا۔ ''اگر تم لوگ ہمارا مقابلہ

کرو گے تو اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھو گے اور خواہ مخواہ مارے جاؤ گے۔ اس لیے میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس احمقانہ خیال سے باز آجاؤ۔''

لیکن امیہ کے سپاہیوں نے جنگ کا اعلان کر دیا اور تلواریں نیام سے باہر نکل گئیں اور کھٹا کھٹ اور شپا شپ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ایک طرف دریا کی سطح پر جگہ جگہ شعلے رقصاں تھے اور دوسری طرف ساحل پر کھٹا کھٹ شپا شپ، نہ سمجھ میں آنے والے نعرے، زخمیوں کی چیخیں اور للکارنے والوں کی ہمت افزائی کے کلمات سے فضا گونج رہی تھی۔

بکیر اور اس کے ساتھیوں نے ساحل پر جنگ کا منظر جو دیکھا تو بھاگ کر وہیں پہنچ گئے اور امیہ کے جنگ آزماؤں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ زخمیوں اور تیس چالیس بچ جانے والوں نے اپنے ہتھیار زمین پر گرا دیے اور امان، امان کے نعرے لگانے لگے۔

بکیر نے اعلان کیا۔ ''نہتوں کو امان دی جائے، ہتھیار برداروں کو ہلاک کر دیا جائے۔''

لیکن اب ہتھیار بردار تو کوئی تھا ہی نہیں، سبھی نہتے تھے یا زخمی۔ یہ سارا کھیل بہ مشکل ڈیڑھ دو ساعت ہوتا رہا اور جب کھیل ختم ہو گیا تو ہارون کو تیس چالیس صحیح سلامت اور تقریباً پچاس زخمی ہاتھ لگے۔ انہیں باندھ کر مرو میں داخل کر دیا گیا۔ مرو کا زنداں گویا ان کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ بکیر نے ادھر سے فرصت پاتے ہی خراسان کا قصد کیا اور مرو کا انتظام اپنے ایک ساتھی احنف بن عبداللہ کے سپرد کیا۔ قیدی ہارون کی نگرانی میں دیے گئے اور عتاب نامی نوجوان کو دریائے آمو کی نگہداشت اور مشاہدے پر تعینات کیا گیا۔ عتاب کو سختی سے حکم دیا گیا کہ جیسے ہی مقابلے کے لیے ساحل پر امیہ اپنی سپاہ کے ساتھ نمودار ہو، اس کو مطلع کر دیا جائے۔

بکیر خراسان چلا گیا تاکہ وہ خراسان سے امیہ کے نائب کو بے دخل کر کے خود حاکم بن جائے۔

☆☆☆

ہارون اس فکر میں تھا کہ گرفتار ہونے والوں کی وفاداریاں بکیر کی طرف کر دے۔ وہ ان سے اچھی طرح پیش آیا اور بڑی دل جوئیاں کیں۔ انہیں ترغیب و تحریص بھی دی اور بڑے سبز باغ دکھائے۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ اکثریت ہارون کی باتوں میں آ گئی۔ ابھی وہ زخمیوں کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا حالانکہ زخمیوں کے علاج معالجے پر جراح اور طبیب متعین کر دیے گئے تھے۔

جب وہ اچھے بھلوں کو بکیر کی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ زخمیوں میں پہنچ گیا۔ انہیں مرو کے قلعے کے ایک کشادہ دالان میں رکھا گیا تھا اور ان میں ذرا ذرا فاصلہ بھی قائم کیا گیا تھا۔ ہارون جس زخمی کے پاس بھی گیا، اس سے بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا اور ان کی مزاج پرسی کے بعد صحت اور تندرستی کا یقین دلایا۔ وہ عموماً ہر ایک سے یہی کہتا۔ ''دوستو! اس وقت تم سب پل صراط پر کھڑے ہو۔ اس پل صراط سے گزرنا ہے تو زمانے کی ہوا کا رخ دیکھو جو سراسر بکیر کے حق میں ہے۔ امیہ بن عبداللہ بخارا کی گرد و غبار میں گم ہو گیا جواب کبھی بھی واپس نہ آئے گا۔ مجھے تو یہ صاف نظر آرہا ہے کہ دمشق سے عبدالملک بن مروان کا پروانۂ ولایت بنام بکیر بہت جلد موصول ہونے والا ہے۔ خراسان کا حقیقی عامل بکیر ہے اور وہی رہے گا۔ تم لوگ اس کی مخالفت مت مول لو۔ بکیر کا دامن تھام لو، پل صراط سے بخیر و خوبی پار اتر جاؤ گے۔ اگر اب بھی ہوائے حماقت اور خوش فہمی سر میں سمائی رہی تو پھر تمہارا خدا حافظ، بہت جلد جہنم کو سدھار جاؤ گے۔''

اس تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ہر زخمی پہلے تو اسے دیکھ کر نفرت اور بے زاری سے منہ بناتا لیکن تقریر سننے کے بعد اس کا قائل اور مداح ہو جاتا۔ وہ ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے زخمی کے پاس جاتا اور باتیں بناتا رہا۔ کامیابی نے اس کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔

لیکن جب وہ پندرھویں زخمی کے پاس پہنچا تو زخمی نے دوسری طرف کروٹ لے لی اور اس نے ہارون کی شکل تک دیکھنے سے انکار کر دیا۔ ہاتھ کے اشارے سے ہارون کو حکم دیا۔ ''واپس چلا جا، میرے پاس مت آ۔''

ہارون زخمی کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ زخمی نے اپنے چہرے کو چادر سے چھپا لیا اور بھاری آواز میں حکم دیا۔ ''اے شخص تو یہاں سے چلا جا، میں تیری باتیں نہیں سننا چاہتا۔''

ہارون نے پوچھا۔ ''آخر کیوں تو میری باتیں نہیں سننا چاہتا؟''

زخمی نے ایک بار پھر بھاری اور رعب دار آواز میں حکم دیا۔

''تو چلا جا، ورنہ میرے غضب کا نشانہ بن جائے گا۔''

ہارون کو ہنسی آ گئی، بولا۔ ''تیرے غضب کا نشانہ بن جاؤں گا؟ خوب...... زخمی اور قیدی بھی کسی آزاد اور خود مختار شخص کو اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بنا سکتا ہے، یہ بات آج ہی معلوم ہوئی۔''

زخمی آوازیں بنا بنا کر بول رہا تھا۔ ''اے شخص! میں نمک حرام اور غدار سے بات نہیں کرتا۔ تو نے خلافتِ اسلامیہ کے نامزد عامل امیہ بن عبداللہ سے غداری کی ہے

اور اب یہیں بھی ورغلانے آگیا ہے۔ دوسرے تیری باتوں میں آتے ہیں تو آجائیں لیکن میں تیرا ہم خیال نہیں ہوسکتا۔ میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔''

ہارون آواز کو سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگا، پوچھا۔ ''کیا میں تیرا نام معلوم کرسکتا ہوں؟''

زخمی نے جواب دیا۔ ''میرا نام معلوم کرکے تو کیا کرے گا؟ میں ایک گمنام سپاہی اور امیرالمومنین عبدالملک بن مروان کا ادنیٰ پرستار ہوں۔''

ہارون نے حیرت زدہ حالت میں زخمی کی چادر اس کے منہ پر سے ہٹا دی۔ یہ منیزہ کا باپ تھا۔ ہارون نے حیرت سے بے ساختہ کہا۔ ''تم! یعنی یہ تم ہو۔''

منیزہ کا باپ شرمندہ و پشیمان مگر آنکھوں میں تنفر لیے ہوئے ہارون کو گھور رہا تھا، بولا۔ ''ہاں، یہ میں ہوں۔ افسوس کہ میں اپنی موجودگی کو تجھ سے چھپائے رکھنا چاہتا تھا لیکن جب خدا ہی کو کوئی بات منظور نہ ہو تو وہ کس طرح پوری ہوسکتی ہے؟''

ہارون اس کے پاس ہی بیٹھ گیا، پوچھا۔ ''لیکن تم یہاں کہاں؟ تم تو بصرہ گئے تھے؟''

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں خارجیوں کے مقابلے کے لیے بصرہ گیا تھا لیکن وہاں حکم ملا کہ میں امیہ بن عبداللہ کے پاس خراسان چلا جاؤں۔ میں کسی ایسے محاذ پر نہیں جانا چاہتا تھا جہاں تو بھی موجود ہو۔ چنانچہ میں نے بڑی کوشش کی کہ خراسان نہ بھیجا جاؤں لیکن خراسان آگیا۔ یہاں مجھے تیری بابت یہ اطلاع ملی کہ تو امیہ بن عبداللہ کے حریف بکیر کا طرف دار ہوگیا ہے اور مرو پہنچ کر اس کے دامن میں پناہ لی ہے۔ مجھ کو تیری غداری پسند نہیں آئی لیکن پھر جب امیہ، بکیر میں صلح صفائی ہوگئی تو میں یہ سوچ کر ایک بار پھر پریشان ہوگیا کہ کسی نہ کسی دن میرا تجھ سے سامنا ضرور ہوجائے گا۔ لیکن جب مجھ کو یہ دوسری خبر ملی کہ امیہ اور بکیر بخارا، جہاد پر جارہے ہیں تو میں بہت خوش ہوا اور کسی حد تک یہ یقین آگیا کہ میں خود کو تجھ سے محفوظ اور روپوش رکھ سکوں گا چنانچہ بخارا کے جہادی لشکر میں، میں بھی شامل ہوگیا مگر بدقسمتی کہ میں جس دستے میں شامل تھا، وہ امیہ تک نہیں پہنچ سکا اور میرے ساتھی جنگ کرتے ہوئے زخمی بھی ہوگئے اور آج تیرے قیدیوں میں پڑے تیرے رحم و کرم کی امیدوں پر زندہ ہیں۔''

ہارون نے کہا۔ ''یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تم سے ملاقات ہوگئی۔'' پھر نظریں جھکا کر کہا۔ ''ورنہ میں تمہاری خاطر بصرہ چلا جاتا۔''

منیزہ کے باپ نے پوچھا۔ ''اب تیرا کیا ارادہ ہے؟''

ہارون نے بھی سوال کردیا۔ ''کیسا ارادہ؟''

منیزہ کے باپ نے کہا۔ ''یہ جو کچھ تو یا تیرے ساتھی بکیر کے ساتھ مل کر کررہے ہیں کیا تو یا بکیر یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح تم دونوں عبدالملک کو مرعوب کرلو گے؟ ہارون! ایسا نہیں ہوگا۔ تم میری باتیں اپنے حافظے میں محفوظ کرلو۔ خلافتِ اسلامیہ اپنے غدار اور مخالف کو کبھی برداشت نہیں کرے گی۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''جناب! میں غدار اور وفادار کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا، فی الحال تو یہ بتاؤ کہ میں تمہارے کیا کام آسکتا ہوں؟ اور میرا مشورہ مانو تو یہ باتیں جو تم نے مجھ سے کی ہیں بکیر یا اس کے کسی اور ساتھی سے ہرگز نہ کرنا۔''

منیزہ کے باپ نے منہ پھیر کر کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کرکے پڑا رہا۔ ہارون بھی نہیں رکا اور وہاں سے چلا آیا لیکن اس دن وہ بے حد بے چین رہا۔

منیزہ کے باپ کا داہنا شانہ زخمی ہوا تھا۔ اب ہارون کی توجہ سے اس کا خصوصی علاج ہورہا تھا۔ وہ دن میں کئی کئی بار منیزہ کے باپ کے پاس جاتا اور مزاج پرسی کرتا۔ منیزہ کا باپ ہارون سے کھنچا کھنچا رہتا، باتیں اکھڑی اکھڑی کرتا لیکن ہارون اس کے کسی بھی ناگوار رویّے کا برا نہ مانتا۔ وہ بار بار یہی کہتا رہا کہ یہ ماحول ایسا نہیں ہے جس میں کوئی شخص امیہ بن عبداللہ کی مدح و ثنا اور بکیر کی مذمت کرے۔ چند دن تو منیزہ کا باپ شعلہ جوالا بنا رہا لیکن پھر جوش میں کمی آگئی اور نظروں کا تنفر بھی جاتا رہا۔ ہارون کا نرم اور مخلصانہ رویّہ اپنا اثر دکھانے لگا۔ ہارون اس کے پاس آکر بیٹھ جاتا تو گاہے بگاہے منیزہ کا باپ کن انکھیوں سے اسے دیکھ لیتا۔

دوسرے زخمیوں کی حالت بہتر ہورہی تھی اور تقریباً سارے ہی صحت یاب ہونے سے پہلے پہلے بکیر کے ساتھی اور طرف دار ... بن چکے تھے اور انہوں نے یہ وعدہ کرلیا تھا کہ آئندہ جنگ میں وہ بکیر کی طرف سے امیہ بن عبداللہ سے جنگ کریں گے۔ دس دن کے اندر سبھی صحت یاب ہوچکے تھے مگر منیزہ کا باپ بدستور بستر پر پڑا رہا۔ اس کا زخمی شانہ اب بھی اسے اذیت پہنچا رہا تھا۔ زخم میں پیپ پڑ گئی تھی۔

ہارون منیزہ کے باپ کی طرف سے خاصا پریشان تھا۔ اس نے جراح کو الگ لے جاکر پوچھا۔ ''کیا بات ہے، یہ زخمی اچھا کیوں نہیں ہوتا؟''

جراح نے جواب دیا۔ ''جنابِ والا! اس کا شانہ کٹے گا۔ سیدھا ہاتھ کٹ جائے گا۔''

ہارون نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا یہ اچھا نہیں ہوسکتا؟''

جراح نے جواب دیا۔ ''نہیں۔ ہاں اگر ایک ہاتھ کٹ جائے تو شاید یہ شخص زندہ رہ جائے ورنہ اس کی زندگی خطرے میں ہے اور یہ یوں ہی باتیں کرتے کرتے کسی بھی وقت مرجائے گا۔''

منیزہ کے باپ نے کہا۔ ''تم دونوں کیا باتیں کررہے ہو، کچھ میں بھی تو سنوں؟''

جراح نے ہارون سے دبی آواز میں کہا۔ ''جس خطرے کا میں نے ذکر کیا ہے، اس کا اظہار زخمی کے روبرو نہ کردینا، ورنہ یہ قبل از وقت ہی مرجائے گا۔''

منیزہ کے باپ نے ایک بار پھر چیخ کر پوچھا۔ ''تم دونوں کس قسم کی باتیں کررہے ہو، مجھے بھی تو بتاؤ؟''

ہارون نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ ''جراح کہتا ہے کہ زخم اتنا کاری تو نہیں تھا کہ تم اتنے دنوں تک صاحبِ فراش رہتے۔ بہرحال اللہ نے چاہا تو جلد ہی اچھے ہوجاؤ گے۔''

منیزہ کے باپ نے کہا۔ ''اتفاق کی بات ہے کہ میں نے تم دونوں کی باتیں سن لی ہیں لیکن میں ابھی مرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔''

ہارون نے تسلی دی۔ ''خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔''

نازک حالت کو دیکھتے ہوئے ہارون کو رات منیزہ کے باپ کے پاس ہی گزارنا پڑی۔ وہ منیزہ کے باپ کے قریب ہی تخت لگا کر بیٹھ گیا۔ اب وہ اپنا بیشتر وقت منیزہ کے باپ ہی کے پاس گزار رہا تھا۔ بکیر حیران تھا کہ اس زخمی میں آخر وہ کون سی خوبی پائی جاتی ہے جس نے ہارون کے دل کو مسخر کرلیا ہے۔ جس رات ہارون منیزہ کے باپ کے پاس رہنے جارہا تھا، بکیر نے اسے روک لیا، پوچھا۔ ''ہارون! تو کہاں جارہا ہے؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''جنابِ والا! اس کی حالت بہت نازک ہے۔ اس لیے آج کی رات میں اس کے پاس ہی گزاروں گا۔''

بکیر نے پوچھا۔ ''وہ رشتے میں تیرا کیا لگتا ہے؟''

ہارون نے دانت چبا کر جواب دیا۔ ''اس نے مجھ پر کئی احسان کیے ہیں، انہی احسانوں کی وجہ سے میں اس کی خدمت پر مجبور ہوگیا ہوں۔''

بکیر نے ہنس کر کہا۔ ''تو اس کی خدمت کرتا رہ مگر نہایت ہوشیاری سے، کیونکہ جہاں تک میں جانتا ہوں تیرا محسن اب بھی میرا سخت مخالف اور امیہ کا طرف دار ہے۔''

پھر ہارون کئی راتیں منیزہ کے باپ کے پاس ہی رہا۔ ان راتوں میں منیزہ کے باپ کی حالت کئی بار اتنی نازک ہوئی کہ زندگی کی امید ہی جاتی رہی لیکن وہ پھر بچ گیا اور جراح اور ہارون کو حیرت زدہ کردیا۔ منیزہ کے باپ پر بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ ہارون دعائیں مانگ رہا تھا کہ خدا منیزہ کے باپ کو اس حد تک صحت یاب کردے کہ وہ اس سے منیزہ کی بابت کچھ دریافت کرلے۔ اس کا یہ خیال بھی تھا کہ وہ منیزہ کے باپ کے ساتھ جو کچھ کررہا ہے، اس کا اس پر اچھا اثر پڑے گا اور عین ممکن ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو اس سے وابستہ کرنے پر آمادہ ہوجائے لیکن جب دعائیں نامقبول اور امیدیں ختم ہونے لگیں تو ہارون کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے اپنے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا تھا۔ اسے دنیا کی ہر شے بےکار اور فضول محسوس ہورہی تھی۔ اس بیزاری، اکتاہٹ اور مایوسی میں اسے اچانک عامر یاد آگیا۔ عامر نے بیزاری، اکتاہٹ اور مایوسی کو کسی حد تک کم کردیا اور جینے کی خواہش کروٹیں لینے لگی۔

وہ منیزہ کے باپ کے پاس مسلسل کئی راتیں جاگ کر نڈھال ہوچکا تھا۔ وہ جاگنے کی کوشش کرتا مگر نیند کے جھونکے اسے معمولی تنکے کی طرح گرائے دے رہے تھے۔ اس کی آنکھیں خودبخود بند ہوجاتیں اور وہ پوری قوتِ ارادی سے کام لے کر آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا اور خود کو بیدار ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ کسی کسی لمحے وہ بیٹھے بیٹھے گرجاتا مگر پھر سنبھل جاتا۔ منیزہ کا باپ کمزوری اور مرض کی شدت میں بھی جب بھی اپنے ہوش وحواس میں ہوتا، ہارون کی حالت پر غور کرنے لگتا۔ وہ اس خدمت گزار نوجوان کا اپنے دل کی گہرائیوں سے معترف اور معتقد ہوچکا تھا۔ اب سے پہلے کبھی ہارون کے کردار کا یہ رخ سامنے نہیں آیا تھا۔

شاید پانچویں رات کی بات ہے کہ منیزہ کے باپ کی حالت نسبتاً بہتر تھی اور وہ رک رک کر اٹک اٹک کر باتیں کرنے کے لائق ہوگیا تھا لیکن نقاہت نے اسے مجبور کردیا تھا۔ وہ اپنا بیشتر وقت اس طرح گزارنے لگا کہ دونوں آنکھیں بند رہتیں اور وہ خیالوں میں ماضی کی سیر کرتا رہتا لیکن جب آنکھ کھولتا تو اپنے سامنے ہارون کو بیٹھا ہوا دیکھتا۔

ہارون دیوار سے ٹیک لگا کر سوگیا اور خراٹے لینے لگا۔ رات کے سناٹے میں خراٹوں کے شور نے ماحول کو خاصا ڈراؤنا اور پراسرار کردیا تھا۔ منیزہ کا باپ بےچینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ اگر اس میں اٹھنے اور چل پھر سکنے کی

طاقت ہوتی تو وہ ہارون کو اٹھا کر باہر پھینک دیتا لیکن کمزوری کی مجبوری نے اسے بے بس کر رکھا تھا.... جب زیادہ پریشان ہوا تو اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش بھی.... بے کار گئی۔ آخر اس نے اپنا تکیہ اٹھایا اور ہارون کی طرف اچھال دیا۔ تکیہ ہارون کے شانے سے ٹکرا کر گر گیا۔ منیزہ کا باپ ہارون پر نظریں جما کر بیٹھ گیا۔ ہارون کی نظریں کچھ کچھ کام کرنے لگیں تو اس کی پہلی مگر گہری نظر منیزہ کے باپ ہی پر پڑی۔ منیزہ کا باپ اس کو دیکھ کر مسکرایا۔ ہارون نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہوں، بس کمزوری تنگ کر رہی ہے۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''اللہ نے چاہا تو یہ کمزوری بھی جاتی رہے گی۔''

منیزہ کے باپ نے کھوکھلا قہقہہ لگانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا، بولا۔ ''ہارون ذرا میرے قریب آ۔ مجھے تجھ سے چند باتیں کرنا ہیں۔''

ہارون بے چون وچرا منیزہ کے باپ کے پاس جا بیٹھا۔

منیزہ کے باپ نے ہارون کا بایاں ہاتھ، ہاتھ میں لے لیا اور اس کو آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ ''ہارون! سچ سچ بتا، یہ جراح کیا کہتا ہے میری بابت؟ میں بچ بھی جاؤں گا یا مر جاؤں گا؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''تم بچ جاؤ گے۔ جراح بھی یہی کہتا ہے۔''

منیزہ کے باپ نے بڑی اداسی سے کہا۔ ''لیکن میں اندر سے یہی محسوس کر رہا ہوں کہ میں اپنے اس زخم سے جانبر نہیں ہو سکوں گا۔ تم دونوں یعنی تم اور جراح مجھے طفل تسلیوں میں بہلانے کی کوشش کر رہے ہو لیکن میں...... میں خوب جانتا ہوں کہ میں نہیں بچوں گا۔ میں جلد یا بدیر مر جاؤں گا۔ میرا دل بڑا دکھی ہے ہارون! میں تجھے خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ تو اور جراح میری بابت جو کچھ بھی جانتے ہو وہ اسے صاف صاف میرے علم میں لے آؤ۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''میں تمہیں تاریکی میں کیوں رکھوں گا؟ میں کہتا ہوں تم بالکل محفوظ ہو اور تمہاری زندگی کو کوئی خطرہ نہیں، تم زندہ رہو گے اور ضرور رہو گے۔ مایوس نہ ہو۔''

منیزہ کے باپ نے مضمحل مگر پشیمان آواز میں کہا۔ ''ہارون! میں بہت شرمندہ ہوں۔''

''کیوں؟ کس بات سے؟''

''ہارون! مجھے اعتراف ہے کہ میں مردم شناس نہیں ہوں۔ میں نے آدمیوں کو سمجھنے میں اکثر غلطیاں کی ہیں۔''

ہارون نے تسلی دی۔ ''یہ غلطیاں ہر کوئی کرتا ہے۔ وہ بھی جس کو مردم شناسی کا دعویٰ ہوتا ہے اور وہ بھی جو سیدھا سادہ اور معصوم ہوتا ہے۔''

منیزہ کے باپ نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ کراہ کر کروٹ بدلنے سے باز رہا، بولا۔ ''ہارون! میں تجھ سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن کمزوری اور نقاہت میرا ساتھ نہیں دے رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''چند دن صبر سے کام لو۔ اللہ نے چاہا تو طاقت بھی بحال ہو جائے گی اور تم دوسروں سے جھکے بغیر باتیں بھی کر سکو گے اور اپنے پاؤں پر کھڑے بھی ہو سکو گے۔''

منیزہ کے باپ نے کہا۔ ''ہارون! کیا تو میری آواز سن رہا ہے؟''

''کیوں نہیں...... میں تمہاری آواز بہت اچھی طرح سن رہا ہوں، کیا کہنا چاہتے ہو؟''

منیزہ کے باپ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ''ہارون! میں پتا نہیں مردم شناس ہوں یا نہیں ہوں مگر یہ جانتا ہوں کہ میں نے تجھ کو سمجھنے اور پہچاننے میں ہمیشہ غلطی کی ہے۔ میں آج سے پہلے تجھ کو نہیں سمجھ سکا تھا۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''اس کمزوری اور بیماری میں ایسی باتیں نہ کرو، خوش رہنے کی کوشش کرو۔''

''افسوس کہ اگر میں خوش رہنا چاہوں تب بھی نہیں رہ سکتا۔ میں نے تجھ پر ظلم کیے ہیں۔ میں نے تجھ کو شرمندہ اور ذلیل کیا، تو اگر چاہتا تو میری ان زیادتیوں کا بہ آسانی بدلہ لے لیتا لیکن تو نے عفو و درگزر سے کام لیا۔''

ہارون نے کہا۔ ''جراح نے ہدایت کی ہے کہ میں زیادہ باتیں نہ کرنے دوں۔ خدا کے لیے خود پر اور مجھ پر رحم کیجیے اور چند دن خاموش رہیے۔''

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ''ہارون! میں اس وقت بولتے رہنے پر مجبور ہوں۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ ابھی میں چند سال اور زندہ رہوں گا تو میں خاموش ہو جاتا اور یہ باتیں جو اس وقت کر رہا ہوں، کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتا لیکن میں تیری اور تیرے جراح کی طفل تسلیوں کے باوجود یہ سمجھتا ہوں کہ میں زیادہ دن جیوں گا نہیں۔ کسی بھی لمحے مر سکتا ہوں۔ اس لیے مرنے سے پہلے اپنے دل کا بوجھ اتار دینا چاہتا ہوں۔''

ہارون نے کہا۔ ''اچھا تو میری یہ درخواست قبول کیجیے کہ آپ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں، اسے مختصراً کہہ ڈالیے، لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت نہیں ہے۔''

منیزہ کے باپ نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں، بولا۔ ''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تجھے منیزہ سے بے پناہ محبت ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو اپنے باپ کا بے حد ادب کرتا ہے اور اسی ادب اور احترام نے اس وقت تیری زبان کو تالا لگا دیا تھا جب وہ تیرے سارے مال وزر کو اپنے قبضے میں کر کے تجھ پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ تو منیزہ سے شادی نہ کرے۔ اس وقت میں غلطی سے یہی سمجھے ہوئے تھا کہ شاید تو غیر معمولی چالاک نوجوان ہے اور ہم دونوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اب یہاں مرو میں یہ بھید کھلا کہ تو انتہائی رحم دل اور شریف نوجوان ہے۔ میں نے تجھے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ میں اپنے سابقہ طرزِ عمل پر نادم ہوں۔''

ہارون نے پوچھا۔ ''اس سے حاصل؟ اس ندامت سے مجھے کیا فائدہ؟''

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، اس کا حاصل بھی ہے اور اس کا فائدہ بھی۔ میں اپنے سابقہ طرزِ عمل کی یوں تلافی کرنا چاہتا ہوں کہ منیزہ کو تیرے حوالے کر دوں لیکن افسوس کہ وہ یہاں سے بہت دور حمص میں ہے۔ میں وہاں تک کس طرح پہنچوں؟ ہائے رے مجبوری، میں کیا کروں؟''

ہارون نے کہا۔ ''جناب! میں ایک بار پھر آپ سے درخواست کروں گا کہ فی الحال ان باتوں کو اپنے دل و دماغ سے نکال دیجیے اور وقت کا انتظار کیجیے۔''

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ''میں کسی چیز کا انتظار نہیں کروں گا۔ قلم دوات اور کاغذ لے آ تاکہ میں اپنی آخری وصیت تحریر کر دوں۔ میں منیزہ کو تیرے حوالے کر دینا چاہتا ہوں۔''

ہارون کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس حیرت انگیز اعلان کا پہلے کبھی وہ خیال تک اپنے دل میں نہیں لا سکتا تھا لیکن اب جو کچھ بھی ہو رہا تھا واقعی وہ ناقابلِ یقین تھا۔

ہارون باہر چلا گیا اور کافی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں قلم دوات اور کاغذ کے علاوہ بھی کئی چیزیں تھیں۔ منیزہ کے باپ نے ہارون سے پوچھا۔ ''کیا میں بولنا شروع کروں؟ تو لکھنے کے لیے تیار ہے؟''

ہارون نے کہا۔ ''بخدا میں نے آپ کی خواہش پوری کر دی لیکن میں کوئی ایسی تحریر اپنے ہاتھ سے نہیں لکھوں گا جس کا تعلق منیزہ اور خود مجھ سے ہو..... کیونکہ جب میں یہ کاغذ دوسروں کے سامنے رکھوں گا تو لوگ مجھے [illegible] اور موقع پرست کہنا شروع کر دیں گے اور اس تحریر کو [illegible] قرار دیں گے۔''

منیزہ کے باپ نے برا سا منہ بنایا۔ ''یہ سب [illegible] سوچ، لوگ کیا کہیں گے اور کیا نہیں کہیں گے۔ یہ [illegible] ہیں ان سے نجات حاصل کر۔''

ہارون نے اس کے سامنے کچھ پھل رکھ دیے اور بولا۔ ''انہیں کھائیے اور اپنی وصیت کسی اور سے لکھوائیے۔''

منیزہ کے باپ نے تلخی سے کہا۔ ''وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا اور نہ کسی کی خاطر ٹھہرتا ہے۔ اگر تو نے یہ موقع کھو دیا تو منیزہ کے لیے زندگی بھر تڑپتا رہے گا کیونکہ میں مر جاؤں گا اور تو منیزہ کو حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''اس وقت میری سب سے بڑی یہ خواہش ہے کہ آپ صحت یاب ہو جائیں کیونکہ صحت یابی کے بعد میں آپ سے کوئی بھی چیز حاصل کر سکتا ہوں۔ اس علالت میں، میں اگر مانگوں گا اور لینے کی کوشش کروں گا تو یہ بڑی انسانیت سوز حرکت ہوگی، اس لیے میں اپنے اس مطالبے سے دستبردار ہوتا ہوں۔''

منیزہ کے باپ نے کہا۔ ''اچھا، کاغذ اور قلم دوات میرے حوالے کر، میں خود لکھنے کی کوشش کروں گا۔''

ہارون نے تینوں چیزیں اس کے حوالے کر دیں اور خود سامنے سے ہٹ گیا۔ منیزہ کے باپ نے صاف صاف لکھ دیا۔

''میں ربیع بن باہان، منیزہ کا باپ۔ یہ چند سطریں وصیت کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ اگر میں زندہ رہا تو منیزہ کی شادی میں خود اپنی مرضی سے کروں گا لیکن اگر میں مر گیا تو منیزہ کی شادی ہارون سے کی جائے گی۔ ہارون ایک بچے عامر کا باپ ہے اور میری بیٹی منیزہ اس سے اچھی طرح واقف ہے۔

''ہارون نے میرے زخمی ہونے کے بعد جتنی خدمت کی ہے، اس سے اس کی شرافت اور نیک نفسی مجھ پر پوری طرح عیاں ہو گئی اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ منیزہ کو اس سے بہتر نوجوان نہیں مل سکتا۔ یہ چند سطریں میں کسی جبر کے بغیر، بہ رضا و رغبت لکھ رہا ہوں اور میرے خاندان کے کسی بھی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ میری وصیت کے خلاف کوئی قدم اٹھائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو قیامت کے دن میرا ہاتھ ہوگا اور اس کا گریبان۔''

منیزہ کے باپ نے یہ تحریر ہارون کے حوالے کر دی

اور کہا۔ "ہارون! میں تجھ سے بے حد خوش ہوں۔ تو بھی خوش ہو جا کہ میں تجھ سے راضی ہو گیا۔"

ہارون نے یہ تحریر رکھ لی۔

دوسری طرف بکیر نے مرو اور خراسان سے امیہ کے قائم مقام کے عہدے سے بیٹے کو بے دخل کر دیا اور خود اقتدار سنبھال لیا۔ یہ خبریں امیہ تک بخارا میں پہنچ گئیں۔ اس نے جنگ کو طول دیے بغیر خراج لے کر صلح کر لی اور تیزی سے واپس ہوا۔ دریائے آمو کے ساحل کی کشتیاں پہلے ہی جلائی جا چکی تھیں۔ امیہ نے دوسری کشتیاں فراہم کرنے کا حکم دیا۔ اس کے آدمی دور و نزدیک پھیل گئے اور کشتیوں کا انتظام کرنے لگے۔ بکیر، امیہ کی آمد کی خبر سن کر مرو سے آگے بڑھا اور آمو کے ساحل پر اسے روک دینے کی کوشش کی۔

امیہ اپنی فوج کے ساتھ بخیر و خوبی پار اتر آیا۔ بکیر نے پیچھے ہٹ کر صف بندی کی اور جھڑپوں کا آغاز ہو گیا۔ امیہ کے کئی سردار فوجیں لے لے کر آگے بڑھے اور شکست کھا کر واپس چلے گئے۔ ان میں سے کئی سردار بکیر کے ہاتھوں گرفتار بھی ہوئے لیکن انہیں اس لیے چھوڑ دیا گیا کہ بکیر ان کا کسی نہ کسی طرح احسان مند رہ چکا تھا۔

سرداروں کی ناکامی اور پسپائی نے امیہ کو غضب ناک کر دیا اور وہ خود آگے بڑھا اور بکیر پر حملہ کر دیا۔ دونوں میں خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔ اس میں بکیر کمزور پڑا اور امیہ پیش قدمی کرتا ہوا آگے بڑھا۔ بکیر نے نہایت ہی ہوشیاری سے اپنی فوج کو پیچھے ہٹایا اور مرو کی فصیلوں کے نیچے لے آیا۔

امیہ کے سرداروں کے حوصلے بلند ہو چکے تھے۔ حریث بن قطبہ نامی سردار نے پیچھے ہٹتے ہوئے بکیر پر اتنی قوت سے حملہ کیا کہ تلوار سر میں پیوست ہو گئی اور بکیر زمین پر گر گیا۔ ہارون نے آگے بڑھ کر حریف بن قطبہ پر حملہ کر دیا اور پے در پے تلوار کے واروں سے اسے پیچھے ہٹا دیا۔ اتنی دیر میں بکیر کے چند سردار بھی قریب پہنچ گئے۔ بکیر اب بھی اپنے ہوش و حواس میں تھا، بولا۔ "ہارون! سرداروں سے کہہ کہ یہ سب کسی طرح فوج کے ساتھ مرو میں داخل ہو جائیں اور قلعہ بند ہو کر امیہ کا مقابلہ کریں کیونکہ اس طرح تو مقابلہ ہو سکتا ہے ورنہ موجودہ حالت میں ہماری شکست یقینی ہے۔"

بکیر کے سرداروں نے اس حکم پر بڑی بہادری اور ہوشیاری سے عمل کیا اور ہارون نے بکیر کو گھوڑے پر ڈال کر مرو کے اندر پہنچ کر دم لیا۔ اس کو محل میں پہنچا دیا گیا اور جراحوں کی ایک جماعت نے اس کا علاج شروع کر دیا۔ بکیر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کی فوج آہستہ آہستہ مرو میں داخل ہو گئی اور قلعے کے در بند کر دیے گئے۔ فوج فصیلوں پر چڑھ گئی اور اوپر سے امیہ اور اس کی فوج کا مذاق اڑانے لگی۔

امیہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ بہ آوازِ بلند اعلان کر دے کہ اگر مرو کے قلعہ بندوں نے اپنی گستاخیاں جاری رکھیں تو امیہ بھی ان کے خلاف سخت قدم اٹھائے گا۔

دوسری طرف سے قلعہ والوں نے یہ جواب دیا کہ اگر ان پر ایک تیر بھی چلایا گیا تو وہ قلعے میں موجود امیہ کے عزیزوں اور رشتے داروں کو ذبح کر ڈالیں گے۔ اس دھمکی نے یہ اثر دکھایا کہ امیہ کے کسی ساتھی میں ہمت نہیں پڑی کہ وہ فصیل پر کھڑے ہوئے بکیر کے حامیوں کو کوئی سزا دے سکے۔

ہارون، بکیر کی تیمارداری میں لگ چکا تھا اور اب اسے یہ بھی نہیں یاد رہا کہ منیزہ کا باپ بھی اس کا مہمان تھا اور کچھ دنوں سے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کا حشر کیا ہوا؟

بکیر بستر علالت پر دراز جنگ کو جاری رکھنے کے خلاف تھا اور اس کوشش میں تھا کہ یہ جنگ کسی طرح صلح میں بدل جائے لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بکیر نے ہارون کو فکر مند دیکھ کر پوچھا۔ "تو کیا سوچنے لگا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "جناب والا! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ زخمی ہو چکے ہیں۔ ہماری فوج بے سردار کے جنگ کر رہی ہے، اس کا انجام کیا ہوگا؟"

بکیر نے دلاسا دیا۔ "اس کا انجام وہی ہوگا جو میں چاہتا ہوں یعنی صلح، معاہدہ، مفاہمت۔"

ہارون نے مایوسی سے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ اب یہ ناممکن ہے۔"

بکیر نے جواب دیا۔ "ناممکن کوئی چیز نہیں۔ صلح اور مفاہمت میں چاہتا ہوں اس لیے ضرور ہوگی لیکن اگر امیہ صلح چاہتا تو میں اس پر ہرگز تیار نہ ہوتا۔"

ہارون نے کہا۔ "امیہ کا پلہ بھاری ہے اس لیے شاید وہ صلح نہیں کرے گا۔"

بکیر نے جواب دیا۔ "پلہ اب بھی میرا ہی بھاری ہے اس لیے صلح بھی میری مرضی سے ہوگی۔"

ہارون نے چڑ کر کہا۔ "اگر پلہ اب بھی ہمارا ہی بھاری ہے تو ہمیں صلح سے گریز کرنا چاہیے۔"

بکیر نے جواب دیا۔ "میں اس لیے صلح کرنا چاہتا ہوں کہ اب آہستہ آہستہ حالات امیہ کے موافق ہوتے چلے جائیں گے۔ ہمارے قلعہ بند ہو جانے کے بعد میرے ساتھی

آہستہ آہستہ بدلنے لگیں گے۔ اور اس طرح مرو اجڑنے لگے گا اور امیہ کی لشکر گاہ آباد ہونے لگے گی۔ چنانچہ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ایسا وقت آنے ہی نہ دیا جائے اور کوئی ایسی چال چل دی جائے کہ ہمارے سپاہی ایسا کر ہی نہ سکیں۔''

ہارون کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا، بولا۔ ''میں اتفاق کرتا ہوں، امیر کا خیال درست ہے۔''

بکیر نے پوچھا۔ ''تو اتنی جلدی میرا ہم خیال کیوں ہو گیا؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''وہ سارے زخمی جو ابھی تک میری قید میں تھے اور انہوں نے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ آپ کا ساتھ دیں گے، ہماری عدم موجودگی میں امیہ کے پاس واپس جا چکے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ وہ زخمی شخص بھی چلا گیا جس کی میں نے تیمارداری کی تھی۔ وہ بھی کچھ بتائے بغیر چلا گیا۔''

بکیر ہنس دیا۔ ''ہارون! وفاداریاں اس طرح نہیں خریدی جاتیں۔ انہوں نے حالات سے عارضی مفاہمت کر لی تھی اور جب وہ حالات ختم ہو گئے تو انہوں نے بھی اپنا عہد توڑ دیا۔''

ہارون نے دل میں سوچا۔ 'تو کیا وہ تحریر جو منیزہ کی بابت اس کے باپ نے لکھ کر دے رکھی ہے، فضول اور عارضی تھی؟' وہ اس کے جواب کے لیے دیر تک سرگرداں رہا لیکن کوئی واضح جواب نہ پا سکا۔

بکیر کے سپاہی زرق برق لباس میں قلعے سے باہر نکلے اور انہوں نے امیہ پر حملہ کر دیا۔ زخمی بکیر ان کی راہنمائی کر رہا تھا اور ان کی ہمتیں بڑھا رہا تھا۔ دوسری طرف امیہ بھی سب سے آگے بڑھ کر انعام واکرام کا لالچ دے کر فوج کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ میں ہر اس شخص کو انعام واکرام سے نوازوں گا جو اس معرکے میں ذرا سا بھی کارنامہ انجام دے گا۔

بکیر نے اعلان کرا دیا۔ ''میں ہر اس شخص کو منہ مانگا انعام دوں گا جو امیہ کا سر میرے پاس لے آئے گا۔ یہاں تک کہ اگر ایسا شخص امیہ کی اپنی فوج کا بھی ہو گا تو وہ بھی مجھ سے اپنا منہ مانگا انعام حاصل کرے گا۔''

امیہ نے یہ اعلان سنا تو ہوش بھی جاتے رہے۔ وہ میدانِ جنگ سے نکل گیا اور اپنے محافظوں کے بیچ میں جا بیٹھا۔ جنگ زوروں سے جاری تھی اور کچھ پتا نہ تھا کہ کون جیتے گا اور کون ہارے گا کہ چند سپاہی بھاگتے ہوئے آئے اور امیہ کو خبردار کیا۔ ''امیر! ہوشیار! چند لالچی سردار طالع آزمائی کے خیال سے آپ کی طرف آ رہے ہیں، ان کے ارادے اچھے نہیں۔''

امیہ نے وہ جگہ چھوڑ دی اور ایسی جگہ چلا گیا جو میدانِ جنگ سے الگ اور محفوظ تھی لیکن امیہ کانپ گیا تھا اور وہ اپنے آدمیوں پر بھی بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بکیر کو صلح کا پیغام بھیجا۔ بکیر تو اس کا منتظر ہی تھا، جواب میں کہلا دیا کہ صلح ہو گی تو میری اپنی شرائط پر۔

امیہ نے جواب دیا۔ ''تیری ہی شرائط پر صلح ہو گی۔''

بکیر نے کہلایا۔ ''تب پھر آؤ ہم دونوں اپنے اپنے آدمیوں کے ساتھ آمنے سامنے بیٹھ جائیں اور صلح کی شرائط پر باتیں کر لیں۔''

امیہ کو مکاری یا دغابازی نہیں آتی تھی، وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ آگے بڑھا اور دوسری طرف سے بکیر اپنے ساتھیوں کو لے کر آ گیا۔ ان میں ہارون بھی شامل تھا۔ امیہ نے ہارون کو دیکھا تو طنزاً پوچھا۔ ''تجھ کو بکیر کے احسانات تو یاد آ گئے تھے لیکن بکیر کے پاس خلافت بنوامیہ کے احسانات بھی کبھی یاد آئے تھے یا نہیں؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''خلافت بنوامیہ کا مجھ پر کوئی احسان نہیں۔ میں نے ملازمت کی جس کی تنخواہ ادا کر دی گئی۔ اس میں کسی نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا۔ احسان تو چیز ہی اور ہوتی ہے۔''

امیہ نے ہنس کر کہا۔ ''بکیر کی طرح اس کے آدمی بھی شاطر اور حاضر جواب ہیں۔''

بکیر نے اس کے سامنے اپنی شرائط رکھیں۔

جنگ بندی کے عوض حکومت اس کو، اس کے ساتھیوں کو جو بھی رقوم طے پا جائیں گی، ادا کرے گی۔ ماضی کی تلخیاں اور غلطیاں معاف کر دی جائیں گی اور اس کا اظہار دونوں طرف سے ہو گا۔ امیہ معافی نامے کا فرمان دمشق سے خلیفہ عبدالملک بن مروان سے منگوا کر بکیر کے حوالے کر دے گا۔ بکیر یا اس کے کسی آدمی کو انتقام کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ امیہ کی صفوں میں موجود بکیر اور اس کے آدمیوں کے حاسد اور دشمن اگر ان کے خلاف شکایات کریں گے تو انہیں نہیں سنا جائے گا۔ بکیر کو اس کی مرضی کا علاقہ حکومت کرنے کے لیے عطا کیا جائے گا۔ اگر امیہ اس کی تمام شرائط مان لے گا تو بکیر بھی لڑے بھڑے بغیر مرو کے دروازے کھول دے گا اور دونوں میں حالتِ امن قائم ہو جائے گی۔

امیہ نے اس کی ساری شرطیں مان لیں اور ایک معاہدہ تیار کرا کے اس پر اپنے دستخط کر دیے۔

امیہ نے بکیر کو چار لاکھ درہم ادا کیے۔ اسی طرح بکیر

کے ساتھیوں کو بھی انعام دیے گئے۔ امیہ نے کہا۔ ''مجھے امیرالمومنین سے امان نامہ منگوانے میں کچھ وقت لگے گا۔ اس لیے کسی ضلع کی حکومت بھی اسی وقت دی جائے گی جب امان نامہ موصول ہو جائے گا۔ اس دوران تو میرے پاس ہی رہ جا۔ تیرے انعام واکرام اور اعزاز واحترام میں کوئی کمی نہ ہوگی۔''

بکیر نے امیہ کے قریب کھڑے ہوئے ایک امیر بکیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''امیہ! تو ایک شریف انسان ہے لیکن تیرے محافظ دستے کا یہ سردار بکیر میرا سب سے بڑا دشمن ہے۔ جب تک یہ تیرے پاس موجود ہے، میں خطرات میں گھرا رہوں گا۔''

امیہ نے جواب دیا۔ ''میں تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بکیر کو اپنے پاس سے دور کیے دیتا ہوں اور اس کی جگہ عطا بن ابی السائب کو اپنے محافظ دستے کا سردار مقرر کرتا ہوں۔''

بکیر نے بگڑ کر کہا۔ ''بکیر! مانا کہ تیری میری دشمنی اظہر من الشمس ہے لیکن تو نے جس طرح کا اظہار کیا ہے، اس سے ہم دونوں میں ایک قسم کا اعلانِ جنگ ہو گیا ہے۔''

لیکن امیہ نے بکیر کو ڈانٹ دیا۔ ''بکیر! صلح کو جنگ کی دھمکیوں کی نذر نہ کر۔''

اس کے بعد امیہ کی نظر اچانک بکیر کے ساتھی عتاب پر پڑ گئی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے کشتیوں کو جلا دینے کا مشورہ دیا تھا۔ امیہ نے شکایتاً کہا۔ ''او دشمنِ اتحاد و یگانگت! کیا تو ہی وہ شخص ہے جس نے بکیر کو کشتیاں جلا دینے کا مشورہ دیا تھا اور بغاوت پر اکسایا تھا؟''

عتاب نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے ہی بکیر کو بغاوت پر آمادہ کیا تھا اور کشتیاں جلوا دی تھیں۔''

امیہ نے پوچھا۔ ''تو نے ایسا کیوں کیا تھا؟''

عتاب نے جواب دیا۔ ''اس وقت میں بالکل مفلس اور نادار ہو گیا تھا اور قرض خواہ مجھے ستا رہے تھے۔ میں نے سوچا اگر بکیر کو حکومت مل گئی تو میں اس سے انعام واکرام میں اتنا ضرور حاصل کرلوں گا کہ میرا قرض اتر جائے۔''

امیہ نے کہا۔ ''افسوس تو نے اتنی ذرا سی بات کے لیے مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوا دی۔ تجھے خدا کا خوف نہ آیا؟''

عتاب نے جواب دیا۔ ''بات وہی تھی جو میں بتا چکا۔ اب میں اپنے اللہ سے معافی مانگ لوں گا۔''

امیہ نے پوچھا۔ ''تو کتنا مقروض ہے؟''

عتاب نے جواب دیا۔ ''بیس ہزار درہم۔''

امیہ نے کہا۔ ''تو اپنی حرکتوں سے باز آجا۔ تیری یہ رقم میں ادا کر دوں گا۔''

عتاب نے شرمندگی سے کہا۔ ''بہتر ہے، اب میں آپ کے حکم پر عمل کروں گا۔''

امیہ نے کہا۔ ''مگر مجھ کو امید نہیں کہ تو جو کچھ کہہ رہا ہے، اس پر واقعی عمل کرے گا۔ کیونکہ منافقوں کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، اس پر عمل نہیں کرتے۔ بولتے ہیں تو جھوٹ بولتے ہیں اور وعدے کرتے ہیں تو اس پر پورا نہیں اترتے۔''

ہارون امیہ کو اتنا زیادہ شریف نہیں سمجھتا تھا۔ بکیر اپنے امراء کے تاثرات دیکھ اور محسوس کر رہا تھا۔ اس کے سر کا زخم بھی پریشان کر رہا تھا۔ امیہ سے کہا۔ ''امیر! اس وقت تو مجھے جانے کی اجازت دی جائے سر کا زخم دکھ رہا ہے۔ میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔''

امیہ نے جانے کی اجازت دے دی۔

گھر پہنچ کر بکیر نے اپنے امراء سے پوچھا۔ ''امیہ کے رویے اور باتوں سے تم لوگوں نے کیا اندازہ لگایا؟''

ہارون نے کہا۔ ''مجھ کو تو امیہ شریف انسان لگتا ہے۔''

بکیر نے بات کاٹ کر کہا۔ ''بیشک..... وہ شریف انسان ہے لیکن اس کے محبانہ اور مخلصانہ رویوں میں یہ سیاست کارفرما ہے کہ میرے اپنے ساتھی اور امراء اس کے ہو جائیں۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''ہو سکتا ہے لیکن آپ کو اپنے زخمی سر کو فکر اور الجھن سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ وفاداریاں اتنی آسانی سے نہیں منتقل ہو جاتیں۔''

عتاب نے کہا۔ ''لیکن پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ امیہ ایک شریف والی ہے اور اب اس سے غداری نہیں کی جا سکتی۔''

بکیر نے عتاب پر نظر ڈال کر ہارون کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ ''امیہ کی سیاست کا جیتا جاگتا نمونہ حاضر ہے، دیکھ لو۔''

ہارون نے سب سے کہا۔ ''دوستو! والیوں اور حاکموں کا کوئی بھروسا نہیں، یہ اپنے اقتدار کو بچانے اور طول دینے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں، ان کے سامنے امراء اور مصاحبین کی فوج موجود رہتی ہے اس لیے اس ہجوم میں گم ہو جانا دانش مندی نہیں۔ اپنے لیے ایسے امیر کا دربار منتخب کرو جو اپنے اردگرد کم سے کم امیر رکھتا ہو کیونکہ کم امیروں میں تم اس کے سامنے رہو گے اور اپنی حیثیت کو زندہ

اور برقرار رکھ سکو گے۔"

جب سب امیر چلے گئے تو بکیر نے چار لاکھ درہم میں سے بیس ہزار ہارون کے حوالے کر دیے، بولا۔ "یہ تیری اس منطقی اور پُرزاز استدلال مختصر تقریر کا انعام ہے جو تو نے میرے امراء کے سامنے کی اور اس میں مجھ سے وفادار رہنے کی شاندار تلقین کی۔"

ہارون نے شکریے کے ساتھ رقم وصول کر لی۔

اب ہارون کو منیزہ کے باپ کی تلاش تھی لیکن اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ جب یہ بات بکیر کے ذریعے امیہ تک پہنچی تو امیہ نے حکم دیا کہ اس شخص کو تلاش کر کے اس کے روبرو پیش کیا جائے۔

چنانچہ کئی دن کی جستجو کے بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ اس شخص کی حالت نازک تھی اس لیے اس کی خواہش پر اسے حمص روانہ کر دیا گیا۔ ہارون کو بڑی مایوسی ہوئی اور بے اختیار جی چاہا کہ اے کاش وہ بھی حمص پہنچ سکتا۔

☆☆☆

بکیر کے سر کا علاج ہوتا رہا۔ ہارون اس کی تیمارداری میں لگا رہا۔ اب بکیر کے دوسرے رشتے دار بھی اس کے پاس ہی آگئے تھے۔ ایک دن ہارون نے ان سب کو یکجا کیا اور انہیں بڑی دیر تک نصیحتیں اور ہدایتیں کرتا رہا۔ اس خوشی کے موقع پر ہارون نے کہا۔ "امیر! جہاں تک میں سمجھ رہا ہوں اب جنگ کے بادل چھٹ چکے ہیں اور حالات پُرامن اور قابو میں ہیں......"

بکیر نے ہارون کی بات کا مفہوم پالیا، بولا۔ "لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم سب غافل ہو جائیں۔"

ہارون نے عرض کیا۔ "امیر! میں غفلت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ دراصل میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں لیکن زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی اور دل کو شرمندگی ہو رہی ہے۔"

بکیر نے ہمت بندھائی۔ "کیا وہ بات کسی طرح افسوسناک اور اخلاق و مروت سے گری ہوئی ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔"

بکیر نے کہا۔ "میرے بچے! پھر شرم کیوں آ رہی ہے کہتے ہوئے؟"

ہارون نے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ میری بیوی مر چکی ہے اور میرا تین چار سالہ بچہ میری بہن اور باپ کے پاس پرورش پا رہا ہے؟"

بکیر نے جواب دیا۔ "ہاں، میں ساری باتیں جانتا ہوں۔"

ہارون نے کہا۔ "اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

بکیر نے کہا۔ "ہاں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو جہاں شادی کرنا چاہتا ہے، وہاں اس لیے نہیں ہوسکی کہ تیرے باپ نے تیرے مال و زر پر قبضہ کر لیا اور تیری ہونے والی بیوی کے باپ کو اصرار ہے کہ یہ مال و زر تو اپنے باپ سے لے کر اس کی بیٹی کے حوالے کر دے۔"

ہارون نے کہا۔ "ہاں، یہ ساری باتیں تھیں لیکن اب منیزہ کے باپ نے وہ قید ہٹا دی ہے اور اس نے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ منیزہ کی شادی مجھ سے ہی کرے گا۔"

اس کے بعد اس نے منیزہ کے باپ کی تحریر بکیر کے سامنے رکھ دی۔ بکیر اسے غور سے پڑھتا رہا پھر پوچھا۔ "یہ تحریر کون دے گیا؟ یہ تحریر تو نے کس طرح حاصل کی؟"

ہارون نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا اور کہا۔ "وہ شخص جس کی میں تیمارداری کرتا رہا ہوں، منیزہ کا باپ تھا۔ میں نے اس کی تیمارداری کی اور ایسا سلوک کیا کہ اس نے اس سے متاثر ہو کر یہ تحریر دے دی۔ صلح کے بعد میں نے اس کو بہت تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ حمص جا چکا ہے۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ میں خود بھی جلد از جلد حمص پہنچ جاؤں اور اس تحریر سے فائدہ اٹھاؤں۔"

بکیر نے پوچھا۔ "کیا وہ لڑکی تیرے بیٹے سے محبت کرتی ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "بہت زیادہ...... اس نے میرے بیٹے کو اتنی زیادہ محبت دی کہ میرا بیٹا تو اس کا عاشق ہو گیا اور اس کے بغیر مرتے مرتے بچا۔"

بکیر نے کہا۔ "بہرحال جو کچھ بھی ہو لیکن ایک مشورہ میں بھی دوں گا۔"

ہارون نے کہا۔ "ارشاد، ارشاد۔ میں آپ کا مشورہ نہیں مانوں گا تو کس کا مانوں گا۔"

بکیر نے کہا۔ "ہارون! تیرا ایک بیٹا بھی ہے۔ تو اگر یہ چاہتا ہے کہ تیرے بیٹے کی پرورش اچھی طرح ہو اور اس کو اپنی نئی ماں کی محبت ہمیشہ حاصل رہے تو اس سے کوئی اولاد نہیں ہونا چاہیے۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "یہی مشورہ مجھے میری بہن کے شوہر نے بھی دیا تھا، میں اس پر ضرور عمل کروں گا۔"

بکیر نے کہا۔ "اگر تو جانا چاہتا ہے تو شوق سے جا لیکن اس وقت تک رکا رہ جب تک کہ مجھے کسی ضلع کا پروانہ حکومت نہیں مل جاتا اور دمشق سے امان نامہ نہیں موصول ہو جاتا۔"

ہارون نے کہا۔ ''بہتر ہے، میں رُک جاؤں گا۔''

بکیر نے کہا۔ ''میں تجھے مال و زر سے مالا مال کردوں گا تاکہ تیری بیوی اور اس کے باپ کو کوئی شکایت نہ رہے۔''

امیہ نے بکیر سے جو جو وعدے کیے تھے، ان کو دیانت داری سے پورا کیا۔ اس نے عبدالملک بن مروان کو امان نامے کے لیے لکھ دیا اور پُرزور سفارش کی تھی کہ بکیر کو معاف کرکے اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کو ضائع ہونے سے بچالیا جائے۔ بکیر کو چونکہ ابھی تک کسی ضلع کی حکومت نہیں دی گئی تھی اس لیے اس کی مصروفیات بہت محدود تھیں۔ گھر اور امیہ کا دربار۔ بکیر کسی سے ملنا جلنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ دوسروں سے کم سے کم ملیں کیونکہ زیادہ میل ملاقات میں یہ اندیشہ موجود تھا، کہ حاسد ان کی باتوں کو غلط رنگ دے کر مشہور کرنا شروع کردیں اور اس سے انہیں نقصان پہنچ جائے۔ ہارون کے لیے ایک ایک لمحہ گراں تھا۔

امیہ کو بکیر کی طرف سے سکون جو ملا تو اس نے اپنی توجہ نظم و نسق پر مبذول کردی۔ اس نے لوگوں سے سرکاری واجبات وصول کرنے میں سختی سے کام لیا۔ اس کا اثر یوں ظاہر ہوا کہ جن پر سرکاری عمال سختیاں کرتے، وہ امیہ کے خلاف باتیں کرنے لگتے۔ مسجدوں میں حکومت کے خلاف باتیں کی جانے لگیں۔

عشا کی نماز کے بعد شمعوں کی روشنی میں کچھ لوگ بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ ان کے پاس ہی بکیر اور ہارون نفلیں پڑھ رہے تھے۔ باتیں کرنے والے عربوں کے مشہور قبیلے بنو تمیم سے تعلق رکھتے تھے۔ بکیر ان کی باتوں سے عاجز آیا ہوا تھا۔ اس نے ہارون سے کہا۔ ''ان لوگوں سے کہو یہ مسجد ہے، یہاں اس قسم کی باتیں نہ کریں۔''

ہارون نے انہیں سمجھایا۔ ''تم لوگ خانۂ خدا کا احترام کیوں نہیں کرتے؟ یہ فضول باتیں اپنے گھروں میں جاکر کرو۔''

ایک شخص نے کہا۔ ''ہمیں باتوں سے منع کرنے والا تو کون ہوتا ہے؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''ایک بندۂ خدا۔''

کسی دوسرے شخص نے کہا۔ ''لوگو! کیا تم اس نوجوان کو نہیں جانتے؟ یہ تو بکیر کا ساتھی ہارون ہے۔''

ایک اور شخص نے کہا۔ ''یہ وہی تو ہیں جو کل تک باغی اور غدار تھے اور آج ہمیں منع کرتے ہیں کہ امیہ کے ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھائیں۔''

اب بکیر کے لیے یہ باتیں ناقابل برداشت ہوگئی تھیں۔ وہ سلام پھیر کر ان لوگوں کے پاس گیا اور کہا۔ ''لوگو! اگر تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ امیہ تم پر ظلم کررہا ہے تو اس کے روبرو مردوں کی طرح اس کا اظہار کرو۔ مجھے یہ انداز بالکل پسند نہیں۔''

بنو تمیم کے ایک شخص نے کہا۔ ''لو اور سنو۔ یہ تو ہمیں قتل ہوجانے کا مشورہ دے رہا ہے۔''

ہارون نے کہا۔ ''اگر تم لوگ خود کو حق بجانب اور سچا سمجھتے ہو تو اس سچ کے لیے اپنی جانیں خطرے میں ڈال دو، ورنہ خاموش رہو۔''

ایک شخص نے جوش و خروش سے کہا۔ ''حق بجانب یا سچا ہونا ایک طرف، اگر چند آدمی میرا ساتھ دے دیں تو میں اس سرخ قریشی امیہ کو اپنے ہاتھ سے قتل کردوں۔''

بکیر نے ہارون کا ہاتھ پکڑا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہارون! اب یہاں ایک لمحہ بھی رکنا خطرناک ہے۔ آ میرے ساتھ چل۔ اب میں یہاں ذرا بھی نہیں ٹھہروں گا۔''

ہارون بے چون و چرا اس کے ساتھ ہی کھڑا ہوگیا اور یہ دونوں اپنے گھر چلے گئے۔ گھر پہنچ کر بکیر نے ہارون کو سمجھایا۔ ''ہارون! ہم سب سخت خطروں میں گھرے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے میرے دشمنوں کا داؤ چل گیا اور میں ان کا شکار ہوچکا ہوں۔''

ہارون نے پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟''

بکیر نے جواب دیا۔ ''اس کا جواب میں کل دوں گا۔ صبح امیہ کی طرف سے طلبی کا پروانہ آنا چاہیے۔''

ہارون نے گونگوں لہجے میں کہا۔ ''شاید، بہ ظاہر تو اس کا کوئی امکان نہیں۔''

وہ دونوں اپنے اپنے بستروں میں چلے گئے۔ دونوں ہی خاصے پریشان تھے۔ بکیر کو اپنے گرد ایک بھیانک ہالہ بڑھتا ہوا نظر آرہا تھا اور ہارون اس لیے پریشان تھا کہ اگر کوئی نیا اور پیچیدہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو وہ حمص نہیں جاسکے گا اور منیزہ کا معاملہ التوا میں پڑ جائے گا۔ رات کے پچھلے پہر دونوں کی آنکھیں لگ گئیں اور ذرا سی دیر کے لیے نیندیں مار لیں۔ پھر فجر کی نماز کے لیے اٹھ گئے۔ پہلے وہ فجر کی نماز باجماعت ادا کرتے تھے لیکن اس دن ان دونوں نے فجر کی نماز گھر ہی میں پڑھ لی۔ ہارون نے اعتراض بھی کیا لیکن بکیر نے یہ کہہ کر ہارون کو چپ کردیا۔ ''بس ایک دن خاموش رہ اور دیکھ کہ کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو جی میں آئے کرتے رہنا۔''

سورج طلوع ہوا، بکیر اور ہارون تلاوت قرآن پاک

میں مشغول ہو گئے۔ اسی دوران کسی نے دروازے پر دستک دی۔ بکیر خوفزدہ ہو گیا اور اپنے خادم کو حکم دیا کہ باہر جا کر معلوم کرے کہ دستک کون اور کیوں دے رہا ہے۔

خادم باہر نکل کر جب دوبارہ اندر داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک خط تھا، بولا۔ ''دمشق سے ایک شخص یہ خط لے کر آیا ہے۔''

بکیر کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا، بولا۔ ''یہ یقیناً امان نامہ ہوگا جو امیر المومنین نے میرے نام بھیجا ہے۔''

لیکن خادم نے عرض کیا۔ ''نہیں جناب! یہ ہارون کا خط ہے جو ہارون کے باپ نے دمشق سے بھیجا ہے۔''

ہارون کا دل خوشی اور خدشات کی ملی جلی کیفیت سے دھڑکنے لگا، ذرا تیز تیز، زور زور سے۔ اس نے یہ خط لے لیا اور جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ اس میں اس کے باپ نے لکھا تھا۔ ''بہن کی حالت نازک ہے، عامر تیری توجہ کا مستحق ہے۔ اس لیے جتنی جلدی ممکن ہو واپس آجا۔''

ہارون نے یہ خط بکیر کے سامنے ڈال دیا اور کہا۔ ''اب میرا جانا بے حد ضروری ہو گیا ہے۔ اب میں یہاں مزید نہیں رک سکتا۔''

بکیر نے خط پڑھ کر افسوس سے کہا۔ ''ان حالات میں واقعی تیرا یہاں پڑا رہنا افسوس ناک ہے۔ اب تو کسی پروا کے بغیر چلا جا۔''

لیکن اسی وقت ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی اور خادم دوبارہ باہر نکل گیا۔ ذرا دیر بعد سر جھکائے چپ چپ اندر آیا اور بکیر سے کہا۔ ''آپ کو امیہ نے طلب فرمایا ہے، اسی وقت، ابھی۔ آپ جس حال میں بھی ہوں اسی حال میں۔''

بکیر نے پوچھا۔ ''کیا وہ آدمی چلا گیا؟''

خادم نے جواب دیا۔ ''نہیں، وہ موجود ہے اور کہتا ہے کہ میں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

بکیر اور ہارون نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بکیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''خدا خیر کرے۔ آثار اچھے نہیں ہیں۔''

ہارون نے ہمت بندھائی۔ ''بدگمانی سے بچیے، اندیشوں کو مار بھگایئے!''

بکیر باہر نکلا، وہاں امیہ کا آدمی اس کا منتظر تھا۔ بکیر نے پوچھا۔ ''کیا کوئی خاص بات ہو گئی؟ ورنہ مجھے آج تک اس طرح نہیں طلب کیا گیا۔''

امیہ کے آدمی نے جواب دیا۔ ''میں نہیں جانتا، مجھے حکم دیا گیا کہ بکیر کو اپنے ساتھ لے آ، میں آپ کے پاس چلا آیا۔''

بکیر نے مزید پوچھا۔ ''امیہ نے جب میری طلبی کا حکم دیا تھا اس وقت ان کی مزاجی کیفیت کیسی تھی؟ درشت یا نرم؟''

آدمی نے جواب دیا۔ ''امیہ مغرور والی ہے اس لیے اس کے لہجے یا چہرے سے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ اس نے کوئی خاص جذبے سے آپ کو طلب فرمایا ہے۔''

بکیر نے پیچھے مڑ کر ہارون کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ہارون! میں چند ساعت بعد واپس آجاؤں گا۔ تو واپسی کی تیاری اسی وقت سے شروع کر دے۔''

بکیر چلا گیا لیکن ہارون کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اس نے کئی بار یہ کوشش کی کہ بکیر کے حکم کی تعمیل میں سفر کی تیاری شروع کر دے لیکن دل اس کا ساتھ ہی نہ دیتا تھا۔ وہ انتشار اور بے دلی کا شکار ہو چکا تھا۔ کسی کروٹ، کسی پہلو اور کسی طور اس کو قرار ہی نہ تھا۔

☆☆☆

بکیر دربار میں داخل ہوا تو امیہ نے اس کی پذیرائی میں مسکراہٹوں کے پھول بکھیرے اور خوش آمدید اور مرحبا سے اس کے اندیشے کم کر دیے۔ بکیر حسب معمول بڑھتا چلا گیا اور امیہ کی نشست کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ امیہ اس سے بیٹھ جانے کو کہے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بکیر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

امیہ نے پوچھا۔ ''بکیر! شاید تو اپنی طلبی کے سبب سے آگاہ ہو چکا ہوگا؟''

بکیر نے بے اختیار جواب دیا۔ ''امیر! میں نے پوری رات اندیشوں اور وسوسوں میں گزار دی ہے۔''

امیہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا، بولا۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ مجھے جو کچھ بتایا گیا ہے درست ہے۔''

بکیر نے خوفزدہ ہو کر دریافت کیا۔ ''آپ کو کیا بتایا گیا ہے؟''

''وہی جو کچھ تو نے کہا ہے۔''

''امیر! وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں نے کیا کہا ہے؟''

امیہ نے تیوریوں پر بل ڈال لیے، بولا۔ ''اے بکیر! میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں، بتا تو سہی کہ میں نے تیرے ساتھ اب تک کیسا سلوک کیا ہے؟''

بکیر نے جواب دیا۔ ''امیر! میں تو آپ کے حسنِ سلوک کا نہ صرف شکر گزار ہوں بلکہ مداح بھی ہوں۔''

امیہ نے پیچ و تاب سے کہا۔ ''تو جھوٹا ہے، تو مجھ کو دھوکا دے رہا ہے، بے وقوف بنا رہا ہے۔''

بکیر نے دونوں کانوں پر ہاتھ دھرے، بولا۔ ''واللہ یہ جھوٹ ہے، اتہام اور افترا ہے۔ میں خدا سے پناہ چاہتا ہوں۔''

امیہ نے کہا۔ ''تو نے کئی بار غداریاں کیں لیکن میں نے تجھ کو ہر بار معاف کر دیا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تو زندہ رہے اور میرے خلاف کوئی سازش نہ ہو؟''

بکیر نے جواب دیا۔ ''امیر! میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے آپ کے خلاف کوئی سازش نہیں کی۔''

امیہ نے حقارت سے کہا۔ ''خدا کی قسم مت کھا۔ اس کے غضب سے ڈر، جو تیری جھوٹی قسموں کے عتاب میں کسی بھی وقت نازل ہو سکتا ہے۔''

بکیر نے خوشامد ترک کر دی اور ذرا تمکنت سے بولا۔ ''امیر! میں آپ کو جتنی عاجزی اور اصرار سے یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مجھ سے جو باتیں منسوب کی گئی ہیں وہ درست نہیں ہیں، آپ اتنے ہی بدگمان ہوتے جا رہے ہیں۔ آخر یہ تو مجھے معلوم ہو کہ میں نے آپ کے خلاف کیا کہا ہے؟''

امیہ نے بجیر کو حکم دیا۔ ''بجیر! انہیں بکیر کے سامنے کھڑا کر دے جو اس کی رات کی باغیانہ باتوں کے گواہ ہیں۔''

بکیر نے فوراً دخل دیا۔ ''امیر! بجیر میرا دشمن ہے۔ آپ اس کی یا اس کے کسی پیش کیے ہوئے شخص کی گواہی پر اعتبار نہ کیجیے۔''

بجیر نے دو آدمیوں کو کھڑا کر دیا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ''امیر! میں نے اس کی رات کی باتیں سنیں تو پریشان ہو گیا۔ یہ اپنے نوجوان ساتھی ہارون سے کہہ رہا تھا کہ اگر بجیر میرا ساتھ دے دیتا تو میں امیہ کو بڑی آسانی سے قتل کر کے خراسان کی حکومت داب لیتا۔''

دوسرے نے گواہی دی۔ ''یہی باتیں میں نے بھی سنی تھیں، جب اس کے ساتھی ہارون نے یہ کہا کہ ایسی باتیں نہ کیجیے دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور اس میں جان چلے جانے کا خطرہ موجود ہے، تو بکیر نے ہنس کر جواب دیا تھا کہ ہارون! تو حکومت کے نشے سے واقف نہیں۔ سر رہے یا جائے، میری منزل کسی ضلع کی حکومت ہرگز نہیں، میں اس سے زیادہ کی فکر میں ہوں۔''

بکیر چیخ پڑا۔ ''امیر! یہ سب جھوٹ ہے، مجھ پر بہتان ہے۔ آپ ان جھوٹوں کی باتوں پر ہرگز یقین نہ کیجیے۔''

امیہ نے اس کی پروا کیے بغیر بجیر سے پوچھا۔ ''بس یہی دو گواہ ہیں یا کوئی اور بھی ہے؟''

بجیر نے ایک تیسرے شخص کو کھڑا کر دیا اور کہا۔ ''تو بھی وہاں موجود تھا۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کے وہ ساری

باتیں دہرادے جو تونے سنی تھیں۔"

اس تیسرے شخص نے جواب میں کہا۔ "امیر! بکیر نے یہ ساری باتیں کہی تو تھیں مگر باتوں کے لہجے سے مذاق کا شبہ ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے رات بکیر نے جو کچھ بھی کہا تھا ازراہِ مذاق کہا تھا۔ اس میں سنجیدگی ذرا بھی نہیں تھی۔"

بکیر بے دست و پا ہو گیا۔ "افسوس کہ اس تیسرے جھوٹے گواہ نے دونوں جھوٹوں کی باتوں پر صداقت کی مہر لگا دی ہے۔ اس کی گواہی دونوں گواہیوں سے زیادہ خطرناک اور قابلِ یقین ہے۔"

امیر نے ترش لہجے میں کہا۔ "بکیر! تیرا ماضی ان گواہیوں کی تائید کرتا ہے، میں اس پر یقین کرنے پر مجبور ہوں۔"

بکیر نے مزید کہا۔ "امیر! آپ ان سے مزید ثبوت مانگیے۔"

امیر نے جواب دیا۔ "میں کوئی ثبوت بھی نہ مانگوں گا، ثبوت تو تو دے کہ تو نے ایسی باتیں نہیں کہیں۔"

بکیر نے کہا۔ "امیر! میں یہیں کھڑا رہوں گا۔ آپ ہارون کو بلوا کر اور اسے انعام و اکرام کا لالچ دے کر پوچھیے کہ میں نے یہ باتیں کی تھیں یا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس سے انکار کر دے گا۔"

امیر نے جواب دیا۔ "اب میں کسی کو بھی نہیں بلاؤں گا۔ تو جا سکتا ہے لیکن میں تنبیہاً کہتا ہوں کہ میں آئندہ ایسی باتیں نہیں سننا چاہتا۔ اگر سنوں گا تو اس کی سزا ابھی دوں گا کیونکہ میں لوگوں سے اب یہ نہیں سننا چاہتا جو ابھی ابھی سن چکا ہوں۔"

بکیر کوئی جواب دیے بغیر دربار سے اٹھ گیا اور ایک جگہ کھڑے ہو کر بجیر کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد بجیر بھی اپنے ساتھیوں میں گھرا نمودار ہوا۔ بکیر نے اس کا راستہ روک لیا، بولا۔ "بجیر! میری تیری دشمنی اپنی جگہ لیکن تجھ کو اتنا بڑا جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا۔"

بجیر نے جواب دیا۔ "میں اس وقت تک تیرا پیچھا کرتا رہوں گا جب تک تیرے جسم میں تیری جان موجود ہے۔"

بکیر نے بھی اکڑ کر کہا۔ "تیری ساری منصوبہ بندی اپنی جگہ، میں پھر بھی بچ کر آ گیا۔"

بجیر نے جواب دیا۔ "میرے وار جاری رہیں گے۔ میں مایوس نہیں ہوا اور تو مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ خبردار جو تو نے اس وقتی آزادی سے فائدہ اٹھا کر بھاگنے کا ارادہ کیا۔ اگر ایسا کیا تو، تو اپنی رات کی باتوں کی عملاً تصدیق کر دے گا۔"

بکیر نے کہا۔ "میں بھاگنے والا ہرگز نہیں، میں تیرا مقابلہ کروں گا۔"

بجیر ہنستا ہوا چلا گیا۔ اس کی ہنسی نے بکیر کو کھسیا کر رکھ دیا۔ وہ بھی اپنے گھر چلا گیا۔ ہارون اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بکیر کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو خوفزدہ ہو گیا مگر اس خیال نے ڈھارس بندھائی کہ اگر کوئی خطرے کی بات ہوتی تو بکیر کو واپسی نصیب نہ ہوتی۔ اس نے پوچھا۔ "امیر نے آپ کو کیوں بلایا تھا؟"

بکیر نے جواب دیا۔ "میں نے تو رات کو ہی بتا دیا تھا کہ میرے دشمن کامیاب ہو گئے۔"

اس کے بعد اس نے ساری روداد سنا دی اور کہا....

"بظاہر تو امیر نے درگزر سے کام لیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ درگزر عارضی ہے اور شاید میں اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا ہوں۔"

ہارون نے مشورہ دیا۔ "ہم دونوں بھاگ تو سکتے ہیں۔"

"ہاں لیکن بجیر کے بقول بھاگنے کا مطلب یہ ہوگا کہ جو کچھ ہم سے منسوب کیا گیا ہے، وہ درست ہے۔"

ہارون نے کہا۔ "ان کذابوں نے آپ کے ساتھ مجھ کو بھی ملوث کر لیا ہے۔"

بکیر نے کہا۔ "ہاں، کیونکہ اس سیاق و سباق سے جھوٹ سچ بن جاتا ہے، چنانچہ انہی چھوٹی چھوٹی باتوں نے مجھے جھوٹا اور جھوٹوں کو سچا ثابت کر دیا ہے۔" پھر ہارون کو مشورہ دیا۔ "ہارون! اب وقت آ گیا ہے کہ تو میرا ساتھ چھوڑ دے اور اپنے گھر چلا جا، میرا کھیل ختم ہو چکا۔"

ہارون نے فرطِ جذبات سے جواب دیا۔ "ان حالات میں، میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا بلکہ کل سے میں خود بھی آپ کے ساتھ دربار چلا کروں گا۔"

بکیر نے کہا۔ "تیری مرضی لیکن میرا خیال ہے کہ تو یہاں سے چلا جا، میرا انجام بہت قریب ہے۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

دونوں کی مایوسیوں کا یہ عالم تھا کہ ان کا پورا دن اضطراب اور انتشار میں گزر گیا۔ رات کو خواب بھی برے برے نظر آتے رہے۔ صبح بیدار ہوئے تو ان کی طبیعتیں پچھلے دن سے زیادہ افسردہ اور مایوس تھیں۔ بکیر حسبِ معمول دربار جانے لگا تو ہارون بھی ساتھ ہولیا، بولا۔ "امیر! میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

بکیر نے جواب دیا۔ "چل لیکن میرے ساتھ چلنے میں فائدہ کوئی نہیں۔ اگر تو دربار کے بجائے دمشق چلا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا ورنہ میرے ساتھ تجھے بھی بھگتنا پڑے گا۔"

ہارون نے جواب دیا۔ ”نہیں امیر! ایسا نہیں ہوگا۔ میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑوں گا۔“

چنانچہ ہارون بکیر کے ساتھ ہولیا۔ دربار میں داخل ہونے سے پہلے ہی ایک غیر معروف شخص نے بکیر کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔ ”اے بدنصیب امیر! اس وقت سے ڈر جب امیہ دربار سے اچانک اٹھ جائے کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ ایک اشارہ ہے تیری گرفتاری کا۔“

ہارون نے کہا۔ ”اب بھی وقت ہے کہ ہم دونوں فرار ہوجائیں۔“

بکیر نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ تو بتا کہ فرار ہوکر ہم جائیں گے کہاں؟ اور کیا ہم تقدیر الٰہی سے بھاگ سکتے ہیں؟“

ہارون لاجواب ہوکر خاموش ہوگیا۔

ان دونوں کا دربار میں گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ امیہ نے مسکرا کر پوچھا۔ ”آج تو ہارون بھی تیرے ساتھ ہی ہے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”ہاں اے امیر! صرف اس لیے کہ جب میں نے اس شخص کا اچھے دنوں میں ساتھ دیا ہے تو اب برے دنوں میں بھی ساتھ دینا چاہیے۔“

امیہ نے پوچھا۔ ”اس کے برے دن ابھی تو نہیں آئے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”امیر! خدا نے آپ کو جو مرتبہ عطا کیا ہے، اس میں یہ صریح جھوٹ آپ کو زیب نہیں دیتا۔“

امیہ غصے میں کھڑا ہوگیا اور اسی وقت دربار سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔ امیر کے جاتے ہی دربار اجڑ گیا اور درباری بھی جانے لگے۔ بکیر نے ہارون کا ہاتھ، ہاتھ میں لے لیا، بولا۔ ”نوشتۂ تقدیر کو کون مٹا سکتا ہے۔ اب ہم دونوں گرفتار کرلیے جائیں گے۔“

ابھی بکیر کا جملہ پورا ہی ہوا تھا کہ امیہ کے سپاہیوں نے ہارون اور بکیر کو گرفتار کرلیا۔ ہارون نے ہنس کر کہا۔ ”ہم اس کے لیے پہلے ہی سے تیار تھے۔“

ان دونوں کو ایک ہی قید خانے میں رکھا گیا۔ یوں تو ہارون نے بکیر کا صدقِ دل سے ساتھ دیا تھا لیکن اب قید خانے میں اس کو اندیشوں اور وسوسوں نے ستانا شروع کردیا تھا۔ یہاں اسے منیزہ یاد آرہی تھی۔ عامر، باپ اور بہن یاد آرہے تھے۔ جب وہ یہ سوچتا کہ معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہوگا تو اور زیادہ پریشان ہوجاتا۔

کئی دنوں تک ان کی خبر ہی نہیں لی گئی۔ ایک ہفتے بعد ان دونوں کو امیہ کے سامنے پیش کردیا گیا۔ امیہ تنہا نہیں تھا، اس کے گرد و پیش اس کے امراء موجود تھے۔ انہی میں بحیر اور اس کے جھوٹے گواہ اور محافظ دستے کا سردار عطا بن ابی السائب بھی موجود تھے۔ امیہ نے بکیر سے تیوری بدل کر پوچھا۔ ”ہاں تو بکیر! اب سچ سچ بتا کہ تو نے میرے خلاف سازش کیوں کی؟ اور اس میں اور کون کون شامل ہے؟“

بکیر نے جواب دیا۔ ”آپ نے جب یہ طے کرلیا ہے کہ اس مقدمے کا سچا فریق جھوٹا اور جھوٹے سچے ہیں تو پھر جو سزا دینا ہو، دے دیجیے لیکن اگر تامل اور تحقیق سے کام لیں تو زیادہ اچھا ہے۔ ممکن ہے کھرا کھوٹا سامنے آجائے۔“

امیہ نے بحیر کی طرف دیکھا، بحیر نے کہا۔ ”بکیر! سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ تو جھوٹا ہے اور میرے گواہ سچے۔ فیصلہ امیر کو خود کرنا ہے۔ میں کیوں دخل دوں لیکن میرا خیال ہے کہ اس سازش کی جتنی بار بھی تحقیق اور تفتیش ہوگی، تیرا کردار مشتبہ اور مجرمانہ ہی نکلے گا۔“

ہارون نے عرض کیا۔ ”امیر! جب یہ بات واضح ہوچکی کہ یہ سارا فتنہ بحیر کا اٹھایا ہوا ہے تو خدا کے لیے بکیر کو معاف کردیجیے۔“

امیہ نے اپنے سامنے موجود امراء سے پوچھا۔ ”میں بکیر کو قتل کرا دینا چاہتا ہوں، تم میں سے کون یہ ذمے داری قبول کرے گا؟“

سبھی نے سکوت اختیار کیا۔ آخر امیہ نے بنی تمیم کے ایک شخص سے پوچھا۔ ”کیا تو اس نابکار کو قتل کرسکتا ہے؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں ایسا نہیں کرسکتا کیونکہ اس سے ایک ایسی جنگ کا آغاز ہوجائے گا جو کسی طرح بجھنے کا نام ہی نہ لے گی۔ بکیر کا قبیلہ اپنی تلواریں نیام سے باہر کرلے گا۔“

امیہ نے بحیر سے پوچھا۔ ”تو کیوں خاموش کھڑا ہے؟ بتا کیا تو بکیر کو قتل کرسکتا ہے؟“

بحیر نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں۔ اس کام کے لیے مجھ سے زیادہ موزوں آدمی نہیں ملے گا۔“

امیہ نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ”بکیر کو بحیر کے حوالے کر دیا جائے تاکہ بکیر کو اس کے کیے کی سزا مل جائے۔“

بحیر کا ایک دوست یعقوب امیہ کے قریب گیا اور درخواست کی۔ ”اے امیر! آپ نے بکیر پر بڑی عنایتیں کی ہیں اور اس سے کچھ معاہدے بھی کیے ہیں اور اس سے جاں بخشی کا وعدہ بھی کر رکھا ہے۔ آپ بکیر کی جان نہ لیں اور اسے معاف کردیں، ورنہ آپ کا اعتبار جاتا رہے گا۔“

امیہ نے جواب دیا۔ ”یعقوب! تو ایک غدار اور فریبی کی سفارش کر رہا ہے۔ اگر اس نے میرے قتل کی

سازش نہ کی ہوتی تو میں اس کو معاف کر دیتا۔ لیکن موجودہ صورت میں یہ معافی کا مستحق نہیں ہے۔''

یعقوب نے بجیر کو مخاطب کیا۔ ''بجیر میرے دوست! تو بکیر کو معاف کر دے کیونکہ اس کو تو نے معاف کیا تھا اور تو خود بھی مسلمان ہے، اس لیے اپنے قول و قرار کا خیال اور پاس کر۔''

بجیر نے جواب دیا۔ ''میں مسلمان تو ہوں لیکن میں بکیر کو معاف نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔''

امیہ کے محافظ دستے کا سردار عطا بن ابی السائب آگے بڑھا اور اس نے سفارش کرنے والے امیر یعقوب کو دھکے دے کر الگ کر دیا اور کہا۔ ''یعقوب! تو کیوں سفارش کر رہا ہے۔ پیچھے ہٹ اور امیر امیہ کے حکم کو قائم اور برقرار رہنے دے۔''

بجیر نے ہارون کی طرف اشارہ کر کے امیہ سے پوچھا۔ ''اس نوجوان کے لیے کیا حکم ہے؟''

امیہ نے جواب دیا۔ ''چونکہ یہ بکیر کی دوستی اور محبت کا دم بھرتا ہے اس لیے ہمارے لیے یہ بھی قابل اعتبار نہیں۔ اس کو قید کر دے اور میرے دوسرے حکم کا انتظار کر۔''

بجیر اپنے دوستوں، بکیر اور ہارون کے ساتھ باہر نکلا۔ راستے میں بکیر نے کہا۔ ''بجیر! تو اپنے ہاتھ سے مجھے قتل نہ کر کیونکہ اگر تو نے مجھے قتل کیا تو ہم دونوں کے قبیلوں میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہے گی۔''

بجیر نے ہنس کر جواب دیا۔ ''مجھ پر لعنت اگر میں تمہارا کہنا مان لوں۔'' اس کے بعد اس نے بکیر سے اس کی تلوار چھین لی، بولا۔ ''نہ صرف یہ کہ میں خود تجھے قتل کروں گا بلکہ تیری ہی تلوار سے تجھے قتل کروں گا۔''

ہارون نے آہستہ سے کہا۔ ''انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خدا تجھ سے سمجھے۔ تو نے مجھ کو بھی معاف نہیں کیا۔''

بجیر نے ہارون کو ڈانٹ دیا۔ ''بکیر کے خوشامدی، تو کیوں ٹرٹر کر رہا ہے۔ میں اگر چاہوں تو تجھے بھی قتل کر دوں لیکن میں امیہ کی ہدایت پر عمل کروں گا اور تجھے سڑنے کے لیے قید خانے میں بند کر دوں گا۔''

بکیر اور ہارون کو بجیر اپنے گھر لے گیا اور گھر کے باہر ہی صحن میں دونوں کو کھڑا کر کے کہا۔ ''ہارون! میں تجھے تو اس وقت تک اپنی قید میں رکھوں گا جب تک کہ مجھے امیہ کا دوسرا حکم نہ مل جائے لیکن تیرا آقا بکیر، آج یہ میرا شکار ہے۔ میں اس کے خون سے اپنے انتقام کی آگ بجھاؤں گا۔''

بکیر نے ہارون کو بولنے سے منع کر دیا۔ ''ہارون! تو اپنے دل سے میرا خیال نکال دے۔'' پھر بجیر کو مخاطب کیا۔ ''او بجیر! میں تجھے ایک بار پھر یہ مشورہ دیتا ہوں کہ مجھے قتل کر کے بنی سعد کی دشمنی نہ مول لے۔ مجھے اپنے ہاتھ سے نہ قتل کر، امیہ کے حوالے کر دے۔ وہ میرے ساتھ جیسا سلوک چاہے کرے، تو خواہ مخواہ دشمنی نہ خرید۔''

بجیر نے بگڑ کر کہا۔ ''فضول باتیں نہ کر۔ جب تک تو ہم میں موجود ہے میرے قبیلے کے حالات خراب رہیں گے۔''

بکیر نے جواب دیا۔ ''تب پھر تو وہی کر جو تو کرنا چاہتا ہے میں موت کو خوش آمدید کہوں گا۔''

بجیر نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ''بکیر کے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیے جائیں اور پاؤں میں زنجیر ڈال دی جائے۔''

ہارون تڑپ گیا، بولا۔ ''او دشمن ہوش و خرد! یہ تو کیا کر رہا ہے؟ تو نے تو......''

بجیر کے آدمیوں نے بکیر کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بکیر ہی کی تلوار کا بھرپور وار کیا جس سے اس کی گردن کٹ گئی اور سر لڑھک کر کچھ دور جا گرا۔ خون کا فوارہ اڑا جس سے ہارون کے کپڑے بھیگ گئے۔ ہارون نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے محسن کے دردناک انجام پر آنسو بہانے لگا۔

☆☆☆

ہارون کو ایک کوٹھری میں قید کر دیا گیا۔ اس پر کوئی سختی نہیں کی گئی۔ ہاں، اس کا سامان اور رقم ضبط کر لی گئی۔ شروع شروع میں تو اس کے دل و دماغ پر بکیر کی وفاداری کا بھوت سوار رہا اور اس سلسلے میں اس نے خاصی جذباتیت کا مظاہرہ کیا مگر پھر یہ جذباتیت کم ہونے لگی اور سود و زیاں کا احساس ستانے لگا۔ اسے قید خانے میں اپنا بچہ عامر یاد آ رہا تھا، باپ یاد آ رہا تھا، بیمار بہن یاد آ رہی تھی اور منیزہ یاد آ رہی تھی۔ اس نے اپنا سب کچھ گنوا کر منیزہ کے باپ کی تحریر سنبھال کر رکھی تھی۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ وہ بجیر کی خوشامد کر کے رہائی حاصل کر لے لیکن مزاج میں کچھ کچھ گرمی اب بھی موجود تھی۔

اس طرح تین ماہ گزر گئے۔ ایک دن قید خانے کا در جو کھلا تو بجیر ایک شخص کو لیے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اس کے کپڑے اور پاؤں کی گرد و غبار سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہیں دور سے چلا آ رہا ہے۔ بجیر نے اس اجنبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہارون! یہ دمشق سے تیرے پاس آیا ہے اور تیرے لیے چند بڑی خبریں لایا ہے۔''

ہارون کا دل کسی انجانے خوف سے دھڑکنے لگا۔ کم سے

کم لفظوں میں پوچھا۔ ''یعنی؟ ان بری خبروں کی تفصیل؟''

اس وقت وہ سرتاپا سوال تھا۔ چہرہ اور چہرے کے تاثرات سوال بن کر رہ گئے تھے۔ آنے والے نے کہنا شروع کردیا۔ ''تیری بہن کا انتقال ہوگیا۔ تیرے باپ کا خیال ہے کہ اسے تیرے بہنوئی نے ہلاک کردیا۔ تیرا بیٹا عامر بیمار ہے۔ تیرا باپ تیرے انتظار اور تیری فکر میں کمزور ہوتا چلا جارہا ہے۔''

ہارون نے پوچھا۔ ''میرا بہنوئی کہاں ہے؟''

اجنبی نے جواب دیا۔ ''وہ معلوم نہیں کہاں چلا گیا لیکن سننے میں یہ آیا ہے کہ وہ حمص چلا گیا۔ ممکن ہے حمص میں اس کے عزیز و اقارب رہتے ہوں؟''

ہارون کھٹکا۔ بہن کی ناگہانی موت اور بہنوئی حمص چلا گیا۔ یہ ساری باتیں چونکا دینے والی تھیں۔ اس نے عاجزی سے بجیر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''میں یہاں کب تک رہوں گا بجیر؟''

بجیر نے جواب دیا۔ ''جب تک امیہ کا دوسرا حکم نہ موصول ہوجائے۔''

ہارون نے عاجزی سے کہا۔ ''بجیر! امیہ مجھے بھول چکا ہوگا۔ مجھ پر قیامتیں گزرتی جارہی ہیں۔ کیا تم امیہ سے میری ملاقات کرا سکتے ہو؟ یا پھر یہ کہ امیہ کو میری بابت سب کچھ بتا کر دوسرا حکم حاصل کرلو۔''

بجیر نے کہا۔ ''بدنصیب نوجوان! تو نے حماقت سے بکیر جیسی کمزور شاخ پر اپنا آشیانہ بنالیا تھا۔ اب وہ آشیانہ ہی نہیں رہا تو تیری جائے امن کس طرح.....''

ہارون نے بات کاٹ کر جواب دیا۔ ''جناب والا! میں سردست بس ایک بات چاہتا ہوں، وہ یہ کہ مجھے ایک بار امیہ کی خدمت میں پہنچا دیا جائے۔ بقیہ کام میں خود کرلوں گا۔''

اس کے بعد ہارون نے پیغام رساں سے کہا۔ ''جناب! ابھی کتنے دن یہاں رکنا ہوگا؟''

اجنبی نے جواب دیا۔ ''غالباً ایک ماہ کیونکہ میں اپنے کسی اور کام سے یہاں آیا ہوں۔''

ہارون بہت جذباتی ہورہا تھا، بجیر سے کہا۔ ''میں نے کوئی جرم نہیں کیا مگر میں قید کردیا گیا۔ میری بہن کا انتقال ہوگیا، میرا بچہ لاوارث ہوگیا مگر میں گھر نہیں جاسکتا۔ بجیر! یہ ظلم ہے جو تیرے نامۂ اعمال میں لکھا جارہا ہوگا۔''

بجیر نے جواب دیا۔ ''میں امیہ سے تیری سفارش کردوں گا، ویسے تو خوش قسمت ہے جو قتل نہیں کیا گیا ورنہ بکیر کی سازش میں شامل تو بھی تھا۔ رہی ظلم کی بات تو میں نے تجھ پر یا بکیر پر کوئی ظلم نہیں کیا۔''

ہارون نے کہا۔ ''میں کسی سازش میں بھی شریک نہیں تھا اور نہ ہی بکیر نے کوئی سازش کی تھی، وہ تو بے گناہ مارا گیا۔ خدا اس کی مغفرت کرے۔''

بجیر نے خفگی سے کہا۔ ''ہارون! تو بکیر کی خوامخواہ وکالت نہ کر۔ بکیر ہی کی وجہ سے تجھے یہ برے دن دیکھنا پڑ رہے ہیں اور تو پریشانیاں اٹھا رہا ہے۔''

ہارون نے زور سے کہا۔ ''بجیر! یا تو، تو مجھ کو قتل کردے یا پھر مجھے یہاں سے چلے جانے دے۔''

بجیر واپس جاتے ہوئے بولا۔ ''میں امیہ کے پاس جارہا ہوں۔ تیری سفارش کردوں گا لیکن مجھے یقین نہیں کہ تیرے ساتھ نرمی برتی جائے۔''

ہارون نے دمشق سے آنے والے پیام رساں سے کہا۔ ''تو دو تین دن بعد مجھ سے مل، اس وقت میں صحیح صورتِ حال بتا سکوں گا۔''

بجیر اور پیام رساں چلے گئے۔ تیسرے دن بجیر، ہارون کو امیہ کے پاس لے گیا کیونکہ امیہ نے اس کو طلب کرلیا تھا۔ ہارون جیسے جیسے امیہ کے قریب ہورہا تھا، اس کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ امیہ کے سامنے پہنچا اور اس کا رحم سے عاری، مسکراہٹ سے محروم سنجیدہ چہرہ دیکھا تو اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ امیہ نے اس کو دیکھتے ہی پیشانی پر بل ڈال لیے اور کہا۔ ''میں تو تجھے بھول ہی گیا تھا، وہ تو کل بجیر نے یاد دلایا۔''

بجیر نے ایک بار پھر سفارش کی۔ ''امیر! یہ بہت پریشان ہے۔ اس کی بہن کا انتقال ہوگیا اور اس کے بیٹے کو بوڑھا باپ پال رہا ہے۔ یہ آپ کی ہمدردی اور رحم کا مستحق ہے۔''

امیہ نے طنزاً کہا۔ ''بجیر! تو اس کی سفارش کررہا ہے۔ یہ وہی تو ہے جس نے میرا ساتھ چھوڑ کر غدار بکیر کی ملازمت اختیار کرلی تھی اور اس کے ساتھ مل کر میرے قتل کا منصوبہ بنا رہا تھا۔''

ہارون نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے بکیر کی ملازمت ضرور کی تھی لیکن یہ غلط ہے کہ بکیر اور میں نے مل کر آپ کو قتل کرنے کی سازش کی تھی۔ بکیر ناکردہ گناہ میں مارا گیا۔ اس طرح میں خود بھی مرنے کے لیے تیار ہوں کیونکہ امیر! کل قیامت کے دن، ہم دونوں قاضی برحق کے روبرو کھڑے ہوں گے اور جہاں انسانی سازشوں کے تار و پود بکھر جائیں گے اور کذاب جھوٹ نہیں بول سکیں گے تو بکیر اور میں دونوں ہی چھوٹ جائیں گے اور آپ، بجیر اور

دوسرے وہ تمام لوگ جو اس خود ساختہ سازش کے ہاتھ پاؤں اور زبان تھے، اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔ تب معلوم ہوگا کہ کون ظالم ہے اور کون مظلوم۔"

ہارون کی جرأت اور صاف گوئی اپنا اثر کرگئی۔ امیہ نے کہا۔ "کون ظالم ہے اور کون مظلوم اور کس نے کس کو دھوکا دیا، یہ باتیں تو خدا ہی بہتر جانتا ہے اور قیامت ہی کو اس کا فیصلہ ہوگا لیکن ہم عاجز انسان ہاتھ پاؤں، آنکھ اور زبان کے وسیلے کے بغیر باتیں نہیں سمجھ سکتے۔"

ہارون نے بڑی دل سوزی سے کہا۔ "امیر! میں خدا اور اس کے رسولؐ کا واسطہ دے کر درخواست کرتا ہوں کہ یا تو، تو مجھے مجرم اور گناہ گار قرار دے کر سزا دے یا پھر اگر میں بے گناہ ہوں تو مجھے چھوڑ دے۔ بے گناہ یا گناہ گار ہونے کا فیصلہ کیے بغیر قید کر رکھنا کہاں کا انصاف ہے۔ میرا دل رو رہا ہے اور میرا رواں رواں اس شخص کو بددعائیں دے رہا ہے جو میری قید و ذلت کا ذمے دار ہے۔"

امیہ نے بکیر سے پوچھا۔ "بکیر! تیرا کیا خیال ہے؟"

بکیر نے جواب دیا۔ "امیر! میرا خیال ہے کہ جس سازش میں یہ گرفتار ہوا تھا، اس کا محرک اور بانی بکیر تھا۔ یہ زیادہ سے زیادہ اسس کا آلۂ کار کہا جاسکتا ہے۔ خود اس نے کوئی سازش نہیں کی، اس لیے اس کو اگر معاف کردیا جائے تو مناسب اور عین انصاف ہوگا۔"

امیہ نے کہا۔ "اچھا میں سوچ لوں۔ فی الحال تو اس کو قید رکھ۔ میں سوچ کر کوئی فیصلہ کردوں گا۔"

بکیر اس کو دوبارہ قید خانے لے گیا اور جب وہ ہارون کو قید خانے میں دھکا دے رہا تھا تو ہارون رو رو کر کہہ رہا تھا۔ "بکیر! میں مظلوم ہوں۔ خدا کے غضب سے ڈر، دل کے ہل جانے سے خدا کا گھر ہل جاتا ہے۔"

امیہ نے چھ دن بعد اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ہارون کو رہا کر دیا گیا۔ اس کا ضبط کیا ہوا سامان اور درہم واپس دے دیے گئے۔ اس کے علاوہ امیہ نے ہمدردی میں اسے دس ہزار درہم اپنے پاس سے ادا کیے اور کہا۔ "مخبری اور سخاوت یہ نہیں ہے جو بکیر سے سرزد ہوئی تھی۔ تو بکیر کا ہمدرد اور خیر خواہ تھا لیکن میں تیرا ہمدرد اور بہی خواہ ہوں۔ بغاوت کے لیے ہمت اور حوصلہ چاہیے۔ میری ہمت اور حوصلے کے سامنے پورے خراسان کی آمدنی بھی ناکافی ہے۔ یہ تو میرے مطبخ کے اخراجات کو بھی ناکافی ہوگا۔"

ہارون پشیمان اور نادم امیہ کی باتیں سنتا رہا۔

امیہ نے چڑ کر کہا۔ "تو عجیب ناشکرا اور احسان فراموش ہے۔ تو تو میری باتیں کسی گونگے کی طرح سن رہا ہے۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "مجھ کو امیر کے احسان اور غیر متوقع نوازش نے حیرت زدہ کردیا ہے اور اسی حیرت نے میری زبان کو تالا لگا دیا ہے۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

امیہ نے کہا۔ "میری ایک پیشکش کو اپنی گرہ میں باندھ لے۔ تو دمشق سے جب بھی واپس آئے گا، ملازمت تیری منتظر ملے گی لیکن ہمیشہ یہ خیال رکھنا کہ مجھ کو ہی ہارون درکار ہے جو اپنے آقا کا وفادار اور مخلص رہتا ہے۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "امیر! وفاداری اور اخلاص میری سرشت میں داخل ہے۔"

اس کے بعد ہارون باہر نکلا اور جانے والے قافلے کی فکر میں پڑاؤ کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

قافلہ دمشق کی طرف بڑھ رہا تھا اور ہارون کے غم میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ایک شبہ جو ذرا سے نقطے کی طرح ابھرا تھا۔ بڑھتے بڑھتے ایک بڑا دھبا بن گیا۔ بہن کی موت یا قتل؟ قتل کس نے کیا؟ بہنوئی نے یا کسی اور نے؟ بہنوئی حمص کیوں چلا گیا؟ منیزہ کے لیے یا اپنے کسی عزیز کے پاس؟ وہ جتنا زیادہ سوچتا، دل ڈوبنے لگتا۔

جب مال واسباب سے لدے ہوئے گدھے اور گھوڑے دروازے پر رکے اور باپ عامر کو گود میں لے کر نکلا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ہارون نے بے اختیار بیٹے کو اپنی گود میں لے کر بوسوں کی بھرمار کردی۔ باپ سامان اتروانے لگا۔ وہ اپنے لائق بیٹے سے بہت خوش تھا۔ ہارون کا خیال تھا کہ باپ اس کی شکل دیکھتے ہی رونا شروع کردے گا لیکن وہ تو مال و زر دیکھتے ہی نہال ہوگیا۔

سامان اور درہموں کو قبضے میں کرنے کے بعد باپ کو احساس ہوا کہ اس نے ابھی تک بیٹی کا کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ ہی اس کے سوگ کا اظہار کیا۔ وہ ایک دم سنجیدہ اور پھر غمزدہ ہوگیا۔

ہارون نے بہن کا نام لیے بغیر پوچھا۔ "بادا جان! آخر یہ ہوا کیا؟ یہ موت کس طرح واقع ہوئی؟"

باپ نے جواب دیا۔ "میں اور کیا کہوں، میرا پورا شبہ تو تیرے بہنوئی پر ہے۔ ویسے غیب کا علم تو خدا ہی کو ہوگا۔"

ہارون نے پوچھا۔ "میں تو آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ موت...... کس طرح واقع ہوئی۔"

باپ نے جواب دیا۔ "اس نے رات کا کھانا کھایا، رات کے پچھلے پہر اس کے پیٹ میں درد اٹھا، کئی قے

ہوگئیں اور صبح ہوتے ہوتے وہ چل بسی۔

ہارون نے بے چینی سے پوچھا۔ ''اور اس کے بعد؟ پھر کیا ہوا؟ اس رات اس کا شوہر کہاں تھا؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''کچھ کھلایا پلایا تھا اس کے شوہر نے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اس نے اپنی بیوی کے غم میں کچھ بھی تو نہیں کیا۔ وہ زیادہ غمزدہ نہیں تھا بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے وہ یہ چاہتا تھا کہ اس سے کوئی سوال نہ کیا جائے، اس سے کچھ بھی نہ پوچھا جائے۔''

ہارون نے پوچھا۔ ''لیکن اس میں یہ تبدیلی آئی کیوں؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''بس یہ سنا ہے کہ وہ کسی دوسری لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔''

ہارون نے کہا۔ ''تو وہ بہن کی موجودگی ہی میں دوسری شادی کرسکتا تھا۔''

باپ نے تنگ آکر کہا۔ ''میرے پاس تیرے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں، اس سے سوالات کرجا کر۔''

ہارون سے عامر اس طرح چمٹا کہ ذرا سی دیر کی جدائی بھی اسے گوارا نہ تھی۔ اب وہ حمص جانے کی سوچ رہا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا باپ ایک بار پھر منیزہ کی مخالفت کرے گا اور اب وہ باپ کو نظرانداز بھی نہیں کرسکتا تھا۔ منیزہ کے باپ کی تحریر اس کے پاس احتیاط سے رکھی ہوئی تھی۔

وہ عامر کو گود میں لیے گھومتا پھرتا رہتا۔ لوگوں کو اس پر رحم آنے لگا۔ ہر شخص یہی مشورہ دیتا کہ دوسری شادی کرلے۔ اس کا باپ بھی اپنے بیٹے کی بے چینی اور پریشانی محسوس کرنے اور سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔

رات کو اٹھ اٹھ کر ہارون بیٹے کو دیکھتا رہتا۔ کبھی سینے کے نیچے دبے ہوئے ہاتھ کو نکال کر اوپر کردیتا، کبھی زمین کی طرف لٹکے ہوئے ہاتھ کو اٹھا کر اوپر رکھ دیتا۔ چادر ادھر ادھر ہوجاتی تو دوبارہ اوڑھا دیتا۔ ہارون کا باپ رات بھر بیٹے کی حرکات دیکھتا رہتا۔ ایک رات پچھلے پہر جب ہارون، عامر کے پاس کھڑا چادر ٹھیک کررہا تھا تو باپ نے بڑی محبت سے آواز دی۔ ''بیٹے ہارون! ادھر میرے پاس تو آنا۔ آج میں چند خاص باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

ہارون اپنے باپ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ باپ نے بہ مشکل کہا۔ ''یہ تو رات بھر کیا کرتا رہتا ہے؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''عامر کی دیکھ بھال۔ یہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔''

باپ نے بڑی دردمندی سے مشورہ دیا۔ ''ہارون! تو اس کی کہاں تک دیکھ بھال کرے گا؟ میرا خیال ہے تو شادی کرلے۔''

ہارون کو باپ کی بات پر یقین نہیں آیا، جلدی سے پوچھا۔ ''جی باوا جان! کیا فرمایا آپ نے؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''دوسری شادی کرنے۔''

ہارون نے پوچھا۔ ''کس سے شادی کرلوں؟''

باپ نے کہا۔ ''اسی لڑکی سے جس سے تو شادی کرنا چاہتا تھا۔''

ہارون ایک بار پھر ششدر رہ گیا۔ باپ کو یہ ہوکیا گیا ہے؟ بولا۔ ''لیکن باوا جان! منیزہ اور اس کا باپ، دونوں ہی لالچی ہیں۔ آتے ہی مال و زر پر قبضہ کرلیں گے۔''

باپ نے جواب دیا۔ ''اس گھر میں جو کچھ بھی ہے، تیرا اور تیری بیوی یا عامر کا ہے۔ بیٹی کی موت نے مجھے مایوس اور غمزدہ کردیا ہے۔ اگر عامر نہ ہوتا تو میں مرجاتا شاید۔''

ہارون نے باپ کی پیشانی کو چوم لیا۔ ''باوا جان! آپ مایوسی کی باتیں نہ کیجیے۔ اس گھر میں جو کچھ بھی ہے، آپ ہی کا ہے۔ میں حمص جاکر منیزہ کو لانے کی کوشش کروں گا۔''

منیزہ کے ساتھ حمص کا نام سن کر اس کا باپ چونک گیا، پوچھا۔ ''کیا منیزہ حمص میں ہے؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''جی ہاں۔''

باپ نے کسی گتھی کو سلجھانا چاہا۔ ''اور یہ بات کیا تیرے بہنوئی کو معلوم تھی؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''ہاں۔''

''کیا وہ منیزہ کو دیکھ چکا ہے؟''

''ہاں، دیکھ چکا ہے۔''

باپ نے جیسے معاملہ سمجھ لیا ہو، کہا۔ ''اب میں سمجھ گیا۔ سب کچھ سمجھ گیا۔ تو حمص جا اور یہ دیکھ کہ منیزہ کیا کررہی ہے؟ اگر وہی بات جس کا مجھے شبہ ہے اور تو خود بھی سمجھ چکا ہے تو فوراً ہی واپس آجانا، تیرے لیے میں کوئی اور لڑکی تلاش کرلوں گا۔''

صبح ہوتے ہوتے ہارون نے کئی فیصلے کرڈالے۔ پہلے وہ تنہا جانے والا تھا لیکن اب وہ عامر کو اپنے ساتھ لے جارہا تھا۔ اب اس نے یہ فیصلہ بھی کرلیا تھا کہ اگر وہاں اس کا بہنوئی موجود ہوا تو یہ اس کے خلاف جنگ کا اعلان ہوگا۔

وہ حمص روانہ ہوگیا۔ عامر اس کے ساتھ تھا۔ مسطح اور غیر مسطح، ہموار اور غیر ہموار، سیدھی اور ٹیڑھی میڑھی راہوں سے گزرتا ہوا وہ دریائے عاصی کے کنارے پہنچ گیا۔ یہاں

سے میں ایک بیل بوٹا تھا۔ اس نے اس ندی سے پانی سے وضو کیا، نماز پڑھی اور دعا مانگی۔ "اے العالمین، میں جس ارادے سے یہاں آیا ہوں اس میں مایوس نہ کر، ورنہ میں ادھ مرا ہو جاؤں گا۔"

اس کے بعد وہ تنگی چبوتروں کے شہر میں داخل ہو گیا۔ یہاں ہر گلی اور بازار میں پتھر کے چوکے بنے ہوئے تھے۔ وہ ذرا سی تلاش سے منیزہ کے گھر پہنچ گیا۔ منیزہ کے دروازے پر اچھے اچھے لباسوں میں ملبوس انسانوں کا ہجوم تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔

اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر منیزہ کے باپ کو دریافت کیا۔

"میں منیزہ کے باپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

کسی نے جواب دیا۔ "منیزہ کا باپ کم از کم آج تو تجھ سے نہیں ملے گا کیونکہ آج اسی وقت منیزہ کی شادی ہو رہی ہے۔"

ہارون کے دل پر گھونسا سا لگا۔ "منیزہ کی شادی ہو رہی ہے، مگر کس سے؟"

لوگوں نے سوال جواب سے بچنے کے لیے اس کو منیزہ کے باپ سے ملا دیا۔ باپ نے بار بار بڑے غور سے ہارون کو دیکھا، پھر پوچھا۔ "کیا تو ابھی زندہ ہے؟"

ہارون نے اس کا لکھا ہوا خط اس کے حوالے کر دیا، بولا۔ "میں اس پر عملدرآمد کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

منیزہ کے باپ نے ایک بار پھر ہارون کو غور سے دیکھا اور پوچھا۔ "ہارون! کیا میں تجھے بیداری میں اپنے سامنے کھڑا دیکھ رہا ہوں؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "میں، ہارون آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔" پھر عامر کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ میرا بیٹا عامر ہے۔"

منیزہ کے باپ نے جھنجلا کر بہ آوازِ بلند کہا۔ "ہارون! مجھ سے دھوکا کیا گیا ہے۔ مجھ کو یہ بتایا گیا تھا کہ خراسان کے والی امیہ نے تجھ کو بکیر کے ساتھ ہی قتل کرا دیا۔ میں تو تجھ سے بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ یا اللہ، یہ سب کیا ہے، یہ کیا ہو رہا ہے؟"

ہارون نے کہا۔ "میں بکیر کے ساتھ ہی گرفتار ہو گیا تھا لیکن مجھے قتل نہیں کیا گیا۔ چند ماہ قید میں رکھ کر رہا کر دیا گیا۔"

منیزہ کے باپ نے مہمانوں کے بیچ میں کھڑے ہو کر اعلان کر دیا۔ "لوگو! یہ شادی نہیں ہوگی۔ منیزہ کا اصل حق دار آ چکا ہے۔ اب یہ شادی نہیں ہوگی۔"

تقریب میں ایک ہنگامہ سا بپا ہو گیا۔ ہارون اس شخص کو دیکھنا چاہتا تھا جو منیزہ سے شادی کر رہا تھا لیکن منیزہ کے باپ نے کہا۔ "مگر میں اس کے خلاف ہوں۔"

پھر چند توقف سے کہا۔ "دولہا کو بھاگ جانے دو، دولہا کو مت دیکھو، اس کا کچھ تو بھرم رہنے دو۔"

اس وقت کوئی شخص بھی اپنی جگہ سے ادھر ادھر نہیں ہوا۔ پھر اچانک ہاکا سا شور ہوا اور کسی نے اس کی پشت سے وار کر دیا۔ ہر طرف سے... پکڑنا جانے نہ دینا کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ منیزہ کے باپ نے حملہ آور کو ٹانگ مار کر گرا دیا۔ ہارون نے پلٹ کر گرنے والے کو دیکھا تو اپنے بہنوئی کو دیکھ کر دنگ نہیں ہوا کیونکہ اگر وہ یہاں کسی اور کو دیکھتا تو واقعی بڑی حیرت کرتا۔

بہنوئی بپھرے ہوئے شیر کی طرح اچھل اچھل کر کسے مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہارون کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ ہجوم ہی میں چیخ رہا تھا۔ "تو نے میری بہن کو ہلاک کر دیا..... او محسن حیا اور شرم و عزت کے تاجر، یہ تجھے ہو کیا گیا ہے؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "ہارون! یہ شادی تجھ سے نہیں ہوگی، مجھ سے ہوگی......"

لیکن منیزہ کے باپ نے اعلان کیا۔ "یہ شخص جس کا نام ہارون ہے میرا محسن ہے اور میری بیٹی کا پسندیدہ شخص ہے۔ میں شادی تو اسی سے کروں گا۔"

بہنوئی نے ایک بار پھر جھگڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

منیزہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہارون ابھی زندہ ہے تو خوشی سے پاگل ہو گئی۔ شادی منسوخ ہو چکی تھی۔ منیزہ نے عامر کو دیکھا تو اسے فرطِ جوش میں گلے سے لگا لیا اور عامر بھی سہما اور پریشان پریشان منیزہ کی گود ہی میں رہا۔

بہنوئی کا دماغی توازن برقرار نہیں رہا تھا۔ وہ چپ رہ کر بولنا شروع کر دیتا تھا۔ وہ رہ رہ کر دیوانگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ منیزہ کا باپ بہت سارے مہمانوں کی موجودگی میں جس تقریب کی منسوخی کا اعلان کر چکا تھا، وہ بڑا اہم تھا۔ اب اس کو اس بے عزتی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جو تنسیخ تقریب کے بعد محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے مہمانوں کو وہ ساری تفصیل بتائی جو خراسان میں مرد کے معرکے اور زخمی ہونے کے بعد پیش آئی تھی اور اپنے زخمی ہونے اور ہارون کی جانبداری کا وہ شاندار منظر کھینچا کہ لوگ اٹھ اٹھ کر ہارون کو دیکھنے لگے۔ پھر ہارون کے بہنوئی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "مجھے اس شخص نے یہاں آ کر یہ خبر دی تھی کہ

ہارون کو بکیر کے ساتھ قتل کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتایا کہ ہارون کی بہن کا انتقال ہو چکا ہے اور ہارون کا تین چار سالہ بچہ منیزہ کا انتظار کر رہا ہے اور اس کو پرورش کرنے کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ منیزہ کی اس سے شادی کر دی جائے۔ شادی کے بعد وہ منیزہ کو دمشق لے جائے گا اور منیزہ ہارون ہی کے گھر میں رہے گی۔ میں اس فریب کا شکار ہو گیا تھا مگر ہارون نے بروقت حاضر ہو کر اپنے فریبی بہنوئی کا سارا کھیل بگاڑ دیا۔''

''حاضرین کو تقریب کی منسوخی کے بعد مایوس واپس نہیں جانا پڑے گا، وہ جس مقصد سے یہاں آئے تھے وہ مقصد پورا ہوگا۔ پہلے دلہا ہارون کا بہنوئی تھا مگر اب خود ہارون ہے۔ وہ جس حالت میں ہے، اسی حالت میں نکاح کی رسم انجام دے دی جائے گی۔''

بہنوئی ایک بار پھر چیخا۔ ''او لالچی بوڑھے! بند کر اپنی بکواس۔ اس شادی کے بعد نہ تو، تو خود خوش رہ سکے گا، نہ منیزہ خوش رہے گی اور نہ ہارون۔ میں تینوں کو ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔''

منیزہ کے باپ نے قاضی کو حکم دیا۔ ''نکاح پڑھایا جائے۔''

قاضی نے اپنی کارروائی شروع کر دی جو ذرا سی دیر میں اختتام پا گئی۔ بہنوئی کو اگر اپنی جان کا خوف نہ ہوتا تو کچھ نہ کچھ ضرور کر گزرتا۔ وہ اپنی بے عزتی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکا اور وہاں سے چلا گیا۔

شادی کے بعد جب ہارون منیزہ کو ساتھ لے کر دمشق روانہ ہوا تو منیزہ کے باپ نے بہ اشک پُرنم ہارون کو نصیحت کی۔ ''بیٹے! منیزہ کو خوش رکھنا۔ اپنے بہنوئی سے ہوشیار رہنا۔ وہ زخمی سانپ ہے جو کبھی نہ کبھی حملہ ضرور کرے گا۔'' پھر بیٹی سے کہا۔ ''منیزہ! اس شریف نوجوان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کرنا۔''

ہارون منیزہ کو لے کر گھر میں داخل ہوا تو اس کے باپ کو اس پر یقین نہ آیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شادی کی بات کر کے آجائے گا لیکن ہارون تو دولہا بن کر دلہن کو لیے گھر میں داخل ہوا تو وہ حیرت زدہ دونوں کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کے پاس ہی عامر کھڑا تھا۔ باپ نے عامر کو ایک نظر دیکھا اور معلوم نہیں کیا محسوس کیا، اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چونک کر جب کھولیں تو منیزہ اور عامر کو ایک بار پھر بڑے غور سے دیکھا، پھر ہارون سے کہا۔ ''ہارون میرے بیٹے! ذرا میرے ساتھ تو آنا۔''

وہ ہارون کو ایک کونے میں لے گیا اور سرگوشی میں نصیحت کی۔ ''ہارون! منیزہ تیرے بیٹے عامر سے بڑی محبت کرتی ہے، لیکن اس کے اس دھوکے میں نہیں رہنا چاہیے کہ وہ اسے اسی طرح ہمیشہ چاہتی رہے گی۔ جس دن منیزہ خود کسی بچے کی ماں بن جائے گی، اس کی یہ محبت اپنے بچے کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ تو اس وقت سے ڈر اور اگر تو یہ چاہتا ہے کہ منیزہ عامر سے ہمیشہ ہی پیار کرتی رہے تو اس کی بس ایک ہی ترکیب ہے۔''

ہارون نے پوچھا۔ ''کون سی ترکیب؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''منیزہ کو صاحب اولاد نہ ہونے دیا جائے، اس کو اولاد سے محروم رکھا جائے۔'' پھر اٹک اٹک کر رک رک کر کہا۔ ''لیکن پیدائش کا سلسلہ روکا کس طرح جائے؟ یہ ایک پیچیدہ اور نازک سوال ہے لیکن اس کی بھی ایک آزمودہ تدبیر ہے اور وہ ہے عزل کرنا۔'' پھر نظریں نیچی کر کے بولا۔ ''افسوس کہ میں نے باپ ہو کر تجھ سے ایسی بات کی لیکن ہارون! یہ بے شرمی اس مسلسل اور مستقل اذیت اور مصیبت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو منیزہ کے بچے کے بعد عامر کو بھگتنا پڑے گی۔''

ہارون کو اپنے باپ کی آواز میں اپنے بہنوئی اور بکیر کی آوازیں شامل محسوس ہوئیں۔ اس نے باپ سے کہا۔ ''میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔''

جب یہ دونوں دوبارہ منیزہ کے پاس واپس گئے تو منیزہ نے ان دونوں کو شک و شبہے سے دیکھا اور تخلیے میں لے جا کر ہارون سے شکایتاً پوچھا۔ ''تیرا باپ کونے میں لے جا کر تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟''

ہارون نے ہنس کر جواب دیا۔ ''وہ سکھا نہیں رہا تھا، سمجھا رہا تھا۔ کہتا تھا، عامر کو یہ مہربان اور محبت کرنے والی خوش قسمتی سے مل گئی ہے۔ کہیں بے پروائی اور غفلت میں اسے بھی نہ ضائع کر دینا۔''

منیزہ خوشی سے پھولے نہ سمائی اور ہارون کی آغوش میں گر گئی لیکن ہارون اپنے جھوٹ پر دل ہی دل میں نادم ہو رہا تھا اور منیزہ خوش ہونے کے باوجود اپنے دل میں شک کا کانٹا چبھتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

جاری ہے

ماخذات

بلاد فلسطین و شام، جی. لی اسٹرنج۔ فتوح البلدان، بلاذری۔ تمدن اسلام، جرجی زیدان۔ تاریخ طبری، طبری۔ تاریخ ابن خلدون، ابن خلدون۔ تاریخ شام، فلپ کے حتی۔

نرم گوشہ

سلیم انور

کاروبارِ حیات نہ تو گرمی سے چلتے ہیں اور نہ ہی صرف نرمی سے کام چلتا ہے... کبھی نرمی تو کبھی گرمی، جو اس توازن پر عمل کرتے ہیں وہی کامیاب رہتے ہیں... وہ بھی اگر ذرا سی نرمی نہ دکھاتا تو اتنی گرما گرم خبر نہ پاتا... جلدبازی کا مظاہرہ کرتا تو تمام عمر کے لیے ایک پچھتاوا تیر بن کر دل میں اتر جاتا۔

قیدِ حیات سے بھاگ نکلنے والے ایک مفرور کا اعترافِ جرم



میرا اکزن پولیس لیفٹیننٹ کنیڈی اپنی میز پر آگے کی جانب جھکا اور دوٹوک انداز میں بات کرنے لگا۔

''میٹ!'' اس نے کہا۔ ''میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے کہ تمہیں اس موسمِ بہار میں ترقی مل سکتی ہے۔ تمہارا ریکارڈ بے حد محدود ہے۔ اب تمہیں کچھ کر دکھانے کی ضرورت ہے۔ کوئی ایسا کارنامہ جو نہایت اہمیت کا حامل ہو۔''

''تم جو چاہو، میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''تین سال قبل میڈیسن کے علاقے میں واقع ہیکن برگ نامی جیولر کو اس کے پاس کام کرنے والے کلرکوں میں سے ایک نے لوٹ لیا تھا۔ اس نوجوان کلرک کا نام ڈینی دلمر تھا اور وہ کیس تمہارے سپرد کیا گیا تھا اور تم اس چور کو کبھی پکڑ

نہ پائے۔ تم توقع پر پورا اترنے میں ناکام رہے تھے۔''

''میں نے ڈینی کو ایک بار فلاڈیلفیا میں تقریباً پکڑ ہی لیا تھا اور ایک بار البینی میں بھی!''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ غالباً نیویارک کے آس پاس ہی کہیں رہ رہا ہے۔'' کنیڈی نے غراتے ہوئے کہا۔ ''اس کی ایک بیوی بھی ہے جو اب بھی اے ایونیو پر رہ رہی ہے۔ وہاں پر تعینات ہمارے لوگوں نے بتایا ہے کہ وہ بے حد بیمار ہے اور شاید قریب المرگ ہے۔ انہیں یہ خبر اس اسٹور سے ملی ہے جو اس کے فلیٹ پر سودا سلف بھیجتا ہے۔''

''تو پھر؟''

لیفٹیننٹ کنیڈی تیوریاں چڑھاتے ہوئے تاکیدی لہجے میں بولا۔ ''دیکھو میٹ! میں تمہیں تمہارے موجودہ کیس پر سے ہٹا رہا ہوں۔ تم ڈینی ولمر کا کیس دوبارہ سے شروع کردو۔ میرا اندازہ ہے کہ جب ڈینی کو یہ خبر ملے گی کہ اس کی بیوی بستر مرگ پر ہے تو وہ اس سے ملنے کے لیے ہر قسم کا خطرہ مول لے لے گا۔ اگر وہ اس سے ملاقات کرنے کے لیے آئے تو تم اسے گرفتار کرلینا۔ اس کی گرفتاری تمہارے ریکارڈ میں ایک شاندار اضافہ ہوگا..... سراغ رساں میٹ اسٹیونسن نے مجرم کو تین سال تک خوش کرنے کے بعد پکڑ لیا۔ یہ شہ سرخی تمہارے کھاتے میں لکھی جائے گی۔ سمجھ رہے ہو نا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''سراغ رساں کوتسی کو ساتھ لے جاؤ اور کام پر لگ جاؤ!'' لیفٹیننٹ کنیڈی نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ ہماری یہ ملاقات اب برخاست سمجھی جائے۔

سو اس رات اپنی ترقی کا خیال ذہن میں سمائے میں سراغ رساں کوتسی کے ہمراہ اے ایونیو پہنچ گیا۔

''تم فلیٹ کے سامنے عمارت کے داخلی دروازے کے پاس کسی آڑ میں کھڑے ہو جاؤ اور نگرانی شروع کردو۔ اگر ڈینی ولمر آتا دکھائی دے تو اس کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی اسے گرفتار کرلینا۔ میں چھت پر جا رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ آگ سے بچاؤ کے ہنگامی زینے کو استعمال کرنے کی کوشش کرے۔''

کیا ہمارا یہ جال کارگر ثابت ہوسکتا تھا؟ میں اس بارے میں کوئی اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ ہم صرف اس توقع پر یہ کھیل کھیل رہے تھے کہ کوئی بھی شخص ..... چاہے وہ کوئی مجرم ہی کیوں نہ ہو..... یہ سننے کے بعد کہ اس کی بیوی مر رہی ہے، تمام تر خطرات کے باوجود اپنے گھر آنے کی...

بیٹھ کا نہ کوشش ضرور کرے گا۔

لیکن ڈینی ولمر اس رات نہیں آیا۔

اور نہ ہی اگلی شب!

تیسری رات شدید بارش ہونے لگی۔ میں اس شب بھی اس عمارت کی چھت پر تھا۔ میں نے ایک چمنی کی آڑ میں پناہ لی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے کوٹ کے بٹن اوپر تک بند کیے ہوئے تھے۔ میرے ہیٹ کے حاشیے سے پانی کسی جھرنے کی طرح گر رہا تھا۔

اس وقت یقیناً رات کے دو بجے کا عمل تھا جب میں نے برابر کی چھت پر ایک آدمی کو دوڑتے ہوئے آتے دیکھا۔

میں فوراً ہی چمنی کے سائے میں دبک گیا اور اپنی سانس روک لی۔ اس بلاک میں تمام عمارتیں ایک جیسی بلندی کی تھیں۔ کوئی بھی فرد جو اس جگہ تک پہنچنا چاہتا، وہ کونے کی عمارت میں داخل ہوکر بغیر کسی مشکل کے ایک عمارت کی چھت سے دوسری عمارت کی چھت کے ذریعے یہاں تک بہ آسانی آسکتا تھا۔

میں نے پوری احتیاط سے کام لیتے ہوئے چمنی کی آڑ سے جھانکا تو دیکھا کہ وہ شخص عمارتوں کے درمیان بنی ہوئی اینٹوں کی اس چھوٹی سی دیوار کو پھلانگ رہا تھا جو ہر عمارت کو دوسری عمارت سے جدا کرنے کے لیے چھتوں پر بنائی گئی تھی۔

اس شخص نے ..... جیکٹ کے کالر کو اپنے حلق تک اٹھایا ہوا تھا اور اس کی ٹوپی کے چھجے نے اس کے چہرے کو ڈھانپا ہوا تھا لیکن اس شخص کی شناخت کسی قسم کے شک اور مغالطے سے بالاتر تھی۔

وہ ڈینی ولمر ہی تھا۔

اس لمحے مجھے اپنے اندر ایک وحشیانہ فتح کا احساس ہوا لیکن میں نے فوری طور پر اسے پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے اچانک ہی سجھائی دیا کہ عقلمندی کا تقاضا ہے کہ اسے آگ سے بچاؤ کے ہنگامی زینے کے راستے نیچے اس کی بیوی کے فلیٹ تک جانے دیا جائے پھر میں اس کا تعاقب کرتا ہوا نیچے جاؤں اور کھڑکی کے پاس چھپ کر ان دونوں کی باتیں سنوں۔ اس طرح ہوسکتا ہے کہ مجھے اتنا کچھ..... سننے کو مل جائے کہ مقدمے کے موقع پر ریاست کو زیادہ مشکلات اور اخراجات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

ڈینی ولمر بارش کی وجہ سے عجلت میں تھا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ اس نے زینے کے آرائشی جنگلے کو عبور کیا اور لوہے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر کر غائب ہوگیا۔

میں نے اسے نیچے تک جانے کے لیے ایک منٹ کا

وقت دیا پھر میں بھی چھت پر دوڑتا ہوا فائر اسکیپ تک پہنچا اور نیچے اترنے لگا۔

ڈینی ولمر کا فلیٹ اوپری منزل پر پچھلی جانب تھا۔ میں فائر اسکیپ کے ذریعے اس فلیٹ کی عقبی کھڑکی کے پاس پہنچ کر وہیں دبک گیا۔ کھڑکی مکمل طور پر بند نہیں تھی۔ میں دھیرے دھیرے اپنا سر کھلی ہوئی کھڑکی کی جانب سرکانے لگا۔

اندر بیڈ روم میں ایک دھیما بلب روشن تھا۔ اس مدھم روشنی میں ایک نوجوان عورت بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ حیرت اور وحشت کے مارے گم صم سی تھی۔ اس کا چہرہ زرد اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کے سنہری بال اس کے رخساروں پر لہرا رہے تھے۔ وہ کرب اور ناقابلِ یقین خوشی کے ملے جلے تاثرات سے پانی میں شرابور اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو اس کے بیڈ کے برابر میں کھڑا ہوا تھا۔

ڈینی ولمر پر اضطراب کی کیفیت طاری تھی۔ وہ اپنے ہاتھ میں موجود ٹوپی کو بار بار مروڑ رہا تھا۔ اس کے بھیگے بال اس کی پیشانی پر چپکے ہوئے تھے۔

اس نے اچانک اپنی ٹوپی نیچے گرا دی۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا اور اس نے اپنا چہرہ اپنی بیوی کے تکیے سے چھپا لیا۔ عورت نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ اس کے بالوں پر رکھ دیا اور اس کی انگلیاں ڈینی کے بالوں میں گردش کرنے لگیں اور انہیں سہلانے لگیں۔ عورت کے بے رونق رخساروں پر بے ساختہ آنسو بہنا شروع ہو گئے۔

''ڈینی!'' وہ سرگوشی کے لہجے میں دہرانے لگی۔ ''ڈینی!''

کچھ دیر بعد ڈینی نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اس عورت کے بے رونق رخساروں کو چومنے لگا۔ ''مجھے ابھی تمہارے بارے میں پتا چلا ہے للی!'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''میں نے جرسی سٹی تمہارے انکل کو فون کیا تھا۔ انہوں نے مجھے.... مجھے بتایا۔''

''لیکن تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' عورت کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔ ''ڈینی! ایک سراغ رساں نے کہا تھا کہ اگر انہوں نے کبھی تمہیں پکڑا تو تمہیں دس سال کی سزا ہو جائے گی۔''

''وہ مجھے پکڑ نہیں پائیں گے۔'' ڈینی نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے سے چمٹے رہے۔ ڈینی نے اسے مضبوطی سے اپنی بانہوں میں لیا ہوا تھا اور اسے بے تابی سے پیار کیے جا رہا تھا۔

دعا

اسکول لگنے سے پہلے دعا ہوئی۔ ہیڈ مسٹریس نے بچوں سے کہا کہ ہاتھ اٹھا کر تمام انسانوں کی صحت و سلامتی کے لیے دعا مانگیں۔

سب نے ہاتھ اٹھا لیے۔ ایک ننھی سی بچی یونہی کھڑی رہی۔ ہیڈ مسٹریس نے اس سے پوچھا۔ ''فارینہ! کیا تم نہیں چاہتیں کہ سب لوگ تندرست رہیں؟''

''جی نہیں میڈم۔''

''مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ پھر میں اور امی ابو بھوک سے مر جائیں گے۔ میرے ابو ڈاکٹر ہیں نا!''

مرسلہ: ممتاز علی، لیاقت آباد، کراچی

پھر عورت نے کراہنا شروع کر دیا۔ ''وہ سمجھتے کیوں نہیں، ڈینی؟ میں نے انہیں بتایا تھا کہ اس دن سے پہلے تم نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی شے چوری نہیں کی تھی۔ حتیٰ کہ میں نے اس ڈاکٹر سے شہادت بھی دلوا دی تھی کہ میرا مرض بڑھتا جا رہا ہے اور وہ میرا آپریشن کرنا چاہتا ہے جس کے لیے مجھے نیویارک سے باہر لے جانا ہوگا اور تمہارے پاس ان اخراجات کے لیے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی ڈینی کہ تم نے وہ چوری میری بیماری کی وجہ سے کی تھی اور...... اور......''

ڈینی نے اسے آگے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''پولیس والوں کے سامنے وضاحت کرنا، انہیں سمجھانا بے سود ہوتا ہے۔'' ڈینی کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''وہ بے حد سنگدل ہوتے ہیں اور کسی کی نہیں سنتے۔ غالباً... میرا خیال ہے کہ انہیں سنگدل ہونا بھی چاہیے۔ ورنہ ان کا کام نہیں چل سکتا۔''

مجھے اپنے سینے میں عجیب سی بے تابانہ دھڑکن محسوس ہونے لگی۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے کمرے میں خود جانا چاہیے اور اپنا ریوالور نکال کر ڈینی کو فوری طور پر حراست میں لے لینا چاہیے لیکن نہ جانے کون سی قوت مجھے اندر جانے سے روک رہی تھی۔ میں اس کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر تھا اور تب اچانک میں نے ڈینی کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ ''میں نے اس بارے میں سب کچھ سوچ لیا ہے، للی۔ جب میں یہاں سے رخصت ہوں گا تو سیدھا قریب ترین پولیس اسٹیشن چلا جاؤں گا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔''

''ڈینی نہیں!''

''مجھے یہی کرنا ہوگا۔'' ڈینی نے درشتی سے کہا۔ ''میں دوڑ دوڑ کر تھک گیا ہوں اور اپنے تعاقب سے عاجز آگیا ہوں۔ اگر میں نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا اور اعترافِ جرم کرلیا تو زیادہ سے زیادہ وہ مجھے دو سال کی سزا دے دیں گے۔ یہ دس سال قید کے مقابلے میں زیادہ بری سزا نہیں ہے۔ میں اسے قبول کرلوں گا۔''

''لیکن ڈینی۔'' اس نے سرگوشی کی۔ اس کے لہجے سے دہشت عیاں تھی۔ ''دو سال......''

''تو کیا ہوا؟ ایک بار جب مجھے رہائی مل جائے گی تو میں آزاد ہوں گا۔ میں صاف ستھری سیدھی زندگی گزاروں گا۔ مجھے اس طرح تمہارے پاس نہیں آنا پڑے گا۔''

''میرے پاس آؤ گے؟'' ملی کا لہجہ کھوکھلا تھا۔ ''ڈینی! ڈاکٹر نے کہا ہے......''

''میں جانتا ہوں کہ ڈاکٹر نے کیا کہا ہے۔'' ڈینی نے اپنی بیوی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں تمہیں یوں مرنے نہیں دوں گا۔ اگر تمہیں کسی بات کی توقع ہو اور تم اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر اس کی منتظر رہو گی تو اپنی اس بیماری سے شفایاب ہونے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔ تمہیں میرا انتظار کرنا ہوگا۔ رہائی پانے کے بعد ہم پہلے کی طرح اور ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔''

میں اس عورت کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی کیفیت تبدیل ہو رہی تھی۔ ان میں ایک پراسرار سی چمک آگئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس آدمی کی باتوں سے اس عورت کے اندر کسی روشنی نے جنم لے لیا تھا۔ اس کیفیت نے اس عورت کے چہرے کو تابناکی عطا کر دی تھی۔

اس عورت کو تکتے ہوئے مجھے احساس ہونے لگا کہ شاید ڈینی ولر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ شاید جینے کے کسی مقصد کی خاطر وہ موت کو شکست دے دے۔ اگر وہ یہ آس لگائی رہے کہ اس کا شوہر دس سال کے بجائے صرف دو سال بعد جیل سے رہا ہو جائے گا تو یہی امید اس کی شفایابی کا سبب بن سکتی ہے۔ اگر وہ رضاکارانہ طور پر خود کو قانون کے حوالے کر دیتا ہے تو یقیناً اسے سزا میں نرمی مل جائے گی جبکہ اگر میں اسے حراست میں لے لوں تو......

تب مجھے یاد آیا کہ میرا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے۔

میری ترقی!

مجھے بس یہی کرنا ہوگا کہ اس دبلے پتلے نوجوان کو اپنی گرفت میں لے لوں۔ اگر میں اسے خود حراست میں لے لوں تو اسے دس سال کی سزا ہو جائے گی۔ اس طرح یقیناً میری ترقی کی سفارش ہو جائے گی۔ اس بارے میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہوسکتا لیکن جب میں ان دونوں جوان میاں بیوی کو دیکھ رہا تھا تو میرے اندر کوئی شے چٹخ سی گئی...... ایک چھناکا سا ہوا اور تب میں نے کیا کیا؟

میں کھڑکی سے پلٹ گیا اور دبے پاؤں واپس چھت پر پہنچ گیا۔ بعد میں کیونکہ مجھے قطعی یقین نہیں تھا کہ ڈینی میں اتنا حوصلہ ہوگا کہ خود کو قانون کے حوالے کر دے گا، میں نے چھپ کر اس کا پیچھا کیا۔ میں بغیر کسی دشواری کے اسے گرفتار کر سکتا تھا...... لیکن یہ ضروری نہیں تھا۔

صبح سویرے جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں بیدار ہوگیا۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر بیڈ سائڈ پر رکھا ہوا فون اٹھالیا۔

لیفٹیننٹ کنیڈی کی بیزار کن آواز میری سماعت کو جھنجھوڑنے لگی۔ ''سیٹ! گزشتہ شب طوفانی بارش میں تم کہاں تھے؟''

''ڈینی ولر کے گھر کی نگرانی کر رہا تھا۔'' میں نے حیرانی سے جواب دیا۔ ''کیوں؟''

''سنو گاڈوی! صبح پانچ بجے ڈینی ولر نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے پہلے اپنی بیوی سے ملاقات کی اور پھر خود کو قانون کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر تم اور کونسی اس کے گھر کی نگرانی کر رہے تھے تو وہ تمہاری نظروں میں کیوں نہیں آیا؟'' لیفٹیننٹ کنیڈی کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

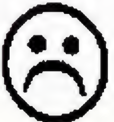
میں نے ایک گہرا سانس لیا اور قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''مجھے نہیں معلوم، کنیڈی۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے ہمیں چکما دے دیا ہو۔''

لیفٹیننٹ کنیڈی تمسخرانہ انداز میں غرایا۔ ''تم تو بالکل ہی نکمے سراغ رساں ثابت ہوئے۔ تم جیسا آدمی ترقی پانے کا اہل ہو ہی نہیں سکتا۔''

یہ کہہ کر اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

میں کچھ دیر تک خالی نظروں سے ٹیلی فون کو تکتا رہا۔ پھر میں واپس تکیے پر لیٹ گیا۔ دونوں ہاتھ اپنے سر کے نیچے باندھے اور چھت کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

میں نہیں سمجھتا کہ اگر آپ کا تعلق پولیس سے ہے تو آپ ہمیشہ سنگدلی سے کام لیں۔ آخر کو پولیس والے بھی انسان ہوتے ہیں اور ہر انسان کے دل میں کہیں نہ کہیں ایک نرم گوشہ ضرور ہوتا ہے۔



ریمنڈ آرسل کے لیے یہ ایک بڑا دن تھا۔ اگرچہ اس کے دن کا آغاز شام چار کے بعد ہوتا تھا کیونکہ وہ اسی وقت سو کر اٹھتا تھا۔ یہ اس کی مجبوری تھی کیونکہ اس کے کام کا آغاز سورج غروب ہونے کے بعد ہی ہوتا تھا۔ اس سے پہلے دو ڈھائی گھنٹے کی تیاری ہوتی تھی۔ ساڑھے چھ سات بجے تک وہ اپارٹمنٹ سے نکل جاتا۔ اس کا اپارٹمنٹ ایک خوب صورت اور پوش قسم کی بلڈنگ میں تھا مگر عمارت کی خوب صورتی سے قطع نظر یہاں رہنے والے ذرا عجیب قسم کے لوگ تھے۔ اس کی ایک مثال خود ریمنڈ تھا۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے آیا تو پرسنل باکس کے پاس رومیو نظر

بدنام

کاشف زبیر

وحشت اور بربریت کاش جنگل اور جانوروں تک ہی محدود رہتی مگر... افسوس کہ انسان نے اس کی ایسی مثالیں قائم کی ہیں کہ انسانیت بھی شرمندہ ہو کر رہ گئی... اس میں نہ تو کسی ایک قوم کا ہاتھ ہے اور نہ ہی کسی ایک طبقے کی کارگزاری... کچھ ایسا ہی حال ان ترقی یافتہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا تھا جو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور دنیا کے آگے ظالموں کا چہرہ بے نقاب کرنے نکلے تھے لیکن تمام عمر اپنا ہی چہرہ چھپانے پر مجبور ہو گئے... بد اور بدنام میں بس یہی تو ایک فرق ہے، کوئی صرف سوچتا ہے اور کوئی کر گزرتا ہے۔

اپنوں کی تلاش میں جنگل جنگل بھٹکنے والی دوشیزہ

کا خوفناک سفر



آیا۔ وہ تقریباً اٹھارہ برس کا تنومند اور طاقتور مگر بہت ہی شریف اور کسی حد تک بزدل لڑکا تھا۔ ریمنڈ نے کبھی اسے کسی سے الجھتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے دیکھ کر بہت ادب سے ہیلو ہائے کرتا تھا اور ریمنڈ کو اس لیے بھی اچھا لگتا تھا کہ لوگ اسے دیکھ کر زیرِ لب گالیاں ضرور دیتے تھے مگر ہیلو ہائے نہیں کرتے تھے کیونکہ سب جانتے تھے کہ ریمنڈ ڈرگ ڈیلر ہے۔

ریمنڈ ڈرگ ڈیلر تھا مگر اس نے کبھی گلی کوچوں میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کو منشیات فروخت نہیں کی تھی۔ اس کے گاہک لگے بندھے تھے۔ اس کے پاس نصف درجن نائٹ کلبس اور بارز تھے اور تقریباً تین درجن ایسے دولت مند گاہک تھے جو منشیات کے لیے گلی گلی پھرنا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے ریمنڈ ان کو ان کی پسند کا نشہ ان کے گھر پہنچاتا تھا اور اپنی پسند کی قیمت لیتا تھا۔ وہ بہت احتیاط سے کام کرتا تھا۔ اس کے باوجود لوگ اس کے بارے میں جان گئے تھے۔

آج وصولیوں کا دن تھا اور اسے خاصی بڑی رقم وصول کرنا تھی۔ انفرادی گاہکوں سے ہاتھ کے ہاتھ وصولی کی جاتی تھی لیکن بارز اور نائٹ کلبس والے ہفتے میں ادائیگی کرتے تھے۔ ردمیو سے ہیلو ہائے کر کے وہ باہر آیا تو سامنے فٹ پاتھ پر کھمبے سے ٹیک لگائے اپنے موبائل میں مگن جین دکھائی دی۔ جین سولہ سترہ برس کی خوب صورت لیکن تیز طرار لڑکی تھی۔ اس کا کوئی گھر نہیں تھا اور وہ بے سہارا لڑکیوں کے لیے مخصوص ادارے میں رہتی تھی۔ وہ ہائی اسکول میں تھی اور مجبوراً پڑھ رہی تھی صرف اسی صورت میں وہ اس ادارے میں رہ سکتی تھی کہ تعلیم جاری رکھے۔ یہ اس کا آخری سال تھا اور اس نے امتحان دے دیا تھا۔ وہ خراب لڑکی نہیں تھی مگر اس نے حلیہ خراب لڑکیوں والا ہی رکھا تھا۔

دس بجے تک وہ تمام کاموں اور وصولیوں سے فارغ ہو گیا اور اس کی پشت پر بندھے بیگ میں تقریباً پچاس ہزار ڈالرز کی خطیر رقم تھی۔ مگر اس میں اس کا حصہ صرف پانچ ہزار ڈالرز تھا اور باقی پینتالیس ہزار ڈالرز اسے بروس جارڈی کو پہنچانے تھے۔ بروس جارڈی لاس اینجلس کا ایک جانا پہچانا منشیات اسمگلر تھا۔ وہ جنوبی امریکا سے کوکین اور میری جوانا منگوا کر پورے جنوب اور مغربی امریکا میں سپلائی کرتا تھا۔ اس کا شمار منشیات فروش مافیا میں ہوتا تھا۔ ریمنڈ ان چند خوش نصیب افراد میں سے تھا جن سے وہ براہِ راست ڈیل کرتا تھا اور اسی وجہ سے ریمنڈ کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مارجن مل جاتا تھا۔ اس کے باوجود اس کی آمدنی زیادہ نہیں تھی کیونکہ وہ جیسا مال لیتا تھا ویسا ہی آگے سپلائی کر دیتا تھا۔ وہ ملاوٹ کا قائل نہیں تھا یہی وجہ تھی کہ اس کے گاہک اس سے بہت خوش تھے۔ جیب میں رقم آئی تو ریمنڈ کا موڈ بن گیا۔ اس نے بائیک کا رخ ایک اعلیٰ درجے کے ریستوران کی طرف موڑ دیا۔ وہاں سے... پرتکلف ڈنر کر کے وہ باہر نکل رہا تھا کہ ایک آدمی نے اسے روک لیا۔

"ہے ریمنڈ! یہ تم ہو؟"

ریمنڈ نے اسے پہچاننے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ "ہاں لیکن تم......؟"

"میں جون ہوں...... ہنری جون۔ تمہارا اسکول فیلو۔"

"ہائے جون۔" اس بار ریمنڈ پہچان گیا۔ "تم کیا کر رہے ہو؟"

"اب میں اسٹاک بروکر ہوں۔" اس نے فخر سے کہا۔ "میرا گھر ہے، بیوی اور تین بچے ہیں۔ تم کیا کر رہے ہو؟"

ریمنڈ ہچکچایا۔ "میں اکیلا ہوں اور وہی کام کر رہا ہوں۔"

"ڈرگ ڈیلنگ۔" جون نے کہا۔ "مجھے معلوم تھا تم یہی کام کرو گے۔ اسکول میں بھی تم یہی کام سب سے اچھے طریقے سے کرتے تھے ایک بار بھی تم پکڑے نہیں گئے۔ مگر اکیلے کیوں ہو؟"

ریمنڈ نے سرد آہ بھری۔ "پتا نہیں شاید اس لیے کہ سب جانتے ہیں کہ میں ڈرگ ڈیلر ہوں۔"

جون کے موبائل کی بیل بجی تو اس نے نکال کر دیکھا اور جلدی سے ریمنڈ سے ہاتھ ملایا۔ "گھر سے کال آئی ہے۔ وہاں میرا انتظار ہو رہا ہے۔ میری چھوٹی بیٹی کی سالگرہ ہے اس کے لیے کیک لینے آیا تھا۔"

"اوہ ہیپی برتھ ڈے۔" ریمنڈ نے کہا اور اپنے بیگ میں بچ جانے والی ایک میری جوانا کی تھیلی نکال کر جون کی طرف بڑھا دی۔ "پرانے دنوں کے نام پر۔"

ریمنڈ کا خیال تھا کہ وہ انکار کر دے گا مگر وہ کھل اٹھا اور اس نے جلدی سے تھیلی لے کر کیک والے شاپر میں ڈال دی اور اس کا شکریہ ادا کر کے کار کی طرف لپکا۔ کار کے عقبی شیشے پر کارٹون کی صورت میں ایک فیملی کی تصویر لگی تھی۔ اس میں ماں باپ اور تین بچوں کے ساتھ ان کا کتا بھی

تھا۔ کار آگے روانہ ہوئی تو ریمنڈ سرد آہ بھر کر روانہ ہو گیا۔ عمارت کی سیڑھیوں پر رومیو اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کا کوئی دوست نہیں تھا اور نہ ہی کوئی گرل فرینڈ تھی۔ وہ ہائی اسکول پاس کر کے ایک کارپینٹر کے پاس کام کر رہا تھا مگر وہ بیس بال کا کھلاڑی بننا چاہتا تھا۔ اس نے پھر ریمنڈ کو دیکھ کر ہائے کہا مگر وہ اسے نظر انداز کر کے اندر آ گیا۔ اسی لمحے پیچھے سے این اندر آئی۔ وہ دونوں ایک ساتھ پرسنل باکس تک پہنچے۔ این نے اسے دیکھ کر منہ بنایا۔ وہ اس کی پڑوسن تھی مگر اسے ناپسند کرتی تھی۔ وہ خوش شکل اور متناسب جسم والی عورت تھی، عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ انہوں نے چابی سے اپنے اپنے باکس کھولے۔ ریمنڈ نے اندر سے لفافے نکالے اور بولا۔

''آج کا دن کیسا گزرا؟''

''تمہیں کیا کہ کیسا گزرا؟''

''ایک پڑوسی ہونے کے ناتے......''

''اپنے کام سے کام رکھو منشیات فروش۔'' این کہتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھی تھی کہ ریمنڈ نے ایک لفافہ الگ کر کے کہا۔

''سنو، میرا خیال ہے یہ تمہارا لفافہ ہے۔ غلطی سے میرے باکس میں آ گیا۔ بلڈنگ منیجر کی طرف سے کرایہ ادا کرنے کا وارننگ لیٹر۔''

این واپس آئی اور لفافہ جھپٹ کر زیر لب بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ ریمنڈ سرد آہ بھر کر اس کے پیچھے جانے لگا تھا کہ اسے رومیو کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اے، یہ کیا کر رہے ہو؟''

ریمنڈ نے پلٹ کر دیکھا تو سڑک پار عمارتوں کے درمیان عقبی گلی میں جین چند لڑکوں کے درمیان میں دکھائی دی اور وہ کوئی چیز ایک دوسرے کی طرف اچھال رہے تھے اور جین ان سے واپس لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے آواز دے کر رومیو کو روکنا چاہا مگر اتنی دیر میں وہ سڑک پار کر کے گلی میں پہنچ گیا تھا۔ یہ ریمنڈ کا معاملہ نہیں تھا مگر وہاں جھگڑا ہوتا تو پولیس آ جاتی اور وہ پولیس سے دور رہنے کی... ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ بادلِ ناخواستہ وہ باہر آیا۔ اس دوران میں لڑکے مداخلت کرنے پر رومیو کو نیچے گرا کر ٹھوکریں مار رہے تھے۔ ریمنڈ گلی تک پہنچا اور خوشگوار لہجے میں بولا۔ ''کیا ہو رہا ہے دوستو؟''

لڑکے چار تھے وہ اس مداخلت پر خوش نہیں ہوئے۔ ایک لمبے تڑنگے سیاہ فام نے کہا۔ ''یہاں سے دفع ہو جاؤ، اس سے پہلے کہ تمہارے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے۔''

ٹھوکریں رکیں تو رومیو جلدی سے اٹھ کر ریمنڈ کے عقب میں آ گیا۔ جین نے کہا۔ ''یہ میرا آئی فون نہیں دے رہے۔''

''تمہارے پاس رہنے کو گھر نہیں ہے اور آئی فون ہے۔''

''تمہارے پاس تو گھر ہے نا۔'' جین زہریلے لہجے میں بولی۔

''مسٹر! تم ہو کون؟'' سیاہ فام نے پوچھا۔

''مسٹر ریمنڈ بہت اچھے آدمی ہیں۔'' عقب سے رومیو نے کہا۔ ''یہ ڈرگ ڈیلر ہیں۔''

یہ سنتے ہی چاروں لڑکوں کی نظریں اس کے بیک پیک پر مرکوز ہو گئیں۔ سیاہ فام نے چاقو نکال لیا اور بولا۔ ''اپنا بیگ ادھر دو۔''

ریمنڈ نے دونوں ہاتھ آگے کیے۔ ''اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تم بیگ دیتے ہو یا میں تمہاری گردن کاٹ کر خود اتار لوں۔''

ریمنڈ لڑائی جھگڑے والا آدمی نہیں تھا مگر وہ یہ بیگ بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس میں پچاس ہزار ڈالرز تھے۔ اس نے زیر لب کہا۔ ''لعنت ہے۔'' اور بیگ اتارتے ہوئے آگے بڑھا مگر نزدیک جاتے ہی اس نے بیگ گھما کر سیاہ فام کے چاقو والے ہاتھ پر مارا اور نزدیکی سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ یہ ہنگامی حالات کے لیے مخصوص سیڑھیاں تھیں۔ وہ تیزی سے چڑھ کر اوپر آیا اور پہلا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ انہیں چکما دے کر نکل جائے گا مگر لڑکے اس جگہ سے زیادہ واقف تھے۔ وہ ایک دروازہ کھول کر دوبارہ سیڑھیوں پر آیا تو گھر چکا تھا۔ اوپر نیچے اور سامنے لڑکے موجود تھے اور ایک عقب سے بھی آ گیا۔ فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔ اس نے چالیس فٹ نیچے دیکھا تو اسے کھلا ہوا کچرے دان نظر آیا۔ اس نے رقم والا بیگ اس میں پھینکا اور پھر خود بھی چھلانگ لگا دی مگر بدقسمتی سے بیگ نے گرتے ہوئے ڈھکن کا لیور دبا دیا اور ڈھکن بند ہو گیا۔ ریمنڈ اس پر جا گرا۔ ابھی وہ کمر پکڑ کر کراہ رہا تھا کہ چاروں بدمعاش نیچے آ گئے اور انہوں نے جانے سے پہلے اس کی تسلی بخش مرمت بھی کی۔ اس کے حواس بحال ہوئے تو رومیو اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

''مسٹر ریمنڈ! تم ٹھیک ہو..... کیا میں پولیس کو کال

کروں؟''

''مہربانی کر کے تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' اس نے اپنا سر دباتے ہوئے کہا۔ اس کا بیگ غائب تھا اور ظاہر ہے اس میں موجود پچاس ہزار ڈالرز بھی غائب تھے جس میں جارڈی کا حصہ بھی شامل تھا۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے جسم میں خوف کی سرد لہر سی دوڑ گئی۔ کئی سال پہلے جب اس نے یہ دھندا شروع کیا تھا تب جارڈی نے اسے ایک لاکھ ڈالرز کا ادھار مال دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس سے اوپر جو مال خریدے گا، اس کی ادائیگی کرتا رہے اور پانچ سال بعد وہ ایک لاکھ ڈالرز واپس کردے گا تب وہ اسے ڈسٹرکٹ ڈیلر بنا دے گا مگر اس نے ادائیگی میں تاخیر کی تو اس کی ڈیلر شپ منسوخ ہو جائے گی اور اس صورت میں اسے ایک لاکھ ڈالرز بھی واپس کرنے ہوں گے۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا وقت آ گیا ہے کیونکہ وہ اب جارڈی کو پینتالیس ہزار ڈالرز نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے پاس کل بیس ہزار ڈالرز تھے۔ وہ اچھا کماتا تھا مگر خرچ بھی کھل کر کرتا تھا اسی وجہ سے اس کے پاس زیادہ رقم نہیں تھی۔ یہ بیس ہزار ڈالرز بھی شیئرز کی صورت میں تھے اور وہ انہیں فروخت کرتا تو اسے نقد رقم ملتی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور رومیو پر غرایا۔

''بزدل، تم دیکھتے رہے؟''

رومیو نے بے بسی سے ہاتھ پھیلائے۔ ''میں کیا کر سکتا تھا۔ وہ چار تھے اور چاروں بدمعاش تھے۔''

ریمنڈ جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ ان لڑکوں کو جانتا تھا لیکن ان کے پیچھے جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایک تو وہ خطرناک تھے اور دوسرے وہ صبح تک یہ رقم اڑا چکے ہوں گے۔ اگلے دن وہ نزدیکی بار میں بیٹھا ہوا جارڈی کی آنے والی کالز کاٹ رہا تھا۔ جارڈی اس سے رقم کا مطالبہ کرتا اور اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بار سے نکلا تو سامنے بل اور ہیمر کھڑے تھے۔ بل سیاہ فام تھا اور ہیمر ملاٹو تھا مگر دونوں ہی تنومند اور خطرناک تھے۔ انہوں نے بلاتکلف اسے پکڑ کر اپنی سیاہ وین میں ڈالا اور اس کے منہ پر کپڑے کا غلاف چڑھا کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ آدھے گھنٹے بعد اس کے منہ سے غلاف اتارا تو وہ جارڈی کے دفتر میں موجود تھا۔ عقب میں ایک بہت بڑا فش ایکوریم تھا جس میں مختلف مچھلیوں کے ساتھ ایک دیو ہیکل شارک بھی تیر رہی تھی۔ ریمنڈ نے نیچے دیکھا اور اچھل پڑا کیونکہ اعلیٰ درجے کی ٹائلوں سے بنے فرش پر ایک بڑی سی پلاسٹک شیٹ بچھی ہوئی تھی۔ اس نے گڑگڑا کر کہا۔

''پلیز مسٹر جارڈی...... میں ڈکیتی کا شکار ہوا ہوں۔ میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا۔''

''درست۔'' جارڈی نے نرم لہجے میں کہا۔ سفید بالوں اور متناسب جسامت والا بروس جارڈی کہیں سے مافیا چیف نہیں لگتا تھا مگر یہ اس کا ظاہری روپ تھا۔ ریمنڈ اچھی طرح جانتا تھا کہ اندر سے وہ کسی وحشی اجڈ نظر آنے والے منشیات فروش سے کم خطرناک نہیں۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ کم سے کم سو افراد اس کے اشارے پر دنیا سے رخصت کیے گئے تھے اور پولیس کسی ایک کے بھی قتل کی فردِ جرم اس پر عائد نہیں کر سکی تھی۔ وہ اسے شانے سے تھام کر کرسی تک لایا اور اس پر بٹھا کر بولا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

ریمنڈ نے خوفزدہ نظروں سے پلاسٹک شیٹ کی طرف دیکھا جو یقیناً فرش کو اس کے خون سے بچانے اور پھر لپیٹ کر اس کی لاش ٹھکانے لگانے کے لیے وہاں بچھائی گئی تھی۔ ''پھر یہ کس لیے ہے؟''

جارڈی نے بلند آہنگ قہقہہ مارا۔ ''اوہ یہ...... دراصل دوپہر کے وقت اوپر سے سورج کی شعاعیں سیدھی آتی ہیں اور ان سے ٹائلوں کا رنگ خراب ہو سکتا ہے تو اس لیے یہ شیٹ یہاں بچھائی گئی ہے۔'' اس نے کہتے ہوئے ریمنڈ کے زخموں کا جائزہ لیا۔ ''یہ کس نے کیا؟''

''کل رات مجھے لوٹ لیا گیا۔'' ریمنڈ نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کیا۔ ''چار لفنگے مجھ سے رقم والا بیگ چھین کر لے گئے۔''

''ڈکیتی والی بات غلط ہے۔'' جارڈی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم شارلی کے گروہ کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ ایک آوارہ لڑکی کی وجہ سے۔''

ریمنڈ حیران تھا کہ یہ خبر اتنی جلدی جارڈی تک کیسے پہنچ گئی۔ مجبوراً اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں مسٹر جارڈی......''

''میری رقم کہاں ہے؟''

ریمنڈ نے پختہ لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایک مہینے میں ساری رقم ادا کر دوں گا۔''

''ایک مہینا بہت ہوتا ہے۔ مجھے اپنی رقم ابھی چاہیے۔'' جارڈی نے صاف انکار کر دیا۔ ''پینتالیس ہزار ڈالرز نہیں، ایک لاکھ پینتالیس ہزار ڈالرز۔''

ریمنڈ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آ گیا۔ جو خدشہ اس کے ذہن میں تھا، وہ اچانک ہی حقیقت بن کر سامنے آیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جارڈی بات برائے بات نہیں کرتا، اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ حتمی ہوتے ہیں۔ مگر

اس نے پھر کہا۔ ''پلیز مسٹر جارڈی! میں نے کبھی دیر نہیں کی لیکن اس بار......''

جارڈی نے اس کی بات نظر انداز کر کے سامنے رکھی بوتل سے قیمتی سبز شراب گلاس میں انڈیلی اور پھر اس میں برف کی ڈلی ڈال کر ایک گھونٹ لیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس کے نزدیک دنیا میں اس سے زیادہ اہم کام اور کوئی نہیں ہے۔ ریمنڈ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب جارڈی فیصلہ سنائے گا اور اس کے گرگے اس پر عمل کریں گے۔ وہ ذہنی طور پر خود کو تیار کرنے لگا۔ پلاسٹک شیٹ کے بارے میں جارڈی کی وضاحت سے اس کا خوف جو کم ہوا تھا، وہ پھر سے ابھرنے لگا۔ مگر خلافِ توقع جارڈی نے فیصلہ سنانے کے بجائے اس سے کہا۔ ''تمہارے پاس ایک چانس ہے۔''

ریمنڈ خوش ہو گیا۔ ''میں نے کہا نا مسٹر جارڈی کہ میں ایک مہینے میں تمہاری رقم لوٹا دوں گا۔''

''وہ بات بھول جاؤ۔'' جارڈی نے غرا کر کہا۔ ''میری اور تمہاری ڈیل ختم ہو گئی ہے۔ تم میرے ایک لاکھ پینتالیس ہزار ڈالرز نہیں دے سکتے اس لیے اب تم میرا ایک کام کرو گے اور اس کے بعد تم آزاد ہو گے۔''

''کیسا کام مسٹر جارڈی۔'' ریمنڈ نے مردہ لہجے میں دریافت کیا۔ اسے معلوم تھا کہ جارڈی جو کام بتائے گا، وہ اس کے لیے ہرگز آسان نہیں ہوگا۔ مگر جارڈی نے جو کام بتایا، اسے سن کر اسے لگا کہ جارڈی نے اسے اصل میں اس طرح سزا دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نے کہا۔

''تمہیں میکسیکو جا کر میرے لیے منشیات کی ایک کھیپ لانی ہوگی۔''

''کیریئر؟'' ریمنڈ نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کبھی یہ کام نہیں کیا ہے۔''

جارڈی نے منہ بنایا اور حقارت سے بولا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، میں ایک دو کلو مال کی بات کر رہا ہوں۔ یہ سو کلوگرام خالص میری جوانا کی کھیپ ہے جو ہیں اکتوبر تک یہاں ہونی چاہیے۔ یعنی آج سے ٹھیک آٹھ دن بعد۔''

''سو کلوگرام۔'' ریمنڈ کے ہوش ایک بار پھر اڑ گئے۔ وہ ہفتے میں ایک کلوگرام منشیات فروخت کرتا تھا۔ ''مسٹر جارڈی! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

عقب میں موجود ایکوریم میں ایک پانی کا بلا سست انداز میں تیر رہا تھا۔ اچانک شارک جھپٹی اور اسے اپنے مہیب جبڑوں میں دبوچ لیا۔ پانی کا بلا تڑپا مگر خود کو چھڑا نہیں سکا۔ شارک اسے ایک طرف لے گئی اور پیچھے خون کی لکیر رہ گئی۔ ریمنڈ دم بخود دیکھ رہا تھا۔ جارڈی آگے جھکا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''تمہیں یہ کام کرنا ہے۔''

''اوکے۔'' ریمنڈ نے کہا۔ ''مجھے اس کے بدلے کیا ملے گا؟''

''ایک لاکھ ڈالرز۔''

☆☆☆

ریمنڈ جانتا تھا کہ میکسیکو امریکا کا بارڈر دنیا کے مشکوک ترین بارڈر کراسنگ میں شمار ہوتا ہے اور یہاں سے گزرنے والی ہر گاڑی کی باریک بینی سے تلاشی لی جاتی ہے۔ خاص طور سے اگر وہ گاڑی میکسیکو سے آ رہی ہو۔ ذرا سے شک پر گاڑی کی مکمل تلاشی لی جاتی تھی۔ جارڈی نے اسے ایک دلدل میں دھکیلنے کا فیصلہ کیا تھا جس سے زندہ سلامت واپسی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے لیکن وہ انکار نہیں کر سکتا تھا اور فرار بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ بل اور ہیمر اس کی چوبیس گھنٹے نگرانی کر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح یہ کام کرے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ پکڑا گیا تو تاعمر جیل سے باہر نہیں آ سکے گا اور ابھی اس کی عمر پینتیس برس بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ عمر اور صحت کے بہترین دور میں تھا اور اپنا یہ دور جیل کے حوالے کرنے کو... ہرگز تیار نہیں تھا مگر دوسری طرف اس کے پاس کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ اسے یہ کام کرنا تھا۔ انکار کی سزا جارڈی اسے پہلے ہی بتا چکا تھا۔ وہ اسے ایکوریم میں ڈال دیتا جس میں شارک تھی۔ ریمنڈ نے منشیات فروخت ضرور کی تھی لیکن اسے اس کی اسمگلنگ کا ہرگز کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ رومیو کے ساتھ عمارت کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ یہ کام کس طرح کرے۔ رومیو نے کہا۔

''تمہارے لیے کیا مشکل ہے..... تم ڈرگ ڈیلر تو ہو۔''

''بے وقوف، یہ ڈرگ اسمگلنگ ہے۔ اس میں اور ڈرگ ڈیلنگ میں فرق ہوتا ہے۔''

رومیو کی عقل محدود تھی اور وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ان دونوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ لیکن ریمنڈ نے کہا تھا اس لیے اس نے مان لیا۔ سامنے سڑک پر ایک سفری ہوم ٹریلر آ کر رکا اور اس سے ایک موٹی عینک والے آدمی نے جھانک کر پوچھا۔ ''پیراڈائز ٹاؤن کی طرف کون سا راستہ جاتا ہے؟''

ریمنڈ کا موڈ خراب تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''جہنم کا راستہ۔''

اسی لمحے ایک پولیس والا آ گیا اور اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ''تم یہاں گاڑی پارک نہیں کر سکتے۔''

''اوہ، میں بیٹے، پارک نہیں کی ہے۔'' عینک والے نے جواب دیا۔ ''میں راستہ سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟''

ریمنڈ کا خیال تھا کہ پولیس والا اسے ٹکٹ تھما دے گا۔ اس دوران میں ٹریلر کی عقبی کھڑکی سے تین بچے جھانکنے لگے تھے جبکہ عینک والے کے ساتھ بیٹھی عورت یقیناً اس کی بیوی تھی۔ پولیس والے نے خوش خلقی سے کہا۔ ''کیوں نہیں، تمہارے پاس نقشہ ہے؟''

آدمی نے نقشہ نکالا تو پولیس والا اسے سمجھانے لگا کہ اسے کس راستے سے جانا ہے۔ راستہ سمجھ کر اس نے پولیس والے کا شکریہ ادا کیا۔ اچانک ایک خیال آیا اور ریمنڈ اچھل پڑا۔ اس نے چلا کر عینک والے سے کہا۔ ''تمہارا بہت شکریہ۔''

''تم اس کا شکریہ کیوں ادا کر رہے تھے؟'' رومیو نے حیرت سے پوچھا۔

''اسے چھوڑو، یہ بتاؤ کہ کیا تم میکسیکو کی سیر کرو گے؟''

رومیو مسکرانے لگا۔ ''کیوں نہیں مگر میرے پاس رقم نہیں ہے۔''

''رقم کی فکر مت کرو اور یہ لڑکی جین..... کیا یہ تیار ہو جائے گی ہمارے ساتھ چلنے کے لیے؟''

''میں اس سے بات کرتا ہوں۔'' رومیو مزید خوش ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ تینوں ایک کیفے میں بیٹھے تھے اور جین مان گئی تھی۔ اس کی آمادگی میں ہزار ڈالرز کا ہاتھ تھا جو ریمنڈ نے اسے میکسیکو سے واپسی پر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے دونوں کو سو سو ڈالرز دیے اور ان سے کہا کہ وہ اپنا حلیہ شریف بچوں والا بنا لیں اور اسی لحاظ سے لباس لیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں بارڈر پر منشیات کا اسمگلر سمجھ کر روک لیا جائے۔ گھر آتے ہوئے ریمنڈ بہت خوش تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ سفری ہوم ٹریلر میں ایک خاندان کے ساتھ سفر کرے گا تو کسٹم حکام اور اینٹی ڈرگ ایجنسی اس پر شک نہیں کریں گے۔ مگر ابھی اس کا خاندان نامکمل تھا۔ اسے ایک عورت کی ضرورت تھی جو اس کی بیوی کا کردار ادا کر سکے۔ وہ اپارٹمنٹ میں داخل ہو رہا تھا کہ اس کی نظر اپنے دروازے پر لگے ریڈ نوٹس پر گئی۔ اس کے مطابق اسے دو دن میں چار مہینے کا کرایہ ادا کرنا تھا ورنہ اسے فلیٹ خالی کرنا تھا۔ اس نوٹس کو دیکھتے ہوئے ریمنڈ کو خیال آیا کہ وہ این سے کیوں نہ بات کر کے دیکھے۔

☆☆☆

این اسٹیج پر واک کرتے ہوئے دائیں جانب بیٹھے تماشائیوں کا دل بہلا رہی تھی۔ وہ جو کام کر رہی تھی، اسے عرف عام میں اسٹرپٹیز کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ چند لڑکیاں اور بھی تھیں۔ یہ ایک نارمل قسم کا نائٹ کلب اور بار تھا اور اس کی اچھی بات یہ تھی کہ انہیں پورا لباس نہیں اتارنا پڑتا تھا اور نہ ہی انہیں جسم فروشی پر مجبور کیا جاتا۔ اپنا وقت مکمل کر کے وہ ڈریسنگ روم میں آئی اور گاؤن پہن کر آئینے کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ اپنا میک اپ صاف کر رہی تھی۔ اس کی شفٹ بارہ بجے ختم ہو جاتی تھی اور وہ چھٹی کر کے گھر چلی جاتی۔ وہ ایک سال سے یہی کام کر رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ اسی نائٹ کلب میں ویٹریس کے طور پر کام کرتی تھی مگر اب اسے زیادہ آمدنی کی ضرورت تھی۔ درحقیقت اس کام سے بھی اس کی ضرورت پوری نہیں ہو پا رہی تھی اور وہ کئی مہینے سے اپنے فلیٹ کا کرایہ ادا نہیں کر سکی تھی۔ بلڈنگ منیجر شریف آدمی تھا ورنہ اسے کب کا نکال باہر کر چکا ہوتا۔ وہ اپنی وگ اتارنے جا رہی تھی کہ زکی نے اندر جھانکا اور ہلکی سی سیٹی بجا کر بولا۔

''ہیے سوئٹی۔''

''میں آف کر چکی ہوں۔''

''صرف ایک آدمی۔'' زکی نے کہا۔ وہ کلب منیجر تھا۔ ''اس نے خاص طور سے تمہیں بلایا ہے۔ ممکن ہے اچھا کیش بھی دے۔''

این مجبوراً باہر آئی اور اس آدمی کی طرف دیکھا جو بار کاؤنٹر سے لگا کھڑا تھا۔ زکی نے اس کی طرف اشارہ کیا تو این اس کے پاس پہنچی اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو ریمنڈ نے مڑ کر دیکھا۔ این نے نفی میں سر ہلایا اور پلٹی تو زکی نظر آیا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے انگلی سے اشارہ کیا کہ وہ گاہک کا دل بہلائے تو این نے دانت پیس کر ریمنڈ کو گریبان سے پکڑا اور ایک کرسی پر دھکیل کر بولی۔ ''کیا بات ہے، کیا چاہتے ہو؟''

''پہلے تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب تم خود ایسی جگہ جاب کرتی ہو جہاں منشیات استعمال کی جاتی ہے اور ممکن ہے تم بھی منشیات گاہکوں تک پہنچاتی ہو تو پھر میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتی ہو؟''

این دھم سے اس کے پیروں پر بیٹھی۔ ''اس لیے کہ تم منشیات فروش ہو۔''

''اس کے باوجود میں شریف آدمی ہوں۔'' ریمنڈ نے کراہ کر کہا۔ ''اگر شریف آدمی نہ ہوتا تو اس مصیبت میں کیوں پھنسا ہوتا؟''

این چونکی۔ ''کیسی مصیبت؟''

ریمنڈ نے سرگوشی میں اسے اپنی پرانی کہانی سنائی اور پھر جارڈی کی دھمکی سے بھی آگاہ کیا۔ "اگر میں نے اس کا کام نہیں کیا تو میری لاش بھی نہیں ملے گی۔ اس کی پالتو شارک مجھے ہضم کرلے گی۔"

این نے اس کی طرف دیکھا۔ "او کے تم شارک کا نوالہ نہیں بننا چاہتے تو مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

ریمنڈ نے ہمت کر کے اسے بتایا کہ وہ اس سے کیا چاہتا ہے۔ حسب توقع این نے فوراً انکار کر دیا۔ "منشیات کی اسمگلنگ..... کسی صورت نہیں۔"

"میں تمہیں دس ہزار ڈالرز دوں گا۔" ریمنڈ نے ایک چیک نکال کر اسے دیا۔ "صرف چند دن کی بات ہے۔"

این نے چیک لیا اور اسے توڑ مروڑ کر واپس ریمنڈ کے منہ پر مارا۔ "تمہارا وقت پورا ہو گیا۔"

"این! میری بات سنو۔" ریمنڈ نے کہا تو این نے جاتے جاتے اسے واہیات اشارہ کیا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے بس رومیو اور جینی کو فیملی بنا کر ساتھ لے جانا پڑے گا۔ اگلے دن اس نے ان دونوں کو اڈاپٹ کیا انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ رومیو میکسیکو کے ٹرپ پر خوش تھا اور جینی ہزار ڈالرز کے خیال میں مگن تھی۔ اب وہ ایک خاندان کی طرح تھے۔ اب صرف ایک کام رہ گیا تھا اور وہ تھا سفری ہوم ٹریلر کا بندوبست۔ یہ ٹریلر خریدنے میں خاصا مہنگا پڑتا اس لیے ریمنڈ نے آسان کام کیا۔ اس نے جارڈی سے کہا کہ اسے ایک سفری ہوم ٹریلر چاہیے اور اگلے دن اسے گاڑی مل گئی۔ یہ ایک ورکشاپ میں کھڑی تھی جہاں اس میں خفیہ خانے بنائے گئے۔ ان خفیہ خانوں میں منشیات چھپا کر لائی جاسکتی تھی۔

☆☆☆

این، ریمنڈ کی پیشکش اس کے منہ پر مار کر بہت خوش تھی مگر اس کی خوشی اس وقت خاک میں مل گئی جب زکی نے اسے بتایا کہ اب یہاں کام کرنے والی لڑکیوں کو گاہکوں کے ساتھ جانا بھی ہوگا۔ این نے پوچھا۔ "کیا مطلب؟ اب ہم جسم فروشی بھی کریں گے؟"

"رقم لے کر۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مگر کیوں؟ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔"

"مڑک پار پارسکا نے یہ کام شروع کر دیا ہے۔ اگر ہم نے نہیں کیا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

"میں استعفا دیتی ہوں۔" این نے کہا۔

"تمہاری مرضی، باقی سب راضی اور بہت خوش ہیں۔" زکی نے شانے اچکائے۔ اس رات این گھر آئی تو دروازے کا تالا کھولنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں کھلا۔ اس نے بلڈنگ منیجر جانسن کو کال کی تو اس نے رسانیت سے کہا۔

"سوری این، تم نے کرایہ نہیں دیا اس لیے فلیٹ کا لاک بدل دیا گیا ہے۔"

"لیکن میرا سامان؟"

"اس کے لیے میں آرہا ہوں۔" جانسن بولا۔

☆☆☆

رومیو اور جینی شاندار ہوم ٹریلر دیکھ کر خوش تھے۔ یہ اصل میں مائیکروبس تھی جس میں دو عدد بیڈ رومز، دو واش رومز، ایک لاؤنج اور ایک کچن تھا۔ گاڑی تقریباً نئی تھی اور اس میں ہر سہولت کے ساتھ اعلیٰ درجے کا میوزک سسٹم بھی لگا ہوا تھا۔ رومیو نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ "میں بتا نہیں سکتا کہ میں تمہارا کتنا شکر گزار ہوں۔"

البتہ جینی نے شکریے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور عقبی نشست پر اپنا آئی فون لے کر بیٹھ گئی۔ ریمنڈ گاڑی لے کر اپارٹمنٹ تک آیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور انجن اسٹارٹ کیا تھا کہ این اندر آئی۔ اس نے ایک بیگ اٹھا رکھا تھا۔ وہ آکر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ریمنڈ کھل اٹھا۔

"ہائے این! تم مان گئیں؟"

"ہاں۔" این نے سرد لہجے میں کہا۔ "لیکن تیس ہزار کے بدلے۔"

"یہ بہت زیادہ ہیں۔" ریمنڈ نے کہا تو وہ خاموشی سے اٹھی اور اپنا بیگ اٹھا کر نیچے اترنے لگی تھی کہ ریمنڈ نے ہتھیار ڈال دیے۔ "او کے..... او کے مجھے منظور ہے۔"

این مسکراتی ہوئی واپس آئی اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے رومیو اور جینی کی طرف دیکھا۔ "یہ دونوں ہمارے بچے ہیں؟"

اس پر رومیو مسکرایا اور جینی نے برا سا منہ بنایا۔

"بالکل۔" ریمنڈ نے کہا۔ "اور بچو، یہ تمہاری مام ہے این آرسنل۔"

"پاسپورٹ پر میرا یہ نام نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں، ہم تمہیں پروفیشنل ظاہر کریں گے۔"

ریمنڈ نے کہہ کر انجن اسٹارٹ کیا اور اعلان کرنے کے انداز میں بولا۔ "اب ہم میکسیکو کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔"

لاس اینجلس سے میکسیکو کی سرحد دو سو کلومیٹرز کے فاصلے پر تھی۔ شروع میں کچھ آبادی اور اچھے مناظر دکھائی دیے مگر اس کے بعد طویل صحرائی علاقہ شروع ہوا جس میں

ایک جیسے مناظر تھے۔ اس ہائی وے کے ساتھ آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ میکسیکو کے علاقے کیلیفورنیا جا رہے تھے جو میکسیکو کی اصل زمین سے ذرا ہٹ کر ایک دُم کی طرح نکلا ہوا ہے اور اس کے دونوں طرف سمندر ہے۔ یہ دنیا کے چند بہترین ساحلی تفریحی علاقوں میں سے ہے لیکن وہ یہاں تفریح کرنے نہیں بلکہ منشیات لینے جا رہے تھے۔ شہر سے نکلنے کے بعد این نے آہستہ سے پوچھا۔ ''تم نے ان بچوں کو کیسے راضی کیا؟''

''رومیو جانتا ہے۔ وہ سیر کرنے کے لیے آیا ہے اور جیمن رقم کے بدلے آئی ہے تمہاری طرح۔''

''کیا مطلب؟ تم نے ان کو بتایا نہیں کہ تم انہیں کہاں لے جا رہے ہو اور وہاں سے کیا لانا ہے؟''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟ یہ جانتے ہیں میں ڈرگ ڈیلر ہوں۔''

''اس کے باوجود انہیں بتانا ضروری ہے۔''

''میکسیکو میں داخل ہونے کے بعد تم چاہو تو بتا دینا۔''

''یہ ان کے ساتھ دھوکا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، تم بتا دو اور یہ نہیں مانے تو ہم یہیں سے واپس چلے جائیں گے۔ میں جا کر سیدھا جارڈی کے ایکوریم میں چھلانگ لگا دوں گا۔'' ریمنڈ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اپنے بارے میں تم خود سوچ سکتی ہو، ان کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

این کا منہ بن گیا مگر اس نے پھر اصرار نہیں کیا اور خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اچانک جیمن چلائی۔ ''آتش بازی.... گاڑی روکو۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' ریمنڈ نے کہا۔ اس نے اسٹال دیکھ لیا تھا جہاں آتش بازی کا سامان بک رہا تھا۔ جیمن نے التجا کی۔

''پلیز! مجھے فائر ورک بہت اچھا لگتا ہے۔''

''ہے ریمنڈ..... مان جاؤ۔'' رومیو نے کہا۔

''کیا حرج ہے؟'' این نے بھی کہا تو ریمنڈ نے انہیں گھور کر دیکھا اور گاڑی موڑ لی۔ چند منٹ بعد وہ چھوٹے سے راکٹ کے سامنے کھڑے تھے جس کا فیتہ جل رہا تھا اور پھر وہ ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ اوپر گیا اور دھماکے سے پھٹ کر آتشیں لکیروں میں بدل گیا۔ اس کے بعد وہ سب گاڑی میں سوار ہو کر آگے روانہ ہو گئے۔ دو گھنٹے بعد وہ امریکا میکسیکو بارڈر پر تھے اور یہاں گاڑیوں کی لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ ریمنڈ نے سب کو خبردار کیا۔ ''ہمیں ایک خاندان کی طرح نظر آنا چاہیے۔''

وہ سب مسکرانے لگے اور جب تک ان کی بس چیکنگ پوائنٹ تک پہنچی، ان کے جبڑے دکھ گئے تھے۔ ایک کسٹم افسر نے اندر جھانکا تو انہوں نے بے زاری سے اسے دیکھا اور اس نے بس کو آگے جانے کا اشارہ کیا۔ ریمنڈ خوش ہو گیا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''واہ، دیکھا کتنا آسان ثابت ہوا۔''

''یہ بات واپسی کے وقت کہنا۔'' این نے خشک لہجے میں کہا تو ریمنڈ کی خوشی پر اوس پڑ گئی۔ واقعی اصل مرحلہ تو واپسی میں طے کرنا تھا۔ جارڈی نے اسے صرف اتنا بتایا تھا کہ اسے کیلیفورنیا جا میں سرحد سے کوئی اسّی کلومیٹرز دور شہر این سانا ڈا کے پاس ایک جگہ جانا تھا۔ انہیں جانے اور آنے میں دو گھنٹے بھی نہیں لگتے مگر ابھی ان کے پاس خاصا وقت تھا۔ جارڈی نے مال میں اکتوبر تک پہنچانے کو کہا تھا اور اس میں ابھی چار دن باقی تھے۔ اس لیے ریمنڈ نے فیصلہ کیا کہ وہ دو دن تفریح میں گزاریں گے اور ان کو اس کے لیے اضافی خرچ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ گاڑی ان کے پاس تھی اور کھانے پینے کا بھی مکمل بندوبست تھا۔ وہ میکسیکو کی پہلی ساحلی تفریح گاہ میں رک گئے اور دو دن وہیں رہے۔ اس دوران میں وہ سمندر میں تیراکی سے لے کر سرفنگ تک کرتے رہے۔ این اور جیمن نے پتنگ اڑائی۔ ریمنڈ نے پانی کی بائیک چلائی اور مرتے مرتے بچا۔ اس کی بائیک الٹ گئی تھی۔ دو دن بعد وہ این سانا ڈا کی طرف روانہ ہوئے تو بہت خوش تھے۔

ہائی وے پر شہر سے پہلے انہیں صحرا کی طرف مڑ جانا تھا۔ راہنمائی کے لیے گاڑی میں ڈیجیٹل نقشہ لگا ہوا تھا اور اس میں روٹ بھی سیٹ تھا۔ جب وہ مذکورہ مقام سے چند کلومیٹرز دور رہ گئے تو ریمنڈ گاڑی روک کر نیچے اتر آیا اور اس نے موبائل پر جارڈی کا نمبر ملایا۔ ''میں اس جگہ کے پاس ہوں؟''

''گڈ! تم ٹھیک وقت پر پہنچے ہو۔ اب غور سے سنو، تمہیں وہاں ایک لمبا تڑنگا شخص ملے گا اور تم اسے کہو گے کہ تمہیں پابیلو نے گرینگو کے پاس بھیجا ہے۔''

''یہ پابیلو اور گرینگو کون ہیں؟''

''کوئی بھی ہوں، یہ لفظ یاد رکھو۔ بھول گئے تو امکان ہے کہ تمہاری واپسی نہیں ہوگی اور شاید تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔''

''او کے پھر سے بتانا۔'' ریمنڈ نے جلدی سے کہا۔

"پابلو نے گرینگو کے پاس بھیجا ہے۔" جارڈی نے کہا اور کال کاٹ دی۔ ریمنڈ نے جملہ یاد کیا اور گاڑی میں آ گیا۔

"تم کس سے بات کر رہے تھے؟" این نے پوچھا۔

"تم اس وقت اصل بیوی کی طرح سوال کر رہی ہو۔" ریمنڈ نے اس کا سوال گول کر کے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ جی پی ایس ریسیور کی مدد سے ڈیجیٹل نقشہ آواز کی مدد سے اس کی راہنمائی کر رہا تھا اور بالآخر وہ ایک قلعہ نما احاطے کے سامنے جا پہنچے جس کی فصیل پر دونوں جانب مسلح افراد دکھائی دے رہے تھے۔ دروازے پر بھی دو مسلح افراد موجود تھے۔ انہوں نے اندر کسی کو بتایا اور دروازہ کھول دیا گیا۔ ریمنڈ نے گاڑی آگے بڑھائی تو ڈیجیٹل نقشے نے بتایا۔

"نامعلوم علاقہ..... مزید راہنمائی نہیں کی جاسکتی ہے۔"

وہ اندر داخل ہوئے تو جگہ جگہ طرح طرح کی گنوں سے مسلح بدمعاش نظر آنے والے افراد کھڑے تھے۔ ایک طرف لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ سامنے ایک کھنڈر نما عمارت تھی۔ یہ شاید سچ مچ کوئی تاریخی قلعہ تھا۔ این نے کہا۔

"یہ ہم کہاں آ گئے ہیں؟"

"جہاں ہمیں آنا تھا۔" ریمنڈ نے کہا اور سامنے دیکھا تو اسے ایک طویل قامت یک چشم دکھائی دیا۔ "تم سب اپنی جگہ رہو، میں آتا ہوں۔"

ریمنڈ نے زندگی میں پہلی بار اتنا اسلحہ اور اتنے بدمعاش ایک ساتھ دیکھے تھے۔ ان میں سب سے خطرناک یک چشم ہی لگ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس پہنچا اور باچھیں ممکنہ حد تک پھیلا کر ہاتھ آگے کیا۔ "ہائے..... میں ریمنڈ آرسنل ہوں اور یہ....." اس نے پلٹ کر گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "میری فیملی ہے۔"

"فیملی۔" یک چشم نے کہا اور اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا تو انہوں نے قہقہہ لگایا۔ یک چشم بھی ہنس رہا تھا پھر اس نے اچانک اپنا بڑا سا پستول نکال لیا اور ریمنڈ کے منہ پر رکھ دیا۔ "یہاں کیوں آئے ہو؟"

ریمنڈ لرزنے لگا۔ اگرچہ اس کا خیال تھا کہ وہ پُرسکون کھڑا ہے۔ اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی مگر اس کے منہ سے جو الفاظ نکل رہے تھے، وہ خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہے تھے۔ یک چشم کو شاید اس کی کیفیت پر ترس آ گیا اور اس نے پستول ہٹا کر کہا۔ "ایک جملے میں بتاؤ، یہاں کیوں آئے ہو ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔"

"وہ..... پابلو نے گرینگو کے پاس بھیجا ہے۔"

یک چشم کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر اس نے ہوم ٹریلر اور اس میں موجود ان تینوں کو دیکھا۔ "پھر سے کہنا کیا کہا ہے؟"

"پابلو نے گرینگو کے پاس بھیجا ہے۔"

یک چشم مسکرانے لگا۔ "آؤ..... اپنی فیملی کو بھی ساتھ لاؤ۔"

کچھ دیر بعد وہ کھنڈر کے تہ خانے میں کھڑے تھے اور یہاں تاحدِ نگاہ منشیات کے ڈھیر تھے۔ کوکین، حشیش اور میری جوانا بڑے سائز کے پولیتھین بیگز میں تھیں اور ان کے انبار لگے تھے۔ ریمنڈ کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے اتنی منشیات پہلی بار دیکھی تھی۔ یک چشم کے آدمی میری جوانا کے پیکٹ اٹھا کر ٹریلر میں لے جا رہے تھے اور اپنی مرضی سے رکھ رہے تھے۔ ریمنڈ کا خیال تھا کہ یہ کام چند منٹ میں نمٹ جائے گا مگر یہ سلسلہ آدھے گھنٹے تک جاری رہا تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے یک چشم سے پوچھا۔ "اس کا وزن کتنا ہوگا؟"

"ایک ٹن۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"ایک ٹن؟" ریمنڈ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"یہ آخری پیس ہے۔" اس نے اندر جانے والے شخص کی طرف اشارہ کیا جس نے چار کلوگرام والا پیکٹ اٹھا رکھا تھا۔ یہ سارے پیکٹ اتنے ہی وزن کے تھے اور ان کی تعداد ڈھائی سو تھی۔ ریمنڈ نے موبائل نکالتے ہوئے یک چشم کو اشارہ کیا کہ وہ ذرا کال کر کے آتا ہے اور ایک کونے میں آیا۔ اس نے جارڈی کو کال کی۔

"ہے ریمنڈ! کیسے ہو تم؟"

اس نے آواز دباتے ہوئے کہا۔ "یہ تم نے مجھے کس چکر میں ڈال دیا ہے؟ تم نے سو کلوگرام کہا تھا مگر انہوں نے گاڑی میں ایک ٹن منشیات بھر دی ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ اگر تم پکڑے گئے تو تمہیں اتنی ہی سزا ہوگی جتنی کہ سو کلوگرام منشیات کے ساتھ پکڑے جانے پر ہوتی ہے۔"

"میں اسے لے کر کیسے آؤں گا؟" ریمنڈ اس جواب پر بھنا گیا۔

"جیسے سو کلوگرام لاتے۔" جارڈی نے مزے سے کہا اور کال کاٹ دی۔ ریمنڈ زبردستی مسکراتا ہوا واپس آیا تو رومیو ایک ٹوکرا تھامے ہوئے تھا جس میں تازہ پھل تھے۔ یک چشم نے کہا۔

"یہ میری ماں کی طرف سے تحفہ ہے۔"

"تمہارا شکریہ۔" ریمنڈ نے کہا۔ "اب ہمیں جانا ہے۔"

یک چشم نے ان کی فوری روانگی پر کوئی اعتراض نہیں

کیا۔ وہ چاروں گاڑی میں داخل ہوئے۔ الماری کے خانوں، کچن کیبنٹس، فریج اور حتیٰ کہ اوپر سامان رکھنے والے خانوں تک میں منشیات بھری ہوئی تھی۔ این نے ریمنڈ کی طرف دیکھا۔ ''ہم اس کے ساتھ انٹرنیشنل بارڈر کراس کریں گے؟''

''ظاہر ہے۔'' ریمنڈ نے پسینا صاف کرتے ہوئے کہا۔ یہ پسینا این کی بات سن کر آیا تھا۔ ''اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔''

جین کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ کس چکر میں آ گئی ہے۔ رومیو کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جین نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ واپس نہیں جا سکتی۔ یہاں سے نکلتے ہی میرا راستہ الگ ہوگا۔''

''اس صورت میں تم واپس نہیں جا سکو گی۔ یہ تمہیں روک لیں گے اور ممکن ہے تمہیں جیل میں ڈال دیں۔ میکسیکو کی جیلیں بہت خوفناک ہوتی ہیں۔'' ریمنڈ نے کہا۔

''میں کیوں نہیں جا سکتی؟''

''کیونکہ تم میری فیملی سے ہو اور میرے پاسپورٹ پر تمہاری میکسیکو میں انٹری ہوئی ہے۔ تمہارے پاس کوئی شناختی دستاویز نہیں ہے۔ ممکن ہے امریکا بھی تمہیں قبول کرنے سے انکار کر دے۔''

''ریمنڈ! یہ بہت خطرناک ہے۔ میں ساری عمر جیل میں نہیں گزارنا چاہتی۔''

''مجبوری ہے ہم پھنس گئے ہیں۔''

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔'' جین بولی۔

''پہلے ہمیں یہاں سے نکلنا ہے، باقی باتیں ہم باہر چل کر کریں گے۔'' ریمنڈ نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا۔ گیٹ کھل گیا تھا۔ اس نے گاڑی باہر نکالی اور امریکا جانے والی ہائی وے پر ڈال دی۔ سب خاموش تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب ان کے ساتھ کیا ہوگا؟ ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ بارڈر پر تھے اور امریکا میں جانے والا حصہ انہوں نے اب دیکھا تھا۔ یہ اس حصے سے بہت مختلف تھا جو میکسیکو میں آنے والا تھا۔ درجنوں کی تعداد میں خودکار رائفلوں سے مسلح سیکیورٹی گارڈز جا بہ جا موجود تھے اور اتنی ہی تعداد میں کتے بھی تھے۔ ہر گاڑی... کو خصوصی چیک کیا جا رہا تھا۔ ریمنڈ نے ٹریلر ایک لائن میں لگا دیا۔ این کراہی۔

''میرے خدا..... ہم اس جگہ سے کیسے نکلیں گے؟''

''ہم پکڑے جائیں گے۔'' جین رو دینے والے لہجے میں بولی۔

''تم اندر رہتی ہو، بچ جاؤ گی۔'' رومیو نے کہا۔ ''میں مارا جاؤں گا۔ کل ہی اٹھارہ سال کا ہوا ہوں۔''

''پلیز شٹ اپ آل آف یو۔'' ریمنڈ نے کہا۔ اسی لمحے برابر میں بالکل ایسا ہی ہوم ٹریلر آ کر رکا جسے ایک موٹی مونچھوں والا موٹا سا آدمی چلا رہا تھا اور برابر میں ایک بڑے چہرے والی عورت بیٹھی تھی۔ ان دونوں نے ان کی طرف دیکھ کر گرم جوشی سے ہاتھ ہلایا۔ وہ ان لوگوں میں سے لگ رہے تھے جو زبردستی ہر ایک سے فری ہو جاتے ہیں۔ ریمنڈ نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ ایک اور مصیبت ہے۔''

این نے کہا۔ ''وہ صرف ہاتھ ہلا رہے ہیں۔ کیا حرج ہے جو ہم بھی ایک فیملی کی طرح انہیں ہاتھ ہلا کر ہیلو ہائے کر لیں۔''

''میں اس وقت بالکل موڈ میں نہیں ہوں۔'' ریمنڈ غرایا۔ مگر برابر والی فیملی کچھ زیادہ ہی بے تکلف تھی۔ مرد نے شیشہ نیچے کیا اور باقاعدہ آواز دی۔

''ہائے فیملی..... ہم جونز ہیں۔''

''جواب دو۔'' این نے کہا اور پھر وہ دونوں ان کی طرف مڑے۔

''ہائے۔'' این بولی۔ ''میں این ہوں۔''

''میں ریمنڈ۔'' ریمنڈ نے دانت نکال کر کہا اور پیچھے اشارہ کیا۔ ''ہمارے بچے۔''

جین اور رومیو اٹھ کر آگے آئے۔ این نے تعارف کرایا۔ ''یہ جین ہے اور یہ رومیو۔ ہم آرسنل ہیں۔''

ان دونوں نے ہاتھ ہلایا۔ ''میں ڈیوڈ جونز اور یہ سارہ جونز ہے۔''

عقب سے ایک نوجوان لڑکی نمودار ہوئی۔ سارہ نے تعارف کرایا۔ ''یہ ہماری بیٹی ہے نورا۔''

''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' این نے کہا۔

ان کی قطار آگے بڑھی تو ریمنڈ نے بھی گاڑی آگے بڑھائی مگر اگلی گاڑی اچانک رکی تو اسے بھی بریک لگانے پڑے۔ دھچکے سے اوپری خانہ کھلا اور اس میں موجود میری جوانا کا پیکٹ این کی گود میں آ گرا۔ وہ دم بہ خود رہ گئے پھر این نے بدحواسی میں جلدی سے تولیا ڈال کر پیکٹ ڈھک لیا۔ اسی لمحے سارہ نے اس طرف دیکھا اور چلائی۔ ''بے بی..... تمہارا بے بی بھی ہے؟''

این نے جلدی سے تولیے میں لپٹے پیکٹ کو اٹھا کر بچے کی طرح سینے سے لگا لیا اور اسی لمحے ڈیوڈ کی قطار آگے ہوئی تو اس نے بھی گاڑی آگے بڑھا دی۔ ان کی قطار سست روی

سے آگے جارہی تھی۔ اب ان سے آگے صرف ایک گاڑی تھی۔ اس ذین کا مالک ایک ہپی تھا اور اس کی بھرپور تلاشی لی جارہی تھی۔ ایک گارڈ اندر سے نکلا اور اس نے چھوٹی سی تھیلی اٹھا رکھی تھی۔ اس نے اعلان کیا۔ ”چرس ہے۔“

ہپی نے بھاگنے کی کوشش کی مگر فوراً ہی دو پولیس والوں نے اسے دبوچا، زمین پر پٹخا اور ڈنڈوں سے اس کی خاطر تواضع کرنے لگے۔ ریمنڈ کا دل حلق میں آگیا۔ تھوڑی سی چرس برآمد ہونے پر اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جارہا تھا وہ تو تقریباً ایک ٹن منشیات لے کر جارہے تھے۔ سب کی حالت بری تھی۔ جب ان کی باری آئی اور کیبن میں موجود آفیسر نے پوچھا۔ ”تم لوگوں کے پاس کلیئر کرانے کے لیے کچھ ہے؟“

ریمنڈ کے ہوش گم تھے، اس سے بولا نہیں جارہا تھا۔ این نے اسے ٹہوکا دیا۔ ”جواب دو..... آفیسر کچھ پوچھ رہا ہے۔“

ریمنڈ چونکا اور جلدی سے مسکرایا مگر اتنی دیر میں آفیسر مشکوک ہوگیا تھا۔ وہ کیبن سے باہر نکل آیا اور نزدیک آکر اپنا سوال دہرایا۔ ”تمہارے پاس کلیئر کرانے کے لیے کچھ ہے؟“

”نہیں۔“ ریمنڈ نے بہ مشکل کہا۔ اسی لمحے منشیات سونگھنے والا کتا ٹریلر کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگا۔ وہ اس میں حق بہ جانب تھا۔ آفیسر کا لہجہ بدل گیا۔

”سب نیچے اتر آئیں..... فوراً۔“

☆☆☆

طویل قامت یک چشم ایک چھوٹے سے ماتحت کے ساتھ کشتی لڑ رہا تھا اور اس نے اسے پٹخا مار کر گرایا تو تالی بجنے کی آواز آئی۔ یک چشم نے چونک کر دیکھا تو اوپر سیڑھیوں پر اس کا باس گرینگو کھڑا تھا۔ ”باس تم؟“

”ہاں، ڈیل بہت بڑی ہے اس لیے میں نے سوچا خود آؤں تاکہ کوئی مسئلہ نہ ہو۔“

”ڈیل تو ہوگئی باس، پارٹی مال لے کر جاچکی ہے۔“

گرینگو تیکھے نقوش والا جوان آدمی تھا۔ اس کے گھنگرالے بال پھیلے ہوئے تھے۔ یک چشم کی بات سن کر اس کی بھویں سکڑ گئی تھیں۔ اس نے کہا۔ ”کون سی پارٹی..... وہ تو یہ ہے۔“

گرینگو کے ساتھ ایک امریکی کھڑا تھا۔ یک چشم کا منہ کھلا رہ گیا۔ گرینگو نے پستول نکالا تو یک چشم چونکا۔ ”باس، ہم انہیں پکڑ سکتے ہیں۔“

”تو چلو۔“ گرینگو نے اشارہ کیا۔ چند منٹ بعد وہ گرینگو کی گولڈن فراری میں تیزی سے سرحد کی طرف جا رہے تھے۔

☆☆☆

آفیسر کے حکم پر وہ نیچے آئے تو کتا این کی طرف منہ کر کے بھونکنے اور لپکنے لگا کیونکہ اس نے چار کلوگرام خالص میری جوانا کا پیکٹ تولیے میں لپیٹ کر سینے سے لگایا ہوا تھا۔ کتے کی زنجیر پکڑا ہوا گارڈ اسے روک رہا تھا۔ آفیسر نے ان کا جائزہ لیا اور ریمنڈ سے بولا۔ ”اب بھی وقت ہے، مجھے بتادو کہ اندر کیا ہے۔ اگر ایک بار ہم اندر گئے تو ٹریلر کی مکمل تلاشی لی جائے گی۔ سب الٹ پلٹ دیا جائے گا۔“

ریمنڈ اور وہ تینوں دم بہ خود تھے۔ وہ آفیسر کو کیا بتاتے کہ اسے الٹنے پلٹنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اندر وہ جو خانہ کھولتے، انہیں منشیات ہی ملتی۔ آفیسر کچھ دیر ان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ٹریلر کا دروازہ کھولنے جارہا تھا کہ اچانک اس کے نیچے سے دو میکسیکن نکل کر بھاگے۔ آفیسر چلایا۔ ”پکڑو انہیں۔“

دو گارڈز ان کے پیچھے لپکے۔ آفیسر نے غصے میں ان سے کہا۔ ”تو یہ تھے تمہاری گاڑی میں؟“

”ہم نہیں جانتے آفیسر۔“ این نے جلدی سے کہا۔ ”پتا نہیں یہ کہاں سے نیچے گھس گئے اور چھپ گئے۔“

”یہ دوسری گاڑی سے نکلے ہیں۔“ پیچھے والی کار کے ڈرائیور نے آکر آفیسر کو بتایا۔ ”میں نے ان کو نکلتے دیکھا تھا۔ اس ٹرک سے۔“

ذرا سی دیر میں وہ دونوں پکڑے گئے اور ٹرک والا بھی حراست میں لے لیا گیا۔ ایک بڑا کیس ان کے ہاتھ لگ گیا تھا اس لیے آفیسر نے ان سے کہا۔ ”تم لوگ جاسکتے ہو۔“

وہ جب وہاں سے نکلے تب بھی ان کے حواس بحال نہیں ہوئے تھے۔ خاصی دیر بعد جاکر ریمنڈ نے اچانک زوردار قہقہہ لگایا اور چلا کر بولا۔ ”ہم کامیاب رہے۔“

”ہم بچ گئے۔“ جینی بولی۔

”تھینکس گاڈ۔“ این بولی۔

”ہم جشن منائیں گے۔“ ریمنڈ نے ریڈیو آن کر کے ایک میوزک چینل ٹیون کیا جس پر جدید میوزک چل رہا تھا اس نے چینل بدلنا چاہا مگر جینی نے روک دیا۔

”یہ مجھے پسند ہے۔“

”مجھے بھی۔“ رومیو بولا۔

ریمنڈ نے این کی طرف دیکھا تو وہ مسکرادی۔ ”مجھے بھی۔“

”تب مجھے بھی۔“ ریمنڈ نے کہا۔ این اندر سے بیئر

کی بوتلیں نکال لائی تھی۔ اس نے ایک ایک جین اور رومیو کو دی اور ایک خود لے لی۔

''میری بوتل؟'' ریمنڈ نے پوچھا۔

''تم ڈرائیونگ کر رہے ہو۔ پولیس نے روک لیا تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

ریمنڈ نے اس سے اتفاق کیا۔ وہ سان ڈیاگو سے آگے نکلے تو لاس اینجلس کی طرف جانے والا ہائی وے کا ٹریک مرمت کی وجہ سے بند تھا اور صرف ایک لائن کھلی تھی جس پر ٹریفک کی لمبی قطار تھی۔ اس لیے ریمنڈ نے ریور سائڈ کی طرف جانے والی ہائی وے منتخب کی۔ وہ آگے سے جا کر لاس اینجلس کی طرف گھوم سکتے تھے۔ مگر ذرا آگے جانے پر یہ ہائی وے بھی زیرِ مرمت نکلی اور جس متبادل راستے کی طرف سائن بورڈ اشارہ کر رہے تھے، وہ عام سی سڑک تھی جس پر کوئی بورڈ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اس طرف مڑے تو این نے پوچھا۔ ''ہم کس طرف جارہے ہیں؟''

''آگے جا کر دوبارہ ہائی وے پر آجائیں گے۔''

دس میل کے بعد سڑک دو حصوں میں بٹی تو ریمنڈ نے جس راستے کا انتخاب کیا، وہ آگے جا کر تنگ اور خراب ہو گیا۔ ریمنڈ فکرمند ہو گیا۔ ڈیجیٹل نقشہ یہاں راہنمائی نہیں کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کسی عام سی سڑک پر آنکلے تھے۔ ریمنڈ نے جلد کہیں پہنچنے کے لیے رفتار تیز کی تو این نے اسے ٹوکا۔ ''اتنی رفتار مناسب نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ گاڑی پر ایک ٹن اضافی بوجھ ہے، اس کا انجن برداشت نہیں کر سکے گا۔''

''کر لے گا، تم فکر مت کرو۔'' ریمنڈ نے کہا اور ابھی الفاظ اس کے منہ میں تھے کہ ایک دھما کا ہوا اور ٹریلر کی رفتار ٹوٹنے لگی۔ انجن سے گاڑھا دھواں اور بھاپ نکل رہی تھی۔ چند لمحے بعد گاڑی رک گئی۔ این کی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ انجن بوجھ برداشت نہیں کر سکا اور گرمی سے ریڈی ایٹر پھٹ گیا تھا۔ وہ چاروں نیچے اتر آئے۔ ریمنڈ کراہا۔ ''اب کیا کریں؟''

''مدد کی تلاش۔'' این نے کہا۔

''اس ویرانے میں مدد کہاں سے آئے گی؟'' ریمنڈ نے کہا تھا کہ سامنے سے ایک ہوم ٹریلر نمودار ہوا اور جب وہ قریب آیا تو وہ جونز فیملی کا ٹریلر ثابت ہوا۔ دس منٹ بعد وہ اس طرح اس میں جا رہے تھے کہ ان کا ٹریلر پیچھے بندھا ہوا تھا اور ریمنڈ ڈیوڈ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ڈیوڈ اسے بتا رہا تھا۔

''میں بھی اسی چکر میں مارا گیا اور راستہ بھٹک گیا۔ اب واپس جا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے ہمیں بائیں طرف والا راستہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔''

این تولیے میں لپٹا ہوا میری جوانا کا پیکٹ سینے سے لگائے بیٹھی تھی کیونکہ وہ ان لوگوں کو بچے کا تاثر تو دے چکے تھے۔ سارہ اس سے کئی بار بچہ دکھانے کو کہہ چکی تھی مگر وہ سنی ان سنی کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''ہماری بہت خواہش تھی کہ لورا کے بعد ہمارے ہاں کوئی اولاد ہو مگر ہوئی نہیں۔''

لورا اور رومیو چیکر کھیل رہے تھے اور جین حسبِ معمول اپنے آئی فون میں لگی تھی۔ ڈیوڈ نے ریمنڈ سے کہا۔ ''یہ کمپارٹ سے ذرا نقشہ تو نکالنا۔ میں آگے جانے سے پہلے چیک کرلوں۔''

ریمنڈ نے کمپارٹ کھولا تو چونک گیا۔ اس میں ایک پستول رکھا تھا۔ ''اوہ...... ہو۔''

''سوری، یہ میری سروس گن ہے۔''

اس کے ساتھ ایک بیج بھی رکھا ہوا تھا۔ جین چونک کر بولی۔ ''تم پولیس والے ہو؟''

''اوہ نہیں، میں پولیس میں نہیں ہوں۔ میں ڈرگ انفورسمینٹ ایجنسی یعنی ڈی ای اے میں کام کرتا ہوں۔''

ان چاروں کا دل حلق میں آگیا۔ وہ ایک ٹن منشیات لے جا رہے تھے اور وہ بھی ایک سرکاری ایجنٹ کے ساتھ۔ ریمنڈ نے نقشہ نکال کر ڈیوڈ کو تھمایا اور کھڑا ہو گیا۔ این بھی کھڑی ہو گئی تھی۔ سارہ نے پوچھا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''بے بی کو دیکھنے۔'' این نے کہا۔

''میں بھی۔''

جین اور رومیو خود پیچھے آگئے تھے۔ وہ ٹریلر کے سب سے کونے والے کمرے میں آئے اور دروازہ بند کر کے ایک دوسرے کو دیکھا۔ این نے پیکٹ بستر پر پٹخا اور کراہی۔ ''بس اسی کی کسر باقی رہ گئی تھی۔''

''گھبراؤ مت، کچھ نہیں ہوگا۔''

''اگر یہ جان گیا کہ ہم کیا لے کر جا رہے ہیں تو کیسے بچیں گے؟'' جین بولی۔

''اسے علم نہیں ہے اور خدا کے لیے اپنے حواس پر قابو رکھو۔ خود سے بتانے کی کیا ضرورت ہے۔'' ریمنڈ نے سخت لہجے میں کہا۔ ''بس چند گھنٹے کی بات ہے پھر یہ اپنی راہ لیں گے اور ہم اپنی راہ۔''

خود پر قابو پا کر وہ باہر آئے تو سارہ اور ڈیوڈ متجسس تھے مگر وہ عام اور شریف انسان تھے اس لیے انہوں نے

آسانی سے ان کی وضاحت قبول کر لی۔ کچھ ہی دیر میں وہ ایک ورکشاپ تک پہنچ گئے۔ مگر جب وہ نیچے اترے تو پتا چلا کہ آج ورکشاپ بند تھی اور کل کھلے گی۔ ڈیوڈ نے ریمنڈ سے کہا۔ ”کل تک انتظار کرنا پڑے گا۔“

”کوئی بات نہیں، تم لوگ جاؤ تب تک ہم یہاں رکتے ہیں۔ اب تو مجبوری ہے۔“ ریمنڈ نے جلدی سے کہا۔ اس کی خواہش تھی کہ جلد از جلد ان سے پیچھا چھوٹے۔

”نہیں...... نہیں۔“ سارہ نے بے ساختہ کہا۔ ”ہم تمہیں یہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔“

”آج رات ہم بھی یہیں قیام کریں گے۔“ ڈیوڈ نے اس کی تائید کی۔ ریمنڈ اور این ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ یہ معاملہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ انہوں نے انکار کیا مگر سارہ اور ڈیوڈ نے ان کے انکار کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس کے بجائے سارہ ایک بار پھر این کے سر ہو گئی کہ وہ اسے اپنا...... بے بی دکھائے۔ این انکار کرنے لگی اور سارہ شوخی سے زبردستی پر اتر آئی۔ وہ تولیا ہٹا کر ”بے بی“ کا دیدار کرنا چاہتی تھی اور اگر وہ ایک بار اس بے بی کو دیکھ لیتی تو صورت حال ہی بدل جاتی۔ این نے بدحواس ہو کر جھٹکے سے اپنا رخ بدلا تو جھٹکے سے پلاسٹک میں ملفوف میری جوانا وزن کی وجہ سے تولیا سے نکل کر فضا میں بلند ہوئی۔ این اور ریمنڈ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ سارہ اور ڈیوڈ اس طرف متوجہ نہیں تھے اس لیے وہ پیکٹ دیکھ نہیں سکے۔ اس سے پہلے کہ پیکٹ سڑک پر گرتا، وہاں سے ایک پک اپ گزری اور پیکٹ اس کے عقبی حصے میں گرا۔ سارہ کو ذرا دیر سے احساس ہوا۔ اس نے چلا کر کہا۔

”این تمہارا بچہ۔“

این اور ریمنڈ کے حواس گم ہو گئے۔ ڈیوڈ تیزی سے آگے آیا۔ ”ہمیں پک اپ کے پیچھے جانا ہوگا۔“

”نہیں۔“ این اور ریمنڈ نے بیک وقت کہا۔

”نہیں؟“ ڈیوڈ تعجب سے بولا۔

”تمہارا بے بی؟“ سارہ بولی۔

”وہ...... ہاں...... بے بی۔“ ریمنڈ نے کہنے کی کوشش کی۔ این کے منہ سے تو آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ ایسے میں جینن نے عقل مندی دکھائی، وہ آگے آئی۔

”ڈونٹ وری مام...... وہ صرف ایک پروجیکٹ تھا۔“

سارہ اور ڈیوڈ چونکے۔ ”پروجیکٹ؟“

”ہاں، میرے اسکول کی طرف سے پروجیکٹ ملا ہے کہ چھوٹے بچے کو کیسے سنبھالتے ہیں تو ہم نے ایک فرضی بے بی بنایا ہوا تھا۔“

این نے جلدی سے بتایا۔ ”وہ اصلی نہیں تھا۔“

ریمنڈ بھی جلدی سے مسکرانے لگا۔ ”یہ بات ہم نے اس لیے تمہیں بتائی نہیں کہ... ہماری طرف سے معذرت قبول کرو۔“

”اوہ... کوئی بات نہیں۔“ سارہ اور ڈیوڈ بھی خوش ہو گئے ورنہ ایک بچے کے ساتھ حادثے کا تصور بھی خاصا خوفناک تھا۔ اس رات انہوں نے وہیں قیام کیا۔ سارہ اور ڈیوڈ نے اپنے لیے خیمہ لگا لیا تھا۔ وہ اپنے ٹریلر میں رہے۔ انہوں نے فائر کیمپ کر کے ڈنر کیا اور پھر مختلف کھیل کھیلے۔ رومیو اور لورا زرا مختلف کھیل آنکھوں آنکھوں میں کھیل رہے تھے اور جب وہ سونے کے لیے اٹھے تو وہ دونوں جان بوجھ کر باہر رہ گئے۔ این اور جینن انہیں ٹریلر کی کھڑکی سے دیکھ رہی تھیں۔ این نے تاسف سے کہا۔

”بہت سیدھا لڑکا ہے۔ اسے تو کسی لڑکی سے بات کرنی بھی نہیں آتی۔“

”میں سکھا دوں گی۔“ جینن نے کہا۔

این نے اسے گھورا۔ ”وہ تمہارا بھائی ہے۔“

”حقیقی بھائی تو نہیں ہے۔“ جینن بے پروائی سے بولی۔ لورا مایوس ہو کر چلی گئی تھی۔ رومیو منہ لٹکائے اندر آیا۔ این نے پوچھا۔ ”کیا ہوا...... وہ کیا کہہ رہی تھی؟“

”کچھ نہیں۔“ رومیو کھسیا کر بولا۔

اگلی صبح ورکشاپ کھلی تو مکینک نے انجن دیکھ کر کہا۔ ”دوپہر تک کا کام ہے تم دو بجے گاڑی لے جا سکتے ہو۔“

ڈیوڈ نے ان سے کہا۔ ”ریور سٹی میں کارنیوال لگا ہے کیا خیال ہے وہاں چلتے ہیں اور پھر تم یہاں آ جانا۔“

ریمنڈ جانا نہیں چاہتا تھا مگر این، جینن اور رومیو مان گئے اس لیے اسے بھی ماننا پڑا۔ اس نے روانگی سے پہلے ٹریلر کو لاک کر دیا۔ وہ ڈیوڈ کی بس میں کارنیوال پہنچے۔ وہاں بہت رونق تھی۔ ڈیوڈ اور سارہ سے جان چھڑانے کے لیے وہ دوسری طرف چلے گئے تھے۔ ریمنڈ بے صبرا ہو رہا تھا۔ اسے خوف کھائے جا رہا تھا کہ کہیں مکینک ٹریلر میں بھری میری جوانا نہ دیکھ لے۔ اس لیے وہ لنچ کیے بغیر ہی ایک بجے واپس ورکشاپ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹیکسی سے اتر کر ریمنڈ نے کرایہ دیا اور وہ چاروں اندر آئے۔ ان کا ٹریلر کھڑا تھا مگر مکینک غائب تھا۔ ریمنڈ اس کے دفتر کی طرف بڑھا اور دروازہ کھولا تو اسے مکینک بندھی ہوئی حالت میں اپنی کرسی پر بیٹھا دکھائی دیا۔ ”میرے خدا! یہ کیا ہے؟“ ریمنڈ اس کی طرف بڑھا تھا کہ عقب سے آواز آئی۔

”اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟“

ریمنڈ نے مڑ کر دیکھا تو کھڑا لے بالوں والا گرینگو کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ ریمنڈ نے بے ساختہ ہاتھ اوپر کر لیے۔ ''میں کسٹمر ہوں، اپنی گاڑی ٹھیک ہونے کے لیے دی تھی۔''

''باہر آؤ کسٹمر کی اولاد۔'' گرینگو نے پستول کو جنبش دی۔ ریمنڈ باہر آیا تو یک چشم کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس کے ہاتھ میں مشین گن تھی اور اس نے این، رومیو اور جین کو نشانے پر لیا ہوا تھا۔ گرینگو غرایا۔

''اب تم سمجھے، یہ میری منشیات ہے۔''

''لیکن مجھے جارڈی نے بھیجا تھا۔'' ریمنڈ بولا۔ ''اس نے کہا تھا کہ تمہارے پاس جا کر کہوں کہ پابلو نے گرینگو کے پاس بھیجا ہے۔ میں نے ایسا ہی کیا...... کیا غلط کیا؟''

''جارڈی۔'' گرینگو غرایا۔ اس نے موبائل نکال کر نمبر ملایا اور کال ملنے پر بولا۔ ''جارڈی۔''

''ہے گرینگو...... کیسے ہو تم؟'' جارڈی نے چہک کر کہا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں اور تمہارے آدمی میری منشیات کے ساتھ میرے قبضے میں ہیں۔ جلد تمہیں ان کی لاشیں مل جائیں گی مگر منشیات نہیں ملے گی دھوکے باز آدمی۔''

''گرینگو۔'' جارڈی نے کہنا چاہا لیکن گرینگو نے لائن کاٹ دی۔

ریمنڈ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''دیکھو اگر جارڈی نے تمہارے ساتھ دھوکا کیا ہے تو میرا اور میرے گھر والوں کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔''

''ہم تمہارے گھر والے نہیں ہیں۔'' این بولی۔

''ہاں بالکل، ہم دوست ہیں۔'' رومیو نے کہا۔

''دوست بھی نہیں ہیں۔'' جین نے انکار کیا۔

''پھر تم کون ہو؟''

''یہ جین ایک آوارہ لڑکی ہے۔'' ریمنڈ نے جین کا تعارف کرایا جس پر اس نے کھا جانے والی نظروں سے ریمنڈ کو دیکھا۔ مگر وہ بولتا رہا۔ ''یہ رومیو ہے، دنیا کا سب سے بڑا احمق اور یہ این ہے، صرف ایک اسٹرائپر۔''

گرینگو جو اس گفتگو کے دوران یک چشم سے مشین گن لے کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا رہا تھا، وہ چونکا اور اس نے دلچسپی سے این کو دیکھا۔ ''سچ سچ تم اسٹرائپر ہو۔''

این مسکرانے لگی۔ ''تم مجھے ایک موقع دو تو میں ثابت کر سکتی ہوں۔''

''میں تمہیں ضرور موقع دوں گا۔''

چند منٹ بعد گرینگو کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور یک چشم نے اس کے عقب سے ان تینوں کو کور کیا ہوا تھا۔ این ایک طرف رکھے ہوئے سامان کے پیچھے گئی اور جب وہاں سے نکلی تو نہ ہونے کے برابر لباس میں تھی۔ وہ ادائیں دکھاتی اور بل کھاتی گرینگو کے پاس آئی تو اس کی نظر ذرا دور رکھے آکسیجن سیلنڈر پر گئی جو ویلڈنگ کے لیے رکھا ہوا تھا۔ این نے نظروں میں ریمنڈ کو اشارے سے سیلنڈر کی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر وہ مٹی کے مادھو کی طرح ساکت کھڑا ہوا تھا۔ جب اس نے دوبارہ این کا اشارہ نہیں دیکھا تو مجبوراً وہ خود حرکت میں آئی۔ وہ لہراتی بل کھاتی سیلنڈر تک گئی اور اس کا پائپ پکڑ کر گھومتے ہوئے اس نے اچانک اس کا والو کھول دیا۔ نال سے یخ بستہ آکسیجن کی پھوار براہ راست گرینگو اور یک چشم پر گئی۔ این چلائی۔ ''بھاگو۔''

''یہ چابی لو۔'' ریمنڈ نے چابی اچھالی جو رومیو نے کیچ کی۔ وہ اور جین ٹریلر کی طرف بھاگے اور دروازہ کھولتے ہوئے اندر گھس گئے۔ رومیو اسٹیئرنگ سیٹ پر آیا تو جین نے پوچھا۔

''تمہیں چلانی آتی ہے۔''

''نہیں لیکن میں کوشش کرتا ہوں۔''

باہر گرینگو منہ پر ہاتھ رکھے دھاڑ رہا تھا اور یک چشم ریمنڈ کو تلاش کر رہا تھا۔ اس نے سیٹی بجا کر اسے متوجہ کیا۔ ''میں یہاں ہوں۔''

جیسے ہی یک چشم نے گھوم کر دیکھا، ریمنڈ نے بھاری رینچ اس کے سر پر رسید کیا۔ وہ کراہ کر گھوما مگر فوراً ہی سیدھا ہو کر ریمنڈ کو مکا مارا تو اسے تارے نظر آ گئے۔ ہنگامہ ہوتے ہی این چھپ گئی تھی۔ ریمنڈ چکرا رہا تھا کہ یک چشم نے اپنی مشین گن سیدھی کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ فائر کھولتا، اچانک ٹریلر ریورس میں آیا اور اسے ٹکر مار کر عقبی دیوار سے ٹکرایا اور ٹین کی شیٹ پھاڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ این ایک طرف سے بھاگتی ہوئی آئی۔ اس نے کپڑے پہن لیے تھے۔ اس نے ریمنڈ کا بازو تھاما اور بولی۔ ''نکلو یہاں سے ہیرو...... تم نے اسے لمبا لٹا دیا۔''

ہوش میں آ کر ریمنڈ نے نیچے گرے یک چشم کو دیکھا تو اسے یقین نہیں آیا کہ اس نے اسے گرایا ہے۔ وہ چونکا۔ ''گاڑی کہاں ہے؟''

''باہر۔''

وہ دونوں باہر آئے اور بھاگ کر ٹریلر میں چڑھ گئے۔ این نے چلا کر کہا۔ ''نکلو یہاں سے۔''

اس دوران میں گرینگو اور یک چشم باہر نکلے اور ٹریلر پر

مشین گن سے فائر کھول دیا۔ رومیو نے بے ساختہ ایکسلریٹر دبایا۔ ٹریلر تیزی سے آگے بڑھا اور گرینگو کی گولڈن فراری کے ٹکڑے اڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔ رومیو اسے قابو نہیں کر پا رہا تھا۔ ٹریلر لہرا رہا تھا اور سب ادھر ادھر لڑھک رہے تھے۔ سڑک پر آتے ہی رومیو نے اسے غلط وے پر ڈال دیا۔ اب اسے سامنے سے آتی گاڑیوں سے بھی بچنا تھا۔ ریمنڈ بہ مشکل اس کی مدد کو آیا۔ اس وقت سامنے سے ایک بھاری ٹرک آرہا تھا۔ ریمنڈ نے بروقت اسٹیئرنگ گھمایا اور وہ تصادم سے بچ گئے لیکن وہ سڑک سے اتر کر ڈھلوان پر آگئے تھے۔ ٹریلر تیزی سے آگے جا رہا تھا اور ریمنڈ چیخ چیخ کر رومیو سے کہہ رہا تھا کہ وہ بریک لگائے اور وہ بوکھلاتے ہوئے بریک لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بڑے تنے والا درخت تیزی سے نزدیک آرہا تھا۔ بالآخر رومیو نے بریک کو دبایا۔ ٹریلر ایک جھٹکے سے رکا تو رومیو نے اچھل کر ونڈ اسکرین کو ٹکر ماری اور بے ہوش ہوگیا۔

☆☆☆

ریمنڈ نے میری جوانا کا آخری پیکٹ بھی اپنی جگہ رکھا اور کیبنٹ کا دروازہ بند کر کے اطمینان کا سانس لیا۔ ٹریلر سڑک سے اترا تو سامان کے ساتھ میری جوانا کے پیکٹ بھی پورے ٹریلر میں بکھر گئے تھے۔ ایمبولینس رومیو کو لے کر روانہ ہوئی تو وہ اس کے پیچھے آیا تھا۔ اس نے ٹریلر کارنیوال کے ٹریلر پارک میں روکا تھا اور تمام منشیات کو اپنی جگہ رکھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے گھڑی دیکھی تو دوپہر کے پونے تین بج رہے تھے۔ اس کے پاس نو گھنٹے تھے اور اگر رومیو اسپتال سے فارغ ہوگیا تھا تو وہ آرام سے واپس لاس اینجلس پہنچ سکتے تھے۔ وہ ٹریلر سے نکلا اور اسپتال کی طرف روانہ ہوگیا۔ اسپتال زیادہ دور نہیں تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہ وزیٹنگ لاؤنج میں داخل ہوا تو ایک لمبے بالوں والا لڑکا جینی سے محو گفتگو تھا۔ این ایک رسالہ دیکھ رہی تھی۔ ریمنڈ اس کی طرف لپکا۔ ”کیا ہوا؟“

”جینی اس لڑکے سے سیٹنگ کر رہی ہے اور میں رسالہ دیکھ رہی ہوں۔“

”میرا مطلب ہے رومیو کب فارغ ہوگا؟“

اسی لمحے ایک ڈاکٹر باہر آیا اور اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”آرسل فیملی۔“

این، ریمنڈ اور جینی اس کی طرف بڑھے۔ ریمنڈ نے کہا۔ ”جلدی سے اسے فارغ کرو، ہم اسے ساتھ لے جا رہے ہیں۔“

”وہ کیسا ہے؟“ این نے ریمنڈ کو گھور کر پوچھا۔

”ایم آئی آر کلیئر ہے مگر احتیاطاً ابھی اسے مزید چار گھنٹے یہاں رکنا ہوگا۔“

”چار گھنٹے؟“ ریمنڈ کراہا۔ ”بالکل نہیں، اسے ابھی فارغ کرو۔“

”میں دیکھ رہا ہوں تمہیں اپنے بیٹے کی بہت فکر ہے۔“ ڈاکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ابھی لے جانے کی صورت میں تمہیں ایک پیپر سائن کرنا ہوگا۔“

”کہاں ہے پیپر؟“ ریمنڈ نے بے صبری سے پوچھا۔

”کوئی پیپر نہیں۔“ این حتمی لہجے میں بولی۔ ”ہم چار گھنٹے بعد رومیو کو لینے آئیں گے۔“

بیس منٹ بعد وہ ٹریلر میں تھے اور این لنچ تیار کر رہی تھی۔ ریمنڈ کا موڈ خراب تھا۔ جینی ان دونوں سے بے نیاز اپنے آئی فون پر لگی ہوئی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ریمنڈ آگے بڑھا تھا کہ جینی نے کہا۔ ”یہ میرے لیے ہے۔“

ریمنڈ نے دروازہ کھولا تو وہی لمبے بالوں والا لڑکا اندر آیا اور کانوں سے زیادہ بگڑی انگریزی میں بولا۔ ”میں ایڈ فشر۔“

”اوہ ایڈ فشر۔“ ریمنڈ نے ہاتھ ملایا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“

جینی پرس شانے پر ٹانگ کر اٹھی تو این نے پوچھا۔ ”تم کہاں جا رہی ہو؟“

”باہر۔“

”اور یہ جو میں لنچ بنا رہی ہوں؟“

”واپس آ کر کھا لوں گی۔“ جینی نے کہا اور ایڈ فشر کو باہر دھکیلتے ہوئے خود بھی اس کے ساتھ نکل گئی۔ ریمنڈ اور این نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو وہ اس کی ہیوی بائیک پر پیچھے بیٹھی تھی۔ این کا موڈ خراب تھا۔ اسے یہ لمبے بالوں والا لڑکا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

”وہ تمہاری بیٹی نہیں ہے۔“ ریمنڈ نے یاد دلایا۔

”تو میں بھی تمہاری بیوی نہیں ہوں جو تمہارے لیے کھانا بناؤں۔“ این نے چیخ کر کہا مگر چند منٹ بعد وہ میز پر بیٹھے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔

”تم نے بہت مزے کا اسٹیک بنایا ہے۔“ ریمنڈ نے کہا۔

”میں کھانا بہت اچھا بناتی ہوں۔ میں نے اپنی ماں سے سیکھا ہے۔“

ریمنڈ ہچکچایا پھر اس نے پوچھا۔ ''تم یہ کام کیوں کرتی ہو؟''

''کیونکہ مجھے اپنی مام کے میڈیکل بل کی ادائیگی کرنی ہے۔ میری آمدنی کا بڑا حصہ اسی میں چلا جاتا ہے۔ وہ کینسر کی مریضہ تھی اور مرنے تک ڈیڑھ لاکھ ڈالرز کا بل بن گیا تھا۔''

''اوہ، مجھے افسوس ہوا۔''

''تم کیوں یہ کام کرتے ہو؟''

''پتا نہیں۔'' ریمنڈ نے اس کی طرف دیکھا۔ ''شاید اس لیے کہ میں شروع سے یہی کام کرتا آیا ہوں۔ یا شاید یہ کام مجھے آسان لگا۔''

''مگر اسی کی وجہ سے تم اس چکر میں پھنسے۔'' این نے کہا۔ ''میرے خدا! میں اب تک نہیں جان سکی کہ ہم بچے کیسے؟''

''تقدیر نے ہمارا ساتھ دیا۔'' ریمنڈ نے کہا۔

''تم یہ کام چھوڑ دو۔'' این نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ''بنیادی طور پر تم ایک اچھے آدمی ہو۔ تمہیں اس قسم کے کاموں سے دور رہنا چاہیے۔''

''میں سوچوں گا۔''

دروازہ کھلا اور جینن اندر آئی۔ این نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ جینن نے پوچھا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' ریمنڈ گھبرا کر بولا۔

''ہم تمہارے بارے میں بات کر رہے تھے۔'' این نے کہا۔ ''تم نے ہم سے پوچھا اور نہ بتایا اور اس لفنگے کے ساتھ چلی گئیں۔''

''ہم فیملی نہیں ہیں۔'' جینن پاؤں پٹخ کر بولی۔

''مگر اس کا ایکٹ تو کر رہے ہیں۔'' این نے یاد دلایا۔ تو جینن نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اوکے آئی ایم سوری۔''

''اب جلدی سے کھانا کھا لو، ہمیں روانہ ہونا ہے۔'' ریمنڈ نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ اس نے ٹریلر سے نکل کر اپنا موبائل فون نکالا اور جارڈی کو کال کی۔ وہ اس کی آواز سن کر چہکا۔

''ہے ریمنڈ! تمہیں زندہ پا کر خوشی ہو رہی ہے۔''

''لیکن میں مرتے مرتے بچا ہوں۔'' ریمنڈ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''دوسری بات، سو کلوگرام لانے کی ہوئی تھی اور تم نے اس کا معاوضہ ایک لاکھ ڈالرز کہا تھا مگر یہ ایک ٹن ہے اس لیے معاوضہ بھی ایک ٹن کے حساب سے ہونا چاہیے۔''

''تم یہاں آچکے ہو۔'' جارڈی نے چالاکی سے کہا۔

''لیکن مال تم تک نہیں پہنچا ہے۔'' ریمنڈ نے بھی اسے یاد دلایا۔

''اوکے تم کیا چاہتے ہو؟''

''دو ملین ڈالرز۔''

''یہ بہت زیادہ ہیں۔''

''اس سے ایک ڈالر بھی کم نہیں۔''

جارڈی کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ''مجھے منظور ہے لیکن مال آج رات بارہ بجے تک میرے پاس ہونا چاہیے۔''

''آج رات بارہ بجے۔'' ریمنڈ نے اسے یقین دلایا۔ وہ اندر آیا تو جینن لنچ کر رہی تھی۔ شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ وہ اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ این نے کاؤنٹر پر رومیو کے بارے میں پوچھا تو کچھ دیر میں رومیو وہیل چیئر پر وہاں لایا گیا۔ ریمنڈ نے اس کے پیپر پر سائن کیے اور اسے وہیل چیئر سمیت لے کر باہر لپکا۔ وقت نہیں تھا اس لیے ریمنڈ وہیل چیئر پر ہی رومیو کو لے کر پارک کی طرف دوڑا۔ جینن اور این پیچھے دوڑتے آرہے تھے۔ وہ پارک میں داخل ہوئے تو این نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''تم پاگل ہو گئے ہو۔ تمہیں رومیو کا خیال نہیں ہے۔''

''وقت نہیں ہے۔'' ریمنڈ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو دوڑتی وہیل چیئر مڑی اور پھر رومیو سمیت الٹ گئی۔ وہ کراہا تھا۔

''میرے خدا! تم سچ مچ پاگل ہو رہے ہو۔'' این چلائی۔ ''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔''

''میں پاگل ہو گیا ہوں یا تم لوگ بات نہیں سمجھ رہے ہو۔ مجھے ہر صورت میں یہ ٹریلر رات بارہ بجے سے پہلے جارڈی تک پہنچانا ہے ورنہ دو ملین ڈالرز نہیں ملیں گے۔''

زبان سے الفاظ ادا کرتے ہی ریمنڈ کو احساس ہوا کہ اس نے کیا کہہ دیا ہے۔ این بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ''تم اس کام کے دو ملین ڈالرز وصول کر رہے ہو اور مجھے کیا دے رہے ہو..... صرف تیس ہزار ڈالرز۔''

جینن بھی حیران تھی۔ ''مجھے صرف ایک ہزار ڈالرز۔''

رومیو بہ مشکل کھڑا ہوا تھا۔ اس نے منہ کھول کر کہا۔ ''کیا ادائیگی بھی ہوئی تھی؟''

''ریمنڈ! تم سچ مچ ایک شرمناک شخص ہو۔'' این نے جارحانہ انداز میں کہا۔

''بکواس بند کرو۔'' ریمنڈ کا موڈ خراب ہو گیا۔ ''میں نے تم سب کو ہائر کیا ہے اور تمہیں وہی سب کرنا ہوگا جو میں کہوں گا۔''

''میں نہیں کروں گی۔'' جینن نے کہا۔ ''لعنت ہو تم پر۔''

جینی پلٹ کر جانے لگی تو ریمنڈ نے عقب سے کہا۔ ”اگر تم گئیں تو ہمارے ساتھ نہیں جاسکوگی۔“
جواب میں جینی نے مڑے بغیر ہاتھ اوپر کر کے ایک واہیات اشارہ کیا۔ ریمنڈ نے این اور رومیو کی طرف دیکھا۔ ”تم دونوں چلو۔“
”میں اس کے بغیر نہیں جاؤں گی۔“ این نے انکار کیا۔
”او کے تم بھی یہیں رہو۔“ ریمنڈ گاڑی کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول کر رومیو سے کہا۔ ”تم آؤ۔“
اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”سوری ریمنڈ! ان دونوں کو چھوڑ کر جانا ٹھیک نہیں ہے۔“
”ٹھیک ہے تم بھی یہیں رہو۔“ اس نے کہا اور ٹریلر میں چلا گیا۔ این زیر لب اسے گالیاں دے رہی تھی۔ ٹریلر حرکت میں آیا تو اس نے رومیو سے کہا۔
”آؤ جینی کو دیکھتے ہیں۔“

☆☆☆

جینی بہت اداس تھی۔ وہ بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے الگ ہو گئی تھی مگر اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرے۔ اس کے پاس زیادہ رقم بھی نہیں تھی۔ وہ ایک بنچ پر بیٹھی تھی کہ ایڈ فنشر آ گیا۔ ”ہے تم یہاں ہو؟ کیا تم اکیلی ہو؟“
”ہاں ...... وہ..... میں اکیلی ہوں۔“ اس نے اعتراف کر لیا۔
”اوہ تم رو رہی ہو، آؤ میرے ساتھ۔“ ایڈ فنشر نے ہمدردی سے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔

☆☆☆

ریمنڈ ٹریلر لے کر نکلا تو غصے میں تھا۔ اسے ان تین احمقوں پر غصہ آرہا تھا جو معاملے کی نزاکت سمجھنے کو تیار نہیں تھے مگر رفتہ رفتہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا اور پھر اس کے اندر پچھتاوا آنے لگا۔ اسے ان کو چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ بے شک مصنوعی سہی لیکن وہ ایک فیملی تو تھے۔ ہر مشکل موقع پر وہ ساتھ رہے اور اب جبکہ کامیابی بالکل سامنے تھی تو وہ ان سے الگ ہو گیا۔ اس نے خود کو یاد دلایا کہ وہ اس سے الگ ہوئے تھے مگر اس کا ضمیر مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی توجہ ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ وہ دو ملین ڈالرز لے کر فلوریڈا چلا جائے گا اور وہاں کوئی چھوٹا موٹا بزنس کر لے گا جو اسے اتنی ہی آمدنی دے جتنی کہ وہ منشیات فروشی سے حاصل کرتا تھا۔ اس طرح وہ اپنا اچھا تاثر بنانے میں کامیاب رہے گا۔ مگر وہ مطمئن نہیں تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سختی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے اور پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر بریک پر پاؤں رکھا۔

☆☆☆

جینی اور ایڈ فنشر کارنیوال کے ایک نسبتاً سنسان گوشے میں تھے۔ جینی اسے اپنی کہانی سنا رہی تھی مگر ایڈ فنشر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتوں کی طرف اس کا دھیان نہیں تھا۔ اچانک اس نے پیش قدمی کی کوشش کی تو جینی بدک گئی۔ ”میں تم سے صرف ہمدردی کی توقع کر رہی ہوں۔“
”تو میں اور کیا کر رہا ہوں۔“ ایڈ فنشر نے اس کا بازو پکڑا تو جینی نے جھٹکا دے کر چھڑانا چاہا۔ ایڈ فنشر زبردستی پر اتر آیا تھا۔
”اسے چھوڑ دو اسے۔“ اچانک این کی تیز آواز آئی۔ وہ رومیو کے ہمراہ جینی کو تلاش کرتی ہوئی وہاں آ گئی تھی۔ جینی جلدی سے ہاتھ چھڑا کر ان کے پاس پہنچ گئی۔ ”اب تم نے اسے ہاتھ لگایا تو......“
”کیا کر لو گی تم؟“ ایڈ فنشر بولا۔ اس پر رومیو سامنے آیا اور ہچکچا کر کہا۔
”بہتر ہوگا تم اپنی راہ لو۔“ اس نے کہتے ہوئے پہلے سے مدافعتی انداز میں ہاتھ بلند کر لیا جیسے اسے گھونسے کا خدشہ ہو۔ پھر گھونسا چلا اور ایڈ فنشر اپنی ناک پکڑ کر پیچھے جا گرا۔ این نے گھونسا تو مار دیا تھا مگر اب اپنا ہاتھ پکڑے کراہ رہی تھی۔ ایڈ فنشر کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔
”تم نے میری ناک توڑ دی ہے۔“
”میں تمہاری باقی ہڈیاں بھی توڑ دوں گی۔“ این نے اسے لات ماری۔ ”یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“
وہ اٹھ کر خوفزدہ انداز میں بھاگ نکلا۔ رومیو اور جینی حیران نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ”تم ٹھیک ہو؟“ این نے اس سے پوچھا۔ ”ہم تمہیں تلاش کر رہے تھے۔“
”شکر ہے تم لوگ آ گئے ورنہ یہ بہت غلط لڑکا نکلا۔“
”آؤ چلو، ابھی ہمیں واپس بھی جانا ہے۔“ این نے کہا اور رومیو کی طرف دیکھا۔ ”اس وقت کھڑے ہونے کے لیے تمہارا شکریہ۔“
وہ مڑے تھے کہ انہوں نے سامنے ریمنڈ کو دیکھا۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ ”میں آ گیا۔“
”تو؟“ این نے سرد لہجے میں کہا۔
”میں تم لوگوں کو لینے آیا ہوں۔ وہ دو ملین ڈالرز میں جارڈی سے وصول کروں گا، اس میں تم سب کا حصہ

گا۔ این! تم اپنی ماں کے علاج کا میڈیکل بل ادا کرسکو گی۔ جین! تم اپنا گھر لے سکو گی اور رومیو تم اپنے سارے شوق پورے کرسکو گے۔" ریمنڈ نے جوش سے کہا اور مڑتے ہوئے بولا۔" چلو وقت کم ہے۔"

مگر وہ اپنی جگہ کھڑے رہے۔ این نے سینے پر ہاتھ باندھ لیے تھے۔" ہم ایسے نہیں جائیں گے۔"

ریمنڈ کراہا۔" خدا کے لیے.... تم کیا چاہتی ہو کہ میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر تم سے التجا کروں؟"

" بالکل۔" این نے سر ہلایا۔

" اف۔" ریمنڈ نے اپنے بال نوچے اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولا۔" اوکے میں......"

" چلو بچو...." این نے کہا اور وہ تینوں اس کے پاس سے ہوتے ہوئے ٹریلر کی طرف چلے گئے۔ ریمنڈ خوشی سے ان کے پیچھے لپکا۔ ٹریلر کے پاس پہنچ کر وہ ٹھٹکے۔ سامنے سے سارہ اور نورا آرہے تھے۔ سارہ خوشی سے بولی۔

" تم...."

" تم...." ان کے منہ سے نکلا۔

" یہ کون ہے؟" نورا نے آنکھیں پھیلا کر کہا تو انہوں نے مڑ کر دیکھا اور ہڑبڑا کر پیچھے آئے۔ یک چشم ان کے عین پیچھے کھڑا ہوا تھا۔

" تم یہاں بھی آگئے۔" ریمنڈ نے چلا کر کہا۔" تمہیں کیسے پتا چلتا ہے کہ ہم کہاں ہوتے ہیں؟"

" اس سے۔" یک چشم نے ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر نیچے پھینکا۔" یہ پھلوں کی ٹوکری میں تھا۔ اس سے تم جہاں جاتے ہو مجھے پتا چل جاتا ہے۔"

یک چشم کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ اس نے ان کی طرف سیدھا کیا تھا کہ ڈیوڈ کے ٹریلر کا دروازہ کھلا اور وہ کافی کے جہازی سائز مگ کے ساتھ برآمد ہوا۔ یک چشم کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے گرم کافی اس کے منہ پر اچھال دی۔ یک چشم نے دھاڑ ماری اور پستول کا رخ اس کی طرف کیا تھا کہ ڈیوڈ نے مگ آگے کر دیا۔ گولی اس کے پیندے سے ٹکرائی اور واپس آکر یک چشم کے ہاتھ پر لگی کیونکہ یہ موٹی اسٹیل کی چادر کا بنا ہوا مگ تھا۔ اس نے دوسری دھاڑ ماری۔ ڈیوڈ نے مگ بلند کیا اور ہوا میں اچھل کر نیچے آتے ہوئے پوری قوت سے یک چشم کے سر پر مارا۔ وہ آخری دھاڑ کے ساتھ نیچے گرا اور ساکت ہو گیا۔ ڈیوڈ نے جلدی سے اپنے پاس سے پلاسٹک کی ہتھکڑی برآمد کی اور یک چشم کے ہاتھ پیچھے کس کر باندھ دیے۔ ریمنڈ نے خوشی سے کہا۔

" تم نے ہمیں بچا لیا۔"

" یہ کیا چکر ہے...... یہ کون ہے؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔" اس نے پستول کس پر نکالا تھا؟"

" میں بتاتا ہوں۔" ایک طرف سے گرینگو یوں برآمد ہوا کہ اس نے پستول کی نال نورا کے سر سے لگا رکھی تھی۔ وہ ایک کونے میں تھی اور اس کے قابو میں آگئی۔" مسٹر...... پہلے تم پستول پھینکو۔"

بیٹی کو خطرے میں دیکھ کر ڈیوڈ نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔" پلیز اسے کچھ مت کہنا۔"

" مگ بھی۔" گرینگو نے اشارہ کیا تو اس نے مگ بھی پھینک دیا۔ گرینگو نے نورا کو آگے دھکیلا اور بولا۔" تم سب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

" دیکھو، یہ سب میرا قصور ہے۔" ریمنڈ آگے آیا۔" میری جوانا میں لے کر آیا ہوں۔ ان لوگوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

" تم ڈرگ ڈیلر ہو۔" ڈیوڈ نے بے یقینی سے کہا۔

" ڈرگ اسمگلر۔" رومیو نے تصحیح کی۔" دونوں میں فرق ہوتا ہے۔"

" ان لوگوں کو جانے دو اور تم بھی اپنی میری جوانا لے کر جاسکتے ہو۔ کسی کو قتل کرنا ضروری نہیں ہے۔" ریمنڈ نے مصالحتی فارمولا پیش کیا۔

" تم نے میری میری جوانا چرائی۔" گرینگو غرایا اور این کی طرف دیکھا۔" اس عورت کی وجہ سے میری ڈاڑھی اور مونچھیں برباد ہوئیں۔" انہوں نے پہلی بار غور کیا کہ وہ کلین شیو تھا۔ اس نے رومیو کی طرف دیکھا۔" اس نے میری قیمتی فراری کے ٹکڑے اڑا دیے۔"

" میں نے کچھ نہیں کیا۔" جین خوش ہو کر بولی۔

" لیکن بچو گی تم بھی نہیں۔"

" اوکے، تمہارے دل کی آگ کسی کے قتل سے بجھ سکتی ہے تو مجھے قتل کر دو۔ میں ان لوگوں کو مرتے نہیں دیکھ سکتا۔"

" اس لیے پہلے میں تمہیں شوٹ کروں گا تاکہ تم انہیں مرتے دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہو۔" گرینگو نے پستول سیدھا کیا تو سب نے آنکھیں بند کر لیں۔ دھماکا ہوا بلکہ دھماکے ہوئے تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ آسمان پر آتش بازی چھوٹ رہی تھی اور ریمنڈ گرینگو سے الجھا ہوا تھا۔ اس کی توجہ ایک لمحے کو ہٹی تو ریمنڈ نے اس کا پستول والا ہاتھ پکڑ

لیا اور پھر اس نے جھٹکا دیا تو پستول اچھل کر رومیو کی طرف گیا۔ اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اسے کیچ کیا اور این کی طرف اچھال دیا۔ وہ پستول قابو کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ گرینگو ریمنڈ کا مکا کھا کر نیچے گرا...... وہ خاموشی سے اپنی بیلٹ سے دوسرا پستول نکال کر پلٹا تھا کہ نزدیک ہی کھڑے رومیو نے دیکھ لیا اور اس نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ایک گھونسا رسید کیا۔ گرینگو کراہ کر گرا۔ ایک منٹ سے پہلے ڈیوڈ اسے بھی جکڑ چکا تھا۔ اس نے تمام ہتھیار بھی اپنے قبضے میں کر لیے تھے۔ ریمنڈ بے چین تھا۔ اس نے کہا۔

''اب ہمیں جانا ہوگا۔''

''ایسے نہیں۔'' ڈیوڈ نے اپنا سروس پستول نکال لیا۔ ''تم جانتے ہو میں قانون کا محافظ ہوں۔''

ان چاروں کے رنگ اڑ گئے تھے۔ این نے کہا۔ ''تم ہمیں گرفتار کرلو گے؟''

سارہ آگے آئی اور دانت پیس کر بولی۔ ''ڈیوڈ.....''

''یہ میرا فرض ہے۔'' وہ بولا۔ ''میرے سامنے کچھ ممکنہ قانون شکن ہیں اور میں انہیں گرفتار کر رہا ہوں۔ لیکن دوسری طرف میری فیملی ابھی ایک مشکل سے نکلی ہے تو میں اس کی طرف مڑ کر انہیں گلے سے لگا رہا ہوں۔'' ڈیوڈ نے کہتے ہوئے ان کی طرف پیٹھ کر لی اور سارہ اور نورا کو گلے سے لگا لیا۔ یہ واضح اشارہ تھا۔ این نے ریمنڈ کو ٹہوکا دیا۔

''سوچ کیا رہے ہو؟''

☆☆☆

ریمنڈ جارڈی کے شاندار دفتر میں تھا اور ایک طرف بل اور ہیمر میری جوانا کے پیکٹ لا کر ترتیب سے رکھ رہے تھے۔ جارڈی نے کہا۔ ''تم نے اپنا کام کر دیا۔''

''تو میرے دو ملین ڈالرز۔''

''سوری، تم لیٹ ہو گئے اس لیے دو ملین ڈالرز نہیں ملیں گے، ہاں تمہارا قرض معاف ہے۔''

''یہ زیادتی ہے۔'' ریمنڈ نے احتجاج کیا۔

جارڈی مکاری سے مسکرایا۔ ''ڈیل ڈیل ہوتی ہے دوست۔ تم ڈیل پوری کرنے میں ناکام رہے۔ بل امسٹر آرسل کو اس کے گھر تک چھوڑ کر آؤ۔''

بل اس کی طرف بڑھا تھا کہ اچانک اوپر گنبد کے شیشے ٹوٹے اور اس سے تین عدد ڈی ای اے ایجنٹس رسیوں سے پھسلتے ہوئے نیچے آئے اور اسی وقت دروازہ کھول کر کوئی نصف درجن ڈی ای اے ایجنٹس مزید اندر گھس آئے۔ ان کی رائفلوں کا رخ ان تینوں کی طرف تھا۔ جارڈی، بل اور ہیمر نے فوراً ہاتھ اوپر کر لیے اور ریمنڈ ایسے ہی کھڑا رہا۔ ایجنٹس نے انہیں غیر مسلح کر کے ہتھکڑیوں میں جکڑ دیا اور جب انہیں وہاں سے لے جانے لگے تو جارڈی نے دانت پیس کر کہا۔ ''تم نے ڈبل کراس کیا، اب اس کا نتیجہ دیکھنا۔''

ان لوگوں کے وہاں سے جانے کے بعد ڈیوڈ اندر آیا۔ اس نے ریمنڈ کی طرف دیکھا۔ ''اس تعاون کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔ ڈی ای اے کو کبھی دو دن میں اتنی کامیابیاں نہیں ملیں۔''

''ہمارا کیا ہوگا؟'' ریمنڈ فکر مند تھا۔ ''جارڈی گرفتار ہوا ہے لیکن اس کے آدمی ہیں۔''

''تم فکر مت کرو۔ امریکی حکومت تمہیں اور ان تینوں کو مکمل تحفظ دے گی۔ تمہیں کسی دور دراز جگہ منتقل کیا جائے گا جہاں تم شناخت بدل کر رہ سکو گے۔ اور ہاں، تمہیں پکڑی جانے والی منشیات کی مالیت کا دو فیصد بہ طور انعام ملے گا۔''

ریمنڈ کو لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے کیونکہ پکڑی جانے والی میری جوانا کی مالیت بیس کروڑ ڈالرز تھی۔ گویا اسے دو ملین ڈالرز اب بھی ملتے اور ساتھ ہی وہ سرکاری خرچ پر مزے سے زندگی گزارتے۔ دو ہفتے بعد وہ الی نوائز کے ایک درمیانے درجے کے خوب صورت قصبے کے ایک بڑے اور حسین مکان میں تھے۔ اس دو منزلہ مکان کے گرد شاندار لان تھا۔ این لاؤنج میں اپنے لیپ ٹاپ پر کچھ کر رہی تھی۔ جین اپنے اتالیق کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور رومیو بیس بال میچ کے لیے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ این خوش تھی کہ اس کی ماں کے علاج کا میڈیکل بل حکومت نے ادا کر دیا تھا۔ انعامی رقم ان چاروں کے حصے میں مساوی آئی تھی۔ جین نے تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور رومیو بیس بال کا پروفیشنل کھلاڑی بننا چاہتا تھا۔ اب اس کے پاس موقع اور وسائل تھے۔ این اپنا کام مکمل کر کے اس کی طرف پلٹی۔ ''ہم کب تک اس طرح رہیں گے؟''

''جب تک خطرہ ٹل نہیں جاتا لیکن کیا تمہیں پریشانی ہے؟''

این مسکرانے لگی۔ ''نہیں، اس کے برعکس میں چاہتی ہوں کہ ہم اسی طرح ہمیشہ ساتھ رہیں۔ ایک خاندان بن کر۔''

ریمنڈ بھی مسکرانے لگا۔



لیا اور پھر اس نے جھٹکا دیا تو پستول اچھل کر رومیو کی طرف گیا۔ اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اسے کیچ کیا اور این کی طرف اچھال دیا۔ وہ پستول قابو کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ گرینگو ریمنڈ کا مکا کھا کر نیچے گرا...... وہ خاموشی سے اپنی بیلٹ سے دوسرا پستول نکال کر پلٹا تھا کہ نزدیک ہی کھڑے رومیو نے دیکھ لیا اور اس نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ایک گھونسا رسید کیا۔ گرینگو کراہ کر گرا۔ ایک منٹ سے پہلے ڈیوڈ اسے بھی جکڑ چکا تھا۔ اس نے تمام ہتھیار بھی اپنے قبضے میں کر لیے تھے۔ ریمنڈ بے چین تھا۔ اس نے کہا۔

''اب ہمیں جانا ہوگا۔''

''ایسے نہیں۔'' ڈیوڈ نے اپنا سروس پستول نکال لیا۔ ''تم جانتے ہو میں قانون کا محافظ ہوں۔''

ان چاروں کے رنگ اڑ گئے تھے۔ این نے کہا۔ ''تم ہمیں گرفتار کرلو گے؟''

سارہ آگے آئی اور دانت پیس کر بولی۔ ''ڈیوڈ......''

''یہ میرا فرض ہے۔'' وہ بولا۔ ''میرے سامنے کچھ ممکنہ قانون شکن ہیں اور میں انہیں گرفتار کر رہا ہوں۔ لیکن دوسری طرف میری فیملی ابھی ایک مشکل سے نکلی ہے تو میں اس کی طرف مڑ کر انہیں گلے سے لگا رہا ہوں۔'' ڈیوڈ نے کہتے ہوئے ان کی طرف پیٹھ کر لی اور سارہ اور انورا کو گلے سے لگا لیا۔ یہ واضح اشارہ تھا۔ این نے ریمنڈ کو ٹہوکا دیا۔

''سوچ کیا رہے ہو؟''

☆☆☆

ریمنڈ جارڈی کے شاندار دفتر میں تھا اور ایک طرف بل اور ہیمر میری جوانا کے پیکٹ لا کر ترتیب سے رکھ رہے تھے۔ جارڈی نے کہا۔ ''تم نے اپنا کام کر دیا۔''

''تو میرے دو ملین ڈالرز۔''

''سوری، تم لیٹ ہو گئے اس لیے دو ملین ڈالرز نہیں ملیں گے، ہاں تمہارا قرض معاف ہے۔''

''یہ زیادتی ہے۔'' ریمنڈ نے احتجاج کیا۔

جارڈی مکاری سے مسکرایا۔ ''ڈیل ڈیل ہوتی ہے دوست۔ تم ڈیل پوری کرنے میں ناکام رہے۔ بل! مسٹر آرسل کو اس کے گھر تک چھوڑ کر آؤ۔''

بل اس کی طرف بڑھا تھا کہ اچانک اوپر گنبد کے شیشے ٹوٹے اور اس سے تین عدد ڈی ای اے ایجنٹس رسیوں سے پھسلتے ہوئے نیچے آئے اور اسی وقت دروازہ کھول کر کوئی درجن بھر ڈی ای اے ایجنٹس مزید اندر گھس آئے۔ ان کی رائفلوں کا رخ ان تینوں کی طرف تھا۔ جارڈی، بل اور ہیمر نے فوراً ہاتھ اوپر کر لیے اور ریمنڈ ایسے ہی کھڑا رہا۔ ایجنٹس نے انہیں غیر مسلح کر کے ہتھکڑیوں میں جکڑ دیا اور جب انہیں وہاں سے لے جانے لگے تو جارڈی نے دانت پیس کر کہا۔ ''تم نے ڈبل کراس کیا، اب اس کا نتیجہ دیکھنا۔''

ان لوگوں کے وہاں سے جانے کے بعد ڈیوڈ اندر آیا۔ اس نے ریمنڈ کی طرف دیکھا۔ ''اس تعاون کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔ ڈی ای اے کو بھی دو دن میں اتنی کامیابیاں نہیں ملیں۔''

''ہمارا کیا ہوگا؟'' ریمنڈ فکر مند تھا۔ ''جارڈی گرفتار ہوا ہے لیکن اس کے آدمی ہیں۔''

''تم فکر مت کرو۔ امریکی حکومت تمہیں اور ان تینوں کو مکمل تحفظ دے گی۔ تمہیں کسی دور دراز جگہ منتقل کیا جائے گا جہاں تم شناخت بدل کر رہ سکو گے۔ اور ہاں، تمہیں پکڑی جانے والی منشیات کی مالیت کا دو فیصد بطور انعام ملے گا۔''

ریمنڈ کو لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے کیونکہ پکڑی جانے والی میری جوانا کی مالیت بیس کروڑ ڈالرز تھی۔ گویا اسے دو ملین ڈالرز اب بھی ملتے اور ساتھ ہی وہ سرکاری خرچ پر مزے سے زندگی گزارتے۔ دو ہفتے بعد وہ الی نوائز کے ایک درمیانے درجے کے خوب صورت قصبے کے ایک بڑے اور حسین مکان میں تھے۔ اس دو منزلہ مکان کے گرد شاندار لان تھا۔ این لاؤنج میں اپنے لیپ ٹاپ پر کچھ کر رہی تھی۔ جین اپنے ائرشیب کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور رومیو بیس بال میچ کے لیے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ این خوش تھی کہ اس کی ماں کے علاج کا میڈیکل بل حکومت نے ادا کر دیا تھا۔ انعامی رقم ان چاروں کے حصے میں مساوی آئی تھی۔ جین نے تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور رومیو بیس بال کا پروفیشنل کھلاڑی بننا چاہتا تھا۔ اب اس کے پاس موقع اور وسائل تھے۔ این اپنا کام مکمل کر کے اس کی طرف پلٹی۔ ''ہم کب تک اس طرح رہیں گے؟''

''جب تک خطرہ ٹل نہیں جاتا لیکن کیا تمہیں پریشانی ہے؟''

این مسکرانے لگی۔ ''نہیں، اس کے برعکس میں چاہتی ہوں کہ ہم اسی طرح ہمیشہ ساتھ رہیں۔ ایک خاندان بن کر۔''

ریمنڈ بھی مسکرانے لگا۔

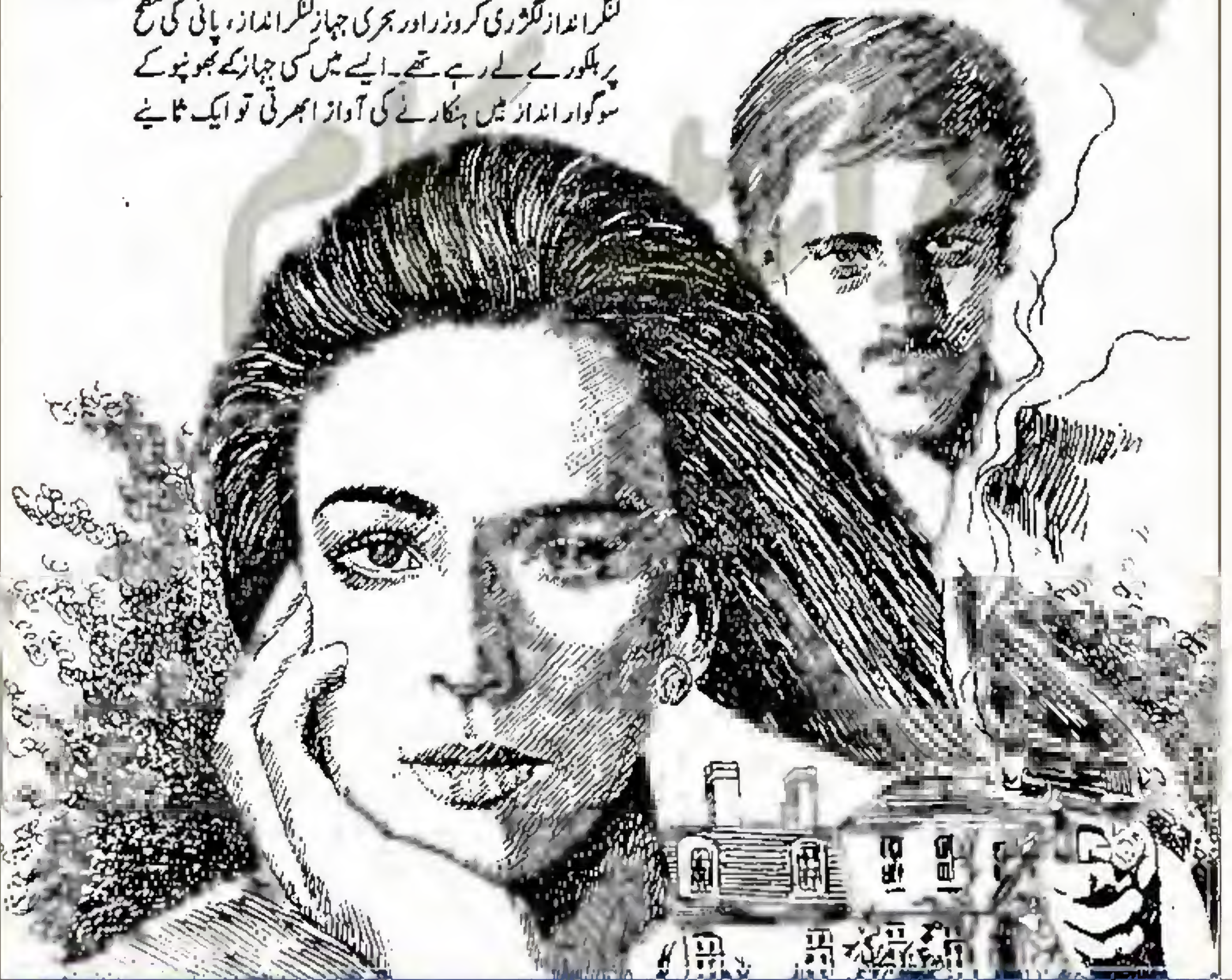
سودائے جنوں

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

عرصۂ دراز سے صیہونی قوتیں امتِ مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس ربِّ کائنات کا بھی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور ہر دور کا موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعونی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظرنامہ جو داستان دل گیر سناتا ہے اس نے تمام عالمِ اسلام میں دکھ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارضِ مقدس میں صیہونی یلغار ان کی چیرہ دستیوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذرِ آتش کرکے ہیکلِ سلیمانی تعمیر کرنے کی مذموم اور ناپاک سازش تیار کی تھی... جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی چنگیزیت اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی ہولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت وہاں گلی گلی دروازوں پر دستک دیتی گھوم رہی ہے لیکن... آج بھی کچھ پاگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سودائے جنوں میں مبتلا ہیں... اب اس بازی کا انجام...

پہلا حصہ | **اجلی رنگت اور مکروہ چہروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر**

قبرص کی بندرگاہ سیماسول پر کہر آمیز رات اتری ہوئی تھی۔ خلافِ توقع آج پورٹ پر چہل پہل معمول سے کم نظر آ رہی تھی۔ تاہم پورٹ کا ماحول چھوٹی بڑی برقی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ ساحل پر موجود دور قریب لنگرانداز لگژری کروزر اور بحری جہاز لنگرانداز، پانی کی سطح پر ہلکورے لے رہے تھے۔ ایسے میں کسی جہاز کے بھونپو کے سوگوار انداز میں ہنکارنے کی آواز ابھرتی تو ایک ثانیے





کے لیے کہرآلود ماحول عجیب سی گونج کے ساتھ تھرا جاتا۔ بحیرۂ روم سے آنے والی خنک اور مست خرام ہوائیں بھی مرتعش سی ہونے لگتیں۔ ہشت فروزاں کی بن پورٹ کی عمارت کے جنوبی حصے میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ ''ابحر'' نامی جہازراں کمپنی کے دفتر کی ایک برانچ تھی، جو دو فلورز پر مشتمل تھی، کارگو بلاک میں جو گراؤنڈ فلور پر واقع تھا، وہاں تاریکی تھی جبکہ فرسٹ فلور پر پسنجر ڈیلنگ ہوتی تھی۔ وہاں روشنی تھی اور وہاں بھی چند ہی افراد مخصوص وردیوں میں نظر آ رہے تھے۔ ایڈمن بلاک میں ایک شاہانہ طرز کے آفس روم میں ایک خوبرو اور دراز قامت نوجوان ٹیک کی بڑی سی میز کے عقب میں بھاری بھرکم ریوالونگ چیئر پر براجمان تھا۔ لبنانی نژاد یہ وجیہہ نوجوان مذکورہ جہازراں کمپنی کے مالک سلطان شیکھری کا اکلوتا بیٹا...... عابد شیکھری تھا۔

وہ اس وقت اپنے باپ کی خصوصی ہدایت پر آج دفتر میں دیر تک موجود تھا۔ اسے دو فلسطینی آفیسرز احسن الزہروی اور ابوجواد العزیز...... کا بے چینی سے انتظار تھا۔ یہ دونوں دو مسافر بردار بحری جہاز چارٹرڈ کروا چکے تھے۔ مذکورہ دونوں آفیسرز جلاوطن فلسطینی تھے۔ جنہیں اسرائیلی حکومت نے دیگر بہت سے فلسطینیوں کے ساتھ انہیں ان کی اپنی سرزمین سے زبردستی بے دخل کر دیا تھا۔ ان پر جلاؤ گھیراؤ اور اشتعال انگیز جلسے جلوس کروانے کا الزام تھا۔ صیہونی حکومت نے اس خودساختہ الزام تلے کئی سو کی تعداد میں فلسطینیوں کو جلاوطنی پر مجبور کر دیا تھا۔ جنہوں نے شام، مراکش اور اردن میں پناہ لے رکھی تھی۔ قبرص میں بھی ایک بڑی تعداد فلسطینی پناہ گزینوں کی موجود تھی اور مذکورہ دونوں آفیسرز نے اب قبرص کے رفیوجی کیمپ میں موجود ساڑھے سات سو فلسطینی پناہ گزینوں کو بحری جہاز کے ذریعے دوبارہ ان کے وطن واپس بھیجنے کا بندوبست کیا تھا۔ اس کے بعد یہ دونوں شام اور اردن کے فلسطینی ریفیوجیز کے سلسلے میں بھی ایسا ہی قدم اٹھانے والے تھے، انہیں دکھ تھا کہ اسرائیلی حکومت خود تو دنیا بھر کے یہودیوں کو لا کر بسا رہے تھے جبکہ فلسطینیوں کو ان کی اپنی سرزمین سے جلاوطنی کے نام پر بے دخل کیا جا رہا تھا۔

عابد شیکھری خود ہی نہیں بلکہ اس کا باپ سلطان شیکھری بھی ایک عرب مسلمان کی حیثیت سے ان کی اس معاملے میں امداد کا پختہ عزم کر چکے تھے۔

بندرگاہ کی عمارت کے باہر سیاہ تارکول کی سڑک دور تک ویران تھی، دفعتاً ایک ہیڈلائٹ کی چمک ابھری اور سیاہ چمکتی سڑک پر جیسے بجلیاں تھرک گئیں۔ وہ سیاہ رنگ کی مرسیڈیز تھی۔ اس میں ایک ڈرائیور اور عقبی سیٹ پر دو سوٹڈ بوٹڈ افراد سوار تھے، ان میں پینتالیس سالہ احسن الزہروی تھا، جو دراز قامت اور چھریرے جسم کا مالک تھا۔ دوسرا اس سے نسبتاً کم عمر اور درمیانی قامت کا ابوجواد العزیز تھا۔

سیماسول کی عمارت کی محراب پر نصب قدیم طرز کے ''بگ بینگ'' نے رات بارہ بجے کا اعلان کیا تو مرسیڈیز ٹھیک عمارت کے گیٹ پھاٹک کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ وسیع و عریض احاطے میں چند اور بھی نئی پرانے ماڈل کی چھوٹی بڑی گاڑیاں موجود تھیں۔ انہی میں ایک سیاہ رنگ کی کری سیڈا بھی کھڑی تھی، جو بہ ظاہر خالی نظر آ رہی تھی، مرسیڈیز اس سے ذرا آگے کھڑی ہوئی۔

''تمہارا وقت سلطان شیکھری سے طے شدہ تو تھا نا؟'' اترنے سے پہلے دراز قامت احسن نے ابوجواد سے پوچھا۔

''جی ہاں! سلطان نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کا بیٹا عابد شیکھری ہمارے ساتھ باقی کے معاملات طے کر دے گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔'' درمیانی قامت کے نسبتاً خوبرو شخص، ابوجواد العزیز نے جواب دیا۔ ساتھ ہی اس نے اپنی بیش قیمت رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ ڈرائیور ساکت تھا۔ دونوں اپنی اپنی طرف کا دروازہ کھول کے اترنے لگے۔ ٹھیک اسی وقت ان کے عقب میں تقریباً آٹھ دس گز کے فاصلے پر کھڑی سیاہ کری سیڈا کار میں تین سر طلوع ہوئے، ان کے چہروں پر سیاہ نقاب چڑھا ہوا تھا، اور آنکھوں سے سفاک چمک مترشح تھی۔ چہروں کے ساتھ ہی جدید رائفلوں کی مہیب نالیں بھی ان کے پہلوؤں میں طلوع ہوئی تھیں۔ ان تینوں نقاب پوشوں کی عقابی نظریں...... سامنے مرسیڈیز سے اترتے ہوئے انہی دونوں فلسطینی آفیسروں پر مرکوز تھیں جن کے باہر اترتے ہی یہ تینوں مسلح نقاب پوش اپنی سیاہ کری سیڈا سے برآمد ہوئے اور وہیں کھڑے کھڑے یک بیک انہوں نے دونوں کا نشانہ لے کر اپنی رائفلوں کے ٹریگر دبا دیے۔

سیماسول بندرگاہ کا دم بہ خود ماحول گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے تھرا اٹھا۔ احسن الزہروی...... کا جسم گولیوں سے چھلنی ہوا اور وہ وہیں تیورا کر گر پڑا جبکہ ابوجواد خوش قسمتی سے زخمی ہو کے گر پڑا، گولیوں کی بارش جاری تھی اور نئی نویلی مرسیڈیز کی چمکتی باڈی گولیوں کا چھلنی جا رہی تھی۔ ڈرائیور بھی موقع پر جاں بحق ہو گیا تھا۔ ابوجواد گرتے ہی کہنیوں اور پیٹ کے بل گھسٹتا ہوا اپنی ہی گاڑی کی آڑ لیتا کنکریٹ

کے بے قدمچوں کی طرف بڑھا اور پھر ہمت کر کے زخمی ہونے کے باوجود اٹھ کر دوڑا۔ قدمچے زیادہ بلند نہ تھے۔ پر اس طرف کچھ تاریکی بھی تھی۔ سامنے نظر آتی ہوئی، سنسناتی موت کو اپنے تعاقب میں دیکھ کر جواد پر اپنی جان بچانے کی خواہش اس قدر غالب تھی کہ اس کے زخمی وجود میں ایک مجنونانہ طاقت سی بھر گئی تھی، گویا وہ کسی جادو یا معجزے کی توقع کیے ہوئے ہو کہ... وہ ہتھیار بہ دست اپنے نامعلوم دشمنوں سے بچ سکتا ہے۔

چکنے فرش پر قدم پڑتے ہی اس کی امید کا ٹمٹماتا دیا کچھ فزوں ہوا، اور پھر وہ اٹھ کر دوڑا۔ ادھر تینوں نقاب پوش موت کے ہرکارے بنے ہوئے تھے اور انہوں نے واضح طور پر اپنے آخری شکار کو زخمی ہو کے گرتے اور پھر مرسڈیز کے پیچھے غائب ہوتے دیکھ لیا تھا۔ گولیوں کی تڑاتڑ جاری تھی۔ ایسے ہی وقت میں کوئی بھولی بھٹکی گولی ادھڑی ہوئی مرسڈیز کی فیول ٹینکی میں بھی جا لگی، ایک بیک دھماکا ہوا اور شعلوں کی بھڑکتی آتشیں گود میں مرسڈیز زمین سے کوئی تین چار فٹ اوپر اچھلی۔

''واپس لوٹ جانا چاہیے۔'' عبرانی لب و لہجے میں ایک ہرکارے نے اپنی مہیب رائفل کی خونیں پیاس بجھتے ہی اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''ایک شکار زخمی ہو کے بھاگا ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ۔'' دوسرے ہرکارے نے کہا۔ تیسرا وہیں کھڑا رہا۔ دونوں مذکورہ ہرکارے عمارت کے زینوں کی طرف دوڑے۔ یہ وہی وقت تھا جب زخمی فلسطینی آفیسر ابوجواد العزیز...... اپنی جان بچانے کی تگ و دو میں چکنے فرش پر لنگڑاتا، لڑکھڑاتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ اس کی انتہائی کوشش تھی کہ...... کسی طرح...... البحر کمپنی کے آفس تک جا پہنچے...... جہاں اسے اپنی جان بچ جانے کی پوری امید تھی۔

اپنے شاہانہ طرز کے آفس روم میں موجود عابد شیکھری فائرنگ کی آواز پر بری طرح چونکا تھا۔ اس کے ہمراہ اس وقت دو ملازم موجود تھے، عابد شیکھری نے کوئی خطرہ محسوس کرتے ہی اپنی میز کی دراز سے جرمن ساختہ نیلگوں مائل سیاہ ریوالور نکال لیا۔ یہ لمبی نال والا جدید پستول تھا۔ جس کے غیر معمولی لمبوترے چیمبر میں سات گولیاں ڈلتی تھیں۔

''سر! آپ کدھر جا رہے ہیں؟ باہر حالات ٹھیک نہیں۔'' ایک گٹھے ہوئے جسم کے ملازم نے شیکھری کو روکنے کی کوشش کی مگر شیکھری کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ شاید اسے ایسی کسی گڑبڑ کی پہلے سے توقع تھی اور وہ کچھ کچھ سمجھ رہا تھا کہ ہوا کیا تھا؟ جلد ہی اسے سامنے ایک شخص لڑکھڑاتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ جب تک شیکھری کچھ سمجھتا دفعتاً موت کے دونوں ہرکاروں نے اپنے آخری شکار کو ''البحر'' کی پناہ کی طرف جاتے دیکھ لیا۔ وہیں کھڑے کھڑے دونوں نے مہیب نالوں والی رائفلیں سیدھی کر دیں۔

''نیچے...... نیچے...... گر جاؤ۔'' شیکھری نے غالباً اس سنسنی خیز اور خوں ریز ڈرامے کا ''کلائمکس'' بھانپتے ہی...... زخمی ابوجواد سے چیخ کر کہا۔ جس کے چہرے پر شیکھری کو دیکھ کر دیدنی مسرت چمکی تھی مگر متعاقب اور یقینی موت نے اسے راہ میں ہی دبوچ لیا۔ بیک وقت دونوں ہرکاروں کی گنوں نے آتشیں قہقہے اگلے تھے اور ابوجواد العزیز...... چکنے فرش پر رقص اجل کرتا لہراتا دھڑام سے گرا...... دونوں ہرکارے پلٹ چکے تھے۔ عابد شیکھری نے بھی خود کو نیچے گرا دیا تھا۔

☆☆☆

اسرائیلی خنجر...... جس دن سرزمین فلسطین کے سینے میں اتارا گیا۔ اس روز سے ایک خونی کھیل کا آغاز ہوا۔ یہ خونی کھیل آج تک جاری ہے۔

دنیا بھر میں دہشت گردی کے نام پر اپنی من مانی کرنے والے امریکا کے پالتو بچے اسرائیل نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر کمزور فلسطینیوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے ایسے ایسے منصوبے بنائے جو انسانیت کے سراسر خلاف تھے۔

مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ دنیا نے اس پر کوئی انگلی تک نہ اٹھائی۔ انہی دنوں میں اسرائیلی اخبار ''داوار'' میں ایک چونکا دینے والی رپورٹ شائع ہوئی۔ عبرانی زبان میں چھپنے والے اس اخبار کی رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ وزیراعظم اضحاق شمعون کے سیکیورٹی ایڈوائزر لیفٹیننٹ کرنل پریسلو بارق نے ان پر زور دیا ہے کہ تنظیم آزادی فلسطین کے چیدہ چیدہ رہنماؤں کو قتل کر دیا جائے۔

اگرچہ ابھی باقاعدہ اسرائیل کے اس گھناؤنے منصوبے کو کوئی عملی شکل نہ دی گئی تھی، تاہم تنظیم آزادی فلسطین کے رہنما نے اپنے تمام سینئر افسروں کے نام انتباہی سرکلر جاری کر دیا۔ جس میں انہوں نے یہ حکم دیا کہ...... ''داوار'' کے مضمون کی نقول دنیا بھر میں پی ایل او کے دفاتر کو بھیج دی جائیں۔

مقبوضہ علاقوں کے فلسطینی مسلمان گزشتہ کئی برسوں

سے اسرائیلی مظالم کے خلاف ڈٹے ہوئے تھے۔ غزہ، القدس، نابلس، یروشلم، جناہ اور تل کرم کے علاوہ دوسرے مقبوضہ شہروں اور قصبوں میں روزانہ احتجاجی مظاہرے ہوتے تھے اور اب تک سیکڑوں فلسطینی شہید ہو چکے تھے۔ اسرائیل کی جانب سے تمام تر تشدد کے باوجود اسرائیلی حکام فلسطینیوں کے جذبہ حریت و آدرش کو دبا نہیں سکے تھے، اس لیے اسرائیل کے ناقابلِ تسخیر ہونے کے مقصد کو زبردست ٹھیس پہنچی تھی۔

☆☆☆

تل ابیب کی شیماز یونیورسٹی میں فلسطینی و عرب طلبا تنظیموں کا آج بھی پُرزور احتجاج جاری تھا۔ یہ احتجاج مسجد اقصیٰ میں آتش زدگی کے علاوہ اسرائیلیوں کی ننگی جارحیت اور بے گناہ فلسطینیوں پر مظالم ڈھائے جانے پر تھا مگر ایک مقصد حریت پسند طالب علم قیصر الخلیلی کی رہائی بھی تھا جسے اسرائیل کی خفیہ پولیس گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ اس حریت پسند طالب علم پر یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ وہ تنظیم آزادی فلسطین کے لیے خفیہ خدمات انجام دیتا تھا۔ ان میں قابل ذکر تنظیم پی فرنٹ تھی جس کا رہنما صادق الخیری تھا۔ یہی نہیں اسرائیلی پولیس گرفتار قیصر الخلیلی کی ایک قریبی ساتھی لیلیٰ کی گرفتاری کے لیے بھی جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی۔

قیصر الخلیلی کے چار قریبی ساتھی محسن، جمال، زبیر اور باقر تھے۔ انہوں نے پی ایل ایس او (فلسطین لبرل اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن) کے نام سے اپنی طلبا تنظیم بنا رکھی تھی۔

پی ایل ایس او کا یہ احتجاجی مظاہرہ حکومتی انتظامیہ کے دفاتر تک پھیلا ہوا تھا مگر ان کے اس پُرامن احتجاجی مظاہروں پر بھی اسرائیلی پولیس نے لاٹھی چارج اور ٹیئر شیل پھینکے تھے۔

اور اس وقت رات کے بارہ بجے کا عمل تھا۔ تل ابیب کی خنک رات کا پہر سکوت ہر سو چھایا ہوا تھا۔ مذکورہ یونیورسٹی کے ہوسٹل کے روم نمبر سیون A میں وہ چاروں سر جوڑے بیٹھے تھے۔

''ہمیں اب یا تو عملی طور پر خود کچھ کرنا چاہیے یا پھر پی فرنٹ کے رہنما جناب صادق الخیری سے مدد کی درخواست کرنا چاہیے۔'' تیس سالہ باقر نے کہا۔ اس کا پورا نام باقر المحمود تھا۔ قیصر الخلیلی کے بعد تنظیم کی باگ اس کے ہاتھ میں تھی، یوں وہ پی ایل ایس او کا نائب لیڈر تھا۔

''ہاں، اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔''

پچیس سالہ محسن نے تائید میں کہا تو جمال نے بھی اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دی مگر محسن کے ہم عمر زبیر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہ مسئلہ ہمیں خود ہی حل کرنا چاہیے۔ اس کام کے لیے پی فرنٹ کے جناب صادق الخیری کو زحمت دینے کی ابھی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ہمارا داخلی مسئلہ ہے اور ابھی اتنا خطرناک نوعیت میں بھی نہیں بدلا۔ ہم کل صبح ایک بار پھر اسرائیلی پولیس کمشنر سے ملاقات کریں گے یا پھر ایک پریس کانفرنس..... اگر پھر بھی کچھ نہیں بنا تو ''حیفہ'' کا رخ کریں گے، وہاں بین الاقوامی صحافی برادری کے بورڈ سے ملاقات کریں گے اور اپنا پُرامن احتجاج ریکارڈ کروائیں گے۔''

تنظیم میں، قیصر الخلیلی کے بعد ذہانت میں زبیر کا نام لیا جاتا تھا۔ وہ الخلیلی کا نائب رہ چکا تھا مگر آج کل یہ عہدہ باقر کے پاس تھا۔

''اور لیلیٰ بھی لاپتا ہے۔''

محسن اور جمال کو اس کے خیال سے بھی اتفاق کرنا پڑا جس نے باقر کو بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تاہم زبیر کی آخری بات کو آگے بڑھاتے ہوئے جمال بولا۔ ''لیلیٰ مفرور ہے..... یا نہیں، لیکن وہ اسرائیلی پولیس کے ہتھے نہیں چڑھ سکتی۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' محسن نے سر ہلایا۔

''یہ تم دونوں کی خوش فہمی ہے۔'' معاً زبیر نے اسرار بھرے لہجے میں کہا تو تینوں قدرے چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگے۔

''یہودی قوم بہت مکار ہے۔ وہ لیلیٰ آفندی کی گرفتاری کو آشکار کیے بغیر اسے چھاپ کر موساد یا اسرائیلی انٹیلی جنس کی نئی پود ڈیوڈ اسنار کے سپرد کر سکتے ہیں۔ اللہ کرے کہ میرا یہ خدشہ غلط ہو، مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے کہ لیلیٰ بھی ان کے ہتھے چڑھ چکی ہے اور کوئی بعید نہیں کہ الخلیلی اور لیلیٰ دونوں کو.....''

''ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔'' باقر نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے یک دم پرجوش ہو کر کہا۔ ''ہم نے تو پہلے ہی اپنے سروں سے کفن باندھ رکھے ہیں..... ہم الخلیلی اور لیلیٰ کو ہر قیمت پر تلاش کر کے رہیں گے اور اگر خدانخواستہ ہمارے ان دونوں ساتھیوں کے ساتھ ایسا کچھ ہوا۔ تو پھر اسرائیل کو بدلے میں ایک بڑے نقصان کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔''

سب نے یک بیک ہو کر اس عزم کا اظہار کیا اور

آئندہ کے لائحہ عمل کی جزئیات پر غور کرنے لگے۔

☆☆☆

پی ایل ایس او میں قیصر الخلیلی کے بعد لیلیٰ کا نمبر آتا تھا۔ دونوں سرفروش مجاہدوں کی جوڑی کے طور پر مشہور تھے، بعض اہم ترین اور حساس خفیہ مہمات دونوں نے تنہا ہی بڑی کامیابی سے انجام دی تھیں۔ ان دنوں بھی یہ دونوں سرفروش ایک خفیہ منصوبے کی بُنت کاری میں مصروف تھے اور وہ تھی ڈیوڈ اسٹار کے چیف جنرل آئزک فرناش کی موت اور ان کے ہیڈ کوارٹر کی تباہی۔

ڈیوڈ اسٹار نے یوں تو موساد کے کالے بطن سے ہی جنم لیا تھا مگر یہ اپنی خوں ریزی اور بربریت میں موساد سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ اس ''شیطان'' بچے کو ایک گھناؤنے مقصد کے لیے ہی موساد کے کالے بطن سے جنم دیا گیا تھا اور وہ تھا فلسطینی حریت پسند تنظیموں کے چیدہ چیدہ رہنماؤں کا قتل۔ آج کل جنرل فرناش کی ہٹ لسٹ میں ایک فلسطینی حریت پسند تنظیم ''الجہاد'' کی رہنما زبیدہ تھی جو ایک بہادر اور جری مجاہدہ تھی۔

پی ایل ایس او ''الجہاد'' کو سپورٹ کرتی تھی۔ جب سے ''داوار'' کی رپورٹ آشکار ہوئی تھی اور مرکزی فلسطینی رہنما نے چیدہ چیدہ رہنماؤں کو انتباہی سرکلر جاری کر دیا تھا۔ ان میں نہ صرف ابوجہاد خلیل الوزیر بلکہ قیصر الخلیلی پی فرنٹ کے صادق الخیری الجہاد کی زبیدہ واسطی شامل تھی۔

قیصر الخلیلی اور لیلیٰ کو پی فرنٹ کے رہنما صادق الخیری نے ہی اس مشن پر لگایا تھا کہ وہ ڈیوڈ اسٹار کا قلع قمع کریں یا اسے جتنی زک پہنچا سکتے ہیں پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں۔

ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈ کوارٹر تل ابیب کے مضافات میں تیونائی کے قریب نیم پہاڑی و جنگلاتی سلسلے میں واقع تھا اور جنرل آئزک فرناش کی رہائش گاہ بھی وہیں تھی۔

ابھی قیصر الخلیلی اور لیلیٰ نے ڈیوڈ اسٹار کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانے کی کوشش ہی کی تھی کہ اچانک الخلیلی کو نقضِ امن کے جھوٹے الزام میں گرفتار کر لیا گیا جبکہ لیلیٰ کی گرفتاری کے لیے بھی چھاپے مارے جانے لگے۔

☆☆☆

دونوں باپ بیٹوں کے چہروں پر گمبھیرتا طاری تھی۔ وہ اس وقت اپنی رہائش گاہ کے ایک کمرے میں موجود تھے۔ ٹھگنے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک سلطان شیکھری ساٹھ، پینسٹھ کے پیٹے میں تھا۔ صحت اچھی تھی اور وہ ساٹھا پاٹھا نظر آتا تھا۔ اس کے سامنے والے صوفے پر اس کا اکلوتا جوان بیٹا عابد شیکھری موجود تھا۔ دونوں کو فلسطینی جلاوطن آفیسرز احسن الزبروی اور ابوجواد کے اس بہیمانہ قتل پر بے حد افسوس تھا مگر سلطان شیکھری کو ایک تشویش نے بھی آن گھیرا تھا۔ اسے اپنی اور اپنے جوان بیٹے عابد اور عابد سے تین سال چھوٹی بیٹی فائقہ کی فکر ہونے لگی تھی۔

''والد! یہ سفاکانہ جرم...... اسرائیلی خفیہ ایجنسی نے کرائے کے قاتلوں سے کروایا ہے۔'' عابد نے کہا۔ وہ اس کی بات پر چونکا پھر اسی لہجے میں بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اس کا مطلب ہے... وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ہم نے تو ہر ممکن اس اہم معاملے کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔'' پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد بھویں سکیڑ کر بیٹے کے چہرے کو بہ غور تکتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''عزیزی! تم اجرتی قاتلوں کی بات محض قیاس کی بنیاد پر کر رہے ہو یا کچھ شواہد تم نے دیکھے ہیں؟'' باپ کی بات پر عابد کے خوبرو چہرے پر اسرار بھری مسکراہٹ ابھری مگر جلد ہی معدوم بھی ہو گئی، بولا۔

''یہ میرا قیاس ہے۔''

''اس قیاس کی بنیاد؟''

''اسرائیلی ایجنسی کا کسی دوسرے ملک میں اپنے مذموم مقاصد کے حصول میں غیر معمولی احتیاط پسندی۔'' عابد نے پرغور لہجے میں کہا۔

بیٹے کی اس قدر ''انسائٹ'' کا پچھلے کئی دنوں سے سلطان شیکھری بھی قائل ہونے لگا تھا۔ ہلکی توصیفی مسکراہٹ سے بولا۔ ''عزیزی! مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ تم بھی میرے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے مسلمان فلسطینی بھائیوں کا درد اپنے دل میں رکھتے ہو۔ کل پولیس کمشنر عبید ترمذی نے مجھے طلب کیا ہے۔ پولیس تفتیش کا یہ آخری مرحلہ ہے۔ یہ معمول کی کارروائی کل ختم ہو جائے گی۔ تم ایک کام کرو...... فلسطینی رفیوجیز کی کل روانگی کا مکمل بندوبست کرلو اور مسکان شاہ کو یہ کام سپرد کر دو۔ اب ان دونوں شہدا...... احسن اور جواد کا ادھورا مشن ہم مکمل کریں گے۔''

''ان شاء اللہ! آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں والد۔ میں یہ کام کل ہی نمٹا لوں گا۔'' عابد شیکھری نے احترام سے کہا۔

سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''عزیزی! ہم بھی دشمنوں کی نظروں میں ہوں گے، اس لیے محتاط رہنا۔''

عابد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس اثنا میں دو خواتین

اندر داخل ہوئیں۔ ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں، یہ سلطان کی بیوی اور عابد کی ماں زینب خاتون تھیں، دوسری نسبتاً جوان العمر دوشیزہ تھی، یہ فائقہ تھی۔ سلطان کی چھوٹی لاڈلی بیٹی اور عابد کی بہن۔ دونوں خواتین نے لمبا لباس زیب تن کررکھا تھا اور سر پر اسکارف تھا۔

''طعام ادھر ہی لگا دیا جائے یا......؟'' زینب خاتون نے ہلکے سے کہا۔

سلطان کا کھانے کا موڈ نہ تھا۔ البتہ عابد نے ماں سے کہا۔ ''والدہ! ادھر ہی لگا دیں۔ کیا آپ دونوں نے بھی ابھی تک طعام نہیں تناول کیا؟''

اس پر عابد کی چھوٹی بہن فائقہ شرارت بھری مسکراہٹ سے بولی۔ ''بھیا عزیزی! بھلا آپ کے بغیر والدہ اور میرا طعام ہضم ہوتا ہے؟''

عابد مسکرا دیا۔ اسے اپنی ماں اور بہن سے بہت محبت تھی۔ چار افراد پر مشتمل یہ گھرانا خوشیوں کا گھوارہ تھا۔ یہ سب ہنسی خوشی رہتے تھے۔ مسلم گھرانا تھا، قدامت پرستی کے ساتھ زندگی کو...... صراطِ مستقیم کے رہنما اصولوں پر گزارنا ان کا مقصد تھا۔ یہی سبب تھا کہ قبرص میں آسودہ حال اور شاہانہ زندگی گزارنے کے باوجود ان کے دل اپنے مسلمان جلاوطن فلسطینی بھائیوں کی ہمدردی میں دھڑکتے تھے، دولت کی فراوانی کے باوصف یہ چھوٹا خاندان بڑی سادہ زندگی گزارتا تھا۔

اگلے دن عابد شیشکھری پولیس کمشنر عبید ترمذی سے ملا۔ عبید ترمذی ایک دراز قامت اور صحت مند پولیس آفیسر تھا۔ عمر پینتالیس، پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک بارعب انسان نظر آتا تھا جو اس وقت ایک اہم میٹنگ سے ہی فارغ ہوا تھا۔ اس نے فوراً عابد شیشکھری کو اپنے کمرے میں بلالیا، مصافحہ کرنے کے بعد اس نے شیشکھری کو سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ شیشکھری کے آمدم برسرِ مطلب کا مقصد جانتا تھا، اس لیے وقت ضائع کیے بغیر بھاری آواز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ابھی تک ان دونوں فلسطینی آفیسرز کے قاتلوں کے بارے میں کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے مگر ہم ناامید نہیں ہیں۔'' اس کی بات سن کر عابد شیشکھری بولا۔

''جناب! قاتلوں نے قاتلوں کے ذریعے یہ کام کروایا ہے...... یہ بات واضح ہے کہ اس کے پیچھے اسرائیلی انٹیلی جنس...... موساد کا ہاتھ ہے اور اس نے...... خود کو پس پردہ رکھتے ہوئے یہ کام اجرتی قاتلوں سے کروایا ہے۔'' اس کی بات سن کر پولیس چیف کے بھاری بھرکم چہرے کی سنجیدگی میں اضافہ ہوگیا اور روکھے لہجے میں بولا۔

''مسٹر شیشکھری! یہ صرف تمہارا ذاتی خیال ہوسکتا ہے لیکن ہم اس سے متفق نہیں ہوسکتے اور نہ ہی تمہیں اس کی اجازت دے سکتے ہیں کہ ملک کے وسیع تر مفادات کے لیے تم ایک ایسی مبالغہ آمیزی کو اچھالو، جس سے ہمیں کسی ملک کے اختلافات کا سامنا کرنا پڑے۔'' عبید ترمذی کی بات پر عابد شیشکھری کے چہرے پر ہی نہیں لہجے میں بھی تلخی گھل گئی، بولا۔

''ملکی مفادات سے آپ کی یہ مراد ہے کہ ایک دوسرے ملک کی انٹیلی جنس ہمارے ہاں اپنے مذموم مقاصد کی خاطر جو بھی کرتی پھرے اور ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائیں؟ اگر یہ بات ہے تو معاف کیجیے گا سر! میں نے اب تک یہاں آکر اپنا وقت ہی ضائع کیا ہے۔ مجھے بہت پہلے پی آئی آر کا رخ کرلینا چاہیے تھا۔ آپ کا وقت دینے کے لیے شکرگزار ہوں میں، تھینکس آلاٹ۔'' کہتے ہوئے عابد شیشکھری اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بھی بڑھا دیا۔ پولیس کمشنر عبید ترمذی چند ثانیے بہ غور گمبھیر نظروں سے عابد شیشکھری کے چہرے کو گھورتا رہا پھر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا مگر ہاتھ چھوڑنے سے پہلے بولا۔

''مسٹر شیشکھری...... تمہارے اور تمہاری فیملی کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ اس مسئلے کو ملکی سطح کا مسئلہ بننے مت دینا...... ورنہ سپیریئر اتھارٹیز کو تمہارے اور تمہارے خاندان کے سلسلے میں سخت فیصلہ کرنا پڑ جائے گا۔''

''میں اس دھمکی کو یاد رکھوں گا۔'' عابد شیشکھری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور پلٹ گیا۔

کمرے سے نکل کر وہ چکنے فرش والے کوریڈورز پر تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ ایک موڑ مڑتے ہی وہ کسی سے ٹکرا گیا تھا۔ ٹکرانے والا بلکہ ٹکرانے والی ایک نازک اندام دوشیزہ تھی جو عابد شیشکھری کے کسرتی جسم سے ٹکرا کے ہلکی چیخ کے ساتھ گرنے لگی تھی کہ عابد نے اسے فوراً تھام کر گرنے سے بچالیا۔ ''بچانے'' کا زاویہ کچھ اس طرح تھا کہ وہ نازک اندام دوشیزہ اس سے ٹکراتے ہی جب ہلکی چیخ کے ساتھ گرنے لگی تو عابد شیشکھری نے بے اختیار اپنا دایاں بازو اس کی لچکیلی کمر کے گرد حمائل کر کے اپنی طرف کھینچا تو وہ رخِ ماہ روشن حسینہ اس کے فراخ سینے سے جا لگی اور دونوں کے چہرے اس قدر قریب ہوتے چلے گئے کہ...... شیشکھری کے ہونٹوں نے اس خوش جمالی کے حریری

رخسار کو تقریباً چھو ہی لیا تھا۔

لڑکی کی عمر تئیس چوبیس کے لپیٹے میں تھی، سنبھلنے کے بعد وہ فوراً شیکھری کے مضبوط بازو کے ''جھولے'' سے نکل گئی تھی۔ عام مارکیٹ یا بازار میں یہ سب ہوا ہوتا تو لڑکی اپنا ہاتھ چھوڑ سکتی تھی اور اس کی خوب تواضع بھی کر ڈالتی مگر یہ پولیس ہیڈ کوارٹر تھا، ایک ذمے دار معتبر ادارے میں یقیناً کوئی بھی ایسی ''حرکت'' دانستہ نہیں کر سکتا تھا پھر لڑکی کو یہ نوجوان بھی ایک پڑھا لکھا ہینڈسم اور سلجھا ہوا سنجیدہ مزاج نظر آیا تھا مگر دوسرے ہی لمحے جب شیکھری خاصی خفت کے ساتھ ''سوری'' کرنے میں مصروف تھا لڑکی کے چہرے پر چونکنے کے آثار ابھرے تھے۔

''میں..... شاید تمہیں..... پہچان رہی ہوں..... تت..... تم..... عابد شیکھری ہو؟'' البحر جہاز راں کمپنی کے مالک سلطان شیکھری کے بیٹے۔''

''جی ہاں۔'' عابد نے ناچار ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ ورنہ پولیس کمشنر سے ملنے کے بعد اس کا موڈ بری طرح خراب ہو رہا تھا۔

''نائس ٹو میٹ یو..... میں نائمہ ہوں..... نائمہ رافیہ..... فری لانسر چیف رپورٹر۔'' لڑکی نے دل آویز مسکراہٹ سے اپنا تعارف کروایا اور ساتھ ہی مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بھی بڑھا دیا۔

''حیرت ہے..... آپ نے مجھے پہچان لیا مگر آئی ایم سو سوری، میں آپ کو نہیں پہچان سکا۔'' عابد شیکھری لڑکی کے تعارفی کلمات کے بعد اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی نائمہ کے سراپا کا سرسری جائزہ بھی لیا۔ وہ ایک مکمل اور بھرپور لڑکی تھی۔ اس کا کتابی چہرہ، سیاہ کجراری آنکھیں اور یاقوت کا تاثر دیتے ہونٹوں سے صاف عیاں تھا کہ وہ ابھی مرد کی قربت سے دور تھی۔ اس کے ریشمی بال سرخی مائل سیاہ تھے۔ جسے اس نے بڑے سلیقے اور نفاست سے ''ہارس ٹیل'' کی طرح پیچھے کی طرف ایک پونی سے باندھ کر چھوڑ رکھے تھے، ہلکے نیلے رنگ کی فل آستین شرٹ اور..... کمر پر سیاہ ربن باندھا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے شرٹ نیچے سے بیک وقت لیس اور فراک کا تاثر دیتی تھی، سیاہ اسکن ٹائٹ لیگنگ تھی جو اس کے گورے پاؤں کے ٹخنوں سے ذرا اونچی تھی، نیچے سیاہ رنگ کے ہیل والے سینڈل تھے۔

''ہماری بھی ملاقات نہیں ہوئی۔'' اس نے مترنم آواز اور دلنشیں مسکراہٹ سے عابد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اخبار میں آپ کی اور آپ کے والد سلطان صاحب کی تصویریں دیکھی تھیں، مجھے قطعاً امید نہ تھی کہ اس طرح اچانک اور اس انداز میں آپ سے سامنا ہو جائے گا۔ کیونکہ میں خود بھی آپ سے ملنے کی متمنی تھی۔''

عابد شیکھری اس کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ وہ اس کے ادھ کھلے دہن سے جھانکتے موتیوں کی لڑی جیسے دودھیا دانتوں کی جھلک سے محظوظ ہونے کے بعد بولا۔ ''پھر یہ میرے لیے بھی ایک اتفاق ہی کی بات ہے کہ پولیس کمشنر..... عبید ترمذی سے مایوس ہونے کے بعد..... مجھے آپ ہی جیسی خاتون کی تلاش تھی، میں بی آئی آر ہی کی طرف جا رہا تھا۔''

اس کی بات سن کر نائمہ کے چہرے پر پہلی بار چند ثانیے کے لیے پرسوچ سی سنجیدگی اتر آئی پھر وہ اپنے دلکش ہونٹوں کو دائرے میں سکیڑ کر بولی۔ ''اوہ..... شاید میں آپ کی مایوسی کا اندازہ لگا سکتی ہوں مگر آپ کو ایک مشورہ دوں گی، اب آپ بی آئی آر کا رخ نہ کریں کیونکہ کالی بھیڑیں ہر جگہ موجود ہیں۔ بورڈ آف انٹرنیشنل رپورٹرز بھی اس سے محفوظ نہیں..... میں اس سلسلے میں ہی آپ سے ملنا چاہتی تھی..... تاکہ آپ کو.....''

''میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔'' شیکھری نے فوراً کہا۔ ''آپ شاید ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں رہنمائی کی ضرورت ہے۔''

نائمہ نے اپنی ہپ پاکٹ سے سیاہ رنگ کا نفیس والٹ نکالا اور اپنا کارڈ اس میں سے نکال کر شیکھری کو تھما دیا۔ وہ اب خاصی عجلت میں نظر آنے لگی تھی۔ ''یہ کارڈ رکھ لیں، میں بہت جلد آپ سے ملوں گی..... مگر پلیز..... ابھی آپ بی آئی آر کا رخ نہیں کریں گے۔''

شیکھری نے اس کا کارڈ سنبھال لیا اور ہولے سے مسکرا کر بولا۔ ''آپ کی نصیحت میں پلو سے باندھ لیتا ہوں۔ میں آپ کا اپنے دفتر میں منتظر رہوں گا۔''

پھر رسمی الوداعی کلمات کے بعد دونوں جدا ہو گئے۔ نائمہ پولیس چیف کے کمرے کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھ گئی۔

☆☆☆

رات کی پرہول تاریکی اور خاموشی میں وہ جیپ خاصی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑے چلی جا رہی تھی۔ جیپ میں فقط دو افراد براجمان تھے۔ ایک پکی عمر کا حسن علی اور دوسری ایک جوان عورت..... لیلیٰ تھی۔

لیلیٰ وہی مجاہدہ تھی جو پی ایل ایس او کے لیڈر...... قیصر الخلیلی کی قریبی ساتھی تھی اور جس کی گرفتاری کے بعد... انٹیلی جنس پولیس اس کی بھی گرفتاری کے لیے جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی۔

لیلیٰ آفندی کو جیسے ہی الخلیلی کی گرفتاری کا علم ہوا تو وہ شیماز یونیورسٹی کیمپس سے فرار ہوگئی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اسرائیلی خفیہ پولیس اب اسے بھی گرفتار کیے بنا نہیں چھوڑے گی۔ چنانچہ وہ یونیورسٹی کے گرلز کیمپس سے فرار ہو کر سیدھی اپنے ہمدرد دوست حسن علی کی رہائش گاہ پر پہنچی تھی۔ حسن علی ایک پچاس پچپن سالہ تاجر تھا۔ وہ کھجوروں کی تجارت کیا کرتا تھا اور نابلس میں اس کے کھجوروں کے بڑے باغات تھے جو اس کی ذاتی ملکیت تھے۔

حسن علی ان لوگوں میں سے تھا جو فلسطینی مجاہدوں کی در پردہ سپورٹ کیا کرتے تھے اور ایسے لوگوں کی یہاں کوئی کمی نہ تھی۔ لیلیٰ جیسے ہی حسن علی کی رہائش گاہ پہنچی اور اسے ساری بات بتائی تو اس نے سوچا کہ لیلیٰ کی پناہ گاہ کے لیے اس کی رہائش گاہ سراسر غیر محفوظ ہے چنانچہ اس نے لیلیٰ کو اسی وقت اپنے ساتھ لیا اور جیپ میں بٹھا کر نابلس کے نیم صحرائی مضافات میں واقع اپنے باغات کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔ اس وقت رات اپنے ابتدائی پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ سفر بہ مشکل ایک گھنٹے پر محیط تھا۔ تاہم پون گھنٹے کے اندر اندر حسن علی، لیلیٰ کو بہ حفاظت اپنی جیپ میں لیے فارم پر پہنچا...... فارم کی عمارت زیادہ بڑی تو نہ تھی مگر کسی حد تک محفوظ ضرور تھی۔ یہاں دشمنوں کی آمد کا خطرہ کم ہی جانا جاتا تھا۔

''بیٹی! جب تک حالات سازگار نہیں ہو جاتے تمہیں ادھر ہی قیام کرنا ہوگا۔''

واپس لوٹتے سمے بوڑھے ہمدرد حسن علی نے لیلیٰ سے پُرشفیق لہجے میں کہا اور لیلیٰ نے کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا پھر بولی۔ ''بابا! میرے ساتھیوں تک میری خیریت کی خبر پہنچا دینا، ورنہ بے چارے پریشان ہوتے رہیں گے۔''

''تو فکر نہ کر میری بہادر بچی...... حالات موافق ہوتے ہی میں موقع دیکھ کر یہ کام کردوں گا۔'' حسن علی نے اس کے سر پر اپنا دست شفقت پھیرتے ہوئے قدرے جوش سے کہا اور اس کی تشفی کی خاطر مزید بولا۔

''مگر یہ کام بھی مجھے ہوشیاری سے انجام دینا ہوگا کیونکہ جہاں بہت سے لوگ عظیم مجاہدوں کی اعانت اور پشت پناہی کے سلسلے میں اسرائیلی خفیہ پولیس کی نظروں میں ہیں، ان میں ایک میں بھی شامل ہوں۔ تم سمجھ رہی ہو ناں...... میری بہادر بچی۔''

''جی ہاں بابا...... بہت اچھی طرح۔'' لیلیٰ نے مسکرا کر کہا۔

''اللہ تجھے اپنی امان میں رکھے۔ اب میں چلتا ہوں۔'' اس نے دعائیہ لہجے میں کہا اور پھر واپس لوٹ گیا۔

لیلیٰ اب فارم میں تنہا رہ گئی تھی۔

بقول اس کے بوڑھے ہمدرد میزبان کے یہ فارم خالی تھا۔ ابھی کاروبار کا موسم شروع نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فارم میں نہ بندہ...... نہ بندے کی ذات نظر آرہی تھی۔

البتہ صبح کے وقت بوڑھے حسن علی کا حساب کار...... ذرا دیر کے لیے آجاتا تھا اور پھر چوکیدار کی نقل و حرکت سے مطمئن ہونے کے تھوڑی دیر بعد واپس لوٹ جاتا تھا۔

ہتھیار کے نام پر لیلیٰ کے پاس صرف ایک پستول تھا اور اس کے چیمبر میں فقط چھ گولیاں تھیں مگر اس کا سب سے بڑا ہتھیار حوصلہ اور ہمت تھا بلکہ اس سے بڑھ کر وہ آہنی عزم بھی جو ناقابلِ تسخیر ہتھیار کی صورت دھڑکتا رہتا تھا۔ یوں تو ہر فلسطینی، خواہ وہ بچہ ہو عورت ہو، جوان یا بوڑھا جذبۂ حریت و آدرش سے سرشار تھا مگر عملی میدان میں بہادروں کی طرح اسرائیلیوں کے خلاف میدان کارزار میں اترنا اور محاذ پر ڈٹے رہنا ایک الگ بات تھی۔ لیلیٰ بھی چند سال پہلے ایک ایسی ہی عام سی گھریلو لڑکی ہوا کرتی تھی مگر اس کا منگیتر اور بڑے بھائی کا شمار ارضِ مقدس کے دلیر مجاہدوں میں ہوتا تھا۔ ان دونوں نے اسرائیلیوں کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے مگر آخر کار جامِ شہادت بھی نوش کرنا پڑا تھا۔

بھائی اور منگیتر کی شہادت کے بعد پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ لیلیٰ کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا اور پھر وہ ایک عام لڑکی سے خاص عورت بن گئی۔ اپنے منگیتر کے چھوٹے بھائی قیصر الخلیلی کی تنظیم میں شامل ہوگئی اور پھر اس نے اس بہادر اور پُرعزم نوجوان کے ساتھ مل کر اسرائیلی خفیہ پولیس کو بھاری جانی و مالی نقصان سے دوچار کردیا کہ دشمنوں کو ان پر ذرا بھی شبہ نہ ہوا مگر مخبروں کے ذریعے کسی طرح یہ خبر اسرائیلی خفیہ پولیس کے چیف آفیسر تک جا پہنچی کے یروشلم ائرپورٹ پر جہاز ہائی جیک اور یہودی کمشنر کو اغوا کرنے اور دیگر حریت پسندانہ کارروائیوں میں پی ایل ایس او ملوث ہے تو قیصر الخلیلی اور لیلیٰ کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جانے لگے۔

پی ایل ایس او کے جری اور مجاہدانہ سرگرمی کے حامل

کارکن..... اپنی ضرورت کے مطابق پی ایل فرنٹ کے خفیہ تربیتی کیمپوں میں ٹریننگ بھی لیتے رہتے تھے۔ لیلیٰ نے بھی ادھر ہی گوریلا تربیت لی تھی۔

اسرائیلی خفیہ پولیس کو یہودیوں کے بعض مراعات یافتہ خیرخواہوں نے بتادیا تھا کہ پی ایل ایس او قیصر الخلیلی اور لیلیٰ کی شکل میں اپنی ایک خفیہ گوریلا فورس بھی رکھتی ہے اور ان کے تعلقات (المجاہد) ''پی فرنٹ'' سے ہے اور پھر یوں ان دونوں کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا گیا تھا۔ ان میں پی ایل ایس او کے کئی کارکن بھی گرفتار کیے گئے تھے، ان میں سے کچھ تو غیر اہم جان کر اور معمولی نوعیت کی پوچھ کچھ کے بعد اسرائیلی خفیہ پولیس نے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اسرائیلی انٹیلی جنس کے لیے زیادہ اہم قیصر الخلیلی اور لیلیٰ آفندی تھے۔ لیلیٰ اپنے ہمدرد میزبان کے جانے کے بعد وہیں فارم ہاؤس کے اندر ایک سنگل سپاٹ دیواروں کے کمرے میں کھڑکی کے قریب بیٹھ گئی۔ آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے۔ صحرا میں خنک چاندنی سی اتری ہوئی تھی۔ اس کے سیماب چہرے سے آج پہلی بار گہرے تفکر اور پریشانی کے تاثرات ہویدا تھے۔ لیلیٰ کو قیصر الخلیلی کی فکر کھائے جارہی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس کے شہید منگیتر کا بھائی تھا بلکہ اس لیے کہ وہ ایک بہادر اور سرفروش مجاہد تھا۔

لیلیٰ یہاں چھپنے کے لیے نہیں آئی تھی، بلکہ وہ سردست کسی فوری خطرے سے بچنے کے لیے سر چھپائے ہوئے تھی کہ چند گھڑی کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرسکے اور اپنے ساتھیوں سے ایک ملاقات بھی اس کا اہم مقصد تھا۔

جب سے اسرائیلیوں نے مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کی گھناؤنی سازش تیار کی تھی تب سے ہی قیصر الخلیلی سمیت لیلیٰ آفندی اور اس کے قریبی جانثار اور سرفروش ساتھیوں نے یہ عزم کر رکھا تھا کہ زہریلے ناگوں کی مثل اسرائیلی غاصبوں کا جینا حرام کردیں گے، لہٰذا لیلیٰ کا مقصد یہاں آکر پناہ لینے کا نہیں تھا بلکہ وہ کسی محفوظ مقام پر کچھ لمحات سکون کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی تاکہ وہ اپنے لیڈر قیصر الخلیلی کی رہائی کے سلسلے میں کچھ کرسکے۔ یہی سبب تھا کہ حسن علی کے جانے کے بعد وہ مسلسل اسی سوچ و بچار میں مستغرق تھی۔ بالآخر پیہم غوروخوض کے بعد اس کے ذہن میں الخلیلی کو اسرائیلی خفیہ پولیس کے چنگل سے چھڑانے کا اس کے ذہن میں ایک خطرناک منصوبہ تشکیل پاچکا تھا۔ اگرچہ اس میں جان جانے کا بھی خطرہ تھا اور کا بھی..... بلکہ در بدری تو اس کے اور اس کے ساتھیوں کا ایک طرح سے مقدر بن ہی چکی تھی، چنانچہ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ اپنے چاروں ساتھیوں محسن، جمال، زبیر اور باقر کی آمد کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ اسے امید تھی کہ حسن علی کسی نہ کسی طرح پیغام پہنچادے گا۔

رات اندیشوں اور وسوسوں کے آسمان تلے کسی بھاری سِل کی طرح سرک رہی تھی کہ دفعتاً لیلیٰ کو کھڑکی کے پاس ایک انسانی ہیولا حرکت کرتا نظر آیا۔ وہ یکدم چونک پڑی۔ اس کے پاس چھوٹی ٹارچ تھی مگر اسے استعمال کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ اس نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ پستول نکال لیا اور کھڑکی سے ہٹ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ گربہ قدمی سے دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ باہر بہت قریب اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی، یکلخت لیلیٰ کا دل انجانے خطرے کی بو سونگھ کر سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا مگر اس نے اپنے حواس قابو میں رکھے تھے پھر ایک ہاتھ میں پستول مضبوطی سے تھامے اس نے دوسرے ہاتھ سے پھرتی کے ساتھ دروازے کی چٹخنی کھول کے دروازہ بھی دھکیل دیا۔ سامنے ایک جوان مرد کو ہاتھ میں چنگیر پکڑے دیکھ کر اس کی کھٹک حیرت میں بدل گئی بظاہر سیدھا سادہ نظر آنے والا نوجوان اچانک دروازہ کھلنے کے باعث چونکا تھا اور پریشان سا بھی ہوگیا تھا۔ تاہم لیلیٰ کو پستول بدست دیکھ کر وہ جلدی سے گھبرا کر بولا۔

''گگ..... گولی مت چلانا..... میں تمہارے لیے کھانا لایا ہوں۔''

لیلیٰ نے پستول تانے رکھا اور عقابی نظروں سے اسے گھور کے بولی ''کون ہو تم؟ کس نے تمہیں یہاں بھیجا ہے؟'' وہ اس کا بغور جائزہ بھی لینے لگی۔ وہ ایک بہ ظاہر عام سا نوجوان نظر آتا تھا۔ فلسطینی لگتا تھا۔ رنگت سانولی تھی نقوش خاصے بھدے تھے، جسم بھی بے ڈول سا تھا، آنکھیں چھوٹی تھیں۔

''میں آقا حسن علی کے حساب کار محمود الحسن کا بیٹا اسد ہوں۔''

نوجوان نے جلدی سے بتایا تو لیلیٰ کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوگئیں، بولی۔ ''مگر تمہارے باپ کو کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں؟''

''تم لیلیٰ ہو ناں؟'' وہ بولا۔ ''آقا خود یہاں سے جاتے جاتے ہمیں تمہارے کھانے پینے کا خیال رکھنے کا کہہ گئے تھے۔''

یہ سن کر لیلیٰ نے پستول والا ہاتھ جھکا دیا۔ اس کے بعد بولی۔ ''ٹھیک ہے، تمہارا شکریہ..... کھانا رکھ دو..... میں کھالوں گی۔'' کہتے ہوئے لیلیٰ نے چنگیر جو نقشین دسترخوان

لمارہ وہاں میں بند کی تھی۔ اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"کھانا کھالو آپ...... میں باہر کھڑا ہوں...... مجھے برتن واپس لے جانے ہوں گے...... صبح آپ کے لیے ناشتا بھی لانا ہوگا۔" اسد نے کہا۔

لیلیٰ چند ثانیے بغور اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

اسد مطمئن ہو کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اندر آیا تو کیا دیکھتا ہے چنگیر خالی تھی اور لیلیٰ زمین پر ایک طرف بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی خبیثانہ مسکراہٹ ابھر آئی پھر اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی عبا نما قمیص کے اندر سے ایک ٹرانسمیٹر نما آلہ نکالا پھر اس کی فریکوئنسی ملانے کے بعد بولا۔

"ہیلو، اسد بول رہا ہوں سر......! میرا انعام تیار رکھیں......آپ کا شکار تیار ہے...... جی وہ لیلیٰ ہی ہے جناب ......خلیلی کی ساتھی...... لیلیٰ آفندی...... میرے والد کے آقا حسن علی آئے تھے آج میرے والد سے ملنے تھے، میں نے ان کی گفتگو سن لی تھی، خیال رہے میرا نام نہیں آئے۔" اس کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور جیسے ہی دوبارہ زمین پر پڑی لیلیٰ کی طرف متوجہ ہوا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔ ایک ثانیے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا مگر حقیقتاً پستول تانے اس کے سامنے بقائمی ہوش و حواس کے ...... لیلیٰ کی صورت کھڑی تھی۔ لیلیٰ کی آنکھوں سے نفرت اور غیظ کے شعلے پھوٹ رہے تھے۔ اس کی گوریلا تربیت میں سب سے پہلا اصول یہی سکھایا گیا تھا کہ بعض حساس معاملات میں اپنے لوگوں پر بھی بھروسا نہ کرو اور دل میں ابھرنے والی پہلی کھٹک کو غیر معمولی سمجھو کہ اسی کا نام چھٹی حس ہے جو ایک بار انسان کو کسی خطرے سے آگاہ ضرور کرتی ہے۔ یہی سبب تھا کہ جب اس نے اسے اسی وقت اپنے سامنے کھانا ختم کرنے پر زور دیا تھا تو لیلیٰ جو پہلے ہی اسد کی غیر متوقع اور اچانک آمد پر کھٹک سی گئی تھی۔ نیز اس کی عقابی چہرہ شناس محتاط نگاہوں نے اسد کے چہرے کے تاثرات بھی بھانپ لیے تھے، چالاکی سے اسے باہر بھیج کر کھانا دوسری جگہ چھپا کر خالی برتن رکھ دیے تھے، اور خود بے ہوش ہو گئی تھی۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو...... خود ہی یہ بات ظاہر ہو جاتی۔ اسد اسے سوتا سمجھ کر خالی برتن خاموشی سے لے جاتا مگر اس نے کھانے میں بے ہوشی کا سفوف ملایا ہوا تھا جو اس کا پہلے سے منصوبہ تھا۔ لہٰذا وہ یہی سمجھا کہ اس کا منصوبہ کامیاب ہو گیا ہے۔ وہ جب ٹرانسمیٹر پر بات کرنے لگا تو بظاہر بے سدھ پڑی لیلیٰ اس کا سارا منصوبہ سمجھ گئی۔

اب لیلیٰ کو اپنی طرف پستول تانے دیکھ کر اس کا مکروہ چہرہ فق ہو گیا تھا۔ "دل تو کرتا ہے...... تم جیسے غدار کے سر میں اسی وقت گولی اتار دوں۔" لیلیٰ بدستور اسے نفرت خیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولی۔ "مگر افسوس کہ میں ایسا نہیں کر سکتی...... بتاؤ کتنا انعام ملا ہے تمہیں یہودیوں کے ہاتھ اپنے ضمیر کا سودا کرنے پر؟" لیلیٰ کی بات پر اس کا سارا خوف کافور ہو گیا۔ بڑی ڈھٹائی سے بولا۔

"ہاں، میں نے یہودیوں کے ساتھ سودا کیا ہے مگر اپنے ضمیر کا نہیں بلکہ اپنے لوگوں کی ہی بھلائی کی خاطر یہ سب کیا ہے۔"

"بھلائی اور بقا کی خاطر......؟ صد حیف ہے تم پر!" ...... لیلیٰ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح غرائی۔ "تم اس ذلیل قوم سے اپنے لوگوں کے لیے کون سی بھلائی اور بقا کی امید لگائے بیٹھے ہو، جن کے ظلم و بربریت نے چنگیز و ہلاکو کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ کیا تم دیدہ و دانستہ نابینا ہو؟ یروشلم، غزہ، نابلس اور تل کرم میں تم نے ان یہودی ظالموں کا وہ...... ناچ نہیں دیکھا جس سے شیطان بھی لرز اٹھتا ہے۔ اگر تم اب بھی کچھ نہیں سمجھ رہے ہو تو سنو، میں ہیکل کے ان پرستاروں کی بات کر رہی ہوں جو خون خوار بھیڑیے ہیں۔ جنہوں نے اسپتالوں، اسکولوں پر گولہ باری کی۔ ان پر نیپام بم برسائے، بے گناہ شہریوں پر زہریلی گیس پھینکی جس کے نتیجے میں ہزاروں ماؤں کے لال، جوان عورتوں کے سہاگ اجڑ گئے اور ہزاروں بچے یتیم ہو گئے۔ ان درندوں نے ہزاروں دوشیزاؤں کی عصمت دری کی۔ بے گناہ عربوں کو اپنی ہی زمین سے بے دخل کر دیا اور ان کا گھر، کاروبار اور جائداد پر بھی قابض ہو گئے اور انہوں نے تو تہذیب اور انسانیت کے منہ پر تھوک دیا ہے۔ یہ ایسی مکار اور دغاباز قوم ہے جس سے تم جیسے غدار ضمیر فروش نہیں بچ پائیں گے۔"

لیلیٰ غیظ و جوش میں کہتی چلی گئی۔ اس کی صراحی دار گردن کی رگیں پھول گئیں، ان میں دوڑتا ہوا خون تک اچھال مارتا دکھائی دینے لگا تھا۔ گوری رنگت کسی آتش فشانی لاوے کی طرح سرخ ہو گئی، پورا وجود غیظ و جوش سے ہولے ہولے مرتعش ہو رہا تھا مگر برعکس اس کے سامنے کھڑے اسد پر لیلیٰ کی جوش بھری اور ولولہ انگیز تقریر کا مطلق اثر نہ ہوا۔ استہزائیہ انداز میں بولا۔

”تم چند سر پھرے لوگ اسرائیل اور ان یہودیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اس کے برعکس تم نے ان کو مشتعل کر دیا اور یہ سارے ظلم انہوں نے اسی اشتعال میں کیے جن کی ذمے داری تم چند لوگوں پر جاتی ہے۔ تم لوگ پہاڑ سے سر ٹکرانے کی حماقت کر رہے ہو کیا تم کو معلوم نہیں کہ جون 1967ء کی صبح اسرائیلی طیاروں نے مصری فضائیہ کا کیا حشر کیا تھا؟ مملکت مصر...... تل ابیب کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ تمہیں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے، اے سر پھری مجاہدہ کہ مقابلہ محض اسرائیل سے نہیں ان بڑی طاقتوں سے ہے جو ناقابل تسخیر ایٹمی قوت ہیں۔ امریکا کو بھول کر تم لوگ بڑی خطرناک خوش فہمی میں مبتلا ہو۔“ اسد کی لنگڑی لولی دلیل پر لیلیٰ نے شعلہ فشاں لہجے میں کہا۔

”کیا تم سمجھتے ہو کہ کوئی تمہارے گھر پر غاصبانہ طور پر قابض ہو جائے اور تم ہاتھ باندھے، سر جھکائے، مہر بہ لب کھڑے تماشائے ظلم و بربریت دیکھتے رہو گے؟ اور تم جن طاقتوں کی بات کر رہے ہو وہ خود بہ ظاہر عالمی امن کے داعی ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر در پردہ نقص امن کے بگاڑ کا سبب وہی ہیں۔ اسرائیل بھی امریکا جیسی سپر پاور کا ایک ناجائز، ناخلف اور نافرماں بردار بچہ مگر یہ ناجائز بچہ ان کی اپنی بھی کمزوری بن چکا ہے۔ وہ اس کی پرورش کرنے پر مجبور ہیں۔ یہودی فطری طور پر ایک بزدل اور خوف زدہ قوم ہے اور گریٹ اسرائیل کا ناپاک منصوبہ ان کی پست ذہنیت اور بیمار دماغ کا وہ خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔“

اسد لاجواب ہو کر خاموش ہو رہا مگر اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ لیلیٰ کو اب یہاں سے نکلنے کی جلدی تھی، اسد اسے رکنے پر مجبور کرنے کی خاطر مکاری سے بولا۔ ”دیکھو، اب بھی کچھ نہیں بگڑا...... تم جوان ہو، خوب صورت ہو، یہودی اب بھی تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لیے تیار ہیں۔ تم یہ راستہ چھوڑنے کا وعدہ کرو تو میں ان سے تمہاری سفارش کر سکتا ہوں۔“

”لعنت ہے تم پر۔“ لیلیٰ نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ ”اتنی بربریت اور بے شرمی کا ننگا ناچ پوری دنیا نے دیکھا اور تم کہتے ہو کہ... کچھ نہیں بگڑا...... تف ہے تم پر اور تم یہودیوں سے جس دوستی کا اصرار کر رہے ہو، یہ اپنی پیٹھ پر خنجر گھونپنے کے مترادف ہوگا... میری ہر سانس اور خون کا ایک ایک قطرہ میری عمر کا ایک ایک پل ارض مقدس، ارض فلسطین اور اسلام کے لیے وقف ہو چکا ہے۔ میرا وقت ضائع نہ کرو...... مجھے بتاؤ کہ تم ابھی کس سے بات کر رہے تھے، کون یہودی افسر ہے وہ جس کے لیے تم اپنے ہی فلسطینی مسلم بھائیوں کی پشت پر چھرا گھونپتے ہو؟“

اسد اس کی بات پر ہنسا۔ لیلیٰ کی طرف سے آغاز میں یہ کہنے پر کہ وہ اسے ایک مجبوری کے باعث ہلاک نہیں کرنا چاہتی وہ یک دم چوہے سے شیر بن گیا تھا بولا۔ ”یہ تو میں تمہیں کبھی نہیں بتاؤں گا، کیونکہ میں یہودی کی دی ہوئی مراعات وعنایات سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ لیلیٰ کی انگلی نے پستول کے ٹریگر پر حرکت کی۔ ایک چنگھاڑتا ہوا شعلہ نال سے برآمد ہوا اور اسد کی پیشانی چیخ گئی۔ وہ آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

”تم جیسے غداروں کا یہی انجام ہونا چاہیے۔ کاش! تمہارا ضمیر جاگ جاتا تو میں یہ قدم کبھی نہ اٹھاتی، لیکن تم زندہ رہتے تو نجانے اور کتنے فلسطینی مجاہدوں سے غداری کرتے رہتے۔ صد حیف ہے تم پر۔“

لیلیٰ خود کلامیہ انداز میں بڑبڑائی، اب اس کا ذہن تازہ صورت حال پر تیزی سے کام کرنا شروع ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلے اسد کی لاش سے وہ خفیہ ٹرانسمیٹر برآمد کیا۔ پھر اسے پیروں تلے توڑ ڈالا۔ رات کے درمیانی پہر میں وہ...... پیدل ہی فارم کی عمارت سے نکل پڑی تھی۔

☆☆☆

بلند چھت والے اس ہال کمرے کے وسط میں مستطیل میز کے گرد...... آٹھ کرسیاں رکھی تھیں جبکہ نویں کرسی صدارتی جگہ پر دھری تھی جو نسبتاً بڑی اور اونچی پشت گاہ والی تھی مگر کرسیوں کی تعداد سے افراد کم تھے یعنی صرف پانچ۔ ان کے چہروں اور آنکھوں کی وضع قطع اور ساخت ان کی مخصوص قومیت اور ذہنیت کی عکاسی کرتی تھی، چہرے گول تھے، اور کچھ ٹھوڑی کی طرف سے لٹکے ہوئے تھے، رنگت البتہ کسی کی سانولی تھی تو کسی کی گوری۔ آنکھیں چندی چندی اور ان سے مکاری جھلکتی تھی۔ یہ پانچوں کٹر اسرائیلی یہودی تھے، صدارتی کرسی پر براجمان قدرے فربہ مگر ٹھگنے جسم کا حامل شخص تھا، ان سب کے جسموں پر مخصوص وردی نظر آتی تھی اور صدارتی کرسی پر براجمان فربہ ٹھگنے شخص کی وردی اس کے اعلیٰ عہدے کو ظاہر کرتی تھی۔ یہ ڈیوڈ اسٹار کا چیف جنرل آئزک فرناش تھا۔ موساد کے دو نمائندے جو میجر رینک کے تھے ایک سیکنڈ ڈائریکٹر، بارق شمعون اور دوسرا ڈپٹی اسحاق شامیر تھا۔ تیسرا اسرائیلی حکومت کا نمائندہ اور وزیراعظم کا سیکیورٹی ایڈوائزر

لیفٹیننٹ کرنل پریسلو تھا جبکہ چوتھا ڈیوڈ اسٹار کا ہی اہم کارکن اور سربراہ جنرل فرناش کا نائب میجر ایہود شابک تھا۔ بند کمرے میں یہ اہم ترین اور ہنگامی میٹنگ تھی اور خفیہ بھی کیونکہ اس میں حکومتی نمائندے نے بھی شرکت.... کی تھی۔ میٹنگ کا اہم ترین ایجنڈا ''المجاہد'' اور ''پی فرنٹ'' کو سبوتاژ کرنا تھا۔

انتہائی مختصر رسمی کلمات کے بعد جنرل فرناش نے گمبھیر لہجے میں سب سے پہلے اسرائیلی حکومت کے نمائندے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر پریسلو! اب تک محض آپ کی وجہ سے آپریشن اسالٹ مشن تاخیر کا باعث بنا رہا، ورنہ ہم کب کے ''غضب خدا'' کے کمانڈر خلیل الوزیر کی طرح ''المجاہد'' اور ''پی فرنٹ'' کے دونوں رہنماؤں صادق الخیری اور زبیدہ خاتون کو ختم کر چکے ہوتے۔''

کرنل پریسلو نے پرمتانت خاموشی سے ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ کی بات سنی پھر اسی سنجیدگی سے گویا جواز پیش کرنے کے انداز میں بولا۔ ''غضب خدا کے رہنما خلیل الوزیر کے خلاف وہ کارروائی قبل از وقت عمل میں لائی گئی تھی، جس کے نتیجے میں ہماری مخلوط اسرائیلی حکومت کی اندرونی کابینہ ''تیونس آپریشن'' پر عمل درآمد کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا اس کے حق میں فیصلہ صرف ایک اکثریتی ووٹ سے ہوا تھا۔ یہی نہیں لیکوڈ پارٹی کے ساتھ مخلوط کابینہ میں شامل تین لیبر وزرا بھی شروع ہی سے اس منصوبے کے متعلق ذہنی تحفظات رکھتے تھے۔ ان میں شمعون پیریز لیبر پارٹی کے لیڈر، وزیر خارجہ ایزر وائز مین اور وزیر تعلیم اضحاق نادان تھے، اس دس رکنی اندرونی کابینہ کے صرف دو لیبر ارکان نے تیونس پر دھاوا بولنے کے منصوبے کی حمایت کی۔ وزیر دفاع اضحاق رابن اور وزیر پولیس حائم بارلیو تھے۔ وہ دونوں اسرائیلی چیف آف اسٹاف کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ بڑی مشکل آن پڑی تھی ہم پر۔'' پریسلو کے اس صراحت آمیز جواب نے چند ثانیے کے لیے جنرل فرناش کو مہر بہ لب بنا دیا تو اس کے نائب میجر ایہود شابک نے قدرے طنزیہ انداز میں حکومتی نمائندے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو کیا تمہاری دس رکنی اندرونی کابینہ کے آٹھ وزرا فلسطینیوں کے ہمدرد ہیں؟''

''یہ بات نہیں۔'' پریسلو نے ڈیوڈ اسٹار کے نائب سربراہ کا چبھتا ہوا طنز محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے تیونس آپریشن میں غضب خدا کے رہنما ابو جہاد خلیل الوزیر کے خلاف اسالٹ ایکشن کے منصوبے کے مذکورہ نقادوں نے حکومت کی توجہ دلائی تھی کہ ستمبر 72ء میں سانحہ میونخ کے بعد بھیجی جانے والی قاتل ٹیموں کی وجہ سے بیرون ملک بالخصوص عالمی تناظر میں ہمارے ملک اسرائیل کے امیج کو جو نقصان پہنچا تھا کوئی ایسا فیصلہ کرتے وقت اسے فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا انہوں نے ملک وقوم (اسرائیل، یہودی) کے وسیع تر مفادات میں ہی کیا تھا۔''

اس پر موساد کے سیکنڈ ڈائریکٹر جو ماضی میں ٹاپ ایجنٹ بھی رہ چکا تھا میجر بارق شمعون نے مداخلت کرتے ہوئے حکومتی نمائندے پریسلو کو نشانہ بناتے ہوئے کہا۔

''ان معاملات میں کسی قسم کی مصلحت پسندی کے ہم قائل نہیں ہیں۔ ہمیں جدھر اور جب موقع ملتا ہے ہم فلسطینی رہنماؤں کو ٹارگٹ کرتے رہیں گے۔ مسلم کشی اور مسلم ممالک میں ہماری ابتری پھیلانے والی سازشیں بھی کسی مصلحت پسندی کا شکار نہیں بن سکتیں۔ تمہارا مفاہمانہ رویہ محض اپنی سیاسی حکومت اور ساکھ تک محدود رہتا ہے۔'' میجر بارق شمعون کی آواز اور لہجے میں بھی فلسطین اور امت مسلمہ کے لیے بھرے ہوئے زہر کی کڑواہٹ صاف مترشح ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھی میجر اضحاق شامیر نے بھی اپنے ساتھی کی حمایت میں بات آگے بڑھاتے ہوئے پریسلو سے کہا۔

''سانحہ میونخ میں بھی ہماری (موساد کی) کارروائی بلاجواز نہیں کہی جا سکتی۔ جب یاروسے میونخ اولمپکس کے موقع پر فلسطینی حریت پسندوں نے گیارہ اسرائیلی اتھلیٹس کو اغوا کر کے انہیں مار ڈالا تھا پھر ''غضب خدا'' کے نام سے یہ اسرائیلی قاتل ٹیمیں یورپ بھر میں پھیل گئی تھیں اور جگہ جگہ انہوں نے بم پھینکے تھے، ان کے ہاتھوں ایک آدمی پیرس میں ہلاک ہوا تھا جو ہمارے ڈیمونا نیوکلیئر ریسرچ پلانٹ کے لیے خفیہ خدمات ہمیں فراہم کر رہا تھا لیکن پھر جولائی 73ء میں ناروے میں انہیں صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر ہم حرکت میں نہ آتے تو صورت حال آگے چل کر ہمارے تصور سے بھی زیادہ بھیانک ہو جاتی۔'' کٹر یہودی میجر اضحاق شامیر کے لب ولہجے سے ازلی خوف مترشح تھا۔

سیاسی حکومتی نمائندہ پریسلو بہ ظاہر خاموشی سے بیک وقت موساد اور ڈیوڈ اسٹار کی تیکھی باتوں کا نشانہ بنا ہوا تھا مگر اس نے اپنا مدافعتی انداز بھی ترک نہیں کیا تھا۔ جواب میں وہ اضحاق شامیر کی طرف دیکھتے ہوئے تحمل سے بولا۔

''ملکی ریاست سیاسی جمہوریت سے آگے بڑھتی اور چلتی

موسم سرما کی خنک آلود رعنائیوں کے ہمراہ دسمبر 2014ء کا دلفریب پاکیزہ آپ کی نذر

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی

نگہت سیما اور **رفاقت جاوید**
کے سلسلے وار ناول بہت خوب صورتی
سے منزل کی جانب گامزن

مایہ ناز رائٹر و پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی **فرحانہ نازملک** کی
یاد میں ساتھی رائٹرز اور مداحوں کے پُرنم اور پُرسوز تاثرات

زاھدہ پروین کے ماہر قلم کا شاہکار **جنگل کا پھول**

نایاب جیلانی نے پردہ اٹھایا **ترکِ وفا** کے اصل راز سے

ماہِ دسمبر کے لیے **غزالہ عزیز** کی دلوں کو گرماتی خوب صورت تحریر

ان کے علاوہ

شیریں حیدر، نگہت اعظمی، ریحانہ حسن، ندا حسنین،
فرحانہ نازملک و دیگر مشاق قلم کاروں کی پُرلطف کاوشیں

گزرتے ماہ و سال کیا
پیغام دیتے ہیں؟ **شائستہ زریں**
کا خصوصی سروے

اس کے ساتھ ساتھ مستقل متنوع سلسلوں کا دلکش اور دلربا امتزاج صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

عالمی تناظر میں یہی ہماری بقا کا راستہ ہے۔

پھولتی ہے...... عالمی تناظر میں یہی ہماری بقا کا راستہ ہے۔ بے شک ہماری خونریزی سے ہمارا امیج خراب ہوتا ہے۔ بے شک ہماری پشت پناہی میں کئی بڑی عالمی طاقتیں ہیں، کچھ عرب ممالک بھی ہیں مگر ایسی کارروائیوں سے ہمارے یہ ''دوست'' متاثر بھی ہو سکتے ہیں۔ خونریزی کے بجائے سیاست کے ذریعے معاملات حل کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ تم لوگوں کی اس کارروائی کے بعد عالمی صحافتی بورڈ کے ایک ہمارے ہم وطن اسرائیلی اخبار ''ہارٹز'' کے کالم نگار یوٹیل مارکس نے تبصرہ کیا تھا کہ ''ہماری انا کی تسکین کے لیے یہ خبر اچھی ہے مگر اس طرح کی خونریز کارروائیوں سے ہمارے ملک کو درپیش سنگین خطرات اور مسائل حل نہیں ہو سکتے۔''

اس پر ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ نے دوبارہ حکومتی نمائندے کو کھدیڑا۔ ''تمہاری پارٹی کے ایک سابق وزیراعظم نے بھی جوشِ خطابت میں یہ بیان دیا تھا کہ ہمارے دشمنوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ اسرائیل جنگ جانتا ہے اور جو ہمیں نقصان پہنچائیں گے انہیں کئی گنا نقصانات کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''پھر تو آپ کو ہماری سیاسی لیڈرشپ پر شبہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اپنی مصلحت اندیشی کے باعث آپ کے کاز کو تاخیر کا شکار بناتی ہے۔''

جنرل فرناش پیچھے ہٹنے والا کہاں تھا۔ اس کی بات کو پکڑتے ہوئے بولا۔ ''یقیناً پر تم لوگ غلطی کرتے ہو اس طرح کی قتل و غارت گری کی ذمہ داری قبول کر کے...... اس طرح ہمارے دوست خصوصاً واشنگٹن مشکل میں پڑ جاتا ہے، جو تیونس کو عرب دنیا میں معتدل اور مغرب نواز خیال کرتے ہیں۔ اسرائیلی حکومت اور اسرائیلی جنس جانتی ہے کہ اس طرح اسے اقوام متحدہ میں سیکیورٹی کونسل کی متفقہ مذمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

''میرا خیال ہے ہمیں اب اس بحث کو چھوڑ کر اپنے اصل ایجنڈے پر بات کرنی چاہیے۔'' بالآخر موساد کے بارق شمعون نے اس بحث کی طوالت سے اجتناب برتنے کی غرض سے کہا تو جنرل فرناش نے ہولے سے کھنکھار کے اصل گفتگو کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''ہمارا اگلا ٹارگٹ ''آپریشن اسالٹ مشن'' ہے۔ جس کے مطابق ہم نے پی فرنٹ کے رہنما صادق الخیری اور المجاہد کی زبیدہ کو ٹارگٹ کر کے ختم کرنا ہے۔''

سوائے حکومتی نمائندے پریسلو کے موجود سب نے حمایت کا اعلان کر دیا ہاتھ اٹھا کر...... جبکہ پریسلو بولا۔

''منصوبے کی تفصیل میں جاننا چاہوں گا۔''

''ہم اس کی تفصیل محفوظ رکھتے ہیں۔ ابھی منصوبے کے لائحہ عمل کی کچھ جزئیات قابلِ غور ہیں۔'' جنرل فرناش نے بھاری اور سنجیدہ آواز میں کہا تو پریسلو کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس منصوبے کی عملی کارروائی کو دانستہ چھپایا جا رہا ہے۔ اسے معلوم تھا اگر وہ تحفظات کا اظہار کرنے کی کوشش کرتا تو پھر ایک طولانی بحث چھڑ جاتی۔ لہٰذا اس کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ ان کے اگلے منصوبے سے واقف تھا۔ بولا۔

''ٹھیک ہے مگر رفیوجیز کے سلسلے میں کیا قدم اٹھایا جا رہا ہے؟ میری مراد ان جلاوطن اور زبردستی بےدخل کرنے والے فلسطینیوں سے ہے۔'' پریسلو کی بات پر میجر ایہود شابک نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

''اس سلسلے میں ہم اپنی پہلی کارروائی کا آغاز سائپرس (قبرص) سے کر چکے ہیں۔ وہ دونوں فلسطینی آفیسرز مارے جا چکے ہیں جو فلسطینی رفیوجیز کے لیے ایک بحری جہاز چارٹرڈ کرنے والے تھے۔''

''گڈ۔'' پریسلو نے اثبات میں سر ہلایا پھر رسٹ واچ میں وقت دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر میرا یہاں مقصد ختم ہو چکا ہے تو کیا میں جا سکتا ہوں؟''

اسے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ایہود شابک موساد کے میجر بارق شمعون اور اضحاق شامیر رہ گئے۔ شامیر نے جنرل فرناش سے کہا۔ ''شام، مراکش اور اردن کے فلسطینی رفیوجیز کے بارے میں کیا قدم اٹھایا جا رہا ہے؟''

جواباً ایہود شابک بولا۔ ''وہاں بھی ہمارے جاسوس مختلف بھیس میں متحرک ہیں۔ ابھی وہاں ان کی سپورٹ میں کوئی نہیں، صرف یہی دونوں فلسطینی آفیسرز احسن الزہروی اور ابوجواد العزیز ہی اس معاملے میں دلچسپی رکھتے تھے اور کوشاں بھی تھے ایک خفیہ اسالٹ آپریشن کے ذریعے انہیں قبرص میں ہی سیماسول کی بندرگاہ پر ختم کر دیا گیا ہے۔''

''کیا اس سلسلے میں ہمیں پوری تسلی ہے کہ اب ان جلاوطن اور بےدخل فلسطینیوں کی واپسی کی ساری راہیں مسدود کی جا چکی ہیں؟'' اضحاق شامیر کے ساتھ بارق شمعون نے اس بار سوال کیا تھا۔

''اپنے سوال کی وضاحت کرو۔'' جنرل فرناش نے اس کی طرف سنجیدہ نظروں سے گھورا۔ تو وہ بولا۔ ''کہنے کا مقصد یہ تھا کہ کیا ان دونوں فلسطینی آفیسرز کے مرنے کے

بعد...... آپ کو یقین ہے کہ اب کوئی ان فلسطینی ریفیوجیز کی سپورٹ میں نہیں رہا؟''

''آپ نے شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے ایہود شابک کی بات پر غور نہیں کیا۔ جس کے مطابق ہمارے جاسوس مختلف بھیس میں متحرک ہیں، جیسے ہی ہمیں اس سے متعلق کوئی اطلاع پہنچتی ہے ہم فوراً حرکت میں آجاتے ہیں۔''

''گڈ۔'' موساد کے دونوں سیکنڈ اینڈ ڈپٹی ڈائریکٹرز نے مکروہ اور بے رحمانہ مسکراہٹ سے بیک وقت اپنے سروں کو اثباتی جنبش دی تھی پھر تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بھی رخصت ہو گئے۔ اب صرف وہاں ڈیوڈ اسٹار کا کورم موجود تھا۔ جنرل آئزک فرناش اور اس کا نائب میجر ایہود شابک۔

قبرص میں مقیم دو جلاوطن آفیسروں احسن الزہروی اور جواد کو قتل کروانے میں میجر ایہود شابک کا ہاتھ تھا۔ اس کی منصوبہ بندی کے باعث ڈیوڈ اسٹار کے تین ٹاپ اسالٹ ایجنٹوں نے قبرص کی بندرگاہ پر دھاوا بولا تھا اور اس خونی دستے نے دونوں فلسطینی آفیسرز کا بے دردی سے قتل کیا تھا، اس سلسلے میں اب میجر ایہود شابک اپنے چیف فرناش کو آئندہ کی رپورٹ دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''چیف! فلسطینی ریفیوجیز کا معاملہ بہ ظاہر ختم نہیں ہوا ہے۔ آج ہی وہاں مقیم ہمارے ایک جاسوس اے سیون نے اپنی خفیہ رپورٹ بھیجی ہے کہ مقامی حکومت تو اگرچہ برائے نام مقتولین آفیسرز کے سلسلے میں تفتیش کر رہی ہے مگر ''البحر'' نامی ایک شپنگ کمپنی کے مالک سلطان شیکھری اور بالخصوص اس کا بیٹا عابد شیکھری نہ جانے کیوں اس کیس میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں اور یہ دونوں لبنانی مسلم ہیں۔''

''ہوں۔'' اس کی بات پر جنرل فرناش نے ایک پُرسوچ اور گمبھیر ہنکاری بھری پھر سوالیہ کہا۔ ''یہ البحر، وہی کمپنی ہے جس کے دو جہاز فلسطینی ریفیوجیز کے لیے چارٹرڈ کروائے جا رہے تھے؟''

''یس چیف۔'' نائب میجر ایہود شابک نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ تو جنرل فرناش بولا۔

''اے سیون سے کہو ہمیں ان دونوں لبنانی مسلمان باپ بیٹے سے متعلق مکمل اور مفصل رپورٹ دے۔ اس کیس میں ان کی دلچسپی کی وجہ کیا ہے؟ دولت کا حصول یا پھر اس کے پیچھے جذبۂ مسلکی کارفرما ہے۔''

''دولت کا ان دونوں باپ بیٹوں کو کوئی لالچ نہیں ہے چیف۔'' ایہود شابک نے کہا۔ ''وہ خالصتاً حمیت مسلم امہ کی بنیاد پر اور ایک کاز کے تحت دلچسپی لے رہے ہیں۔ اے سیون اپنی مفصل رپورٹ دے چکا ہے۔ جس کے مطابق اب ان دونوں ٹارگٹڈ مقتول فلسطینی آفیسروں کے کام کا بیڑا سلطان شیکھری اور عابد شیکھری نے اٹھالیا ہے۔''

اپنے نائب کے اس انکشاف پر جنرل فرناش کا چہرہ غیظ وغضب کے مارے سرخ ہوگیا۔ اس نے کشتی کے فرش جیسی ساخت وشکل کے پیندے والی میز پر اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا مارا اور غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ''تو پھر اب تک وہ دونوں لبنانی مسلم باپ بیٹا زندہ کیوں ہیں؟ پتا نہیں وہ وقت کب آئے گا جب ہم مکمل طور پر مسلمانوں کے اس جذبۂ حمیت کی چین کو توڑ ڈالیں گے۔ ان کے اس جذبۂ اتحاد المسلمین سے ہماری پوری یہودی قوم خوف کے مارے نفسیاتی مریض بن کر رہ گئی ہے۔'' کہتے ہوئے جنرل فرناش کا چہرہ مسخ ہو کے رہ گیا تھا۔ ایہود شابک اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''اس سلسلے میں ہم...... آپریشن اسالٹ ٹو کے نام سے ایک اور منصوبہ ترتیب دے چکے ہیں، آپ کے حتمی احکامات کی دیر تھی۔''

''فوراً عمل کرو، ایسے کسی بھی منصوبے پر میرے حتمی احکامات یا اجازت کی ضرورت میں وقت ضائع نہ کیا کرو...... جس میں خونِ مسلم کو بہانا ہو اور ہمارے وسیع تر مفادات کے عین مطابق بھی ہو۔'' جنرل فرناش نے سفاکانہ غراہٹ سے اپنے نائب کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ محتاط لہجے میں بولا۔

''چیف آئندہ ایسا ہی ہوگا لیکن ابھی آپریشن اسالٹ ٹو پر اتنی جلدی عمل درآمد نہیں ہوسکتا وجہ آپ کو معلوم ہے۔''

''نو...... نیور...... میجر شابک! کسی کی پروانہ کرو...... اور فوراً اس منصوبے پر عمل کرو۔ اب دوسرے اور سب سے اہم منصوبے پر بات کرو۔ اس کے بارے میں تمہارا لائحہ عمل کیا ہے؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا اور خودکلامیہ انداز میں بڑبڑایا۔ ''مجھے بھارت سے را کے نائب سربراہ سے اہم میٹنگ کرنی ہے۔''

''یس چیف، بالکل ایسے ہی ہوگا۔'' میجر شابک نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''دوسرے منصوبے کے مطابق پی فرنٹ کے رہنما صادق الخیری اور الجاہد کی زبیدہ کو ٹارگٹ کرنے کا پلان فائنل ہو چکا ہے۔''

''مختصر بریفنگ دو، اس کے بعد اس میٹنگ کو ختم

کرو۔'' جنرل فرناش نے تحکمانہ انداز میں کہا تو میجر ایہود شابک نے فرفر بولنا شروع کر دیا۔

یہ میٹنگ ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر میں ہو رہی تھی۔ جو تل ابیب کے مضافات میں تیونائی کے قریب ایک نیم پہاڑی و جنگلاتی سلسلے میں واقع تھا۔ جنرل فرناش کی رہائش گاہ بھی وہیں تھی اور میجر ایہود شابک کی بھی۔

☆☆☆

پرانے بیت المقدس کے جنوبی مضافات میں بیت صفانہ کا گنجان پہاڑی سلسلہ تھا۔ یہ ''المجاہد'' کی رہنما زبیدہ اور اس کے جاں نثار ساتھیوں کا خفیہ ٹھکانا تھا۔ ادھر ایک نیم پختہ مکان کے ایک کمرے میں پانچ افراد موجود تھے جن میں قابلِ ذکر پی فرنٹ کے رہنما صادق الخیری اور المجاہد کی زبیدہ کے نام تھے، باقی تین اہم ساتھیوں میں سے ایک ساتھی، صادق الخیری کا تھا اور باقی دو زبیدہ کے۔ رات اپنے درمیانی پہر میں داخل ہو رہی تھی۔ کمرے میں زیتون کے تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ فرش پر برگ چھالا بچھا ہوا تھا۔ درمیان میں قہوہ کی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔

''محترم خیری...... آپ کی یہاں آمد سے ہمارے حوصلے بلند ہوئے ہیں مگر ہمیں ''داوار'' کی رپورٹ کے مطابق آپ کی جان سے متعلق گہری تشویش ہے۔'' زبیدہ نے الخیری سے کہا۔ وہ ایک پینتیس سالہ گوری چٹی اور آہنی عزم رکھنے والی مجاہدہ تھی۔ صادق الخیری اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''مجاہدوں میں انتشار پھیلانے والی ایسی رپورٹیں آتی رہتی ہیں۔ یہ بھی صیہونی سازش کا ایک حصہ ہے۔ ہمیں اس کی پروا نہیں، نہ ہی ہم ایسی گیدڑ بھبکیوں کی وجہ سے اپنی کارروائیوں کو پس پشت ڈال سکتے ہیں۔ جبکہ یہودی ہمارے خلاف ہمہ وقت اپنی مذموم، ناپاک بزدلانہ کارروائیوں میں معروفِ عمل رہتے ہیں۔'' صادق الخیری اتنا کہہ کر چند ثانیوں کے لیے رکا۔ وہ ایک پچاس سالہ دلیر فلسطینی مجاہد تھا۔ رنگت سانولی تھی، اس نے اسرائیلی انٹیلی جنس کا کافی عرصے سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اس کی مجاہدانہ کارروائیوں سے موساد بھی تنگ آ چکی تھی، وہ اب تک اپنی سرتوڑ کوششوں کے باوجود اس دلیر مجاہد کو ٹارگٹ کرنے سے قاصر تھی یہ ہی سبب تھا کہ موساد کو اپنے کاسۂ بطن سے ڈیوڈ اسٹار کو جنم دینا پڑا تھا مگر ڈیوڈ اسٹار بھی اب تک اس کی گرد کو نہ پا سکی تھی۔

''ہمیں بہت جلد اسرائیل کو ایک زبردست چوٹ پہنچانی ہے۔ تمہاری رپورٹ ہمیں ملی تھی، وہ اس قدر اہم تھی کہ مجھے خود اپنی کمین گاہ سے نکل کر تمہارے پاس بیت صفانہ آنا پڑا۔''

''محترم...... آپ ہماری قوم کا سرمایہ ہیں آپ کی جان کو خطرہ تھا مجھے حکم کیا ہوتا میں حاضر ہو جاتی۔''

زبیدہ بولی تو صادق نے کہا۔ ''نہیں، عزیزی زبیدہ! میں، تم اور ہمارا ہر مجاہد ارضِ مقدس کا سرمایہ ہے۔ جو صیہونیت کے ناپاک عزائم سے برسرپیکار ہے۔ میرے علم میں تمہاری بھی اسرائیلیوں کے خلاف مجاہدانہ کارروائیاں آتی رہتی ہیں۔ تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے بھی اسرائیلیوں کو ان کی بدمعاشی کا مزہ چکھایا ہوا ہے۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری رپورٹ کی تصدیق کیا ہے؟ کیونکہ ہم اس سلسلے میں بہت جلد حتمی کارروائی کرنا چاہتے ہیں۔''

جواباً زبیدہ بولی۔ ''پی ایل ایس او کا ایک دلیر مجاہد تیسیر الخلیلی جو مسلسل ہمارے رابطے میں تھا۔ اس نے اپنی ساتھی لیلیٰ کے ساتھ مل کر اسرائیلیوں کا یہ بھیانک اور ناپاک منصوبہ بے نقاب کیا ہے مگر افسوس کہ اسرائیلی انٹیلی جنس کو اس کی بھنک پڑ گئی اور وہ پی ایل ایس او (فلسطین لبرل اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن) کے خلاف فوراً حرکت میں آ گئی، جس کے نتیجے میں تیسیر الخلیلی ان کے ہتھے چڑھ گیا اور لیلیٰ ابھی تک مفرور ہے۔ تاہم ان کی رپورٹ کے مطابق...... صحرائے نجف میں جدھر اسرائیل کا ڈیمونا ریسرچ نیوکلیئر پلانٹ قائم ہے وہیں بہ ظاہر ایٹمی بجلی گھر کے نام پر یورینیم کی افزودگی کا بھی ایک خفیہ پلانٹ لگایا جا رہا ہے اور اس میں فرانس، امریکی سفارش سے اسرائیل کی مدد کر رہا ہے کیونکہ فرانس کو امریکا بلیک تھنڈر ریبوٹ نامی ایٹمی آبدوزیں دے رہا ہے۔ یہ خفیہ پلانٹ تیار کیا جا چکا ہے جو اب آخری مراحل میں ہے۔ اسے سبوتاژ کرنا بہت ضروری ہے۔''

زبیدہ نے اپنی بات ختم کی تو صادق الخیری کا چہرہ جوشِ غیظ تلے سرخ ہو گیا اور وہ برہم لہجے میں بولا۔ ''ہم نے ہر صورت میں اس ناپاک منصوبے کو سبوتاژ کرنا ہے۔''

''ہم آپ کے ساتھ ہیں۔'' زبیدو نے بہ یک زبان و ہم آواز کہا تو صادق بولا۔

''میں آج ہی تیونس روانہ ہو رہا ہوں۔ وہاں دو روز میں ایک مربوط اور منظم پلاننگ ترتیب دوں گا۔ میرا ایک ساتھی آ کر تمہیں میرے لائحہ عمل سے آگاہ کر دے گا اور یہ پیغام بھی دے گا کہ ہم نے کس طرح مشترکہ کارروائی کا آغاز کرنا ہے۔''

گفتگو کے اختتام کے بعد صادق الخیری وہاں سے

رخصت ہونے کی تیاری کرنے لگا۔

☆☆☆

اس کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ اسے مسلسل سات روز تک انسانیت سوز تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہ ایک دبلا پتلا دراز قامت نوجوان تھا مگر وہ جذبۂ حریت سے سرشار... اور ایک بہادر اور دلیر نوجوان تھا۔ اسے نہ اپنے اوپر ہونے والے ظالمانہ تشدد کی پروا تھی، نہ اپنی جان کی، پروا تھی تو صرف ایک بات کی کہ ان غاصب یہودیوں کو ایسا سبق سکھائے کی جو یہ رہتی دنیا تک یاد رکھتے۔ پروا تھی تو ان کے ناپاک عزائم کو نیست و نابود کرنے کی، جنہوں نے عرصہ دراز سے...... بیت المقدس اور ارض فلسطین پر... مسلم فلسطینیوں کے لیے زمین تنگ کر رکھی تھی یہ بہادر نوجوان پی ایل ایس او آرگنائزر...... قیصر الخلیلی تھا۔ جس نے اپنی ایک بہادر ساتھی لیلیٰ آفندی کے ساتھ مل کر اسرائیلیوں کے ایک بھیانک خفیہ منصوبے کو بے نقاب کر ڈالا تھا، جہاں بہ ظاہر بجلی گھر کی تعمیر کی جا رہی تھی مگر در پردہ وہاں یورینیم کی افزودگی کا پلانٹ، فرانس اور امریکا کی مدد سے لگایا جا رہا تھا۔

قیصر الخلیلی نے فوراً اس کی رپورٹ مجاہد تنظیموں کو کر دی تھی اور اس کی بھنک اسرائیلی انٹیلی جنس کو پڑی تو وہ الخلیلی اور لیلیٰ کو گرفتار کرنے کے لیے حرکت میں آ گئے، لیلیٰ تو ان کے ہتھے نہ چڑھ سکی، البتہ قیصر الخلیلی کو یہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

موساد کے ہیڈ کوارٹر میں ایک ٹارچر سیل ''ریڈ سیل'' میں اسے رکھا ہوا تھا اور اس سے اس کی دوسری ساتھی لیلیٰ کے بارے میں اگلوایا جا رہا تھا۔ نیز یہ کہ اس نے اب تک یہ رپورٹ کن کن مجاہد تنظیموں کو فراہم کی تھی اور اب کون اس ناپاک منصوبے کے خلاف کمربستہ تھا۔

موساد کے ایک اعلیٰ عہدے دار میجر بارق شمعون اور اضحاق شامیر اس سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ ایک تنگ و تاریک اور سیلن زدہ کمرے میں قیصر الخلیلی کو اس حالت میں رکھا ہوا تھا کہ اس کے جسم پر صرف ایک شلوار تھی اور جسم جگہ جگہ سے تشدد کے نتیجے میں نیلا اور سوجا پڑا تھا۔

''تم اب بھی اپنی ضد چھوڑ دو تو تمہیں نہ صرف چھوڑ دیا جائے گا، بلکہ تمہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک بڑے ترقی یافتہ ملک کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن کا موقع بھی دیں گے۔'' ٹھگنے سے قد والا میجر شمعون اس سے بولا تو قیصر نے اپنے سوجے ہوئے خون آلود ہونٹوں سے فرش پر انتہائی نفرت سے تھوک دیا اور اس لمحے میں میجر شمعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بے خوفی سے بولا۔

''میں تم پر اور تمہاری مراعات پر تھوکتا ہوں یہودی کتے...... ہاں، میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ارض مقدس کو اپنے ناپاک وجود سے پاک کر دو۔'' یہ کہتے ہوئے خلیلی کا سانس پھولنے لگا۔

شمعون کا چہرہ نفرت و طیش سے لال بھبوکا ہو گیا۔ اس کا ساتھی اضحاق شامیر اور دو ساتھی اہلکار چست وردیوں میں وہاں موجود تھے، میجر شمعون نے اپنے بیلٹ سے جھولتے ہوئے ہولسٹر سے پستول نکال لیا اور اس کی نال کا رخ قیصر الخلیلی کی طرف کر دیا۔ موت کو سامنے دیکھ کر قیصر الخلیلی نے زیر لب کلمہ پڑھ لیا۔ اسی وقت میجر شمعون کے پستول نے شعلہ اگلا اور گولی اس بہادر نڈر جوان کے سر میں پیوست ہو گئی، وہ آواز نکالے بغیر وہیں جام شہادت نوش کر چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میجر شمعون اور میجر شامیر آپس میں اس بات پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے کہ اس کی دوسری ساتھی لیلیٰ کو کس طرح اور کہاں تلاش کیا جائے؟

☆☆☆

لیلیٰ اپنی جان کو خطرات میں ڈالے، راتوں رات شیخ حسن علی کے کھجوروں کے فارم سے نکل گئی تھی، اس کے پاس صرف پستول تھا۔ جس میں پانچ گولیاں تھیں۔ ایک گولی سے غدار اسد کی پیشانی میں سوراخ بنا چکی تھی۔ لیلیٰ اب خود کو غیر محفوظ سمجھ رہی تھی۔ اسے جلد کسی محفوظ پناہ گاہ کی ضرورت تھی۔ اس کی واپسی کے سارے دروازے بند ہو چکے تھے۔ وہ سر سے تو اسی دن کفن باندھ چکی تھی جب اس کے مجاہد بھائی اور منگیتر کو اسرائیلی خفیہ پولیس نے گولیوں سے چھلنی کر ڈالا تھا پھر قیصر الخلیلی کے ساتھ مل کر اس نے شیماز یونیورسٹی میں پی ایل ایس او کی داغ بیل ڈالی تھی مگر اسرائیلی خفیہ پولیس نے ان کی وہ سرگرمیاں کچلنے کی کوشش شروع کر دی تھی جس کے نتیجے میں پی ایل ایس او کے آرگنائزر قیصر الخلیلی کو گرفتار کیا جا چکا تھا مگر اب وہ شہید کیا جا چکا تھا۔ اس کے بعد اب اسرائیلی درندوں نے پی ایل ایس او کی نائب صدر لیلیٰ آفندی کی بھوکے بھیڑیوں کی طرح تلاش شروع کر دی تھی۔ لیلیٰ یوں بھی قیصر الخلیلی کی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ان کے پیچھے موساد لگ چکی ہے۔

لیلیٰ اور قیصر الخلیلی نے مل کر سب سے پہلے پی فرنٹ کے صادق الخیری والے مجاہد گروپ میں شامل رہتے ہوئے.... گوریلا ٹریننگ حاصل کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے دیگر چار اہم ساتھیوں، محسن، جمال، زبیر اور باقر کو بھی

ایسی ہی تربیت دی تھی۔ انہیں اسلحہ، پی فرنٹ ہی نے خفیہ طور پر سپلائی کیا تھا مگر بدقسمتی سے جلد ہی موساد کے میجر بارق شمعون کو ان کی بھنک مل گئی اور یوں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور یونیورسٹی کیمپس کی بھی خفیہ ریکی شروع کرا دی گئی تھی، یہی سبب تھا کہ لیلیٰ وہاں کا رخ کرنے سے کترا رہی تھی، اس کا ارادہ...... پی فرنٹ کے صادق الخیری سے ملنا تھا، جو سرِ دست ناممکن حد تک مشکل نظر آ رہا تھا۔ البتہ اس نے بیت صفانہ کا رخ کیا کہ وہاں وہ ''المجاہد'' کی پناہ میں جا سکتی تھی۔ بیت صفانہ کے گنجان پہاڑی سلسلوں میں ہی موساد نے گولہ باری کی تھی اور سرچ آپریشن بھی کیا تھا مگر وہاں اسے المجاہد کی زبیدہ اور اس کے ساتھیوں سے منہ کی کھانی پڑی تھی۔ لہٰذا لیلیٰ اب بیت صفانہ کی پہاڑیوں کو ہی اپنا محفوظ ٹھکانا سمجھتی تھی، وہ المجاہد میں شامل ہو کے اپنے چاروں ساتھیوں کو سپورٹ کرنا چاہتی تھی اور اپنے لیڈر قیصر الخلیلی کو بھی چھڑانے کی کوشش کرتی، اگرچہ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ جامِ شہادت نوش کر چکا تھا۔

لیلیٰ کسی طرح چھپتی چھپاتی بیت صفانہ کی پہاڑیوں میں جا پہنچی۔ اس وقت پو پھٹنے لگی تھی اور صبح دم کی سحر خیزی نمودار ہونے لگی تھی، جب اسے اچانک چار ہتھیار بہ دست آدمیوں نے گھیر لیا۔ لیلیٰ سمجھ نہ پائی کہ یہ دشمن تھے یا مجاہد...... لیکن جلدی ہی اسے اس کربہ حقیقت کا اندازہ ہو گیا کہ وہ موساد کے جاسوسوں کے ہاتھ لگ گئی ہے جو ان پہاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے پھر جیسے آگ اور خون کا کھیل شروع ہو گیا۔ وہ لیلیٰ کو پہچان نہیں سکتے تھے تاہم لیلیٰ نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے خود کو یہودیوں کے ایک خیر خواہ کی حیثیت سے ظاہر کیا اور بتایا کہ وہ یہاں المجاہد کی زبیدہ سے ملنے آئی ہے۔

موساد کے ایکشن اسالٹ ایجنٹوں کو ہر قسم کی معلومات سے ''اپ ڈیٹ'' کیا جاتا تھا، یہی سبب تھا کہ انہوں نے تھوڑی دیر بعد ہی لیلیٰ کو پہچان لیا مگر اب دیر ہو چکی تھی، تعارفی کلمات کے دوران ہی لیلیٰ نے خطرہ بھانپ لیا تھا اور اس نے پھرتی کے ساتھ پستول نکال کر ان پر یکے بعد دیگرے گولیاں چلا دیں۔ دو اسرائیلی ایجنٹ اس کے دھوکے میں آ کر مار کھا گئے، اور تیورا کر گرے جبکہ باقی دو نے سنگلاخ درے کی آڑ میں پناہ لے لی۔ لیلیٰ کے پستول میں اب صرف ایک ہی...... آخری گولی بچی تھی اسے جس چٹانی آڑ میں چھپنے کا موقع ملا تھا ایک مردہ دشمن کی نعش اس سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھی، جبکہ دوسرے کی لاش اس کی پہنچ سے دور تھی اور اسلحے کے نام پر اس کے پستول میں فقط ایک گولی تھی۔

اس نے بڑی محتاط اور عقابی نگاہوں سے آڑ سے ذرا ابھر کر جھانکا۔ دشمن نے پوزیشن سنبھالی ہوئی تھی مگر لیلیٰ نے کمال پھرتی کے ساتھ سب سے پہلے آخری گولی کا فائر سامنے جھونک دیا اور ساتھ ہی پتھریلی زمین پر تیزی سے کہنیوں اور گھٹنوں کے بل رینگتی ہوئی پہلے والے مردہ دشمن کی لاش کے قریب جا پہنچی، اسے فقط اتنا ہی موقع مل سکا کہ وہ اس کے قریب گری ہوئی گن پر ہی قبضہ جما سکی تھی مگر اسے سیدھا کر کے سنبھالنے کا ابھی موقع بھی نہ ملا تھا کہ دشمن آڑ کی سمت سے اس پر یک دم گولیوں کی بوچھاڑ پڑی۔ لیلیٰ نے چونکہ خود کو دشمن کی لاش کے ساتھ ہی زمین پر بالکل سپاٹ کر رکھا تھا اس لیے اسے فی الحال اس کی آڑ میسر رہی۔ گولیاں مردہ دشمن کی لاش میں پیوست ہو رہی تھیں اور لاش کو جھٹکے لگ رہے تھے، مٹی اور دھول کا غبار سا رقص کرنے لگا۔ پھر لمحہ بھر کو فائرنگ تھمی تو لیلیٰ نے فوراً اس قلیل ترین موقع سے فائدہ اٹھایا۔ دوسرے ہی لمحے اسے لیٹے لیٹے گن کو دشمن آڑ کی سمت کرنے کا موقع مل گیا اور لبلبی دبا دی۔ گن پہلے ہی برسٹ پر سیٹ تھی نشانہ بلینک پوائنٹ سہی...... مگر اسے بہر حال اپنی آڑ تک جا پہنچنے کا موقع ضرور مل گیا۔

گن اور آڑ میسر آتے ہی لیلیٰ کا حوصلہ بھی فزوں تر ہو گیا اور پورے وجود میں جوش کی بجلیاں سی دوڑنے لگیں۔ اس نے فوراً پینترا بدلا اور پہلے والی آڑ چھوڑ کر عقب میں رینگ گئی۔

ابھی صبح کی روشنی پوری طرح سے نہیں پھیلی تھی اور بلند و بالا سنگلاخ پہاڑیوں میں ملگجے اندھیرے اترے ہوئے تھے۔ لیلیٰ نے پلٹ کر ذہن میں دشمن آڑ کا نقشہ تازہ کیا...... گن سنبھالے...... سینے کے بل تیزی سے رینگتی ہوئی وہ جب ایک تنگ درے سے طلوع ہوئی تو چونک پڑی۔ اسے محض چند گز کے فاصلے پر ایک دشمن دبکا دکھائی دے گیا جو اپنی کمانڈو جیکٹ سے ایک دستی بم نکال کر پھینکنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی نہ جانے کدھر تھا۔ لیلیٰ کی آنکھوں میں نفرت و غیظ کی بجلی لہرا گئی، اور اس نے وہیں سے اپنی گن سیدھی کر کے اس تیسرے دشمن ایجنٹ کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔ گولیوں کی پوری آتشیں باڑ نے اسے چھلنی کر کے رکھ دیا تھا۔ لیلیٰ وہیں چند ثانیے دبکی رہی، ممکن تھا چوتھا دشمن نمودار ہوتا، مگر وہ تو جیسے گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔

"اپنی گن پھینک دو لیلیٰ آفندی... کھیل ختم ہو گیا۔"
دفعتاً ایک زہریلی آواز کے ساتھ ہی ایک مہیب آہنی
نال لیلیٰ کی پشت پر آن لگی۔ پیٹ کے بل سنگلاخ اور
ناہموار زمین پر لیلیٰ کا پورا وجود سنسنا گیا۔ ابھی وہ بے بسی
سے ہونٹ بھینچے ہوئے تھی کہ اچانک برسٹ چلنے کی گرج
ابھری۔ لیلیٰ کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ دوسرے ہی
لمحے اس نے آخری دشمن کو "بھد" کی آواز کے ساتھ اپنے
بالکل قریب گرتے دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئی، پھرتی کے
ساتھ وہ لیٹے لیٹے پلٹی تو اس کے سامنے ایک جری عورت
ہتھیاروں سے لیس کھڑی تھی، اس کے ہاتھ میں گن تھی
اور اس کے ہمراہ دو آدمی بھی تھے، لیلیٰ الجاہد کی زبیدہ کو دیکھ
کر فرطِ مسرت سے چیخ پڑی اور اٹھ کھڑی ہوئی، پھر جب
ان نے اپنا تعارف کرایا تو زبیدہ نے اسے وفورِ جذبات
کے ساتھ اپنے سینے سے لگا لیا۔

"لیلیٰ بہن! تم یہاں کیسے آن پھنسی تھیں؟ یہاں تو
دشمن ایجنٹوں کے جاسوسوں کا جال پھیلا ہوا ہے؟" زبیدہ
نے پوچھا تو لیلیٰ نے اسے ساری بات مختصراً سا سی بتا دی۔
جسے سن کر زبیدہ نے اس کی پیشانی چوم لی اور اس کی
بہادری کی تعریف کرتے ہوئے پُرجوش لہجے میں بولی۔

"میری بہن! جب تک تم جیسی بہادر بہنیں اور بیٹیاں ارضِ
فلسطین کے لیے یہودی غاصبوں کے آگے سینہ سپر رہیں گی،
اس سرزمین کو خونِ صیہونیت سے رنگ دیا جائے گا۔ آؤ
ہمارے ساتھ۔"

یہ لوگ واپس پلٹے۔ زبیدہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ
لوگ ابھی تھوڑی دیر پہلے...... پی ایف ٹی کے رہنما......
صادق الخیری کو آگے محفوظ مقام تک الوداع کر کے لوٹ
رہے تھے کہ گولیوں کی آوازیں سن کر اس طرف کا رخ کرنے
پر مجبور ہو گئے تھے۔

☆☆☆

عابد شیکھری نے دونوں مقتول شہید اور جلاوطن
فلسطینی آفیسروں احسن الزہروی اور ابوجواد العزیز کے
ادھورے مشن کو پورا کرنے کی ٹھان رکھی تھی، پھر اس کے
باپ سلطان شیکھری نے بھی اپنے جوان بیٹے سے اس عزم
کا اعادہ بھی کروایا تھا۔ عابد کے دل میں تو ویسے ہی ارضِ
مقدس میں صیہونی یلغار، ان کی چیرہ دستیوں کے خلاف
نفرت و غیظ کی آگ سے بھری ہوئی تھی۔ اس کی یہ... دلی
آرزو تھی کہ وہ ان مٹھی بھر عظیم اور دلیر فلسطینی مجاہدوں کے
کسی کام آسکے، یہ ہی نہیں، فلسطینی مظلوم عوام کے لیے بھی
اس کے سینے میں ایک جذبۂ ہمدردی بہت پہلے سے ہی
پانے لگا تھا۔ جب غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذرِ
آتش کر کے اس کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کی مذموم اور
ناپاک سازش تیار کی تھی، اس کے بعد اسرائیلی فوجیوں نے
نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی چنگیزیت اور بربریت کا
نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔

نائمہ رافیہ سے ملنے کے بعد اس کی نصیحت کو اس نے
قابلِ اعتنا جان کر پی آئی آر سے رابطہ کرنے کا ارادہ ترک تو
کر دیا تھا مگر اپنے مشن سے ہٹا نہیں تھا۔

اس نے فوری طور پر فلسطینی ریفیوجیز کے لیے دو
جہازوں کا بندوبست کیا۔ انہیں اپنی حفاظت میں فلسطین
پہنچانے کا پختہ عزم کر لیا۔ روانگی سے عین چند گھنٹے قبل اس کی
نائمہ سے دوسری بار ملاقات ہوئی، اس بار وہ اس کے دفتر
آئی تھی۔ یہ ان کی تفصیلی ملاقات تھی۔ نائمہ کو جب عابد
شیکھری کے ان نیک عزائم کا اندازہ ہوا تو وہ اس سے متاثر
ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نائمہ بھی فلسطین کے
لیے وہی جذبات رکھتی تھی جو عابد کے دل و دماغ میں
پرورش پا رہے تھے۔ تاہم وہ اسے محتاط رہنے کی تلقین
کرتے ہوئے بولی۔

"عابد صاحب! آپ کے جذبات قابلِ قدر ہیں۔
میں نے بھی اپنے قلم اور اپنے آدرش کو فلسطینی مسلم بھائیوں
کے لیے وقف کرنے کا عزم کر رکھا ہے اور اپنے قلم کے
ذریعے دنیا والوں کو فلسطین پر ہونے والے صیہونی مظالم کی
مکروہ شکل دکھاتی رہتی ہوں لیکن آپ کو شاید کچھ باتوں کی
خطرناکی کا ابھی پوری طرح اندازہ نہیں۔ میں رپورٹنگ
کے سلسلے میں دو بار تل ابیب، حیفہ اور یروشلم کا دورہ بھی کر
چکی ہوں، اس کے علاوہ بھی میں یہودی مکروہ عزائم کا گہرا
مطالعہ اور مشاہدہ رکھتی ہوں۔ اسرائیل کی پشت پر بڑی سپر
طاقتیں ہیں انہی کی وجہ سے مٹھی بھر یہودی تیزی سے پھل
پھول رہے ہیں۔ صرف فلسطین ہی نہیں اریب قریب کی
پوری عرب ریاستوں پر غاصبانہ قبضہ ان کا اہم مقصد ہے
اور جن دور دراز ممالک میں جہاں جہاں مسلمان ہیں، ان
کے خلاف بھی اپنی مکروہ سازشوں میں مصروف رہتے ہیں۔
جن میں سرفہرست شام، اردن، عراق، ایران اور
بالخصوص پاکستان جیسے ملک شامل ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے
کہ یہ لوگ اپنی مکروہ سازشوں کا ٹارگٹ ہمیشہ مسلمانوں کو
ہی رکھتے ہیں۔"

"یہ باتیں میں بھی جانتا ہوں بلکہ ان کی سازشوں

کے تار حیرت زدہ مجھے نہیں رہے۔ کسی خطرے والی بات تو اس کا بھی میں ادراک رکھتا ہوں۔ ان کی تازہ خونی کارروائی میں بھولا نہیں ہوں۔" عابد نے کہا۔ اس کا اشارہ کچھ دن قبل یہاں بندرگاہ میں ہونے والی خونی کارروائی کی طرف تھا جس میں دو فلسطینی آفیسرز مارے گئے تھے۔

"میں یہی بتانا چاہ رہی تھی۔" نائمہ بولی۔ "جہاں یہودیوں کو اپنے مفادات کے سامنے کوئی کھڑا نظر آتا ہے اسے گرانے کے لیے موساد حرکت میں آجاتی ہے۔ وہ اس سلسلے میں پوری ریکی کرتے ہیں۔ یقیناً ان دونوں فلسطینی مقتولین آفیسرز کی بھی انہوں نے جاسوسی کی ہوگی اور اب آپ نے ان کے ادھورے مشن کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے تو یہ سب ان کی نظروں سے چھپا نہیں رہ سکتا۔"

"مجھے اس کا ادراک ہے۔" عابد گمبھیر متانت سے بولا۔ "لیکن میں خوف زدہ ہونے والا نہیں۔"

"بات صرف خوف زدہ ہونے کی نہیں ہے۔" نائمہ نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اپنے دفاع کے سلسلے میں بھی انسان کو کچھ کرنا پڑتا ہے۔ دانش مندی بھی یہی ہے۔ دفاع بھی اور مقصد بھی برآور ہو۔"

"میں سمجھ رہا ہوں آپ کی بات۔" عابد نے پہلی بار بغور اس کے دلکش اور چمکتی دل آویز ملائم جلد والے حسین چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آپ کے ذہن میں کوئی بات یا مشورہ ہو تو مجھ سے ضرور شیئر کریں۔"

عابد کی اس بات پر نائمہ پہلی بار مسکرا کر بولی۔ "مجھے آپ کی یہ بات اچھی لگی کہ آپ نے اپنے عظیم مقصد کے لیے مجھے درخور اعتنا جانا، درحقیقت عابد صاحب! میرا دل بہت جلتا ہے جب میں مظلوم فلسطینی مسلم بھائیوں کو صیہونی چنگیزیت میں پستا دیکھتی ہوں۔ دماغ میرا بھی سلگتا ہے جب میں ان غاصب یہودیوں کی مکروہ سازشوں کو کامیاب ہوتا دیکھتی ہوں۔ فلسطینی عورتوں، مردوں، بوڑھوں اور بچوں پر ان بزدل یہودی فوجیوں کو ظلم کرتا دیکھتی ہوں تو جی میرا بھی کڑھتا ہے۔ ان کی بربریت کی ایک بھیانک جھلک میں بھی دیکھ چکی ہوں بلکہ ان کے ستم کا نشانہ میں بھی بن چکی ہوں۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔ لہجے کا آہنگ اور انداز گفتگو رحریہ ہونے لگا۔ اس نے عابد شمشیری کو بھی چونکنے پر مجبور کر دیا۔

"عابد صاحب! کبھی موقع ملا تو میں اپنے بارے میں آپ کو سب بتا دوں گی لیکن خدا کے لیے آپ اپنے اس نیک مشن میں احتیاط کا دامن بھی تھامے رکھیں اور اگر مجھے کسی قابل سمجھیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ ایسے ہر مشن میں شامل رکھیں جو اسرائیلی درندوں کی ہلاکت اور مظلوم فلسطینی مسلم بھائیوں کے حق میں جاتا ہو۔"

عابد، نائمہ کی گفتگو سے متاثر ہو کے بولا۔ "میں آپ کے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ میرے دل میں آپ کے بارے میں جاننے کی خواہش پوری شدت سے ابھری ہے کہ آخر آپ کے ساتھ اسرائیلی درندوں نے کیا ظلم کیا؟ نیز کیوں اور کب؟ مگر آپ کی بات سے میرا حوصلہ بھی سوا ہوا ہے کہ اب اکیلا نہیں ہوں۔" نائمہ کی دلنشین کجراری آنکھیں نمناک سی ہونے لگی تھیں مگر جلد ہی اس نے اپنی رقت زدہ ہوتی کیفیات کو سنبھال لیا اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"عابد صاحب! مجھے واقعی دلی خوشی ہوئی ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔" جواباً عابد نے بھی کھلے دل سے کہا۔

"مجھے اب لگتا ہے کہ مجھے آپ کی رہنمائی اور مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ سوری میں آپ سے پوچھنا بھول گیا۔ آپ پہلی بار میرے دفتر میں تشریف لائی ہیں اور میں نے آپ سے کچھ کھانے پینے کا پوچھا ہی نہیں۔"

جواباً نائمہ کے دلنشین لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور عابد نے بھی مسکراتے ہوئے اپنے سامنے رکھے انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا۔

☆☆☆

دونوں فلسطینی آفیسرز کی ہلاکت خیز خونی مہم کی کامیابی کے بعد ڈیوڈ اسٹار نے فوراً اپنی اگلی خونی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ اس سلسلے میں ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل فرناش اور میجر ایبوڈشا بک اپنی منصوبہ بندی کو حتمی شکل دے چکے تھے، اس بار انہوں نے اپنے اس خونی آپریشن کو آپریشن ایکشن اسالٹ 2 کا نام دیا تھا۔ یہ کارروائی پی فرنٹ کے رہنما صادق الخیری کو گھیرنا اور اسے ہلاک کرنے کی تھی۔ صادق الخیری کی تیونس میں موجودگی کی خبر موساد نے انہیں دی تھی اور اب عملی کارروائی کرنے کی دیر تھی۔ ان کے خیال کے مطابق صادق الخیری کو ہلاک کرنے کا یہ بڑا سنہری اور اچھا موقع تھا۔

اس وقت اسرائیل کے دفاعی حلقوں میں "موساد" کے بعد "ڈیوڈ اسٹار" کی پوزیشن بڑی تابناک تھی۔ آپریشن اسالٹ 2 میں موساد کے کمانڈو ایجنٹوں نے بھی حصہ لیا تھا۔

اس خونی دستے کی کارروائی کا آغاز بہت تیزی سے عمل میں لایا گیا تھا۔

کل تین ان میں سے دو ڈیوڈ اسٹار کے اور ایک

موساد کا ایجنٹ تھا۔ ایجنٹوں نے جعلی لبنانی پاسپورٹوں پر بذریعہ تیونس سفر کیا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے ایک کار اور دو بسیں حاصل کیں جو ''وھاوے'' میں استعمال ہونے کے بعد ویران ساحل پر کھڑی ملیں۔ یہاں اسرائیلی میزائل بوٹ نے تیس چالیس کمانڈوز ربر کی کشتیوں میں اتارے۔ یہ آدمی ''سات متکال'' نامی یونٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کا مطلب تھا۔ ''جنرل اسٹاف کی سراغ رساں پارٹی۔'' ابھی آپریشن کا کمانڈ ونگ میجر ایہود بارق بحیرۂ روم میں میزائل بوٹ پر موجود تھا۔

ادھر سمندر پر تیونس فضائی حدود سے باہر ایک اسرائیلی بوئنگ 707 اڑ رہا تھا جس کے الیکٹرک آلات، صادق الخیری کی رہائش گاہ سے آنے والے ریڈیو وائرلیس پیغامات اور ٹیلی فون کالیں جام کرتے رہے۔ ڈیوڈ اسٹار اور موساد کے اس مشترک قاتل اور خونی دستے سے تل ابیب میں واقع آئی، ڈی، ایف کوارٹرز کے مابین ریلے اسٹیشن کا کام بھی کیا۔

یہ طیارہ تیونس اور سسلی کے مابین فلائٹ پاتھ بلیوارڈ پر اڑتا رہا جو ایک عام کمرشل روٹ ہے اور اطالوی فضائی کنٹرول میں آتا ہے۔

اصل خونی اور قاتل دستہ آٹھ یا نو افراد پر مشتمل تھا۔ کارروائی پروگرام کے مطابق رات سوا ایک بجے شروع کی گئی۔ اس دوران میں بارہ کمانڈوز عمارت کے باہر موجود رہے۔ وہ پہلے ہی وہاں تک خفیہ طور پر رسائی حاصل کر چکے تھے۔ قاتل دستے نے سائیلنسر لگی سب مشین گنیں استعمال میں رکھی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے انہوں نے دو فلسطینی باڈی گارڈز اور ایک قاصد کو مار ڈالا جو پہلی منزل پر جانے سے پہلے رات میں...... وہاں ٹھہر جاتا تھا۔

اس وقت صادق الخیری اپنے کمرائے مطالعہ سے باہر آئے، ان کے ہاتھ میں پستول تھا مگر اسرائیلیوں کے آٹومیٹک ہتھیاروں نے آناً فاناً کم و بیش سو گولیاں ان کے جسم میں اتار دیں۔ ان کی اہلیہ انتصار جو پانچ بچوں کی ماں تھی، اپنی نوخیز جوان بیٹی کے ساتھ موقع واردات پر آئی۔ اس نے اپنے خاوند کو خون میں لت پت پایا یہ سوچ کر کہ شاید میرا ابھی آخری وقت آگیا ہے تو قاتلوں کی گولیوں کے انتظار میں اپنا منہ دیوار کی طرف کر لیا پھر اسے ایک نقاب پوش اسرائیلی کمانڈو کی آواز سنائی دی جو اس کی جوان بیٹی سے عبرانی لہجے کی عربی میں کہہ رہا تھا۔

''جاؤ اور اپنی ماں کو سنبھالو۔''

پی فرنٹ کے رہنما صادق الخیری کی شہادت پر اسرائیل میں مختلف ردعمل سامنے آئے۔ فلسطینی مسلمان احتجاجاً سڑکوں پر نکل آئے اور اسرائیلیوں سے ان کے جگہ جگہ تصادم ہونے لگے۔ اسرائیلی فوج کی وحشیانہ فائرنگ سے کتنے ہی فلسطینی شہید ہوگئے۔

☆☆☆

بی آئی آر کی ممبر رپورٹر نائمہ رافیہ نے اس اندوہناک واقعے اور خونی آپریشن کی بھرپور رپورٹنگ کی تھی اور اسے اسرائیل کی کھلی بربریت اور درندگی سے تعبیر کیا تھا۔ اس کے چیختے چنگھاڑتے کالم اور اداریوں نے اسرائیل کے اس آپریشن کو دہشت گردی قرار دیا تھا۔ اس نے امریکا کو بھی رگید ڈالا تھا جو بظاہر خود کو عالمی امن کا داعی کہتے ہوئے نہیں تھکتا تھا۔ وہ اس کھلی جارحیت پر ''پابہ گوش'' بنا ہوا تھا۔ نائمہ کی اس دھواں دھار رپورٹنگ نے عالمی سطح پر تہلکہ مچا دیا، جس کے باعث اسرائیل کے امیج کو ایک بار پھر زبردست دھچکا پہنچا تھا۔ نائمہ نے واشگاف انداز میں اس کریہہ حقیقت کا اظہار کیا تھا کہ اسرائیلی انٹیلی جنس نے ایسی ہی کارروائی کچھ روز پہلے قبرص کی بندرگاہ سیماسول میں بھی کی تھی جس کے نتیجے میں دو بے گناہ اور جلاوطن فلسطینی آفیسرز کو بیدردی سے ہلاک کر دیا گیا تھا۔

اسرائیلی حکومت کی کابینہ میں ایک بار پھر ہلچل مچ گئی۔ مخلوط حکومت خطرے میں نظر آنے لگی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس خونی کارروائیوں کے خلاف تھی بلکہ اس لیے کہ اس سلسلے میں اسرائیل کے امیج کو کیوں نہیں مدنظر رکھا گیا تھا۔ عرب اور مسلم دنیا میں بھی شدید احتجاج کیا گیا تھا اور اسرائیل کو ہر جگہ تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔

عابد شیکھری کا عزم مزید پختہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے مشن کو حتمی شکل دے دی تھی، اس کا خیال تھا یہ ایک بہترین موقع تھا جبکہ اسرائیل اس وقت اپنی ناکام ''گلوخلاصی'' میں مصروف تھا۔ اس نے دو بحری جہاز فلسطینی رفوجیز سے لاد کر روانہ کر دیے۔ حیفہ میں بین الاقوامی صحافتی بورڈ کی پریس کانفرنس میں شرکت کے لیے نائمہ رافیہ نے بھی تل ابیب کا رخ کیا۔ وہاں عابد شیکھری نے بھی اس سے ملاقات کرنے کا عندیہ ظاہر کیا تھا۔ وہ بھی اس کانفرنس میں شریک ہونا چاہتا تھا۔

ایک بحری جہاز پر عابد شیکھری خود بھی موجود تھا۔ دونوں بحری جہاز بحیرۂ روم میں رواں دواں تھے، عابد شیکھری کا ارادہ پہلے تل ابیب کی بندرگاہ میں لنگرانداز

ہونے کا تھا مگر پھر کچھ وجوہ کی بنا پر جہاز حیفہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز کر دیے گئے۔ یہ سارا عمل خفیہ طور پر کیا گیا تھا اور مرحلہ وار جہازوں کو پہنچایا گیا تھا۔ ان میں ایک کارگو شپ اور دوسرا پسنجر تھا۔ فلسطینی مہاجر اپنے دیس میں آکر خوشی سے پھولے نہیں سمائے تھے۔ انہوں نے فوراً بندرگاہ سے اپنی عرب بستیوں کی طرف رخ کرنا شروع کر دیا۔

احسن الزہروی اور ابوجواد کے پانچ آدمیوں نے عابد شیکھری سے بھرپور تعاون کیا تھا اور کرتے بھی کیوں نا، اس لیے کہ عابد نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ان کے ادھورے مشن کو پورا کیا تھا۔ یہ پانچوں پی فرنٹ کے مجاہد تھے۔ عابد شیکھری نے وہاں ایک ہوٹل میں قیام کیا جس کا بندوبست احسن کے ساتھیوں نے ہی کیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اسے فوراً نکل جانے کا کہا تھا مگر عابد شیکھری حیفہ میں ہونے والی بین الاقوامی صحافتی بورڈ کی پریس کانفرنس میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ ہوٹل میں وہ کسی اور نام اور شناخت سے قیام پذیر تھا۔

البتہ اس کی حفاظت کے لیے احسن الزہروی کے دو ساتھی وہاں موجود تھے جس ہوٹل میں عابد شیکھری مقیم تھا، اس کے منیجر کے اسرائیلی انٹیلی جنس سے خفیہ تعلقات تھے جن کی طرف سے اسے سختی کے ساتھ ہدایت تھی کہ وہ باہر سے ہر آنے جانے والے آدمیوں پر نظر رکھے اور مطلع بھی کرتا رہے۔

عابد شیکھری کے سلسلے میں منان نے فوراً ایک انٹیلی جنس افسر سے رابطہ کیا اور اس کے دو آدمی بازک اور شعبان حرکت میں آگئے۔ دونوں نے فوراً مذکورہ ہوٹل کے ویٹر کا بھیس بھر لیا اور پہلے ایک نے عابد شیکھری کے کمرے تک رسائی حاصل کی اور دروازے پر دستک دی۔

اس وقت رات کے نو بجے کا وقت تھا۔ فضا میں ہلکی خنکی تھی اور ماحول میں عجیب سی اداسی۔ خاموشی طاری تھی۔ عابد شیکھری کے ساتھ مقیم دو فلسطینی محافظ میں سے ایک تو اس کے دوست کی حیثیت سے اس کے ساتھ ہی کمرے میں موجود تھا جبکہ دوسرے نے برابر والا کمرا لے رکھا تھا۔

دستک کی آواز پر اعیان نے دروازہ کھولا۔ عابد اس وقت بیڈ پر نیم دراز تھا۔

"سر! ڈنر کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ کھانا ادھر ہی کھائیں گے یا نیچے ڈائننگ ہال میں تشریف لائیں گے؟"

اعیان نے بہ غور ویٹر کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "ہم کھانا ادھر ہی کھائیں گے۔"

اس کے مختصر جواب پر ویٹر جو کہ درحقیقت اسرائیلی انٹیلی جنس کا ہی آدمی بازک تھا، اس قلیل وقفے میں اس کی عقابی نظروں نے اندر کمرے کا جائزہ لے لیا تھا اور عابد شیکھری کو بھی دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں مینیو رائٹنگ پیڈ اور ایک عدد پین تھا۔ جسے وہ عجیب انداز میں حرکت دے رہا تھا۔ فوراً مؤدبانہ بولا۔

"رائٹ سر۔" یہ کہنے کے بعد وہ الٹے پاؤں لوٹ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے پین کے کیپ میں ایک خفیہ مائیکرو واسائی کیپ نصب تھا جس کے ذریعے اس نے عابد شیکھری کی تصویر لے لی تھی۔ وہ تصویر اس وقت ہائی پروفائل سینڈنگ آپشن کے ذریعے ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر کے آبزرونگ سیل پہنچا دی گئی، جدھر تصویر کی ایک سپر کمپیوٹر میں اسکیننگ کی گئی تو عابد شیکھری کا سارا اصل نام پتا مع پورے بائیوڈیٹا کے اسکرین پر آ گیا۔ یہ سپر کمپیوٹر محض تصویر میں یہ بھی بتا دیتا تھا کہ یہ میک اپ میں ہے یا اپنے اصل روپ میں، تاہم عابد شیکھری نے کوئی میک اپ نہیں کیا تھا اور اپنی اصل شکل میں تھا صرف نام پتا اور شناخت غلط تھی۔

"اوہ.... تو یہ عابد شیکھری ہے۔ ڈیم اٹ، اس نے یقیناً وہ کام کر ڈالا ہوگا جسے سبوتاژ کرنے کے لیے ہم نے تین آدمیوں کا خونی دستہ قبرص کی بندرگاہ سیماسول روانہ کیا تھا۔" میجر ایہود شابک نے اپنی کرسی کے ہتھے پر غصے سے گھونسا مار کر کہا۔ اس نے فوراً اس کی رپورٹ اپنے چیف جنرل فرناش کو دی تو وہ بری طرح بگڑ گیا۔

"اسی وقت ہوٹل پورٹ لینڈ میں خفیہ ریڈ کرو اور عابد شیکھری کو گرفتار کر لو۔ اس کا جو بھی ساتھی ملے اسے بھی پکڑ لو۔" اس نے جوش غیظ سے تحکمانہ کہا تو میجر ایہود شابک نے کہا۔

"چیف! ابھی یہ کارروائی ہمارے مفاد میں نہیں ہوگی کیونکہ کل شہر کے سٹی ہال میں بین الاقوامی صحافی برادری کا اہم اجلاس ہو رہا ہے اور پریس کانفرنس بھی ہے اور شنید ہے کہ اسرائیلی حکومت اور خفیہ انٹیلی جنس ونگ کو وہاں شدید نکتہ چینی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے ابھی ہم عابد شیکھری کو صرف ریکنگ میں رکھتے ہیں۔"

اپنے نائب کی بات سن کر جنرل فرناش بے بسی سے تلملا کر رہ گیا۔ پھر بولا۔ "ٹھیک ہے مگر اب اس شخص کو ٹارگٹ کر لو اور اپنے دو جاسوس اس کے پیچھے لگا دو۔ اس کے علاوہ دو ٹاپ ایجنٹوں کو قبرص روانہ کر دو جو اس کی شپنگ کمپنی کو نظر میں رکھیں۔ مجھے اس کے ارادے بہت بلند اور

گہرے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔''
ابھی اس نے اپنی بات پوری کی تھی کہ اچانک موساد کے سیکنڈ ڈائریکٹر بارق شمعون کی فون کال اسے موصول ہوئی۔
''ابھی ابھی ہمارے انفارمیشن سیل کو یہ خفیہ اطلاع ملی ہے کہ حیفہ کی بندرگاہ پر قبرص سے آنے والے دو بحری جہاز لنگر انداز ہوئے تھے جن کا تعلق ''البحر'' جہاز راں کمپنی سے بتایا جاتا ہے ایک کارگو شپ اور پسنجر شپ کے ذریعے مسافروں اور عملے کے بہروپ میں ساڑھے سات سو فلسطینی مہاجروں کو یہاں لایا گیا ہے جو قبرص کے ریفیوجی کیمپ میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جنرل فرناش! یہ سب ہماری ناک کے نیچے ہوتا رہا اور ہم دیکھتے رہ گئے، کیوں؟''
بارق شمعون بے شک جنرل فرناش کے رینک سے نیچے تھا مگر اس کی حیثیت موساد میں سیکنڈ ڈائریکٹر کی تھی اور ڈیوڈ اسٹار کو بہرحال موساد کا ہی تابع بنایا ہوا تھا۔ اس لیے بہ وقت ضرورت جنرل فرناش کو جواب دہ ہونا پڑتا تھا مگر وہ بھی کم نہ تھا۔ کرخت سنجیدگی سے بولا۔ ''تم جانتے ہو ہم اس طرح کی انفارمیٹیو پالیسی کے زمرے میں بالکل نہیں آتے، یہ تمہارا کام تھا کہ ہمیں پہلے انفارم کرتے، ہمارا اصل کام کمانڈو اسالٹ ایکٹنگ ہے اور ہم اپنی یہ ذمے داری بہ حسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔''
جنرل فرناش کی بات پر موساد کے سیکنڈ ڈائریکٹر میجر بارق شمعون کو محتاط ہونا پڑا تاہم بولا۔ ''اٹس او کے، مگر ابھی فی الحال عابد شیکھری کے خلاف کوئی اسالٹ ایکشن نہیں ہونا چاہیے۔ کل کی بی آئی آر کانفرنس کے بعد کچھ سوچا جائے گا۔''
''ہم محتاط اور الرٹ ہیں اس سلسلے میں۔'' جنرل فرناش نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ اس کے بعد رابطہ منقطع ہوگیا۔

☆☆☆

شیماز یونیورسٹی کیمپس کے روم نمبر سیون میں خاصا جوش وخروش پایا جاتا تھا۔ پی ایل ایس او کے چاروں اہم ارکان محسن، جمال، زبیر اور باقر موجود تھے، انہیں آج ہی تھوڑی دیر پہلے ان کی نائب آرگنائزر لیلیٰ کے سلسلے میں پیغام ملا تھا اور یہ خفیہ پیغام پہنچانے والا ''الجہاد'' کا ایک جاسوس تھا۔ جسے زبیدہ نے بھیجا تھا۔ لیلیٰ کی خیریت کی خبر ملتے ہی ان چاروں کے حوصلے بلند ہوگئے تھے اور اب یہ لوگ اس سے ملنے کے لیے بیت صفانہ کی طرف روانہ ہونے والے تھے، ایک عرب بستی کے ہمدرد شیخ یعقوب نے انہیں

کترنیں

☆ ہر رشتہ معصوم پرندے کی طرح ہوتا ہے، اگر سختی سے پکڑو گے تو مر جائے گا اور اگر نرمی سے پکڑو گے تو اڑ جائے گا لیکن اگر محبت سے پکڑو گے تو ساری زندگی ساتھ نبھائے گا۔
☆ مور ناچتے ہوئے بھی روتا ہے اور ہنس مرتے ہوئے بھی گاتا ہے، یہی زندگی کا دستور ہے دکھ والی رات نیند نہیں آتی اور خوشی والی رات سویا نہیں جاتا۔
☆ ہر دشواری کے بعد آسانی ہے اور ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ بے شک ہماری تدبیر سے اللہ پاک کی حکمت بہت بلند اور اعلیٰ ہے۔
☆ اگر تم کسی کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاؤ تو یہ نہ سمجھنا وہ کتنا بے وقوف ہے، بلکہ یہ سوچنا اس کو تم پر اعتبار کتنا تھا؟

* * * *

ماں تجھے سلام

ایک کم سن بچہ اور اس کی ماں دریا پار کر رہے تھے، ماں نے کہا۔ ''بیٹا میرا ہاتھ پکڑ لو۔''
بیٹا بولا۔ ''نہیں ماں جی آپ میرا ہاتھ پکڑ لو۔''
ماں۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''
بیٹا۔ ''اگر میں آپ کا ہاتھ پکڑوں تو ہو سکتا ہے کہ میں آپ کا ہاتھ پکڑے نہ رکھ سکوں لیکن اگر آپ میرا ہاتھ پکڑیں گی تو مجھے یقین ہے آپ کبھی نہیں چھوڑیں گی۔''

* * * *

خلیل جبران

بعض لوگ خلوص کی تلاش میں بہتے دریاؤں اور بھرے چشموں کی طرف چلتے ہیں کہ شاید خلوص پانی کی وسعتوں میں مل جائے لیکن اتنا دور جانے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اپنے قریب آیئے، اتنا قریب کہ خلوص کے چراغ اپنی ذات کے اندر نظر آسکیں۔
مرسلہ۔ رضوان تنولی کریزوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

ذاتی استعمال کے لیے گاڑی دے رکھی تھی، یہ چاروں اس میں سوار ہو کے بیت صفانہ کی پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ روانہ ہوتے وقت انہوں نے اپنے تعاقب کا پورا خیال رکھا تھا۔ ان تینوں میں جو قدرے کم عمر تھا یعنی باقر، وہ کچھ زیادہ ہی پرجوش نظر آرہا تھا۔ ورنہ تو وہ لیلیٰ کی گمشدگی سے ازحد مایوس ہو کے بے قرار سا رہتا تھا۔ وہ لیلیٰ سے قلبی لگاؤ بھی رکھتا تھا۔ جس کا لیلیٰ کو علم نہ تھا، نہ ہی کبھی اس نے ایسا کوئی قلبی اظہار اس کے سامنے کرنے کی جرأت کی تھی۔ اس کی وجہ وہ احترام تھا جو پی ایل ایس او کے یہ چاروں خاص کارکن لیلیٰ کا کیا کرتے تھے۔

بیت صفانہ کی پہاڑیوں کے قریب ایک جگہ کار روک کر یہ لوگ اترے اور پیدل ہی آگے بڑھ کر ایک طے شدہ مطلوبہ مقام پر پہنچے تو جمال نے اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو اپنے منہ کے قریب کر کے کسی جانور سے ملتی جلتی آواز نکالی۔ ہر طرف خاموشی چھائی رہی۔ کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ ایک اداس سی شام بیت صفانہ کی پہاڑیوں میں اتری ہوئی تھی، جمال نے دوسری بار یہی آواز نکالی تو ایک طرف سے الو کے بولنے کی آواز ابھری، چاروں محتاط ہو گئے۔ پھر ذرا ہی دیر گزری تھی کہ چند سائے متحرک نظر آئے۔ یہاں اسرائیلی انٹیلی جنس کے جاسوس بھی بکھرے ہوئے تھے۔ اس لیے احتیاط کا دامن تھامے رکھتے ہوئے، جمال نے بہ آواز بلند ایک کوڈ ورڈ دہرایا۔ پھر تسلی بخش جواب ملتے ہی چاروں ان متحرک ہیولوں کی طرف بڑھ گئے۔ وہ تعداد میں تین تھے، چست لباس اور چہروں پر نقاب، یہ الجاہد کے کارکن اور زبیدہ کے ساتھی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید اسلحہ نظر آتا تھا۔

وہ سب مصافحہ کرنے کے بعد ایک طرف کو محتاط روی کے ساتھ چل پڑے۔ اونچے نیچے پتھریلے راستوں اور اندھی گھاٹیوں کو عبور کرنے کے بعد یہ ایک غار کے دہانے پر پہنچ کر رک گئے۔ یہاں مشعلیں روشن تھیں۔ کچھ مسلح افراد بھی تھے، اشارہ ملتے ہی صرف ایک آدمی ان چاروں کو اپنے ساتھ لے کر غار میں اتر گیا۔

باہر سے غار کا دہانہ جس قدر تنگ تھا اندر سے اس کا خلا اسی قدر وسیع تھا یہاں بھی چند مسلح اور مستعد محافظ کھڑے دکھائی دیے۔ یہ لوگ ایک موڑ کاٹ کے جس گوشے میں پہنچ کر رکے اس کے آمنے سامنے کی ناہموار پتھریلی دیواروں سے بھی دو گپھائیں جھانک رہی تھیں۔ ان کے اندر روشنی ہو رہی تھی، مگر انہیں ادھر ہی ایک مرگ چھالا پر بٹھا دیا گیا۔

چاروں دائرے کی صورت میں بیٹھ گئے۔ انہیں قہوہ پیش کیا گیا اور کچھ کھجوریں، ذرا ہی دیر بعد ایک گپھا سے دو خواتین برآمد ہوئیں۔ اپنی نائب آرگنائزر لیلیٰ کو پہچان کر چاروں فوراً ازراہِ احترام اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ اپنی آرگنائزر لیلیٰ کو پہچان چکے تھے جبکہ دوسری نسبتاً دبنگ نظر آنے والی خاتون...... زبیدہ کو غائبانہ طور پر بھی سمجھ گئے کہ وہ الجاہد کی سربراہ ہو سکتی تھی۔

پرتپاک اور گرم جوشی کے اظہار کے علاوہ باقر کے دل میں لیلیٰ کے لیے انسیت کے دیپ یکایک جل پڑے تھے۔ وہ بڑے غور سے لیلیٰ کے خوب رو اور دلکش چہرے کو تکتے رہنے کے بعد اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح نظریں جھکا کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ لیلیٰ نے زبیدہ کا تعارف کرا دیا۔ وہ کچھ مغموم اور افسردہ سی نظر آرہی تھی، اس کی وجہ یہی تھی کہ الجاہد کے کسی مخبر نے انہیں پی ایل ایس او کے آرگنائزر قیصرالخلیلی کی موساد کے ٹارچر سیل میں میجر بارق شمعون کے ہاتھوں شہادت کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا جبکہ پی فرنٹ کے رہنما کی ڈیوڈ اسٹار کے خونی دستے کی کارروائی میں شہادت کے بارے میں تو یہ سب ہی واقف تھے، اس خونی دستے کے آپریشن ایکشن اسالٹ کا ماسٹر مائنڈ ایہود شابک تھا۔

اپنے آرگنائزر قیصرالخلیلی کی شہادت کا سن کر پی ایل ایس او کے چاروں ارکان محسن، جمال، زبیر اور باقر مغموم ہو گئے۔ ان کے بشروں سے غم و غصے کا اظہار ہونے لگا جبکہ محسن اپنے جوشِ غیظ پر قابو نہ پا سکا اور سلگتے جلتے لہجے میں بولا۔

''موساد اور بالخصوص ڈیوڈ اسٹار کی چیرہ دستیاں بڑھتی جارہی ہیں مگر افسوس کہ ہم ابھی تک انہیں کوئی سبق نہیں سکھا سکے۔''

''محسن بھائی کا کہنا ٹھیک ہے۔'' جمال نے اس کی تائید میں کہا۔ ''اس طرح کی مذموم کارروائیوں کی کامیابیاں ہمارے دشمنوں کو مزید ظلم پر ابھاریں گی، ہمیں ان کا منہ توڑ جواب دینا ہوگا۔''

''تم کیا سمجھ رہے ہو نوجوان! ہم یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں؟'' زبیدہ نے تیز نگاہوں سے محسن اور جمال کو دیکھتے ہوئے کہا۔ تو زبیر نے فوراً اپنے ساتھیوں کی مدافعت میں زبیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ اس کے ساتھیوں کا مطلب یہ نہیں تھا۔ درحقیقت......

''میں ان کے جذبات سمجھ رہی ہوں۔'' زبیدہ نے زبیر کی بات کاٹ کر ملائمت آمیزی سے کہا۔ ''بلکہ مجھے خوشی

ہے کہ ہماری طرح ان کے سینوں میں بھی صیہونی چنگیزیت کے خلاف آگ بھڑک رہی ہے۔ تم لوگوں کو یہاں بلانے کا مقصد محض لیلیٰ کی خیر و عافیت نہیں تھا بلکہ ہم مشترکہ طور پر ایک پلان بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے موساد اور ڈیوڈ اسٹار مشترکہ طور پر ایک مربوط منصوبہ بندیوں میں ہمارے خلاف مصروف کار رہتے ہیں۔ میری الجاہد تنظیم ہی نہیں بلکہ پی فرنٹ کے رہنما جناب صادق الخیری شہید بھی تم لوگوں سے از حد متاثر تھے۔ تمہارے آرگنائزر شہید قیصر الخلیلی اور اس دلیر مجاہدہ لیلیٰ.....'' زبیدہ نے اپنے قریب بیٹھی لیلیٰ کی طرف اشارہ کیا۔

''ان دونوں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر اسرائیل کا ایک نیا نیوکلیئر پلانٹ جہاں یورینیم کی افزودگی اور سینٹری فیوج کی جائے گی پتا لگایا۔ بہ ظاہر وہاں یروشلم کا بجلی گھر تعمیر کیے جانے کا منصوبہ دنیا دکھاوے کے لیے بتایا جا رہا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ اس گھناؤنی سازش تلے یہودی اپنا گریٹر اسرائیل کا پرانا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتے ہیں اور عرب دنیا پر بہ جبر و زور حکمرانی کرنے کا سودا رکھے ہوئے ہیں۔ مگر قیصر الخلیلی اور لیلیٰ نے ان کی مذموم سازش بے نقاب کر ڈالی جس کے نتیجے میں لیلیٰ کو دربدری اور قیصر الخلیلی کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔''

وہ ذرا خاموش ہوئی تو باتر نے پرعزم اور پرجوش ہو کے کہا۔ ''ہم ان کی عظیم قربانی کو ضائع نہیں جانے دیں گے، عزیزی زبیدہ! اس پلانٹ کو تباہ کرنے کے سلسلے میں اگر آپ کے ذہن میں کوئی لائحہ عمل ہے تو ہمیں بتائیں۔''

زبیدہ نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔ تاہم اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لیلیٰ نے لب کشائی کی۔

''اس یورینیم پلانٹ کی تباہی کا بنیادی طور پر منصوبہ میں اور شہید قیصر الخلیلی بنا چکے تھے، آخری جزئیات پر غور کرنا باقی تھا کہ اسرائیلی انٹیلی جنس کو اس کی بھنک پڑ گئی۔ وہ ہماری پکڑ دھکڑ کے لیے فوراً حرکت میں آ گئے۔ میں خود ایک غدار کے ہاتھوں موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچی ہوں لیکن اب ہم اور زبیدہ بہن ایک حتمی اور مربوط لائحہ عمل ترتیب دے چکے ہیں بلکہ آج رات ہی اس پر عمل پیرا ہونے کی بھی ٹھان چکے ہیں۔'' اپنی نائب آرگنائزر کی اس بات پر چاروں کے چہرے جوش سے چمکنے لگے تھے۔

☆☆☆

انگلے دن صبح کو عابد شیکھری تیار ہو گے اپنے دونوں محافظ ساتھیوں اعیان اور خالد کے ہمراہ...... حیفہ کے سٹی ہال پہنچا۔ اعیان اور خالد جن کا تعلق پی فرنٹ سے تھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ ادھر اسرائیلی انٹیلی جنس کے آدمی بھی مختلف بھیس میں موجود ہو سکتے تھے، اس لیے وہ دونوں بھی محتاط تھے۔ سٹی ہال میں خاصی گہما گہمی دیکھنے میں آ رہی تھی۔ مختلف ممالک کے ٹاپ پروفیشنل رپورٹرز موجود تھے، اور تند و تیز سوالات کی بوچھاڑ کے لیے بے چین اور پرجوش نظر آ رہے تھے۔ سٹی ہال میں اسرائیلی حکومت کے وزیراعظم اور اس کے سیکیورٹی ایڈوائزر لیفٹیننٹ کرنل پریسلو بھی شامل تھے جبکہ تل ابیب کا یہودی کمشنر...... بھی موجود تھا۔ نیز وزارت

اہل علم اہل دولت سے افضل ہیں

مصر کے امیر کے دو بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک نے علم حاصل کیا جبکہ دوسرے نے مال و دنیا سمیٹی۔ علم والا بھائی عالم ہوا۔ اور لوگوں کی نظر میں صاحب عزت و احترام بھی جبکہ مال و دولت کا مالک دوسرا بھائی مصر کے بادشاہ کا وزیر بن گیا تھا۔ مال و دولت رکھنے والا بھائی اپنی دولت اور وزارت کے نشے میں چور عالم بھائی کو حقارت و نفرت سے دیکھتا تھا۔ وزیر نے ایک روز دوسرے بھائی کو حقارت سے کہا کہ میں وزیر بن گیا ہوں اور تو فقیر کا فقیر ہی رہا۔ غریب مگر عالم بھائی نے امیر بھائی کو جواب دیا۔

میرے بھائی اللہ کا مجھ پر بڑا کرم ہے جس کا مجھے ہر دم شکرگزار ہونا چاہیے اس لیے کہ میں نے علم حاصل کیا جو پیغمبروں کی میراث ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میں تو اس چیونٹی کی مانند ہوں جسے راہ گزر پاؤں تلے مسل کر گزر جاتے ہیں، شکر ہے میں وہ بھڑ نہیں ہوں جس کے ڈنک مارنے سے لوگ چیخنے چلانے لگیں۔ میں اللہ کی عطا کردہ اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا۔ مجھ میں لوگوں کو ستانے کی قوت ہے نہ دنیاوی منصب...... اب یہ فیصلہ تجھے کرنا ہے کہ تو فائدے میں رہا یا تیرا یہ غریب بھائی۔

ڈاکٹر تصدق حسین کی کتاب ''حکایات مولانا رومیؒ و سعدیؒ'' سے اقتباس

دفاع کے کچھ اہم عہدے دار بھی موجود تھے۔ اسرائیلی انٹیلی جنس کا سربراہ بھی موجود تھا۔

نائمہ رافیہ پوری تیاریوں کے ساتھ آئی تھی اور سب سے پہلے اس کی متلاشی نظریں ہال میں تیزی سے گردش کرتی ہوئی عابد شکیکھری پر جا ٹھہریں اور اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلا دیا۔

کانفرنس کے شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ نائمہ رافیہ بڑی گرم جوشی کے ساتھ عابد شکیکھری سے ملی تھی، ایک خاتون رپورٹر کو شناسا انداز کی ملاقات کرتے پا کر اعیان اور خالد دانستہ عابد شکیکھری سے دور دائیں بائیں کھسک گئے تھے تاہم انہوں نے چوکس انداز میں اس پر نظریں رکھی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی وہ محتاط نظروں سے گرد و پیش کا بھی جائزہ لے رہے تھے۔ سٹی ہال میں ان کی شرکت نائمہ رافیہ کے تعلقات کا نتیجہ تھی۔

کانفرنس شروع ہوگئی اور صحافیوں نے اسرائیل کے سربرآوردہ اور مقتدر شخصیات کو اپنے تیز و تند سوالوں کی بوچھاڑ کے ذریعے خوب لتاڑا حتیٰ کہ ان سے کوئی جواب ہی نہیں بن پڑا۔ اگرچہ بین الاقوامی صحافتی بورڈ میں کچھ یہودی نواز "زرد صحافی" بھی موجود تھے اور وہ دانستہ ایسے "غیر متعلق" سوالات کرنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ یہودی مقتدرہ کو اپنے "دفاع" کا موقع مل سکے مگر انہیں بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

سوالوں کا لب لباب تیونس آپریشن کے دوران پی فرنٹ کے رہنما صادق الخیری کی شہادت، فلسطینی عرب بستیوں میں اسرائیلی فوج کی وحشیانہ گولہ باری اور دیگر برننگ ایشوز پر تھا۔ اس کانفرنس کی باقاعدہ لائیو کوریج ہو رہی تھی، اسرائیل کو عالمی سطح پر سخت سبکی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اصل دھماکا تو نائمہ رافیہ کے سوالات نے کیا تھا، اور اس کے آخری سوال پر تو جیسے یہودی مقتدرہ کو سانپ ہی سونگھ گیا تھا جب نائمہ رافیہ نے قبرص میں مقیم دو جلا وطن فلسطینی آفیسرز کے قتل کا ایشو اٹھایا۔

ادھر موساد کے ہیڈ کوارٹر میں سیکنڈ ڈائریکٹر میجر بارق شمعون "وار روم" میں بیٹھا لمبی چوڑی ٹی وی اسکرین پر اس دھواں دھار پریس کانفرنس کی کارروائی دیکھ کر اندر ہی اندر بری طرح سلگ رہا تھا۔ حتیٰ کہ غصے اور طیش میں آ کر اس نے ایک مکروہ چیخ مار کے ہاتھ میں جو شے سمائی وہ ہی .... ٹی وی اسکرین پر دے ماری۔ اسکرین پر جھماکے ہوئے اور پھر کچھ نہ ہوا۔ تصویر ٹھیک ہوگئی اور اجلاس کی کارروائی ایک بار پھر اس کا منہ چڑانے لگی۔ پل کے پل اس نے ایک بھیانک اور سفاکانہ فیصلہ کیا اور فوراً ویڈیو اسٹار کے جنرل فرناش سے رابطہ کر ڈالا۔

"دیکھ رہے ہو یہ جنرل فرناش؟" اس کا لہجہ غراہٹ سے مشابہ تھا۔

"ہاں، سب دیکھ رہا ہوں میں بھی۔ یہ کانفرنس ہونا ہی نہیں چاہیے تھی، جس کے بارے میں ہمیں پہلے اندازہ تھا کہ پوری دنیا میں ہمارے بدنامی ہوگی۔" دوسری طرف سے جنرل فرناش کی بلکتی ہوئی سی آواز ابھری۔

"اس کانفرنس سے ہم نہیں بچ سکتے تھے۔ ورنہ اس سے زیادہ اور بغیر کسی ابہام کے بدنامی کا سامنا کرنا پڑتا ہمیں۔" میجر بارق شمعون دانت پیس کر بولا۔

"کانفرنس شروع کرنے کے تھوڑی دیر بعد بم کے دھماکے کر کے سب کچھ منتشر کر دیتے اور اس کی ذمہ داری حریت پسندوں پر ڈال دیتے۔" جنرل فرناش نے بعد از وقت مشورہ دیا تو شمعون نے جھلا کر کہا۔

"یہ خیال تو ہمیں بھی آیا تھا مگر سپیریئر اتھارٹیز نے اسے رد کر دیا تھا کیونکہ یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ یہ کانفرنس کس نوعیت کی ہوگی اور کس کی حمایت میں اور اسے سبوتاژ کرنے والے کون ہو سکتے ہیں۔"

"تو پھر اب لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں، مسٹر بارق شمعون!" جنرل فرناش نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

"سائپرس سے آئی ہوئی اس خاتون رپورٹر نائمہ رافیہ اور عابد شکیکھری کو ٹارگٹ کرو۔ یہ دونوں ہمارے منہ پر ملی ہوئی کالک کو دھوڈالنے کا سبب بن سکتے ہیں۔" جنرل فرناش نے مکاری سے کہا اس کے پتلے پتلے بدہیئت ہونٹوں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ تھی۔

"اس وقت ہم ان کے کسی کتے کو بھی ٹارگٹ نہیں کر سکتے، ورنہ ہمارے منہ پر ملی ہوئی کالک اور گہری ہو جائے گی۔" میجر شمعون بری طرح جھلایا ہوا تھا۔ تیونس آپریشن اسالٹ ایکشن کے ماسٹر مائنڈ ہونے کی سزا اسے اس وقت اس کے اپنے ملک اسرائیل ہی کی نہیں بلکہ اپنی پوری یہودی قوم کی بدنامی کی صورت میں مل رہی تھی۔ اس لیے وہ زیادہ جھلایا اور بوکھلایا ہوا تھا۔ یہی حال جنرل فرناش کا بھی تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے اپنے اور اپنی قوم کے منہ پر لگی سیاہی کو اسی سیاہی سے دھونے کا ایک شرمناک اور مکروہ منصوبہ بنا لیا تھا لہٰذا اپنی بات کی وضاحت میں بولا۔

"تم میری بات کا مطلب نہیں سمجھے ایہود! میں اس بین الاقوامی صحافتی بورڈ کے منہ پر وہی کالک ملنا چاہتا

ہوں جو انہوں نے ہمارے سپرد کی ہے۔"

"کہتے رہو، فرناش! میں سن رہا ہوں۔" شمعون بولا۔

"اس وقت ٹی وی تم بھی دیکھ رہے ہو اور میں بھی...... نائمہ اور عابد شنکھری کا آپس میں گہرے تعلق کا ہمیں پتا چلا ہے اور اب اندازہ بھی ہو رہا ہے۔ زندہ تو ہم دونوں کو نہیں چھوڑیں گے کسی حادثاتی موت سے دونوں کو ہمکنار کریں گے، نائمہ کا پورا بائیو ڈیٹا ہمارے پاس ہے۔ یہ لبنانی نژاد رپورٹر ضرور ہے مگر اس کے والدین فلسطینی تھے جو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ لڑکی ایک کاز کے تحت ہمارے خلاف عرصے سے میدان صحافت میں اپنے قلم کے ذریعے مہم میں مصروف ہے اور حیفہ میں صحافتی بورڈ قائم کرنے میں اس کی کوششوں کا دخل ہے اور یہ کانفرنس بھی اسی کی وجہ سے منعقد ہوئی ہے۔ میرے آدمی دونوں کی ریکی کر رہے ہیں۔ کانفرنس کے بعد نائمہ اور شنکھری کی ملاقات لازمی ہوگی، دونوں کو بے ہوش کر کے ہوٹل پورٹ لینڈ کے کمرے میں دونوں کی نیوڈ تصویر اتاریں گے جس میں دونوں کو بوس و کنار اور شراب پیتے ہوئے دکھانا ہوگا اس کے بعد ان کی شرمناکی آشکار کر دیں گے اور دنیا کو دکھا دیں گے کہ دوسروں پر نکتہ چینی کرنے والے خود کیا ہیں۔ کیا کہتے ہو اس منصوبے کے بارے میں؟"

جنرل فرناش نے خبیثانہ لہجے میں کہا تو بارق شمعون کا چہرہ مسرت سے جل اٹھا اور وہ اسی لہجے میں بولا۔ "فرناش! اگر یہ کام تم نے کر ڈالا تو یقین کرو تم پوری قوم کے ہیرو بن جاؤ گے اور کچھ نہیں تو دنیا میں ہماری بدنامی زبردست ابہام کا شکار ہو جائے گی پھر ہمیں بھی بولنے کا موقع مل جائے گا اور ہم بہ آسانی اس کانفرنس کو صیہونیت دشمن سازش قرار دے سکتے ہیں مگر یہ سب ہوگا کیسے؟ میرا مطلب ہے بے ہوشی کی حالت میں بوس و کنار پھر نیوڈ تصاویر؟"

"یہ سب ہمارے کیمرا ایکسپرٹ بہ آسانی انجام دے لیں گے، آج کل کمپیوٹر کی وجہ سے کیمرا فیلڈ گرافی بہت ایڈوانس اور فاسٹ ہوگئی ہے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔" جنرل فرناش بولا۔

"فوراً عمل کر ڈالو۔ اس سے پہلے کہ یہ لوگ تل ابیب، حیفہ سے نکل جائیں۔" شمعون جوشِ مسرت سے تقریباً چیخ کر بولا تو جنرل فرناز بولا۔

"آگے کا منصوبہ بھی سن لو، جو اس کی آخری کڑی ہوگی۔"

"وہ کیا؟"

"ان دونوں کی موت۔"

گھن چکر

کتنا عجیب چکر ہے چوہا بلی سے ڈرتا ہے اور بلی کتے سے۔

کتا بھیڑیے سے ڈرتا ہے اور بھیڑیا چیتے سے
چیتا شیر سے ڈرتا ہے اور شیر ہاتھی سے
ہاتھی آدمی سے ڈرتا ہے اور آدمی بیوی سے
اور بیوی چوہے سے......

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

"وہ تو ان دونوں کا مقدر ہوگی۔" میجر شمعون نفرت خیز لہجے میں بولا۔ "مناسب سمجھو تو بتادو، وہ کس طرح ہوگی؟"

"جس جہاز میں یہ سفر کریں گے اس میں خرابی کر ڈالیں گے۔ سردست انہیں ختم کرنے کا یہی منصوبہ ذہن میں آتا ہے۔ بصورت دیگر یہ کام ان دونوں کے سائپرس پہنچنے کے بعد بھی ہوسکتا ہے۔"

"مگر نیوڈ تصویروں والا کام حیفہ میں ہی ہونا چاہیے...... یعنی ہوٹل پورٹ لینڈ میں۔"

"وہ تو ظاہر ہے، یہ فریضہ تو دونوں سے پہلے ادھر دلوائیں گے۔ موت ان کی ہماری سرزمین پر نہیں ہونی چاہیے۔"

"گڈ لک جنرل فرناش! میں اس خوش خبری کا بے چینی سے منتظر رہوں گا۔"

"گڈ بائے۔"

☆☆☆

نائمہ رافیہ اور عابد شنکھری اس مکروہ صیہونی سازش سے بے خبر بڑے شاداں و فرحاں سٹی ہال کی لابی میں بیٹھے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ نائمہ بار بار شنکھری کے اس اقدام کی تعریفیں کر رہی تھی جو اس نے قبرص میں مقیم ساڑھے سات سو جلاوطن فلسطینیوں کو دوبارہ ان کے وطن لاکر بسایا تھا مگر وہ اسے بار بار محتاط رہنے کا بھی اشارہ دے رہی تھی۔ پی فرنٹ کے صادق الخیری کی شہادت کے بعد یہودیوں کا خیال تھا کہ اب یہ حریت پسند تنظیم انتشار یا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گی، اگرچہ عارضی طور پر ایسا ہوتا نظر بھی آرہا تھا مگر یہ ان کی ایک مصلحت تھی چونکہ جلاوطن فلسطینیوں کی واپسی کے سلسلے میں پی فرنٹ زیادہ متحرک تھی اور وہی عابد شنکھری کو سپورٹ بھی کر رہی تھی، اس وقت بھی اس کے پانچ محافظ عابد شنکھری کی حفاظت پر مامور تھے جبکہ دو ساتھی اعیان اور خالد سائے کی طرح اس کے ساتھ

تھے۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ اب عابد شکھری اور نائمہ رانیہ کو جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے مگر نائمہ ابھی کچھ رپورٹنگ کرنے کے موڈ میں تھی۔ عابد نے بھی اپنی اس دیرینہ خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اس کا کام دیکھنے کی تمنا رکھتا ہے۔

سٹی ہال سے تھوڑی دیر بعد دونوں روانہ ہو گئے اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل پورٹ لینڈ آ گئے۔ یہ ایک جدید طرز کا ہوٹل تھا جو ساحل کے قریب واقع تھا۔ وہاں عابد نے نائمہ کو شاندار لنچ کی دعوت دی تھی جو اس نے مسکراتے ہوئے قبول کر لی۔

دونوں ڈائننگ ہال کے ایک ایسے گوشے میں دو میز کرسیوں پر موجود تھے جو کھڑکی کے قریب دھری تھیں۔ یہاں سے حیفہ کی بندرگاہ اور ساحل سمندر کا منظر نظر آتا تھا۔ جس کے اوپر نیلا شفاف آسمان پھیلا ہوا تھا اور روئی کے سفید گالوں جیسے بادل کے ٹکڑے تیرتے پھر رہے تھے۔ سفید اور لمبی زرد ٹانگوں اور سرخ لمبی چونچوں والے آبی پرندوں کی قیں قیں...... سمندری موجوں کے شور میں مدغم ہو کر عجیب سا تاثر پیش کر رہی تھیں۔ موجوں کا ساز بہت رومینٹک تھا جو سماعتوں کو بھلا محسوس ہوتا تھا۔

دونوں لنچ کے دوران باتیں بھی کر رہے تھے۔ دونوں کی گفتگو کا زیادہ تر تعلق ایک دوسرے کے کاموں کی تعریف رہا۔ تاہم عابد سے نائمہ نے پوچھ لیا۔

''آپ کب تک یہاں مقیم ہیں؟'' جواباً عابد شکھری نے کھڑکی سے باہر کے دلفریب اجلے اجلے منظر پر ایک نگاہ ڈالی اور نائمہ سے بولا۔

''شاید آج ہی رات لوٹ جاؤں یا پھر صبح۔''

''آپ کے دونوں جہاز ابھی تک جیٹی پر ہیں؟'' نائمہ نے پوچھا۔ جس پر عابد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ایک کارگوشپ تو آج صبح ہی روانہ ہو چکا ہے۔ دوسرا ابھی لنگر انداز ہے۔ وہ آج رات کو روانہ ہو گا، ارادہ تو میرا بھی اس میں واپسی کا ہے لیکن میں ابھی دو تین روز مزید یہاں رہنا چاہتا ہوں۔''

اس کی بات سن کر نائمہ نے گہری نگاہوں سے عابد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اسے یہ نوجوان پہلی ہی ملاقات سے متاثر کن لگا تھا۔ پھر جب اس نے دوسری ملاقات اس کے دفتر میں کی جو قدرے تفصیلی بھی تھی تو اس کے اسرائیلیوں کے خلاف اور مظلوم فلسطینیوں کی حمایت میں خیالات جان کر نائمہ کو عابد کی شخصیت میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی طرح وہ بھی ایک نیک اور اہم کام پر کمر بستہ تھا۔ پھر جب نائمہ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ عابد شکھری نے بڑی کامیابی اور مستعدی سے اپنا مشن مکمل کیا تھا کہ اسرائیلی انٹیلی جنس والے ہاتھ ملتے رہ گئے تھے اور ایسے میں بین الاقوامی پریس کانفرنس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر ڈالی اور اس طرح اسرائیلیوں کو کسی فوری مہم جوئی کا موقع ہی نہ مل سکا تھا مگر نائمہ جانتی تھی کہ ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔ اسرائیلی انٹیلی جنس کو ضرور اس کی بھنک پڑ چکی تھی، یہی سبب تھا کہ نائمہ کو عابد کی طرف سے تشویش آمیز فکر لاحق تھی اور وہ چاہتی تھی کہ عابد جلد از جلد واپس لوٹ جائے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جب وہ اس کے ساتھ ہے، اسرائیلی انٹیلی جنس عابد پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرے گی اور بعید نہیں تھا کہ اس وقت عابد اور وہ خود ان کی نظروں میں بھی ہوں۔ اس لیے وہ کسی ایسی گفتگو سے اجتناب ہی برت رہی تھی جبکہ حقیقت بھی یہی تھی۔ جس میز پر وہ دونوں لنچ اور باتوں میں مصروف تھے وہ ''بگڈ'' تھی۔ ایک چھوٹا بٹن کی ساخت جیسا مائیکرو ڈکٹا فون ان کی میز کی نچلی سطح پر چسپاں کیا جا چکا تھا اور یہ فریضہ ویٹر کے بھیس میں بازک اس وقت انجام دے چکا تھا جب وہ ان کی میز پر کھانا سرو کر رہا تھا۔ اگرچہ عابد کو اس ویٹر پر حیرت ہوئی تھی کہ وہ ڈائننگ ہال میں بھی اس کی ''خدمت'' کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے رہا تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ اس میں ویٹر کا ''تگڑی ٹپ'' ملنے کا لالچ شامل ہو۔

''میں آپ کو یہی مشورہ دوں گی کہ آپ جتنی جلدی ہو سکے تل ابیب کو چھوڑ دیں۔'' نائمہ نے ہولے سے کہا۔ وہ کھانا ختم کر چکے تھے۔ عابد شکھری نے مسکرا کر اس کے اجلے چہرے کی طرف دیکھا پھر اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا۔ وہ باقاعدہ سگریٹ نوش نہیں تھا مگر کبھی کبھی پی لیا کرتا تھا۔ وہ بھی پوری نہیں، نصف سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا کرتا تھا۔ سگریٹ سلگا کر اس نے ایک گہرا کش لیا پھر نائمہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''آپ میری فکر نہ کرو، دیکھا جائے تو ہم دونوں ہی خطرے کی ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ انجانے خطرات کی زد میں تم بھی ہو مگر میں اپنے مسلم فلسطینی مظلوم بھائیوں کی مدد سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ بہت جلد میں ایک اور کھیپ یہاں پہنچانے والا ہوں۔'' نائمہ اس کی بات سن کر ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ تاہم بولی۔

''مجھے خوشی ہوئی، عابد! آپ کے جذبات قابل قدر ہیں۔ میں خود بھی یہی کچھ کر رہی ہوں۔ اپنے فلسطینی مظلوم

بھائیوں کا آخری دم تک ساتھ دوں گی مگر ہمیں دامن بچا کر کام کرنا پڑتا ہے۔ ایک شیلٹر ایک پروٹیکشن کے ساتھ...... جو کم از کم مجھے حاصل ہے۔ مگر آپ کو نہیں۔"

عابد نے مسکرا کر ایک گہرا کش لیا اور کھلی کھڑکی کی طرف منہ کر کے اگل دیا اور بولا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ میرے ساتھ کسی کی سپورٹ نہیں۔ کوئی میرے تحفظ کا ذمہ دار نہیں۔ یہ تمہاری بھول ہے مس نائمہ۔ میرے ساتھ اس دنیا کی اس کائنات کے سب سے بڑے رکھوالے کی سپورٹ ہے اور وہ اللہ ہے، وہی میرے لیے کافی ہے۔"

اس کی بات پر نائمہ بے اختیار ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ عابد شیکھری کی انگلیوں میں دبا سگریٹ نصف ہو چکا تھا۔ اس نے عادتاً ایک آخری کش لے کر اسے ایش ٹرے میں مسل دیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ خاتون رپورٹر اس کے بارے میں کچھ زیادہ متفکر ہو رہی ہے کیوں؟ اس میں کون سا جذبہ کارفرما تھا؟ اہمیت کا...... یا پھر انسیت کا؟ ممکن ہو اس سے بھی کچھ آگے کا...... مگر کیا؟

عابد اس سے آگے سوچنے کی کوشش کرتا تو بہت کچھ سمجھ سکتا تھا، مگر وہ آگے کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی سوچنا۔ بات بدلنے کی غرض سے اس نے نائمہ سے کہا۔ "آپ کتنے دن یہاں قیام کریں گی؟" نائمہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ قدرے چونک کر بولی۔ "ہاں، میں ابھی کچھ دن ادھر ہی ہوں۔ ہماری ٹیم کچھ عرب بستیوں کا دورہ کرنا چاہتی ہے۔ ہمارا قیام اسی ہوٹل کی دوسری منزل پر ہے۔" پھر قدرے توقف کے بعد دوبارہ اس نے اپنی بات دہرائی۔

"عابد صاحب! میں آپ سے پھر یہی کہوں گی آپ کا مشن پورا ہو گیا آپ پلیز آج ہی واپس لوٹ جائیے۔"

"ہاں، شاید مجھے لوٹ جانا ہی چاہیے۔" بالآخر عابد نے ہولے سے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

ان کی میز سے کچھ فاصلے پر ایک دوسرے ویٹر کے بھیس میں کھڑے بازک کے دوسرے ساتھی شہان نے ان دونوں کو اپنی عقابی نظروں میں لے رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب تھوڑی دیر بعد کیا ہونے والا تھا اور اس نے اپنے ساتھی بازک کے ساتھ مل کر کیا کرنا تھا جبکہ وہ خود اس بات سے بے خبر تھے کہ پی فرنٹ کے دو حریت پسند مخبر پہلے ہی نائمہ اور عابد پر حفاظتی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

ادھر نائمہ اور عابد لنچ سے فارغ ہو کے اٹھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ نائمہ کو چکر سا آ گیا۔ وہ گرتے گرتے کرسی کا سہارا لینے لگی مگر کامیاب نہ ہو سکی، تو عابد نے فوراً بڑھ کر اس کے جھولتے ڈولتے نازک اندام جسم کو تھام لیا۔ اس کے چہرے پر تشویش پھیل گئی۔ اس نے چلا کر مدد کے لیے کسی کو پکارا تو وہی ویٹر بازک اس کی جانب تیزی سے بڑھا۔ نائمہ ابھی تک بے ہوشی کے عالم میں تھی۔

"ڈاکٹر کو فوراً فون کرو جلدی۔" عابد نے چلا کر ویٹر سے کہا تو اس اثنا میں بازک کا دوسرا ساتھی وہاں آن دھمکا اور عابد سے مؤدبانہ بولا۔ "سر ہم ابھی میڈیکل یونٹ سے رابطہ کرتے ہیں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔" پھر وہ اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر آنکھ سے مخصوص اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"میڈم کو عابد صاحب کے کمرے میں لے جاؤ، میں ابھی میڈیکل یونٹ کو لے کر پہنچتا ہوں......" بازک اپنے ساتھی کا اشارہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا۔ سب کچھ طے شدہ پروگرام کے تحت ہو رہا تھا۔ عابد خود پریشان تھا۔ اس نے نیم بے ہوش سی نائمہ کو تھام رکھا تھا۔ پھر ویٹر بازک کی مدد سے وہ اسے لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ ادھر پی فرنٹ کے اعیان نے یہ سب دیکھ لیا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی خالد ہوٹل کے گیٹ کی طرف منڈلا رہا تھا۔ اسے ابھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ اعیان حرکت میں آ گیا، وہ ان کے پیچھے چل پڑا۔ وہ چونکا ہوا تو تھا پہلے سے ہی اس لیے اسے کسی سازش کی بو محسوس ہونے لگی۔

کمرے میں آتے ہی جب عابد شیکھری نے نائمہ کو بیڈ پر لٹایا اور جب سیدھا ہوا تو بازک تب تک نہایت چابک دستی کے ساتھ بھاری اور کند دستے والا پستول نکال چکا تھا۔ اس نے پھرتی سے دستے کا وار عابد شیکھری کے سر کے پچھلے حصے پر کیا۔ عابد کب اس صورت حال کے لیے تیار تھا، نیچتا مار کھا گیا اور تیورا کر نائمہ ہی کے قریب بیڈ پر گر گیا۔ بازک دونوں کو بیڈ پر آڑھا ترچھا پڑے دیکھ کر مکروہ انداز میں مسکرا کر خود کلامیہ بڑبڑایا۔

"اب تم دونوں کی آنکھیں تب ہی کھلیں گی جب دنیا بھر کے ٹی وی چینلز تمہاری برہنہ تصویروں کی خبر نشر کریں گے۔"

اس نے اپنے شرٹ کے کالر کو چھوا جدھر ایک جدید ...... خفیہ ٹرانسمیٹر نصب تھا۔ وہ اپنے ساتھی شہان سے مخاطب ہو کے عبرانی لہجے میں بولا۔

"کام ہو گیا۔ ہے آ جاؤ۔ باقی کا کام نمٹایا جائے۔" ابھی اس نے رابطہ منقطع کیا ہی تھا کہ دھڑ سے دروازہ کھلا، سامنے اعیان کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول تھا۔ بازک کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پستول اس کے ہاتھ میں بھی تھا مگر اسے اعیان پر فائر کرنے کا موقع

نہ ہل سکا۔ دوسرے ہی لمحے دروازے پر کھڑے اعیان کے سائلنسر لگے پستول سے ہلکی ”چز“ کی آواز ابھری اور بازک کی پیشانی میں سرخ روشن دان بن گیا۔ وہ آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اعیان نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور بازک کی لاش گھسیٹ کر باتھ روم کی طرف لے جانے لگا۔ لاش ٹھکانے لگانے کے بعد وہ اپنے دوسرے ساتھی خالد سے رابطہ کرنا چاہتا تھا جو ہوٹل کی لابی اور گیسٹ تک کے وسیع احاطے میں مٹرگشت کر رہا تھا۔

ادھر اپنے ساتھی بازک کا پیغام ملتے ہی شہان فوراً حرکت میں آگیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے ساتھی نے عابد شیکھری کو بھی انٹاغفیل کردیا تھا۔ لہٰذا وہ تیزی کے ساتھ مطلوبہ کمرے کی طرف چل پڑا۔ کوریڈور سنسان تھا۔ اکا دکا لوگ آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بظاہر مطمئن اور ویٹروں کے سے انداز میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مطلوبہ کمرے کے دروازے پر پہنچا اور ’ناک‘ کیے بغیر اسے ذرا اندر کی طرف دھکیلنا چاہا تو اسے بند پاکر اس کا ماتھا ٹھنکا۔

”کیا اندر کوئی گڑبڑ ہے؟“ اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔ وہ بری طرح الجھ گیا کیونکہ منصوبے کے مطابق بازک کو اندر سے دروازے کی کنڈی نہیں لگانی چاہیے تھی۔ خطرہ محسوس کرتے ہی اس نے فوراً محتاط انداز میں پستول نکال لیا۔ گرد و پیش پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں سے پستول تھاما اور چند قدم پیچھے ہٹ کر نال کا رخ دروازے کے ہینڈل پر کرکے ٹریگر دبا دیا۔ اس کے پستول میں بھی سائلنسر فٹ تھا۔ ”چز“ کی ہلکی سی آواز ابھری اور ہینڈل زوردار کڑاکے کی آواز سے ٹوٹ گیا اور دروازہ بھی کھل کر تھوڑا سا اندر کی طرف سرک گیا۔ شہان نے دروازے کو لات ماری تو دروازہ پورا کھل گیا۔ سامنے ہی بیڈ پر اسے اپنے شکار بے سدھ آڑھے ترچھے پڑے نظر آگئے۔ اس کا ساتھی غائب تھا۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ وہ اس طرح اپنے دونوں ہاتھوں سے پستول تھامے محتاط انداز میں اندر داخل ہوا۔ اعیان اس وقت بازک کی لاش کو باتھ روم میں ڈال کر باہر نکل رہا تھا۔ جب اس نے دروازے کو اندر کی جانب کھلتے دیکھا تو وہ یکدم پستول تھامے دروازے کے دائیں جانب ہی دیوار کے ساتھ چپک گیا پھر جیسے ہی شہان اندر داخل ہوا اعیان نے اس پر فائر کردیا۔ گولی شہان کے پہلو پر کہیں لگی تھی مگر اس نے گرتے گرتے بھی اعیان پر گولی چلادی جو اس کی گردن میں پیوست ہوگئی۔ اعیان کے حلق سے کرب ناک چیخ نکلی۔ اس کی گردن سے خون کا فوارہ اُمنڈ پڑا۔ شاید شہان کی چلائی ہوئی گولی نے اس کی شہ رگ پھاڑ دی تھی، وہ لڑکھڑایا۔ دونوں ہاتھ غیر ارادی طور پر سہارا لینے کے لیے دیوار سے ٹکرائے۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور پھر وہ خود بھی دیوار سے ٹیک لگائے لگائے فرش پر آرہا۔ شہان کی اپنی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ اعیان کی چلائی ہوئی گولی اس کے دائیں پہلو میں پیوست ہوئی تھی اور وہاں سے بھل بھل خون جاری ہو چکا تھا۔ شہان کو مرتے مرتے کچھ نہیں سوجھا تو اس نے اپنی شرٹ کے کالر سے چسپاں خفیہ ٹرانسمیٹر پر اٹک اٹک کر کوئی پیغام دینا شروع کردیا۔

خالد کو شبہ ہوا کہ ہوٹل کے وردی پوش گارڈ اسے اب مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے تھے، اس لیے اس نے فوراً گیسٹ کے احاطے سے لابی کا رخ کیا۔ اسے کافی دیر ہوگئی تھی کیونکہ ابھی تک اس کے ساتھی اعیان نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ پھر اس نے خود ہی ڈائننگ ہال کا جائزہ لینے کی ٹھانی۔ جدھر اس کے خیال کے مطابق اس کا ساتھی اعیان ان دونوں محسن مہمانوں پر حفاظت کی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

جب خالد وہاں پہنچا تو چونک پڑا۔ وہاں اسے وہ دونوں مہمان نظر آئے نہ اپنا ساتھی۔ وہ چند ثانیے وہیں کھڑا اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے سوچا..... یقیناً وہ سب اپنے کمرے میں جا چکے ہوں گے۔ خالد نے پھر بھی اپنے ساتھی سے تازہ صورت حال کی جانکاری کے لیے رابطہ کرنا ضروری سمجھا اور ایک کونے میں جاکر جب اس نے اپنے ہینڈی پر اعیان سے رابطہ کرنے کی کوشش چاہی تو کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ اب خالد کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے خطرے کی بو محسوس ہونے لگی۔ اس نے فوراً عابد شیکھری کے کمرے کا رخ کرنے کی ٹھانی۔ ٹھیک اسی وقت اسے شیشے کے پار ڈائننگ ہال کے اندر ایک وردی پوش گارڈ نظر آیا جو کسی ویٹر کے قریب ہوکر کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ وہی گارڈ تھا جو باہر احاطے میں اسے بار بار تشکیک بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ خالد سمجھ گیا کہ وہ یقیناً ویٹر سے اس کے بارے میں کچھ کہہ رہا ہوگا۔ خالد پھر وہاں نہیں رکا اور تیزی کے ساتھ کوریڈور کی طرف بڑھ گیا جدھر عابد شیکھری کا کمرا تھا۔

☆☆☆

گہری اور خاموش رات کی دھڑکتی تاریکی میں ایک دودھ والے کے اونٹ ریڑھے میں کل چھ افراد عام سے لباس میں سوار تھے، ریڑھے پر سوار دودھ کے بڑے کین رکھے ہوئے تھے، یہ خیال رکھا گیا تھا کہ دودھ کے کین غیر

معمولی طور پر کھلنے اور چوڑے ڈھکنوں والے ہوں۔ ان میں بارہ کین دودھ سے بھرے ہوئے تھے جبکہ باقی چار کے اندر اسلحہ تھا جن میں ایم ون تھنڈر آٹو میٹک رائفلیں چار انفرا ریڈ ٹیلی اسکوپ گنیں، دستی بم، ٹائم بم کے علاوہ مشین گنیں تھیں۔ اسلحے والے کین پہچاننے کے لیے ان پر مخصوص اور خفیہ نشان لگائے گئے تھے۔ صحرائے نجف میں داخلے کے بعد دو مقامات پر اونٹ ریڑھے کی اسرائیلی آرمی نے چیکنگ کی تھی۔ یہ معمول کی چیکنگ تھی جس میں یکسانیت کا دخل ہونے کی وجہ سے دیر نہیں لگائی گئی تھی اور آگے روانگی کا پروانہ مل گیا۔ دوسری چیک پوسٹ پر البتہ تھوڑی معمول سے ہٹ کر کے چیکنگ ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اونٹ ریڑھے میں جو پانچ افراد، جو یقیناً بھیس بدلے ہوئے تھے، ان سے پرانے آدمیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوئی تھی۔

اونٹ ریڑھے پر چھ افراد سوار تھے۔ ان میں تین پی ایل ایس او اور تین الجاہد سے تعلق رکھتے تھے۔ لیلیٰ، جمال اور باقر ان میں شامل تھا۔ یہ راستہ زبیدہ کا بتایا ہوا تھا۔ دودھ والے ریڑھے کا بندوبست مع دودھ اور اسلحے کے الجاہد نے ہی کیا تھا۔ انہیں پہلے سے ہی علم تھا کہ یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے، اکثر ایسا ہوتا رہا تھا کہ دودھ والے بدلتے رہتے تھے۔ تسلی بخش جواب کے بعد انہیں جانے دیا گیا۔

پانچوں کی سانس میں سانس آئی اور بالآخر یہ لوگ نجف کے ایک سرائے تک پہنچ گئے۔ سرائے کے مالک... ابونصر نے انہیں خوش آمدید کہا۔ یہ فلسطینی حریت پسندوں کا ہمدرد اور ان کا حامی تھا۔ اس نے انہیں ایک کمرے میں بحفاظت پہنچادیا۔ دودھ والے بارہ کین اتار دیے گئے تھے۔ جبکہ چار مخصوص نشان والے ان کے کمروں میں رکھ دیے گئے۔

سرائے کے تہ خانے میں ابونصر انہیں مزید آگے کی ہدایات دے رہا تھا۔ یہ ایک پچاس سالہ اچھی صحت کا حامل ساٹھا پاٹھا شخص تھا۔ اس سرائے میں ہی اس کا ٹھکانا تھا یہاں اس کی بیوی بھی رہتی تھی۔ یہ بے اولاد جوڑا تھا۔

”یہاں سے آگے شمال جنوب کا راستہ ریڈ زون کہلاتا ہے۔“ ایک سوکھی کھال پر لگے نقشے پر ابونصر سمجھا رہا تھا۔ نقشے میں آڑھی ترچھی لکیروں کے بعض زاویوں پر چوکور اور گول نشان بنے ہوئے تھے۔ ان نشانوں پر نکیلی پنسل سے اشارہ کرتے ہوئے آگے بتانے لگا۔

”ریڈ زون سے پہلے ایک مورچانما چوکی ہے۔ اسے پوائنٹ تھرٹی کہتے ہیں۔ یہی وہ سب سے اہم چوکی ہے جسے پار کرنے کے بعد تم سب یورینیم پلانٹ کے مین گیٹ تک پہنچ سکتے ہو اور یہ بڑا چوکور نشان دیکھ رہے ہو اس کے ساتھ جو چھوٹا گول سرخ نشان ہے، یہ ایک خفیہ بنکر ہے۔ اس کے اندر کوئی ذی نفس موجود نہیں ہے مگر یہ بنکر مسلح انسانوں کے چھپے ہوئے دستے سے زیادہ خطرناک اور مہلک ہے۔ اس کے اندر ایک جدید سرچنگ اینڈ الارم سسٹم کے ساتھ لیزر گائڈڈ فائرنگ میکنزم بھی نصب ہے۔ اس بنکر کو پار کرنے کے بعد ہی تم لوگ یورینیم سالونٹ پلانٹ کے اندر داخل ہوسکتے ہو مگر وہاں بھی سخت پہرا ہے۔ آگے تمہاری قسمت، کوئی سوال ہو تو پوچھ سکتے ہو۔“

ابونصر اتنا بتا کر نقشے کے اوپر پنسل رکھ کر خاموش ہو گیا وہ پانچوں نقشے پر جھکے ہوئے تھے۔ لیلیٰ نے سوال کیا۔

”محترم ابونصر! کیا ضروری ہے کہ ہم پوائنٹ تھرٹی والی سمت سے پلانٹ میں داخل ہونے کی کوشش کریں جدھر ایک خطرناک بنکر سے بھی سامنا ہونا ہو۔ دوسری یا عقبی سمت کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

ابونصر نے جواب دیا۔ ”بیٹی! دوسری سمت کا رخ کرنے کا تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس طرف اندھی خندقیں کھودی ہوئی ہیں اور مائنز الارم زمین میں نصب ہیں پھر بارہ فٹ اونچی پتھروں کی دیوار پر تین فٹ کے آہنی بریکٹوں میں چار رویہ خاردار تاریں نصب ہیں جن میں ہر وقت ہائی ٹینشن وولٹیج برقی رو چلتی ہے ہزارویں حصے میں انسان کو کوئلہ بنادے گی۔ اول تو وہ راستہ پانا ناممکن حد تک مشکل ترین ہے..... اگر تم اپنی جان جوکھم میں ڈال کر کامیاب ہو بھی جاتے ہو تو..... پھر بھی تمہیں پلانٹ کے اندر داخل ہونے کے لیے سامنے کے گیٹ کے اندرونی احاطے کا ہی رخ کرنا پڑے گا۔ اور اس صورت میں ریڈ پوائنٹ چوکی میں موجود اسلحہ بردار گارڈز سے مقابلہ کرنا مشکل ہوجائے گا۔ اس لیے بہتر یہی راستہ ہے جو میں نے بتایا ہے۔“

سب نے ابونصر کی حمایت کرتے ہوئے سر ہلا دیا۔

وہ سب روانگی کے لیے تیار ہوگئے۔ پلانٹ کو رسد سپلائی کرنے والے ٹرک کو یرغمال بنانے کے لیے ابونصر نے انہیں جو راستہ بتایا تھا..... یہ لوگ راتوں رات سرائے سے اس طرف پیش قدمی کے لیے پیدل روانہ ہوگئے۔ ابونصر نے ان کے مشن کی کامیابی کے لیے دعائیں کرتے ہوئے ان جری جنگجوؤں کو رخصت کیا تھا۔

جس تاریک مقام پر انہوں نے رسد سپلائی کرنے

والے ٹرک کو پرغمال بنانا تھا۔ جس کا نام انہوں نے "ہیسٹ پوڈ کیٹ" رکھا تھا۔ وہ مقام سرائے سے نصف کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور انہیں ٹرک گزرنے سے پہلے وہاں پہنچ کر گھات لگا کر بیٹھنا تھا۔

آزادیٔ وطن کی خاطر اور اپنی مادرِ گیتی پر غاصب و سفاک درندہ صفت اسرائیلیوں سے پاک کرنے کے جذبہ حریت سے سرشار یہ چھ گوریلا جانباز اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے کفن بدوش تھے مگر انہوں نے یہ ٹھان رکھی تھی کہ وہ جان دینے سے پہلے اپنا یہ اہم مشن ضرور پورا کریں گے جو اسرائیلیوں کی کمر توڑنے کے مترادف ہوگا۔

☆☆☆

زبیدہ نے اس مشن کو "گرینڈ پلان" کا نام دیا تھا جس کے اس نے دو گروپ تشکیل دیے تھے۔ پہلا گروپ دو تھا جس میں آمنہ جنجو اور زینڈ کمانڈوز شامل تھے۔ چھ المجاہد کے بشمول زبیدہ کے اور تین محسن اور زبیر پی ایل ایس ہو کی طرف سے تھے۔

"گروپ بی" جس کی کمانڈ لیلیٰ کے ہاتھ میں تھی اسے نجف روانہ کر دیا گیا تھا۔ خود زبیدہ کا گروہ تل ابیب میں تیونائی کی طرف کوچ کر چکا تھا۔ جدھر ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈ کوارٹر اور اس کے سربراہ جنرل آئزک فرناش اور ایہود شابک کی رہائش گاہیں تھیں۔ منصوبے کی پہلی تقسیم کے مطابق گروپ بی کو یورینیم کے پلانٹ پہنچ کر اسے تباہ کرنا تھا جس سے بجلی کا گرڈ بند ہونے کی وجہ سے پورا تل ابیب، یروشلم سمیت تاریکی میں ڈوب جاتا اور پھر گروپ اے اپنی پیش قدمی کر کے ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈ کوارٹر مع اس کے جدید آلات و مشینری کے اڑا دیتا..... اس میں جنرل فرناش اور میجر ایہود شابک کو موت کے گھاٹ اتارنا بھی شامل تھا۔

زبیدہ نے گروپ بی..... یعنی لیلیٰ والے گروپ کو اس بات کی تاکید کی تھی کہ اسے اپنا اہم مشن گول..... مقررہ وقت میں کرنا ہوگا کیونکہ اس کے مشن کی بروقت کامیابی پر گروپ اے کے مشن کی بھی کامیابی کا دارومدار تھا۔ وہ گھات میں ہوں گے اور جیسے ہی بجلی کا نظام درہم برہم ہوگا تیونائی کے ڈیوڈ اسٹار والے ہیڈ کوارٹر میں یک دم افراتفری مچ جائے گی اور پھر یہی موقع ہوگا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گروپ اے اپنے مشن پر عمل پیرا ہو جائے گا۔

چنانچہ لیلیٰ والے گروپ کی روانگی کے نصف گھنٹے بعد زبیدہ بھی اپنے ریت صفانہ والے خفیہ ٹھکانے سے اپنے سات جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ تیونائی کی طرف روانہ ہو گئی۔ یہ لوگ رات کے آخری پہر کے اختتام تک بغیر ہڈ والی جیپ میں روانہ ہوئے تھے۔

☆☆☆

کوریڈور کے چکنے فرش پر خالد تیز تیز قدموں سے عابد شکیھری کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ابھی وہ مطلوبہ کمرا محض چند قدموں کے فاصلے پر تھا کہ اسے ایک تیز نسوانی چیخ سنائی دی۔ وہ ٹھٹک کر رکنے پر مجبور ہو گیا۔ چونکہ عابد شکیھری کے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا رہ گیا تھا اور سامنے فرش پر شہان کی لاش پڑی تھی جس کے پہلو سے خون بہتا ہوا کمرے کے فرش سے باہر کوریڈور تک بہہ کر تالاب بنا رہا تھا۔ وہاں سے ایک نیا شادی شدہ جوڑا گزر رہا تھا۔ مرد نے تو خود کو فوراً سنبھالنے کی کوشش کی مگر اس کی ساتھی لڑکی سے یہ وحشت ناک منظر برداشت نہ ہو سکا اور بے اختیار وہ دہشت زدہ ہو کر چیخ پڑی تھی۔ پھر تو جیسے کوریڈور میں ہلچل مچ گئی، دائیں بائیں کمروں کے دروازے دھڑا دھڑ کھلنے لگے، آدمی اپنی ساتھی خوف زدہ لڑکی کو سنبھالے جدھر سے آ رہا تھا دوبارہ اس طرف پلٹ گیا۔ ہوٹل کے عملے کے افراد بھی دوڑتے ہوئے آنے لگے۔ خالد کو تشویش ہوئی وہ آگے بڑھا مگر حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر چکے تھے کہ وہ اب کمرے کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا عام لوگوں کی طرح وہ بھی مجمع کے ساتھ کھڑا ہو کے اچک اچک کر کمرے کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔

جلد ہی خالد کو یہ افسوسناک جانکاری مل گئی کہ اندر اس کا ساتھی بھی ہلاک ہو چکا تھا مگر اس کی سمجھ میں یہ نہ آ سکا تھا کہ آخر ان کے دونوں مہمانوں کو کیا ہوا تھا؟ وہ کیوں بے ہوش تھے، پولیس کو کال کر دی گئی تھی اور ہوٹل کی انتظامیہ حرکت میں آ چکی تھی، اس نے لوگوں کو وہاں سے ہٹانا شروع کر دیا تھا۔

"اس آدمی کو پکڑو..... یہ مشکوک ہے۔" دفعتاً خالد کی سماعتوں سے ایک چیختی ہوئی آواز ٹکرائی۔ جب اس نے آواز کی سمت چونک کر دیکھا تو وہی گارڈ اس کی طرف اشارہ کیے ہوئے تھا جو اسے تھوڑی دیر پہلے تشکیک زدہ نظروں میں لیے ہوئے تھا۔ سب لوگ مڑ مڑ کر خالد کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں فطری خوف جھلکنے لگا اور وہ دائیں بائیں کھسکنے لگے۔ خالد اس صورت حال سے پریشان ہو گیا۔ وہ ابھی یہاں سے ہلنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر اس نئی افتاد نے اسے وہاں سے دوڑنے پر اس وقت مجبور کر ہی ڈالا جب گارڈ کی چلاتی ہوئی نشاندہی پر عملے کے دو آدمی خالد کو پکڑنے دوڑے..... مگر خالد نے فوراً اپنا پستول نکال کر ہوائی

فائر کر ڈالا۔ ایک بار پھر کوریڈور میں بھگدڑ مچ گئی۔ مذکورہ گارڈ نے اپنی گن سیدھی کر لی تھی مگر "پبلک اسپاٹ" کے بیچوں بیچ اس میں گولی چلانے کی ہمت نہ ہوسکی اور خالد اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہاں سے راہ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ ہوٹل سے باہر آ کر وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ یہاں اچھی خاصی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ اسے پولیس کے سائرن کی گونج سنائی دی وہ بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ بالآخر اس نے وہیں کہیں ارد گرد قریب منڈلاتے ہوئے اپنے ایک ساتھی سے رابطہ کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ اس سے آخر میں بولا۔

"خضر! میں نظروں میں آ چکا ہوں...... تم فوراً ہوٹل پورٹ لینڈ پہنچو...... ہمارے دونوں مہمان مشکل صورت حال سے دوچار ہیں۔"

عابد شیکھری کی حفاظت پر مامور پی فرنٹ کے پانچ فلسطینی حریت پسندوں میں سے ایک ہلاک ہو چکا تھا۔ دوسرا مشتبہ قرار پا چکا تھا۔ خضر سمیت باقی تین محافظ حرکت میں آ گئے۔ جو ہوٹل کے ارد گرد ہی موجود تھے۔ اس گروپ کی کمانڈ اعیان کر رہا تھا جو بدقسمتی سے اسرائیلی انٹیلی جنس کے خفیہ اہلکار...... شہان کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا جبکہ خود شہان بھی اعیان کی گولی کا نشانہ بن کر جہنم واصل ہو چکا تھا۔ خضر کو، خالد نے ساری صورت حال سمجھا دی تھی۔ لہٰذا وہ اپنے باقی دو ساتھیوں معید اور حارث کے ساتھ فوراً حرکت میں آ گیا اور ہوٹل پورٹ لینڈ کی طرف لپکا۔

ہوٹل پورٹ لینڈ کو اب چاروں طرف سے اسرائیلی پولیس یونٹ نے گھیرے میں لے لیا تھا اور کسی کو سخت چیکنگ اور پوچھ گچھ کے بغیر اندر نہیں جانے دیا جا رہا تھا جبکہ اندر سے باہر کسی کو چھوڑنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اس لیے کہ ابھی پولیس کی اندر تفتیش جاری تھی اور باہر آنے والے کی اچھی طرح تلاشی اور جانچ پڑتال کے بعد ہی چھوڑا جاتا تھا۔

خضر وغیرہ نے فوری طور پر ہوٹل کے اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ ان کے پاس ہوٹل میں داخلے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اگر وہ عابد شیکھری اور نائمہ سے اپنے تعلق کا اظہار کرتے تو انہیں لمبی چوڑی قانونی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑتا اور ممکن تھا کہ یہ اسرائیلی خفیہ پولیس کی نظروں میں آ جاتے۔ بہت غور و خوض کے بعد انہوں نے ایک منصوبہ بنایا۔ یہ بات تو طے تھی کہ یہ لوگ اپنے "محسن" مہمانوں کو پولیس کی کسٹڈی میں نہیں جانے دینا چاہتے تھے کیونکہ بازک اور شہان کی موت نے ظاہر کر

دوستی یا دو۔ستی

اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دوستی ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں دونوں کا ستی ہو جانا، یعنی جب دو انسان ایک دوسرے کی خاطر جان دینے کا جذبہ رکھتے ہوئے آپس میں تعلق استوار کر لیں تو تب دوستی جیسا رشتہ وجود میں آتا ہے لیکن اس رشتے کے لیے سب سے خطرناک چیز شک کا ناگ ہے جس کا زہر ایک دفعہ دوستی کی رگوں میں گھس جائے تو اس رشتے کی موت کے بغیر نہیں نکلتا۔ اس لیے اس رشتے کو مضبوط رکھنے کے لیے دوست پر شک کرنا گناہ ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں دوستی کہو تو ایک لفظ...... مانو تو زندگی...... سوچو تو بندگی...... ڈوبو تو گہرا ساگر کرو تو آسان...... نبھاؤ تو مشکل......

مرسلہ۔ اشوک کمار، میر پور خاص

خون گروپس کے بارے میں ایک دلچسپ ریسرچ

☆ اے پوزیٹو (A+) ...... قائدانہ صلاحیت رکھنے والے

☆ اے نیگیٹو (A-)...... محنت کش

☆ بی پوزیٹو (B+) ...... دوسروں کے لیے قربانی دینے والے

☆ بی نیگیٹو (B-) ...... خود غرض اور مطلب پرست

☆ او پوزیٹیو (O+) ...... ہر ایک کے کام آنے والے

☆ او نیگیٹو (O-)...... تنگ نظر

☆ اے، بی پوزیٹیو (AB+) ...... بڑی مشکل سے سمجھ آنے والے

☆ اے، بی نیگیٹو (AB-)...... شاطر اور ذہین

O آپ کا بلڈ گروپ کیا ہے؟

مرسلہ۔ طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل ملتان

دیا تھا کہ اسرائیلی انٹیلی جنس جانبدارانہ رپورٹ کے خلاف حرکت میں آ چکے تھے۔ اتنا تو انہیں بھی اندازہ ہو چلا تھا کہ ان کے مہمانوں کے خلاف یقیناً کوئی گہری سازش یا چال چلنے کی کوشش کی گئی تھی جو عین وقت پر ان کے ساتھی اعیان نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے وہ ناکام بنادی تھی۔

''ہمیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔'' خالد نے سرگوشی میں اپنے ساتھیوں سے کہا۔ وہ تینوں اس وقت ہوٹل پورٹ لینڈ کے سامنے بنے ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں موجود بہ ظاہر ہلکی پھلکی کھانے پینے کی چیزیں خریدنے میں مصروف تھے اور شیشے کے پار ان کی عقابی نظریں ہوٹل کے گیٹ پر مرکوز تھیں جدھر پولیس موجود تھی۔ ان کی دو گاڑیاں بھی کھڑی تھیں ایک جیپ اور ایک کار تھی۔

''پولیس ہمارے مہمانوں کو اپنی کسٹڈی میں لے کر یہاں سے جلد روانہ ہو گی مگر اس سے پہلے ہم ان کی گاڑیوں پر حملہ کر کے انہیں چھڑانے کی کوشش کریں گے۔'' خضر کی بات پر معید اور حارث نے اثبات میں سر ہلا دیے۔ تھوڑی دیر بعد جب خضر...... اپنے ایک اور ساتھی خالد کو اپنے تازہ ترین لائحہ عمل سے متعلق آگاہ کر رہا تھا اس کی نظریں شیشے سے پار جمی ہوئی تھیں۔ وہ اچانک بری طرح چونک پڑا۔ دو بھاری گاڑیاں ہوٹل پورٹ لینڈ کے قریب آ کر ایک جھٹکے سے رکی تھیں۔ خضر کے چہرے پر گہری تشویش کے آثار نمودار ہوتے چلے گئے۔

☆☆☆

تیونائی کے مقام پر ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر میں جشن کا سماں تھا۔ موساد کا سیکنڈ ڈائریکٹر میجر بارق شمعون اور ساتھی اضحاق شامیر، جنرل فرناش کی اسپیشل دعوت پر شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔

یروشلم اور تل ابیب کے نائٹ کلبوں سے حسین رقاصائیں بلائی گئی تھیں۔ اعلیٰ درجے کی شراب میں رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔ طعام میں بکرے اور بھیڑ کی سجیاں اور گائے کے کباب کا خاص طور پر بندوبست تھا۔

ہال کے ایک طرف دو فٹ اونچا بڑا سا گول اسٹیج بنایا ہوا تھا جس کے وسط میں ایک اسٹیل راڈ نصب تھی۔ گورا رنگ متناسب الاعضا بدن والی حسین و جمیل اپسراؤں کا نیم عریاں رقص جاری تھا۔ گویا جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ جنرل فرناش اس کا دست راست میجر ایہود شانک، موساد کے دونوں سیکنڈ اینڈ ڈپٹی ڈائریکٹرز میجر بارق شمعون، میجر اضحاق شامیر...... کچھ حکومتی عہدے دار بھی رقص و سرود میں غلطاں بیٹھے تھے تل ابیب کا یہودی کمشنر پیریز نادون بھی موجود تھا۔ اس کی بائیس سالہ جوان سال لاڈلی بیٹی بازغہ بھی ساتھ تھی۔ اکلوتی اولاد اور اپنے باپ کی لاڈلی ہونے کے باعث وہ باپ کے ساتھ تھی اور دیگر خواتین بیگمات کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ اپنے مردوں کی طرح ان کی زرق برق لباس میں ملبوس بیگمات بھی پوری طرح پینے پلانے اور عیش کوشی میں مصروف تھیں۔ بازغہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی اور امریکا سے اس نے تعلیم حاصل کی تھی، بازغہ یوں تو ایک یہودی باپ کی یہودی بیٹی تھی مگر اس کے خیال و افکار اپنے باپ کے بالکل برعکس تھے۔ بلکہ باپ سے کیا اپنی پوری یہودی قوم سے مختلف تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی ماں کا اس کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ باپ نے اسے چھوٹی عمر میں ہی امریکا کے ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ وہیں اس نے آگے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ اپنے ملک اسرائیل اور فلسطینی مظلوم عوام اور حریت پسند مجاہدوں کے بارے میں خبریں پڑھتی رہتی تھی۔ اس سے متعلق کئی سوالیہ نشان اس کے سلجھے ہوئے ذہن میں ابھرتے تھے۔

اکثر و بیشتر وہ اپنے باپ پیریز نادون سے بھی الجھ جاتی تھی۔ مثلاً ایک دن جب وہ امتحانات کے بعد حسب معمول تل ابیب پہنچی تو باپ سے اس کی بحث چھڑ گئی۔ ''پاپا...... ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی، آخر کیا وجہ ہے کہ مملکت اسرائیل کے قیام کے باوجود یہاں جنگ وجدل اور کشمکش کی فضا برپا رہتی ہے؟ اسرائیل کے قیام کے بعد ہمیں اور کیا چاہیے؟ سچ پوچھیں تو مجھے یہاں آ کر بڑی گھبراہٹ اور بے چینی سی رہتی ہے۔''

''یہ سب عرب دہشت پسندوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ مائی سویٹ ڈاٹر۔'' نادون نے بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''لیکن کیوں؟ اس لیے کہ ہم نے ان کی سرزمین پر ناجائز قبضہ جما رکھا ہے؟'' بازغہ سنجیدگی سے بولتی رہی۔ ''بیت المقدس پر ہمارا قبضہ ہونے کے باوجود ہم اس پر قانع کیوں نہیں رہے۔ مسلمانوں کی مسجد اقصیٰ کو نذر آتش کر کے ان کے جذبات کیوں مجروح کیے گئے؟''

''بیٹی! وہ آگ ہم نے نہیں لگائی تھی۔'' پیریز نادون نے بیٹی سے آنکھیں چراتے ہوئے ایک مکروہ اور سفید جھوٹ بولا تو بازغہ خاموش نہ رہ سکی بولی۔

''نہیں پاپا! آپ کو معلوم ہے یہ آگ ہم یہودیوں نے ہی لگائی تھی۔ اسرائیلی انٹیلی جنس بھی اس میں شامل تھی۔ میں نے اس سلسلے میں ایک غیر جانبدار صحافی کی مفصل

رپورٹ اخبار میں پڑھی تھی جس میں ہم یہودیوں کی اس حرکت پر عرب دنیا نے ہم پر لعن طعن کی تھی اور بتایا گیا تھا کہ اس ناپاک حرکت کا مقصد ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا تھا۔ جس سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو مشتعل کر دیا گیا۔ پھر عربوں کو مطمئن کرنے کی خاطر ایک عام سے شخص کو آتش زنی کے الزام میں گرفتار بھی کیا گیا۔ اس پر مقدمہ بھی چلا مگر بہت معمولی سزا کے بعد... اسے چھوڑ دیا گیا۔ یہ کیا دوغلا پن ہے ہمارا پاپا؟“

بیٹی کے ان چبھتے ہوئے سوالوں کا جواب نادن کے پاس نہیں تھا۔ اس نے آئیں بائیں شائیں کر کے بات ختم کر دی مگر...... اس سے بازغہ کے دل و دماغ میں پلنے والے سوالیہ نشان سوا ہونے لگے۔

درحقیقت...... بازغہ کو ایسا شعور خود ہی عطا نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنی کھلی آنکھوں سے، وسیع النظری اور کھلے دل اور سوجھ بوجھ کے ساتھ یہ سب دیکھا اور محسوس کیا اور سمجھا بھی تھا۔ یونیورسٹی میں بھانت بھانت کے ملکوں سے آئے ہوئے طالب علم پڑھتے تھے۔ ان میں مسلم ممالک کے بھی طالب علم ہوتے، وہ ان کے اسلامی طرز عمل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ کس قدر سادگی محسوس ہوتی تھی اسے ان کے انداز و اطوار میں...... ان کا رکھ رکھاؤ ایک سچے مذہب اسلام کے تشخص کو ابھارنے جیسا ہوتا تھا۔ وہ سوچتی ایسے لوگ بھلا کیسے دہشت پسند ہو سکتے ہیں؟ یا جو شراب کو حرام اور نائٹ کلبس...... میں جانا بھی گناہ سمجھتے تھے۔

اور آج...... بازغہ یہ سب اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی یہودی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کو لہو و لعب میں ڈوبے دیکھ کر حیرت زدہ ہو رہی تھی اور تو اور یہودی بیگمات بھی رقص و سرود کی اس محفل آوارگی میں اپنے مردوں کے شانہ بشانہ تھیں۔ بازغہ کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ہال کے کمرے سے نکل آئی اور یونہی چہل قدمی کے انداز میں چلتی ہوئی ”وار روم“ میں آ گئی۔ یہاں دیواروں پر بڑی بڑی اسکرینیں نصب تھیں۔ جلتی بجھتی بتیوں والے پینل نظر آئے۔ وہ تعجب اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ ایک اسکرین پر ڈیمونا نیوکلیئر ریسرچ پلانٹ کا پورا خاکہ جھلک رہا تھا اور ایک طرف سرخ پینل والی اسکرین پر ”وار ہیڈ اسٹیٹس“ کا گراف بلنک کر رہا تھا۔ دوسری طرف بحیرۂ روم کی تہ میں موجود اسرائیلی ایٹمی آبدوزوں کے خاکے جل بجھ رہے تھے۔ بازغہ کو اگرچہ معلوم تھا کہ اسرائیل بلاشبہ ایک ایٹمی طاقت رکھنے والا ملک ہے اور آج یہ سب وہ اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ رہی تھی۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس قدر طاقت اور قوت رکھنے کے باوصف اسرائیل، عرب بستیوں کے مظلوم مسلمانوں سے کیونکر خوف زدہ رہتا ہے؟

اچانک ایک کھنکے کی آواز پر وہ چونکی۔ دروازے کی طرف سے کچھ لوگوں کے اندر آتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز آئی جو ہلکے قہقہے لگاتے ہوئے اندر داخل ہو رہے تھے۔ بازغہ کو اگرچہ یہاں کوئی خطرہ نہ تھا مگر پھر اس نے جانے کیا سوچا اور بڑی تیزی کے ساتھ ایک لمبے چوڑے پینل کے پیچھے جا چھپی۔

اندر داخل ہونے والے وہ چار افراد تھے۔ جنرل آئزک فرناش، میجر ایہود شابک، بارق شمعون اور اضحاق شامیر تھے۔ ان کے ہاتھوں میں شراب کے ادھ بھرے بلوریں پیگ بھی تھے۔ یہ چاروں درمیان میں بچھی آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ درمیان میں چھوٹی گول میز تھی۔

”ہمیں اس عظیم جشن کا پورا یقین تھا کہ ایک دن ہم اس سے ضرور لطف اندوز ہوں گے۔“ موساد کے میجر شمعون نے کریہہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو اس کے ساتھی شامیر نے جنرل فرناش سے کہا تھا اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس فتح کا کریڈٹ آپ کے سر جاتا ہے۔

”میں آپ دوستوں کا بھی شکرگزار ہوں۔ آپ نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔“ جنرل فرناش نے آب ارغوان کا ایک تلخ گھونٹ بھر کے فتح کے نشے میں چور ہو کے کہا۔ ”مگر ابھی ہماری منزل اور آگے ہے۔ الجاہد کے رہنما کا قتل اور پی ایل ایس او کے آرگنائزر کو ہلاک کرنا ہماری آخری منزل نہیں، ہم ان سب کو چن چن کے ہلاک کر ڈالیں گے جو بھی ہمارے خلاف آواز اٹھائے گا۔“ جنرل فرناش کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کے ساتھی دست راست میجر ایہود شابک بولا۔

”ابھی ہمارا گریٹر اسرائیل کا خواب ادھورا ہے مگر ہم نے اس کے لیے بھی گرینڈ پلان بنا رکھے ہیں۔ ہمارا ٹارگٹ صرف فلسطینی مسلمان نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلم ممالک ہیں۔ ہم دھیرے دھیرے دیگر مسلم دشمن ممالک کی مدد سے...... اپنے گریٹر اسرائیل کے پلان کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔“

”اس سلسلے میں، میں تم کو بریفنگ دے چکا ہوں۔“ موساد کے میجر بارق شمعون نے جنرل فرناش سے کہا۔

”بھارت، امریکا ہمارے ساتھ ہے۔ دیگر ممالک

کے مقتدرہ بھی ہماری خیر خواہی کا دم بھرتے ہیں۔ ہمیں شام اور عراق کے لیے کچھ سوچنا ہوگا۔ بہت جلد۔ اس کے بعد اردن اور مراکش، مصر بھی ہماری سازشوں کا نشانہ بنیں گے۔ امریکا ہمارے شانہ بشانہ ہوگا۔"

"ایک اہم اسلامی ملک کو بھول رہے ہو تم، شمعون۔" ڈیوڈ اسٹار کے سیکنڈ ان کمانڈ میجر ایہود شابک نے کہا۔ "پاکستان..... یہ وہ دنیا کا پہلا ایٹمی ملک ہے جس سے ہمیں سب سے زیادہ خطرہ ہے۔"

"یقیناً" اس بار اضحاق شامیر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "پاکستان میں پڑوسی انٹیلی جنس ایجنسی کے ساتھ ہمارے ایک پرانے گٹھ جوڑ سے سازشوں کا عمل جاری ہے مگر وہاں کی عوام بہت باشعور اور قومی اور ملی جذباتیت سے سرشار ہے۔ جس کے تحت کچھ رکاوٹوں کا سامنا ہے مگر وہاں کچھ "کرسی" کے بھوکے مقتدرہ ایسے بھی ہیں جو ہمارا کام آسان کرتے رہتے ہیں۔ دولت سے بھی ہم بہت کچھ کر گزرتے ہیں۔ انارکی اور انتشار کے ذریعے بھی ہم اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ امریکا کے ذریعے ہماری کچھ کٹھ پتلیاں وہاں متحرک ہیں جو اپنے اقتدار کو کامیاب اور طول دینے کے لیے آئے روز بڑی بڑی امداد مانگنے امریکا کے سامنے دوزانو رہتے ہیں اور امریکا ہماری مٹھی میں ہے۔"

شامیر کی مختصر اصراحت پر جنرل فرناش قدرے الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "مگر باوجود اس کے ہم ابھی تک پاکستان کی سرزمین سے اپنے خاطر خواہ مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں اس کی وجہ شاید وہاں مسلمانوں کا اتحاد ہے۔ ہمیں اس اتحاد کو توڑنے کے لیے وہاں اپنی کچھ قوتوں کو حرکت دینا ہوگی۔"

چند ثانیے گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر ایہود شابک بولا۔ "ہم عنقریب شام کی کچھ باغی قوتوں کو کیمیائی ہتھیار دینے والے ہیں۔ پھر امریکا ہمارے اشارے پر وہاں جنگی کارروائی کرنے کا جواز حاصل کرتے ہی اس پر چڑھ دوڑے گا۔ جس کا اختتام بالآخر عراق کو لے ڈوبے گا۔ اس طرح ہم رفتہ رفتہ امت مسلمہ کا دنیا سے نام ونشان ہی مٹا دیں گے۔ (خاکم بدہن)

"ویسے عربوں سے ہمیں سب سے زیادہ خطرہ تھا مگر امریکا نے انہیں ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے کنٹرول کر رکھا ہے ورنہ..... اگر ان میں اتحاد ہو گیا تو امریکا سمیت ہماری لٹیا بھی ڈوب جائے گی۔" شمعون نے لقمہ دیا۔

پینل کے آڑ میں چھپی بیٹھی بازغہ یہ سب سن رہی تھی، اور اس کے دل و دماغ میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ آج اسے صحیح معنوں میں اپنے لوگوں اور اپنی قوم کا بھیانک چہرہ بے نقاب ہوتا دکھائی دے رہا تھا جو اسے کچھ..... بلکہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

ابھی وہ اپنی سازشوں کی کھچڑی میں بدمست ہوئے جارہے تھے کہ اچانک موساد کے میجر بارق شمعون کو اپنے ہیڈ کوارٹر سے ایک کال موصول ہوئی جسے سن کر اس کا چہرہ سکتے میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

لیلیٰ اپنے گروپ کے پانچ مجاہدوں کے ہمراہ مطلوبہ مقام پر وقت مقررہ پر پہنچ چکی تھی جسے انہوں نے اپنی اصطلاح میں بلیک پوائنٹ کا نام دے رکھا تھا۔ رات اپنے نصف پہر سے آگے کو سرک چکی تھی۔ یہ سب ایک تاریکی کا حصہ بنے کھجور کے ایک جھنڈ میں دبک کر بیٹھ گئے تھے۔ نیم پختہ صحرائی راستہ بل کھاتا ہوا دور تاریکی میں گم ہو رہا تھا۔ فلک بیکراں پر ماہ تمام کسی روشن قندیل کی طرح بیچوں بیچ جھولتا محسوس ہو رہا تھا۔ جس کی چٹکی ہوئی چاندنی صحرا میں طلسماتی ضوفشانی کیے ہوئے تھی۔ ایک سحر سا طاری تھا ماحول پر..... یہ سب دھڑکتے دلوں کے ساتھ گھات لگا کر بیٹھ گئے۔

اچانک انہیں سامنے سے ایک روشنی نمودار ہوتی دکھائی دی۔

"ہوشیار باشند۔" مدور نما روشنی کو دیکھ کر لیلیٰ نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کرنے کے لیے سرسراتی سرگوشی کر ڈالی۔

وہ رسد سپلائی کرنے والا ٹرک ہی تھا جس کا رخ موساد کے ہیڈ کوارٹر کی طرف تھا۔ ابونصر نے انہیں اس سلسلے میں گائڈ کیا تھا کہ ٹرک میں دو سے زیادہ سوار نہیں ہوتے۔ یعنی ایک ڈرائیور اور دوسرا ہیلپر۔

ٹرک قریب آتا جارہا تھا۔ ٹھیک اس وقت منصوبے کے مطابق لیلیٰ کا ایک ساتھی حرکت میں آیا اور عین ٹرک کے راستے پر چت لیٹ گیا۔ لیلیٰ اور اس کے ساتھیوں کی عقابی نظریں قریب آتے ٹرک پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ درمیانی رفتار سے آرہا تھا۔ اچانک اس کی رفتار دھیمی پڑنے لگی۔ ان کے دل یکبارگی دھڑکے۔ منصوبہ یہی تھا کہ ڈرائیور..... راستے میں بے سدھ پڑے انسان کو دیکھ کر ذرا دیر کے لیے اپنا ٹرک روک دے گا اور پھر یہی موقع ہوگا اسے چھاپنے کا..... مگر دوسرے ہی لمحے ایک عجیب بات ہوئی جس نے ایک لمحے کے لیے ان پانچوں کو دہلا کر رکھ دیا۔

(جاری ہے)

مجھے پتا چلا تھا کہ پروفیسر اشفاق عثمانی صاحب کچھ ڈائریاں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سیکڑوں لوگوں کی ڈائریوں میں سے بیس ڈائریاں انہوں نے منتخب کی تھیں۔ یہ ذاتی ڈائریاں تھیں لیکن لکھنے والوں کی رضامندی سے شائع ہو رہی تھیں۔ ممکن ہے کہ ان کے مندرجات میں سے کچھ حصے حذف بھی کیے جا رہے ہوں۔ یہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی زندگی کا احوال تھا۔ ان کے شب و روز کی کہانی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان ڈائریوں میں زندگی کے سارے رنگ تھے۔ بچوں کی معصومیت اور شوخی، بڑوں کی محبت اور نفرت، جوان دلوں کی دھڑکنیں، ملنا بچھڑنا اور بچھڑ کر ملنا، دشمنیاں، بھائی چارے، زن، زر، زمین کے مسائل اور ان کے حل۔ غرض سب کچھ ان ڈائریوں میں موجود تھا۔ میری اطلاع کے مطابق پروفیسر اشفاق نے ان میں سے دو ڈائریاں ''بہترین'' کے طور پر منتخب کی تھیں۔ ایک سب سے



دو ڈائریاں

طاہر جاوید مغل

انسان اس دنیا میں ایک ہی بار پیدا ہوتا ہے اور ایک ہی بار موت کی آغوش میں جاتا ہے لیکن... وہ کیسا بدنصیب تھا جو روز جیتا اور روز مرتا تھا... عجب امتحان تھا... ایک شخص کے دن رات دو انداز میں کیسے گزر سکتے ہیں مگر وہ گزار رہا تھا۔ اسے ڈائری لکھنے کا شوق تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کبھی ان بے جان صفحات میں زندگی بھی دوڑ جائے گی... پوری دلکشی اور توانائی سے بھرپور ایک مکمل زندگی، جیسے وہ کسی کا خواب ہو!... جیسے ماں کی کوئی خاص دعا ہو۔

ایک ماں اور بچے کے شعور اور لاشعور کی دل گرفتہ منظر کشی

امید افزا اور خوش کن ڈائری۔ دوسری سب سے [illegible]می اور پُردرد ڈائری۔

پروفیسر اشفاق عثمانی سے میری پرانی یاد اللہ تھی۔ دو تین دن پہلے ان ڈائریوں کے حوالے سے ہی فون پر ہماری طویل بات چیت ہوئی تھی۔ آج میں پروفیسر اشفاق کی منتخب کردہ دو خاص ڈائریوں کو دیکھنے ہی ان کے گھر پہنچا تھا۔

کوٹھی کے گیٹ پر ہی انہوں نے میرا استقبال کیا اور ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ آٹھ سال پہلے ان کی بیوی کی وفات ہوئی تھی اور وہ اکیلے ہی رہتے تھے۔ دیکھنے میں بھی وہ پروفیسر ہی نظر آتے تھے۔ چھریرا بدن، سفید لیکن گھنے بال، چھوٹی سی ڈاڑھی اور عینک۔ جب ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہے تھے ایک مرد اور عورت ڈائننگ روم میں سے نکلے۔ وہ پروفیسر صاحب کے کوئی ملنے والے تھے۔ دونوں ادھیڑ عمر میاں بیوی تھے۔ انہوں نے اشفاق صاحب سے جانے کی اجازت چاہی۔ اشفاق صاحب نے اصرار کیا کہ وہ کھانا کھا کر جائیں لیکن انہوں نے کہا کہ اب آپ کے مہمان آگئے ہیں، اس لیے اجازت دیجیے پھر ملاقات ہوگی۔ مرد اچھے اخلاق کا مالک اور خوش باش لگتا تھا۔ میری نظر صرف ایک دو لمحے کے لیے عورت کے چہرے پر پڑی اور یہ چہرہ جیسے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا۔ یہ ایک درمیانی عمر کی عورت کا عام سا چہرہ تھا۔ اسے قبول صورت کہا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے خاوند کی طرح پروفیسر اشفاق سے مسکرا کر بات کر رہی تھی اور جانے کی اجازت چاہ رہی تھی لیکن جس چیز کی وجہ سے میں چونکا وہ اس کی آنکھیں تھیں۔ یہ آنکھیں ان کے بہ ظاہر مسکراتے چہرے سے بالکل جدا نظر آتی تھیں۔ ایک دم مختلف، جیسے وہ اس چہرے کی نہیں کسی اور چہرے کی آنکھیں ہوں۔ ان آنکھوں کے اندر غم اور یاس کی کیفیت ایک بہت بڑی جھیل کی طرح ٹھہری ہوئی تھی۔ ایک بے حد گہری لیکن خاموش جھیل۔ اس کے جانے کے بعد میں کتنی ہی دیر اس کی آنکھوں کے کرب کو محسوس کرتا رہا۔

''یہ کون لوگ تھے؟'' میں نے پروفیسر اشفاق سے پوچھا۔

''بس ان ڈائریوں کے کرداروں میں سے دو کردار تھے۔ ایک ڈائری میں سے کچھ حصے حذف کرانا چاہتے تھے۔'' اشفاق صاحب نے مختصر جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور پوچھتا، اشفاق صاحب کا فون آگیا، وہ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ میں ایک طرف الماری میں رکھی ان ڈائریوں کو دیکھنے لگا جو اشاعت کے [illegible] مرحلے میں داخل ہونے والی تھیں۔ یہ مختلف سائز کی چھوٹی بڑی ڈائریاں تھیں۔ کچھ بوسیدہ تھیں، کچھ نسبتاً بہتر حالت میں دکھائی دیتی تھیں۔ اشفاق صاحب نے ڈائریوں کے اندر کہیں کہیں کاغذ کی نشانیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ ان بیس عدد ڈائریوں کے علاوہ بھی درجنوں ڈائریاں ایک دوسری الماری میں موجود تھیں۔

چائے کے بعد ہم جلد ہی اصل موضوع پر آگئے۔ اشفاق صاحب مجھے وہ ڈائریاں دکھانا چاہتے تھے جو ان کے انتخاب کے مطابق سب سے خوش کن اور سب سے دردناک ڈائریاں کہلائی جا سکتی تھیں۔ یہ فروری کی ایک پُربہار شام تھی۔ کھڑکیوں سے باہر شفق کے رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ اشفاق صاحب نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''کہو طاہر! پہلے کون سی ڈائری دیکھنا چاہو گے۔ ہیپی اینڈ یا ٹریجک اینڈ؟''

''جیسے آپ کی مرضی۔''

''چلو، میں تمہیں بتاتا نہیں ہوں کہ یہ ہیپی اینڈ والی ہے یا ٹریجک اینڈ والی۔ تم دیکھو اور خود ہی اندازہ لگاؤ۔ تمہاری دلچسپی بھی برقرار رہے گی، ان میں سے ایک ڈائری لمبی ہے، دوسری نسبتاً مختصر۔''

''چلیں ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

انہوں نے سیاہ جلد والی ایک موٹی ڈائری اٹھائی۔ اسے آہستہ سے کھولا۔ پہلے صفحے پر لکھا تھا...... محمد انیس۔ کلاس 9th...... ایڈریس، کریسنٹ ٹاؤن، پیکو روڈ، ملتان روڈ، لاہور۔

اشفاق صاحب نے پہلے آٹھ دس صفحے بغیر پڑھے پلٹ دیے۔ پھر ایک صفحے پر رک گئے۔ اس صفحے پر 18 مارچ 2007ء کی تاریخ درج تھی۔ انیس نے لکھا تھا۔

''آج اچھا دن گزرا۔ کبھی کبھی اسکول کی کتابیں دیکھ لیتا ہوں۔ آج بھی کچھ دیر نویں کلاس کی انگلش کی کتاب پڑھتا رہا۔ ویسے ابو کہتے ہیں کہ مجھے فی الحال اپنی ساری توجہ قرآن پاک کے حفظ کی طرف رکھنی چاہیے۔ حفظ کے بعد دوبارہ اسکول کی پڑھائی شروع کر دیں گے۔ آج مدرسے میں چھٹی تھی۔ دوپہر کو میں نے تھوڑی دیر سیپارے کی دہرائی کی پھر طلحہ کے ساتھ کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔ کمپیوٹر گیمز کے بعد کرکٹ کھیلنا مجھے سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ آج محلے کے لڑکوں کے ساتھ ہمارا میچ تھا۔ میں نے تیس اسکور بنائے اور بالنگ بھی کی۔ ٹانگوں اور کمر میں درد ہونے لگا۔ پتا نہیں کیوں آج کل جسم میں کبھی کبھی درد ہوتا ہے۔ امی کہتی

ہیں، میں اپنی خوراک کی طرف توجہ دوں۔ وہ مجھے زبردستی دودھ اور کیپسول پلانے کی کوشش بھی کرتی رہتی ہیں۔''

پروفیسر اشفاق نے چند صفحے پلٹے پھر 8 مئی 2007ء کی تاریخ کی ڈائری پڑھنی شروع کی۔ انیس نے لکھا تھا۔

''گرمیاں شروع ہوگئی ہیں۔ باہر کی کھیل کود تو بہت کم ہوگئی ہے۔ ہاں کمپیوٹر گیمز وغیرہ کھیل لیتے ہیں یا پھر کبھی کوئی کارٹون فلم دیکھ لیتے ہیں۔ طلحہ مجھ سے چھوٹا ہے لیکن گیم کھیلنے میں کبھی کبھی مجھے ہرا بھی دیتا ہے۔ چھوٹی ایمن خاموشی سے ہمیں کھیلتے دیکھتی رہتی ہے۔ فیڈر ہر وقت اس کے منہ میں رہتا ہے۔ کل ابو کہہ رہے تھے کہ چھٹیوں میں مری کا پروگرام بنائیں گے۔ آٹھ دس روز رہیں گے۔ ابو کو پہاڑوں سے بہت محبت ہے۔ وہ باقاعدہ کوہ پیمائی کرتے ہیں اور دوستوں کے ساتھ دور دراز کے سفر پر نکل جاتے ہیں۔ مجھے بھی گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔ ہوسکتا ہے، کسی دن میں بھی ابو کی طرح کے ٹو اور نانگا پربت کے راستوں پر جاؤں۔ مجھے باہر کی دنیا دیکھنے کا بھی بڑا شوق ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میرے پاس ایک ہوائی جہاز ہو جس میں ہم سب گھر والے بیٹھیں اور پوری دنیا میں چکر لگائیں۔ جہاں جی چاہا اتر گئے، جب جی چاہا چل پڑے۔ پچھلے دنوں مجھے بخار ہوگیا تھا۔ کئی دن دوا کھانا پڑی ہے۔ دراصل چند سال پہلے میرا ٹانسلز (گلے کا) آپریشن ہوا تھا۔ تب سے کبھی کبھی انفیکشن ہو جاتا ہے۔ بہرحال اب ٹھیک ہوں اور دل ہی دل میں مری کا پروگرام بنا رہا ہوں۔ آپی اور طلحہ بھی بہت خوش ہیں۔ آپی کبھی کبھی مجھ سے ناراض ہو جاتی ہیں لیکن وہ دل کی بہت زیادہ اچھی ہیں...... بجلی گئی ہوئی ہے۔ یو پی ایس چل رہا ہے اور میں ڈائری لکھ رہا ہوں۔''

قریباً ڈیڑھ مہینا بعد کی تاریخ میں انیس نے لکھا تھا۔

''آج کل مری میں ہیں۔ بہت انجوائے کر رہے ہیں۔ ایمن کی شرارتیں سارا دن ہمیں ہنساتی رہتی ہیں۔ بہت تیز ہوگئی ہے۔ ہر وقت میری گود میں چڑھی رہتی ہے۔ مجھے بھی اس سے بہت پیار ہے۔ کل میں نے مال روڈ سے کرکٹ کا بیٹ اور گیند خریدی ہے، لیکن یہاں مری میں کھیلنے کی جگہ تو نہیں ہے۔ ابو کہتے ہیں کہ مجھے تفریح کے ساتھ ساتھ حفظ سیپاروں کی دہرائی بھی کرتے رہنا چاہیے۔ ان کی شدید خواہش ہے کہ میں جلد از جلد قرآن پاک حفظ کرلوں۔ میں بھی دل و جان سے کوشش کر رہا ہوں کہ پیارے ابو کی خواہش پوری ہو مگر پتا نہیں کیا بات ہے، تھوڑی دیر پڑھتا ہوں تو طبیعت گھبرانے لگتی ہے، ایسے لگتا ہے، سر پھٹ رہا ہے۔ کل ابو سے تھوڑی سی ڈانٹ بھی پڑی ہے۔ آج دوپہر تک دہرائی کی ہے۔ شکر ہے آج طبیعت ٹھیک رہی ہے۔ ہاں پرسوں رات کو ہلکا سا بخار ہوگیا تھا لیکن دوا کے بغیر ہی آرام آگیا۔ پتا نہیں کبھی کبھی یہ بخار کیوں ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے کئی ایسی چیزیں کھانے نہیں دی جاتیں جو میں شوق سے کھانا چاہتا ہوں۔ مثلاً ٹماٹو کیچپ، دہی بڑے، آلو چھولے، آئس کریم وغیرہ وغیرہ۔ خیر ابو اس کی کسر دوسری طرح پوری کر دیتے ہیں۔ جو چیزیں میں کھا سکتا ہوں وہ میرے لیے چپکے سے علیحدہ لے آتے ہیں۔ ابو امی کو میری صحت کا بہت زیادہ خیال رہتا ہے۔''

بیس پچیس دن بعد انیس نے اس طرح ڈائری لکھی تھی۔ ''...... نزلے زکام کی دوائیں کھا کھا کر میرا برا حال ہوگیا ہے۔ کبھی کبھی تو میں امی سے، دوا نہ کھانے کے لیے جھگڑ پڑتا ہوں۔ بعد میں افسوس بھی ہوتا ہے کہ اتنی پیاری امی کو ناراض کیا۔ مری سے جو بیٹ اور گیند لے کر آئے تھے وہ اسی طرح پڑے ہیں۔ آج کل کھیلنے کو بھی بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ کچھ دیر ٹی وی دیکھتا ہوں تو بھی سر میں درد ہونے لگتا ہے اور آنکھوں میں بھی۔ ابو کہہ رہے تھے کہ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔ ابو کمپیوٹر پروگرامر ہیں، ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کرتے ہیں۔ بہت تھکے ہوئے گھر آتے ہیں۔ روز کہتے ہیں کہ آج ڈاکٹر کے پاس جائیں گے...... آج جائیں گے۔ مدرسے میں بھی آج کل بالکل دل نہیں لگ رہا۔ بڑے حافظ جی نے ابو سے شکایت کی ہے کہ انیس پڑھنے کی طرف زیادہ دھیان نہیں دے رہا۔ جتنی دیر میں اس نے پندرہ سیپارے حفظ کیے ہیں، اسے بیسویں بائیسویں سیپارے پر ہونا چاہیے تھا۔ آج بھی مدرسے جانے کو میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ امی کچھ دیر مجھ سے سرکھپاتی رہی ہیں۔ اب باورچی خانے میں میرے لیے باداموں والا حلوا تیار کر رہی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مجھے دماغی طاقت کی ضرورت ہے۔ دماغی طاقت تو تب آئے گی جب میں حلوا کھاؤں گا۔ مجھے پتا ہے پہلے کی طرح یہ حلوا بھی آپی اور طلحہ کے کام ہی آئے گا۔''

دو ہفتے بعد کی تاریخ میں درج تھا۔ ''...... آج کا دن بہت برا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ابو نے مجھے مارا۔ میں مدرسے جانے سے انکار کر رہا تھا۔ پہلے تو وہ مجھے پیار سے سمجھاتے رہے لیکن جب میں نہیں مانا تو انہیں غصہ آگیا۔ انہوں نے مجھے تھپڑ مارے۔ میں روتا ہوا اوپر کمرے میں چلا گیا اور دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ آپی، امی وغیرہ

مجھے دروازہ کھولنے کے لیے کہتی رہیں لیکن میں نے نہیں کھولا۔ پھر ابو بھی آگئے۔ وہ سب پریشان تھے کہ میں دروازہ نہیں کھول رہا ہوں۔ آخر کافی دیر بعد میں نے دروازہ کھولا۔ امی مجھے اپنے ساتھ لگا کر روتی رہیں۔ انہوں نے ابو سے کہا۔ ''یہ پہلے ایسا کب تھا۔ اب بیمار ہے اس لیے ضدیں کر رہا ہے۔''

ابو نے کہا۔ ''اور کچھ نہیں ہے۔ بس ہمارے زیادہ لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ ابھی اسے کہو کہ چھت پر پتنگ اڑائے تو فوراً چلا جائے گا۔''

''بہرحال رات تک ابو کا غصہ اتر چکا تھا۔ دفتر سے آئے تو بہت دیر تک مجھے مناتے رہے، میرا سر گود میں لے کر دباتے رہے۔ پھر میرے پاؤں دبانے لگے۔ میں پھر رونے لگا۔ آج ٹھنڈے دل سے سوچ رہا ہوں تو یہی لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، میرے بھلے کے لیے ہی کہتے ہیں۔ وہ میرے اسکول کی پڑھائی دوبارہ شروع کرنے سے پہلے مجھے حافظِ قرآن دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی بہت بڑی خواہش ہے، اور...... میں یہ خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے ابو امی کو بہت خوش دیکھنا چاہتا ہوں لیکن کیا کروں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں نے سوچا ہے چند دن آرام کے بعد پھر مدرسے جانا شروع کر دوں گا اور جان مار کر پڑھوں گا۔ کل رات ابو مجھے بڑے بڑے ڈاکٹر صاحب کے پاس بھی لے کر گئے تھے۔ میرے ایک دو ٹیسٹوں کی رپورٹیں تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ دوائیں دی ہیں۔ آہ...... پھر وہی کڑوی، بدبودار دوائیں، دل خراب ہوتا رہتا ہے۔ کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہتا۔ ہفتے کو سارے چچا اور ان کے بچے پکنک پر گئے تھے۔ سارے کزن کھا پی رہے تھے اور کھیل کود بھی رہے تھے لیکن میں ایک طرف بیٹھا رہا۔ ان کے بار بار کہنے کے باوجود کھیل میں شامل نہیں ہوا۔ تایا ابو نے کہا۔ ''انیس! تم تو کرکٹ کے دیوانے تھے اور کھیلتے بھی بہت اچھا تھے۔ اب کیا ہوگیا؟''

امی نے کہا۔ ''مری سے بڑے شوق سے گیند بیٹ لے کر آیا تھا۔ وہیں کا وہیں پڑا ہے۔ ہاتھ تک لگا کر نہیں دیکھا۔''

''تایا ابو مجھے سمجھانے لگے کہ اس طرح الگ تھلگ نہیں رہتے۔''

اشفاق صاحب نے ڈائری کے کئی صفحے پلٹ دیے اور پھر ایک جگہ سے پڑھنا شروع کیا۔ تاریخ تھی 18 ستمبر 2007ء ...... اس تاریخ کے نیچے انیس نے اپنی ترچھی لکھائی میں لکھا تھا۔ ''موسم کافی بدل گیا ہے۔ ہوا میں ٹھنڈک آگئی ہے۔ مدرسہ چھوڑتے ہوئے کافی دکھ ہوا۔ ساتھیوں کو بھاری دل کے ساتھ خدا حافظ کہا۔ بہرحال ابو نے کہا ہے کہ یہ تبدیلی عارضی طور پر ہے۔ ابھی میں اسکول جاؤں گا اور میٹرک کا امتحان دوں گا۔ اس کے بعد دوبارہ قرآن پاک کے حفظ کی طرف آجاؤں گا۔ آج کل ہومیوپیتھک دوا شروع کی ہوئی ہے۔ سر کا درد کچھ ٹھیک ہے۔ لیکن ہفتے دو ہفتے میں ایک بار بخار ضرور ہو جاتا ہے۔ اسکول کی کتابیں پھر سے نکل آئی ہیں۔ پرانے سبق دہرا رہا ہوں۔ ابو نے طلحہ کے اسکول میں ہی داخلہ دلوایا ہے۔ وہ خود اسکول چھوڑ کر آتے ہیں۔ جب سے ڈاکٹری دوا چھوڑی ہے، کھانا کھانے کو دل چاہتا ہے۔ ابو نے ویک اینڈ پر چائنیز کھلانے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ آئی لو چائنیز...... اینڈ چکن برگرز۔ اور ساتھ میں ننھی ایمن بھی ہو تو آؤٹنگ کا مزہ آجاتا ہے۔ وہ مجھ سے بہت مانوس ہے۔''

2 اکتوبر 2007ء۔ ''کل چائنیز کھانے گئے تھے۔ کھانے سے پہلے ہی طبیعت کچھ خراب تھی ٹھیک سے کھایا بھی نہیں گیا۔ کھانے کے کچھ ہی دیر بعد الٹیاں آنا شروع ہوگئیں۔ تیز بخار بھی ہوگیا۔ رات ایک بجے ڈاکٹر کے پاس گئے۔ اس نے انجکشن لگایا اور دوا دی۔ بخار اترا تو نہیں لیکن کچھ کم ہوگیا ہے۔ سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ کچھ کھانے کو دل نہیں چاہتا۔ امی ابو بہت پریشان ہیں۔ پتا نہیں میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ لگتا ہے جیسے خوشی مجھے راس ہی نہیں آتی۔ سوچتا تھا کہ اسکول جانا شروع کروں گا تو مجھے اچھا لگے گا اور طبیعت بھی شاید کچھ ٹھیک ہو جائے لیکن اب طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی ہے۔ بخار تو پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا۔ تایا، چچا اور ماموں وغیرہ آئے ہوئے تھے۔ ابو کو مشورہ دے رہے تھے کہ کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھائیں۔ تایا کہہ رہے تھے کہ انیس کا منہ سوجا ہوا لگ رہا ہے۔ رنگ بھی پیلا ہے۔ یہ اندر سے ٹھیک نہیں ہے۔ ایمن سے پیار کرنے کو بڑا دل چاہتا ہے لیکن بخار کی وجہ سے میں اسے خود سے دور رکھتا ہوں۔ امی بھی اسے یہی کہتی ہیں کہ بھائی کے ساتھ زیادہ نہ چپکو۔ سارے کزن حارث، بلال، احمد علی، ریحان وغیرہ باہر کرکٹ کھیل رہے ہیں۔ محلے کے بچے بھی ہیں۔ ان کی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی ہیں۔ پتا نہیں میں کب ٹھیک ہوں گا اور ان کے ساتھ کھیل سکوں گا؟''

اس سے چند دن بعد انیس نے 22 اکتوبر کی تاریخ میں لکھا تھا۔ ''ابو نے ڈاکٹر طارق کے کہنے پر میرے کچھ ٹیسٹ کرائے تھے۔ پرسوں ان کی ساری رپورٹیں مل

گئیں۔ ابو اور امی مجھے لے کر ڈاکٹر طارق کے پاس گئے اور رپورٹس دکھائیں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ چپ سے ہوگئے۔ انہوں نے کہا رپورٹس ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ کلمہ چوک میں ڈاکٹر عطاالرحمٰن سے رابطہ کریں اور رپورٹس دکھائیں۔ کل ابو اور تایا جان مجھے لے کر ڈاکٹر عطا کے پاس پہنچے۔ انہوں نے رپورٹس دیکھیں۔ پھر میرا چیک اپ کیا، اس کے بعد مجھے تھوڑی دیر باہر جانے کے لیے کہا۔ وہ اکیلے میں ابو اور تایا سے کچھ بات کرنا چاہتے تھے۔ کچھ دیر بعد ابو اور تایا باہر آئے تو ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ دونوں بالکل گم صم تھے۔ میں سمجھ گیا کہ معاملہ خراب ہے۔ انہوں نے مجھے کھل کر کچھ نہیں بتایا۔ بس اتنا کہا کہ ایک اور جگہ چیک کرانا ہے۔ ہم گاڑی پر روانہ ہوئے۔ جب گاڑی شوکت خانم اسپتال کی طرف مڑی تو میرے دل کو کچھ کچھ ہونے لگا۔ مجھے زیادہ پتا تو نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ کینسر کا اسپتال ہے۔ اسپتال میں ہم نے کوئی دو گھنٹے گزارے۔ دو تین ڈاکٹروں نے میری رپورٹیں دیکھیں۔ پھر اکیلے میں ابو سے بات کی۔ میں اور تایا جان باہر بیٹھے رہے۔ مجھے تیز بخار بھی تھا۔ بار بار پیاس لگ رہی تھی۔ ابو باہر آئے۔ وہ اور تایا جان آپس میں سرگوشیوں میں بھی بات کرتے رہے۔ ایک دو فقرے میرے کانوں میں بھی پڑے۔ تایا کہہ رہے تھے...... ہر تکلیف کا علاج ہے۔ اللہ شفا دینے والا ہے۔ ان دونوں کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ شوکت خانم والوں نے مجھے داخل نہیں کیا۔ شاید ان کے پاس میری تکلیف کا علاج نہیں ہے۔ یا پھر کوئی واقفیت وغیرہ ہونی چاہیے۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ کل سے گھر کا ماحول بڑا پریشانی والا ہے۔ امی کا رنگ ہلدی ہے۔ بار بار ابو سے پوچھ رہی ہیں کہ ڈاکٹروں نے کیا بتایا ہے۔ ابو انہیں بس گول مول سا جواب دیتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ابو اور تایا ابو کے درمیان طے ہوا ہے کہ ابھی گھر میں کچھ نہ بتایا جائے۔ ابو کا چہرہ بالکل اترا ہوا ہے۔ انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ میں نے انہیں زندگی میں اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا...... سوچتا ہوں کہ کہیں مجھے کینسر ہی تو نہیں ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ یہ بہت بری بیماری ہے۔ آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اگر واقعی یہ کینسر ہے تو پھر کس چیز کا ہے۔ مجھے تو صرف بخار رہتا ہے یا سر میں درد ہوتا ہے۔ اللہ کرے یہ کوئی اور تکلیف ہو۔ اللہ کرے میرے امی ابو کی پریشانیاں دور ہوجائیں۔ بخار کے انجکشن کے بعد اس وقت طبیعت کچھ بہتر ہے۔ میں کمرے میں ڈائری لکھ رہا ہوں۔ ساتھ والے کمرے میں امی پھر ابو سے سوال جواب کررہی ہیں شاید۔

آٹھ دس دن بعد کی تاریخ میں انیس نے لکھا تھا۔

"میرے سامنے کوئی نہیں روتا لیکن آپی اور امی کی سرخ آنکھیں دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ وہ آج کل بہت رو رہی ہیں۔ سارے تایا، چچا اور ان کی فیملیاں بھی بے حد افسردہ ہیں۔ کوئی مجھ سے کھل کر بات نہیں کرتا۔ آج کل میں کینال روڈ لاہور کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل ہوں۔ بہت خرچہ ہے، زیادہ تر امی میرے پاس رہتی ہیں۔ کل ابو جان میرے پاس تھے۔ عشا کی نماز کے بعد وہ بہت دیر تک دعا مانگتے رہے۔ پھر انہوں نے میرا سر گود میں لیا اور ہولے ہولے دبانے لگے۔ مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے دھیمی نرم آواز میں کہا۔ "انیس! خوشی غمی، صحت بیماری، سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ مرض بعد میں پیدا کرتا ہے پہلے اس کا علاج پیدا کرتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔"

میں نے ہمت کرکے پوچھا۔ "ابو! کیا مجھے...... کینسر ہے؟"

ان کا چہرہ زرد ہوگیا۔ میرے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولے۔ "لیکن انیس...... اب یہ کوئی لاعلاج بیماری نہیں ہے۔ اس کا مکمل علاج ہے۔ بہت جلد تم بالکل ٹھیک ہوجاؤ گے۔ بس شرط یہی ہے کہ دوا کھانی ہے اور ڈاکٹروں نے جو پرہیز بتایا ہے وہ کرنا ہے۔ صرف تازہ جوس، صرف چھلکے والے پھل اور بیکری کی کوئی چیز نہیں۔"

میں نے کہا۔ "لیکن ابو! مجھے تو برگر اور سینڈوچ بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"بس کچھ دیر کے لیے انیس! پھر تم سب کچھ کھاؤ گے۔ سب کچھ پہلے کی طرح ہوجائے گا۔ تم کھیلو کودو گے، اسکول بھی جاؤ گے، دوستوں کے ساتھ گھومو پھرو گے بھی۔"

میں نے کہا۔ "مجھے اسکول کے دوست بہت یاد آتے ہیں ابو اور مدرسے کے بھی...... جی چاہتا ہے کہ پھر مدرسے میں جانا شروع کردوں۔"

ابو بولے۔ "ضرور...... تم مدرسے بھی جاؤ گے۔ باقی کا قرآن پاک حفظ کرنا ہے، اور ضرور کرنا ہے۔ میٹرک کا امتحان دے کر سب سے پہلے یہی کام کرنا ہے۔"

"میں بہت سوچتا رہا کہ ابو سے اپنی بیماری کے بارے میں پوچھوں۔ ان سے پوچھوں کہ اگر مجھے کینسر ہے تو کس طرح کا کینسر ہے لیکن ہمت نہیں پڑی۔ یہاں کی ڈاکٹر ثمینہ بہت اچھی ڈاکٹر ہیں۔ امی سے دوستوں کی طرح بات کرتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ انیس، مجھے اپنے بچوں کی طرح لگتا ہے۔ وہ

شاید ابو سے کوئی کمپیوٹر پروگرام بھی بنوانا چاہتی ہیں اپنے کلینک کے لیے۔''

آٹھ دن بعد کی ڈائری کچھ اس طرح تھی۔ ''اسپتال میں آج چودہ پندرہ دن ہو چکے ہیں۔ آج کا دن میرے لیے بہت زیادہ تکلیف والا رہا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ دکھ والا رہا ہے۔ ایمن میرے پاس آنے کے لیے مچل رہی تھی۔ امی نے اسے میری گود میں بٹھا دیا۔ وہ بڑے پیار سے میرے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ چھوٹی چھوٹی شرارتیں کرنے لگی۔ میں چکن چاول کھا رہا تھا۔ ایمن نے میرے چمچ سے تھوڑے سے چاول لے کر اپنے منہ میں ڈالنا چاہے۔ پاس ہی نانا ابو بیٹھے تھے۔ انہوں نے جھپٹ کر ایمن کا ہاتھ پکڑ لیا اور ڈانٹ کر بولے۔ ''کیا کرتی ہو، پتا نہیں چلتا تمہیں؟''

''انہوں نے اسے چاول منہ میں نہیں ڈالنے دیے۔

''مجھے بہت دکھ ہوا۔ کیا میری بیماری اتنی بری ہے کہ کوئی میری جھوٹی چیز نہیں کھا سکتا۔ میں نے سوچا ہے، اب کبھی ایمن یا طلحہ کو اپنی جھوٹی چیز نہیں دوں گا۔ مجھے ان سے بہت پیار ہے، بہت زیادہ۔ میں انہیں اپنے زیادہ پاس بھی نہیں آنے دیا کروں گا۔ بس دور سے دیکھا کروں گا اور باتیں کیا کروں گا۔

''تائی جان نے ایمن کو دوسری پلیٹ میں چاول ڈال کر دے دیے۔ میں نے ابو کو نانا ابو سے کہتے سنا، جھوٹا کھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ دیر بعد میں نے بڑے ماموں کی آواز سنی۔ وہ موبائل فون پر کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ شاید کسی کو میری تکلیف کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ان کا ایک فقرہ میرے کانوں میں پڑا۔ اس فقرے نے مجھے سر سے پیر تک ہلا دیا ہے۔ یہ فقرہ اس طرح تھا۔ ''ہاں جی...... یہ خون میں ہے...... بہت سخت علاج ہو رہا ہے۔ جی...... جی ہاں...... بہت تیز دوائیاں ہیں......''

''تو کیا میرے خون میں بیماری ہے؟ خون میں کینسر ہے؟ یعنی بلڈ کینسر...... جہاں تک مجھے پتا ہے بلڈ کینسر تو بہت بری چیز ہوتی ہے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم نانا کے گھر گئے ہوئے تھے، ہم نے ٹی وی پر ایک فلم دیکھی تھی۔ اس میں ایک بندے کو بلڈ کینسر تھا۔ وہ بہت دل دکھانے والی اور رلانے والی فلم تھی۔ کیا...... واقعی میں بھی اسی بیماری کا شکار ہوں۔ کیا کچھ عرصے بعد مجھے بھی مر جانا ہے؟ میں آج شام بہت دیر تک چپ کر کے لیٹا رہا ہوں اور سوچتا رہا ہوں...... مر کر لوگ کہاں جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ یہ دوسری دنیا کیا ہوتی ہے؟ میرا دل امی کے بارے میں سوچ کر بہت زیادہ دکھتا ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا، تو امی کیا کریں گی، ابو کیا کریں گے؟ وہ تو میری سانس کے ساتھ سانس لیتے ہیں...... اور میری چھوٹی سی گڑیا، میری ایمن، کیا میں اسے کبھی نہ دیکھ سکوں گا......؟

مجھے یہ سوچ کر رونا آنے لگا۔ میں کروٹ بدل کر لیٹ گیا اور چہرہ چھپا کر دیر تک روتا رہا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں۔ امی اس وقت باہر نماز پڑھ رہی تھیں۔ ان کے واپس آنے سے پہلے پہلے میں نے آنکھیں اچھی طرح صاف کر لیں۔ میں امی کو پتا نہیں چلنے دینا چاہتا کہ میں رو دیا ہوں۔ وہ تو پہلے ہی میرے لیے بہت پریشان ہیں۔ بالکل آدھی رہ گئی ہیں۔ مجھے پتا ہے، وہ بھی روتی رہتی ہیں۔ شاید اسی طرح چھپ کر جس طرح آج میں رویا ہوں۔ ابو نے مجھے کہا ہے کہ میں بیماری سے لڑنے کے لیے بہادر بنوں۔ میں بہادر بنوں گا۔ اب کبھی نہیں روؤں گا۔ امی کی خاطر کبھی نہیں روؤں گا۔''

3 مئی 2008ء۔ ''آج کافی دنوں بعد ڈائری لکھ رہا ہوں۔ دوبارہ اسپتال میں داخل ہونا پڑا تھا لیکن اب گھر آ چکا ہوں۔ آج کل گرمی پڑ رہی ہے۔ ابو نے بڑے کمرے سے اے سی اتروا کر میرے کمرے میں لگا دیا ہے۔ وہ مجھ پر بے دریغ پیسے خرچ کر رہے ہیں۔ ان دنوں پرائیویٹ اسپتال میں میری کیموتھراپی ہو رہی ہے۔ ہر ہفتے قریباً پندرہ ہزار کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اسپتال میں ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے بھاری چارجز ہیں۔ اس کے علاوہ جب Germs کچھ بڑھ جاتے ہیں اور تھراپی ذرا سخت ہوتی ہے تو پیسے بھی زیادہ دینے پڑتے ہیں۔ بڑے ڈاکٹرز بھی موجود ہوتے ہیں کبھی نہیں ہوتے۔ جب وہ موجود نہیں ہوتے تو چھوٹے ڈاکٹر اپنی سمجھ کے مطابق تھراپی کی دوا گھٹاتے بڑھاتے رہتے ہیں۔ ابو پرائیویٹ جاب کرتے ہیں۔ تنخواہ بہت زیادہ تو نہیں ہے لیکن وہ بڑے حساب سے چل رہے ہیں۔ پرسوں میں نے امی اور ابو کو ساتھ والے کمرے میں بات کرتے سنا۔ امی روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ جیسے بھی ہوا، انیس کا علاج کروائیں گے۔ چاہے اس کے لیے گھر ہی کیوں نہ بیچنا پڑے۔ ابو تسلی دے رہے تھے کہ گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جب میں اسپتال میں تھا اور ایک دم خرچے کا بہت بوجھ پڑ گیا تھا تو تایوں اور چچاؤں نے بھی ہر طرح کا تعاون کیا۔ سب کی ایک ہی خواہش ہے، میں جلد سے جلد ٹھیک ہو جاؤں۔

کیموتھراپی کافی سخت ہوتی ہے۔ دو تین دن نڈھال پڑا رہتا ہوں۔ ابو دفتر میں ہوتے ہیں۔ کیموتھراپی کے لیے عام طور پر جنید بھائی یا ضیا بھائی لے کر جاتے ہیں۔ امی بھی ساتھ ہوتی ہیں۔ جنید بڑے تایا کے اور ضیا چھوٹے تایا کے بیٹے ہیں۔ جب ہم کیموتھراپی کے لیے جاتے ہیں تو ایمن کو بڑے تایا کے گھر چھوڑ جاتے ہیں۔ ایمن کی سالگرہ آنے والی ہے۔ میں اس دفعہ اس کے لیے کوئی بہت اچھا تحفہ خریدنا چاہتا ہوں۔ مجھے بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ اس سے پیار ہے۔ اس کے لیے کوئی چیز خریدنے کے لیے میں گھنٹوں بھی بازار میں پھرتا رہوں تو مجھے کوئی تھکاوٹ نہیں ہوتی۔ میں تحفے کے لیے پیسے جمع کررہا ہوں۔ پتا نہیں دل بھی کبھی بہت اداس ہو جاتا ہے۔ ہر چیز غیر لگنے لگتی ہے۔ دل میں عجیب عجیب خیال آتے ہیں۔ پھر میں اپنے ایک دوست کے کزن شیروانی کے بارے میں سوچتا ہوں۔ شیروانی میری ہی عمر کا ہے اور میرے ہی جیسی بیماری کا شکار ہے۔ شیروانی کینیڈا میں پیدا ہوا تھا۔ وہیں پلا بڑھا ہے، اس کے والدین بہت عرصے سے وہیں رہتے ہیں۔ اوٹاوا کے ایک اسپتال میں دو سال سے شیروانی کا علاج ہو رہا ہے اور وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے، بیماری لاعلاج نہیں ہے، میں بھی ٹھیک ہو سکتا ہوں اور کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں ٹھیک ہو رہا ہوں۔ آج کل ہم نانا کے گھر آئے ہوئے ہیں۔ امی اور آپی بازار گئی ہیں۔ میں چھت پر بیٹھ کر ڈائری لکھ رہا ہوں۔ میں ڈائری کو بہت چھپا کر رکھتا ہوں۔ بس امی کو پتا ہے کہ میں کبھی کبھی ڈائری میں کچھ لکھتا ہوں۔“

......شام اب رات میں بدل چکی تھی۔ اشفاق صاحب کے گھریلو ملازم نے مزید چائے لاکر رکھ دی۔ اشفاق صاحب نے اگلے پندرہ بیس صفحے ایسے ہی پلٹ دیے۔ غالباً ان میں کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔ چھوٹے چھوٹے واقعات تھے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور چھوٹی چھوٹی تکلیفیں۔ کبھی طبیعت کا خراب ہو جانا، کبھی بحال ہو جانا۔ خاندان میں ہونے والی شادیوں کا ذکر، عیدوں کا ذکر اور سالگرہوں کا تذکرہ۔ پھر انہوں نے ایک صفحہ کھولا اور بہ غور دیکھنے لگے۔ ایک گہری سانس لے کر پڑھنا شروع کیا۔ تاریخ تھی 18 مئی 2009ء۔ لکھا تھا۔ ”آج کل ہم مری میں ہیں۔ تایا اور چچا کی فیملیاں بھی ساتھ ہیں۔ بہت انجوائے کر رہے ہیں۔ میری طبیعت بہت اچھی رہتی ہے۔ وزن بھی بڑھ گیا ہے۔ کھانے پینے کو دل چاہتا ہے۔ سر کے بال جو بہت ہلکے ہو گئے تھے، اب بہتر ہو گئے ہیں۔ کل چھوٹے تایا کہہ رہے تھے، ماشاءاللہ اب تو جوان ہو گئے ہو۔

“مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہ میں ایک بار پھر اپنے بہن بھائیوں اور کزنوں کے ساتھ کھیل کود سکتا ہوں۔ ہر طرح کی تفریح کر سکتا ہوں۔ ہم یہاں فلیٹ میں رہ رہے ہیں۔ آج فلیٹ کے سامنے ہی ہم نے کرکٹ بھی کھیلی ہے۔ تایا، چچا، ابو سب کھیل میں شامل تھے۔ بہت مزہ آیا۔ اگلے سنڈے کو لاہور واپسی ہوگی کیونکہ پیر کو کیموتھراپی ہونی ہے۔ تھراپی کے ساتھ ساتھ ٹیسٹ بھی ہو رہے ہیں۔ کبھی کبھی خون بھی لگانا پڑتا ہے۔ ضیا بھائی اور دیگر کزن خون کا انتظام کر دیتے ہیں۔ علاج شروع ہوئے اب قریباً ڈیڑھ سال ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ بہت اچھی ڈاکٹر ہیں۔ وہ شعبے کی انچارج ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔ فروری میں جب مجھے خون لگانا پڑا تھا اور میں اسپتال میں داخل ہوا تھا تو وہ ہر روز میرے پاس آتی تھیں۔ مجھ سے اور امی سے دیر تک باتیں کرتی تھیں۔ ایک دو بار گھر سے میرے لیے کھانا پکا کر بھی لائیں۔ چند مہینے پہلے جب میری طبیعت خراب تھی تو ابو بھی کبھی سوچتے تھے کہ شاید کسی باہر کے ملک میں میرا علاج زیادہ اچھا ہو سکے۔ ابو کا خیال تھا کہ اگر مجھے باہر لے جانے کی ضرورت پڑی تو شاید ڈاکٹر ثمینہ اس سلسلے میں مدد کر سکیں۔ ان کے دو تین ڈاکٹر عزیز کینیڈا میں ہیں۔ بہرحال اب طبیعت بحال ہے اور دن بدن بہتر ہو رہی ہے۔“

21 مئی 2009ء ”ابھی ہم مری میں ہی ہیں۔ پتا نہیں، میرے ساتھ ہمیشہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جب میں خوش ہوتا ہوں تو کچھ نہ کچھ اس طرح کا ہو جاتا ہے جو بہت دکھی کر دیتا ہے۔ کل ہم سب لوڈو کھیلتے رہے۔ بہت ہنسی مذاق ہوا، بہت مزہ آیا۔ مغرب کے وقت جب میں واش روم میں وضو کر رہا تھا۔ مجھے چھینک آئی اور اس کے ساتھ ہی ناک سے خون نکلنا شروع ہو گیا۔ میں بہت گھبرایا لیکن میں نے کسی کو بتایا نہیں ہے۔ سب بہت خوش ہیں۔ میں ان کی خوشی کو خراب کرنا نہیں چاہتا۔ ڈرتا ہوں کہ دوبارہ کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ کل ہی سے سر بھی کچھ بھاری بھاری ہے۔ امی کچھ چونکی ہوئی سی ہیں۔ بار بار پوچھ رہی ہیں، کیا بات ہے میں نے ان کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ اپنی کسی پریشانی یا تکلیف کو چھپانا اور چہرے پر مسکراہٹ رکھنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے اس کا پتا آج چلا ہے۔“

25 مئی 2009ء بروز پیر ”آج مشکل دن تھا...... بہت ہی زیادہ مشکل۔ یوں لگتا ہے کہ جسم میں جان ہی نہیں رہی۔ امی ابو آپی، سب کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ تین روز

پہلے ہم مری سے واپس آگئے تھے۔ پرسوں پیر کو کیموتھراپی ہونا تھی۔ ہم کیموتھراپی کے لیے گئے۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے بلڈ کی رپورٹ دیکھ کر کہا کہ آج تھراپی نہیں ہوگی۔ رپورٹ ٹھیک نہیں ہے۔ مزید تفصیل بڑے ڈاکٹر صاحب بتائیں گے۔ امی ڈاکٹر ثمینہ کو فون کرتی رہیں لیکن ان سے رابطہ نہیں ہوا۔ وہ رات بڑی بے چینی سے گزری۔ اگلے روز خیال تھا کہ ڈاکٹر ثمینہ سے ملاقات ہوگی۔ لیکن ان سے پہلے ایک دوسرے ڈاکٹر صاحب نے ملاقات کی۔ یہ بھی سینئر ڈاکٹر ہیں۔ مختار رندھاوا نام ہے، اپنے کمرے میں موجود تھے۔ انہوں نے مجھے باہر جانے کو کہا اور ابو اور تایا سے بات کرنے لگے۔ میں باہر تو چلا گیا تھا لیکن دروازے کے پاس ہی تھا۔ وہ آوازیں میرے کانوں تک پہنچیں جنہوں نے مجھے سر سے پیروں تک ہلا دیا۔ ڈاکٹر مختار، ابو اور تایا کو بتا رہے تھے کہ کینسر خون سے ہڈیوں تک چلا گیا ہے۔ رپورٹ بہت خراب آئی ہے۔ ڈاکٹر مختار اور تایا جان کی باتوں سے یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ شاید روٹین کے بلڈ ٹیسٹ میں کچھ دیر ہوئی ہے جس کی وجہ سے دیر سے پتا چلا ہے۔ ابو اور تایا غمزدہ تھے اور کچھ سخت لہجے میں بھی بات کر رہے تھے۔ ڈاکٹر مختار کہہ رہے تھے کہ اگر پہلے بھی پتا چل جاتا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا تھا۔ جو مرض نکل آیا ہے، وہ بس نکل آیا ہے۔ وہ ابو کو ''بون میرو ٹرانسپلانٹیشن'' کا بتا رہے تھے۔ یعنی ہڈیوں کے گودے کی تبدیلی۔

پھر کچھ دیر بعد ابو اور تایا باہر آئے تو ان کے ماتھوں پر پسینے کی چمک تھی...... بہت افسردہ دکھائی دیتے تھے۔ میں نے ان پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ گھر میں سوگ کی سی کیفیت ہے۔ تایا اور چچا بھی آئے ہوئے ہیں۔ سب چپکے چپکے باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بڑے بوجھل دل کے ساتھ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہونا ہے؟''

چار پانچ روز بعد 29 مئی بروز جمعہ کی تاریخ میں انیس نے لکھا تھا۔ ''اتوار کے روز میرا دوست سلمان اور اس کے ابو میری خیریت معلوم کرنے آئے ہوئے تھے۔ سلمان وہی دوست ہے جس کا کزن شیروانی کینیڈا میں رہتا ہے۔ شیروانی میری ہی طرح بیمار تھا۔ لیکن اب وہ کافی حد تک ٹھیک ہو چکا ہے۔ پچھلے دنوں وہ اپنے ابو امی اور بہنوں کے ساتھ اٹلی کی سیر کو گیا ہوا تھا۔ سلمان کے ابو، باہر کے ملکوں میں علاج معالجے کی سہولتوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ میرے اندازے کے مطابق، ابو اور تایا چچا وغیرہ بھی آج کل اسی موضوع پر باتیں کر رہے ہیں۔ ان کا خیال بھی یہی ہے کہ میں جس اسپتال میں رہا ہوں وہاں علاج کا وہ معیار نہیں، جو ہونا چاہیے تھا۔ مجھے کسی اور اسپتال لے جانے یا پھر باہر کے ملک لے جانے کے بارے میں بھی سوچا جا رہا ہے۔ ابو کا خیال ہے کہ ڈاکٹر ثمینہ شاید اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکیں۔ ان کے عزیزوں میں سے کئی ڈاکٹرز ہیں جو کینیڈا میں ہیں۔ امی کو بھی ایک امید سی ہے کہ ڈاکٹر ثمینہ کچھ کریں گی۔ وہ مجھے اپنے گھر کے فرد کی طرح سمجھنے لگی ہیں۔ کل ان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ بھی افسردہ ہیں۔ انہوں نے ابو کو بتایا ہے کہ ہڈیوں کے گودے کی تبدیلی کے لیے میرے بہن بھائیوں میں سے کسی کو گودے کا عطیہ دینا پڑے گا۔ اس آپریشن کے لیے پاکستان میں بھی کم از کم 30 لاکھ روپیا چاہیے ہوگا (اور میرے خیال میں اس کے بعد بھی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ اللہ جانے یہ علاج کتنے فیصد کامیاب ہوتا ہے) یہ ایک بہت بڑی مصیبت ہے جو ہم سب پر آئی ہے۔ مجھ سے امی اور ابو کے چہرے نہیں دیکھے جا رہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ ہر رات کے بعد سویرا ہوتا ہے۔ پتا نہیں کہ میری رات کا سویرا کہاں ہے۔ اس وقت بھی ساتھ والے کمرے میں ابو، تایا اور ماموں وغیرہ سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں اور صلاح مشورہ کر رہے ہیں۔ ابو جیسے تھک ہار چکے ہیں۔ ٹوٹ چکے ہیں۔ ان سے میری تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ کسی وقت تو ان کا دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مجھے اپنے بازوؤں میں لیں...... اور کہیں دور لے جائیں۔ کسی ایسی جگہ جہاں کسی بیماری یا تکلیف کے خوفناک پنجے مجھ تک نہ پہنچ سکیں...... یہ بہت بُرے دن ہیں...... بہت ہی بُرے۔ کل ہم نے پھر ڈاکٹر ثمینہ سے ملنے جانا ہے۔ اللہ کرے کوئی راستہ نظر آ جائے۔ آج تو ڈائری لکھنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا لیکن اپنا دھیان ہٹانے کے لیے میں لکھ رہا ہوں۔ کسی گھر میں شاید ریڈیو بج رہا ہے۔ گیت کی آواز آ رہی ہے۔ مجھے دل سے نہ بھلانا۔ چاہے روکے یہ زمانہ۔ مجھے ایسے گیت اچھے لگتے ہیں۔''

3 جون 2009ء کی تاریخ میں تحریر تھا۔ ''ڈاکٹر ثمینہ سے ملنے گئے۔ وہ بہت مصروف تھیں مگر ہمارے آنے کا سن کر انہوں نے ہمیں فوراً اندر بلا لیا۔ ابو کے علاوہ امی بھی میرے ساتھ تھیں۔ ڈاکٹر ثمینہ بہت غمزدہ دکھائی دیتی تھیں مگر میرے سامنے انہوں نے کوئی مایوسی والی بات نہیں کی۔ انہوں نے اس بات پر دبے لفظوں میں افسوس کا اظہار بھی کیا کہ بیماری کی ''گروتھ'' جاننے کے لیے میرا جو ٹیسٹ ہوتا

تھا اس میں دو ڈھائی ماہ کی تاخیر ہوئی...... جس کی وجہ سے مزید مشکل پیدا ہوئی۔ ہمارے بیٹھے بیٹھے وہ ساتھ والے چھوٹے کمرے میں گئیں اور انہوں نے کئی جگہ فون کیا۔ غالباً کینیڈا میں اپنے کسی عزیز سے بھی بات کی۔ آدھ پون گھنٹے بعد وہ باہر آئیں تو ان کے چہرے پر کچھ اطمینان سا تھا۔ انہوں نے میرا ماتھا چوما اور مجھے تھوڑی دیر باہر بیٹھنے کو کہا۔ ابو امی اور ڈاکٹر ثمینہ کوئی ایک گھنٹا گفتگو کرتے رہے۔ ڈاکٹر ثمینہ نے لیبارٹری سے میری کچھ رپورٹیں بھی منگوائیں۔ ہم تین بجے کے قریب اسپتال سے روانہ ہوئے۔ ابو اور امی کے چہرے پر امید کی روشنی سی تھی۔ میرے پوچھنے پر ابو نے بتایا۔ ''ہم کل اسلام آباد جا رہے ہیں۔''

''کس لیے ابو؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں کے ایک اسپتال میں ڈاکٹر ثمینہ نے تمہارا ایڈمیشن کرا دیا ہے۔ کہتے ہیں بہت اچھا اسپتال ہے۔ انشاءاللہ وہاں مکمل ٹریٹمنٹ ہوگی اور تم صحت یاب ہو کر آؤ گے۔''

''آج سارا دن سفر کی تیاری ہوتی رہی ہے۔ اس وقت بھی امی پیکنگ میں مصروف ہیں۔ ابو فون پر اسلام آباد بات کر رہے ہیں۔ وہاں ہمارے ایک دور کے چچا رہتے ہیں۔ ابو، امی، فی الحال ان کے پاس ہی ٹھہریں گے۔ ایمن کو بڑے تایا جان کے گھر اور آپی کو نانا کے گھر بھیج دیا گیا ہے۔''

13 جون 2009ء ......'' اسلام آباد کی پرفضا پہاڑیوں میں یہ ''دی گرین ہوپ اسپتال'' ہے۔ کافی کشادہ اور صاف ستھری عمارت ہے۔ یہاں جدید مشینیں اور ساری ضروری سہولتیں موجود ہیں۔ یہ اسپتال چند خوش حال افراد مل کر چلا رہے ہیں۔ اس کے کرتا دھرتا، کوئی مبشر صاحب ہیں۔ ابو بتا رہے تھے۔ مبشر صاحب نے لاہور اور راولپنڈی وغیرہ میں کئی رہائشی کالونیاں آباد کی ہیں۔ بہت امیر آدمی ہیں اور اتنے ہی نیک دل بھی ہیں۔ میں دس بارہ روز سے اس اسپتال میں ہوں۔ بس ایک بار ان کی تھوڑی سی جھلک دیکھی ہے۔ عمر ساٹھ پینسٹھ کے قریب ہے۔ بال بالکل سفید ہیں۔ کپڑے بھی سفید ہی پہنے ہوئے تھے۔ کھلتا ہوا رنگ، نرم لہجے میں بات کرتے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی دل میں ''کچھ اچھے'' کی امید سی جاگنے لگتی ہے۔ انہوں نے میرے کندھے پر بھی ہاتھ رکھا اور مختصر سی بات کی۔ ڈاکٹروں کا ایک گروپ ان کے ساتھ تھا۔

''کل ڈاکٹروں نے میری فائنل رپورٹس دیکھی ہیں۔ رائے یہی ہے کہ میرا بون میرو ٹرانسپلانٹ ہوگا۔ اسپتال میں جدید ترین سہولتوں کے باوجود خرچہ کافی کم بتایا جا رہا ہے۔ کل شام لاہور سے ڈاکٹر ثمینہ کا فون بھی آیا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ میرے آپریشن کو مزید سہل اور کم خرچ بنانے کی کوشش کر رہی ہیں اور انہیں امید ہے کہ ایسا ہو بھی جائے گا۔ ابو پیسے ارینج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں...... لگتا ہے کہ انہوں نے کافی حد تک انتظام کر بھی لیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بون میرو کون دے گا۔ ڈاکٹروں کے مطابق بون میرو یعنی ہڈی کا گودا سب سے زیادہ بہن بھائیوں کا میچ کرتا ہے۔ والدین کی میچنگ ہونے کے بھی بہت چانسز ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی بہت قریبی عزیزوں کا گودا بھی میچ کر جاتا ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ بتا رہی تھیں کہ باہر کے ملکوں میں ایسے ادارے بنے ہوئے ہیں جہاں سے بون میرو کا عطیہ مل سکتا ہے۔ ان اداروں کو ''بون میرو رجسٹریز'' کہا جاتا ہے۔ کاش ہمارے ملک میں بھی اس طرح کے کاموں کا رواج ہو جائے۔ اس گرین ہوپ اسپتال کا عملہ بہت تربیت یافتہ اور خوش اخلاق ہے۔ ہر طرح کا تعاون کرتا ہے اور مریضوں کی حوصلہ افزائی میں مصروف رہتا ہے۔ مجھے لاہور کا وہ اسپتال نہیں بھولتا، جہاں قریباً پونے دو سال میرا علاج ہوتا رہا ہے۔ وہاں کا ایک ڈاکٹر اور ایک دو نرسیں، امی ابو سے جس طرح کی باتیں کرتی رہی ہیں ان کی بھنک میرے کانوں میں بھی پڑی تھی۔ وہ سب مایوس کرنے والی باتیں تھیں، ہمت ختم کر دینے والی۔ ایک نرس نے تو ابو کو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اس اسپتال میں پچھلے ایک برس میں اس قسم کے کینسر کا ایک مریض بھی زندہ نہیں بچا۔ یہ بات سننے کے بعد میں کئی روز تک سخت ترین ڈپریشن میں رہا تھا۔ پھر میرے ذہن میں بار بار کینیڈا کے شیروانی کا خیال آیا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ شیروانی بچ سکتا ہے اور اس جیسے ہزاروں بچ سکتے ہیں تو میں بھی بچ جاؤں گا۔ یہاں گرین ہوپ اسپتال میں آنے کے بعد میری ساری امیدیں پھر سے تازہ ہونے لگی ہیں۔''

اشفاق صاحب نے سیاہ جلد والی ڈائری کے چند صفحے پلٹ دیے۔ پھر ایک صفحے پر رک گئے۔ انہوں نے دھیمی آواز میں پڑھنا شروع کیا۔ ''12 جولائی 2009ء بروز اتوار اللہ کا بہت شکر ہے، میں ایک بہت بڑے مرحلے سے سرخرو ہو کر نکلا ہوں، یہ ایک بہت بڑا اور مشکل کام تھا لیکن اللہ کی مدد اور گرین ہوپ اسپتال کے تعاون سے یہ سب کچھ ہو گیا ہے۔ میرے بون میرو کے کینسرزدہ Cells کو نئے Cells سے بدل دیا گیا ہے۔ اس کے لیے میرے پیارے ابو جان کا ''بون میرو'' استعمال ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی جیسے اپنے جسم سے نچوڑ کر

میرے جسم میں بھر رہی ہے۔ آٹھ دس دن وہ بھی بستر پر رہے ہیں اور ان کی ٹریٹمنٹ بھی ہوتی رہی ہے لیکن اب وہ ٹھیک ہیں۔ میرے جسم کی بجھتی ہوئی بتی میں بھی جیسے کسی نے پھر سے تیل ڈال دیا ہے۔ اب تازہ بون میرو نے میرے جسم میں نئے خون کی افزائش شروع کر دی ہے۔ میں بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ اسپتال کے ایم ڈی مبشر رحیم صاحب نے اس سلسلے میں خاص تعاون کیا ہے۔ ابو بتا رہے تھے کہ یہ سارا پروسیجر کسی دوسرے اسپتال میں ہوتا تو کم ازکم تین گنا خرچہ آتا اور پھر یہاں جو جدید سہولتیں ملی ہیں، ان کا تصور عام اسپتالوں میں کیا ہی نہیں جاسکتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسپتال کے ایک سینئر ڈاکٹر یہاں کمرے میں ابو کے پاس موجود تھے۔ انہیں بتا رہے تھے کہ رزلٹ بہت اچھے ہیں...... بیماری کے ''جرمز'' مکمل کنٹرول میں ہیں۔

''لاہور سے تمام قریبی عزیز یہاں آن موجود ہوئے ہیں۔ سب خوش نظر آتے ہیں۔ آپریشن کی کامیابی پر مبارکباد دے رہے ہیں۔ تایا ابو کہہ رہے تھے، انیس ٹھیک ہوتا ہے تو سب مل کر پہاڑی علاقوں کی لمبی سیر پر نکلیں گے۔ ڈیڑھ دو مہینے وہیں پر گزاریں گے۔ میں نے کہا۔ ''میں تو ابو کے ساتھ کے ٹو کے بیس کیمپ کی طرف جاؤں گا۔ ابو ایک غیر ملکی ٹیم کے ساتھ کے ٹو کے بیس کیمپ تک بلکہ اس سے آگے بھی جاچکے ہیں۔ انہوں نے جھیل سیف الملوک سے آگے ملکہ پربت سر کرنے والی مہم میں بھی حصہ لیا تھا۔ وہ اس ٹیم کے کپتان تھے۔ میں بھی وہ سب چوٹیاں، سب جھیلیں اور سارے منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں یہاں ایک بہت آرام دہ کمرے میں ہوں۔ شام کا وقت ہے کھڑکیوں سے باہر مارگلہ کی خوب صورت پہاڑیاں نظر آرہی ہیں اور ان سے آگے مری اور نتھیا گلی وغیرہ کی چوٹیاں۔ یہ بلندیاں مجھے اپنی طرف بلا رہی ہیں، یہ کھلی فضائیں مجھے پکار رہی ہیں۔ مجھے لگتا ہے...... میں پھر سے زندہ ہو رہا ہوں۔ اسپتال کے لانوں کی طرح میرے اندر بھی پھول سے کھل رہے ہیں۔

''موبائل کی بیل ہو رہی ہے۔ شاید لاہور سے ڈاکٹر آنٹی ثمینہ کا فون ہے۔ وہ مسلسل میرے حال سے باخبر رہتی ہیں۔ یس...... اٹ واز اے ویری گڈ ڈے۔ آج کی ڈائری ختم کرتا ہوں۔''

اس کے بعد میں نے اور پروفیسر اشفاق نے ڈائری کے پچیس تیس ورق طائرانہ نظروں سے دیکھے۔ ان صفحوں میں گاہے بگاہے لکھی گئی تحریروں کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا...... قریباً تین ماہ بعد انیس دی گرین ہوپ اسپتال سے ڈسچارج ہوا۔ لاہور پہنچ کر اس نے وہ کام مکمل کرنے کا فیصلہ کیا جو شدید بیماری کی وجہ سے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے قرآن پاک کے حفظ کو مکمل کرنے کا ارادہ کیا اور مدرسے میں داخل ہوگیا۔ ساتھ ہی میٹرک کی پڑھائی بھی شروع کر دی۔ موسم گرما کی چھٹیوں میں وہ سب لوگ بالاکوٹ، کاغان اور ناران کے علاقوں کی طرف نکل گئے۔ واپسی پر انیس نے اپنی ایک دیرینہ خواہش پوری کی۔ پنڈی سے لاہور تک ٹرین کی ایئر کنڈیشنڈ کلاس میں سفر کیا۔ انیس نے اپنا پرانا شوق بھی دوبارہ سے شروع کر دیا تھا۔ شام کے وقت وہ اور طلحہ کرکٹ کھیلنے جاتے تھے۔ کبھی کبھی اسکواش کا شوق بھی پورا ہوتا تھا۔ کرکٹ میں انیس کی بالنگ بہت اچھی ہوگئی تھی۔ چھٹی کے روز جو میچ ہوتے تھے ان میں انیس کے ساتھی اس کی شمولیت کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ انیس کا علاج جاری تھا اور گاہے بگاہے ٹیسٹ بھی ہوتا رہتا تھا۔

ڈائری پر 6 نومبر 2010ء کی تاریخ پر آکر اشفاق صاحب رک گئے۔ یہاں انیس نے لکھا تھا ''آج کا دن میرے لیے بہت زیادہ اہم اور خوشی والا ہے۔ میں نے قرآن پاک کا حفظ مکمل کرلیا ہے۔ یوں میرے ابو اور دادا مرحوم کی دیرینہ خواہش پوری ہوگئی۔ سب گھر والے بے حد خوش ہیں۔ ابو نے دیگ پکوائی ہے۔ سب کی دعوت کی ہے۔ مدرسے اور محلے میں بھی مٹھائی بانٹی گئی ہے۔ امی بار بار میرا ماتھا چومتی ہیں اور سر پر ہاتھ پھیرتی ہیں۔ ایمن اب قریباً چار سال کی ہوگئی ہے۔ ہر بات میں امی کی نقل اتارتی ہے۔ وہ امی کے انداز میں میرے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے اور ماتھا چومنے کی کوشش کرتی ہے۔ امی نے میرے تمام استادوں کے لیے کپڑے سلوائے ہیں۔ خوشی کے اس موقع پر آپی نے مجھے کتابوں کا سیٹ تحفے میں دیا ہے۔

''رات کو میرے اور ابو کے درمیان دیر تک بات ہوتی رہی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں عام تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کروں۔ میں عالم بننا چاہتا ہوں۔ ابو نے میری اس خواہش کی تائید کی ہے تاہم کہا ہے کہ مجھے دونوں کام ساتھ ساتھ جاری رکھنے کے لیے سخت محنت کرنا پڑے گی۔ میں محنت کے لیے تیار ہوں۔ اللہ نے مجھے صحت دی ہے۔ میں اس صحت اور تندرستی سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ مہربان ڈاکٹر ثمینہ سے بھی گاہے بگاہے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ وہ میری صحت کے سلسلے میں باخبر رہتی ہیں۔''

چند صفحات کے بعد 28 جنوری 2011ء کی تاریخ میں لکھا تھا۔ ''ڈائری لکھنے میں کبھی کبھی لمبا وقفہ آجاتا ہے۔

آج بھی قریباً ڈیڑھ ماہ بعد لکھ رہا ہوں۔ اس کی وجہ بڑھی ہوئی مصروفیت ہے۔ مدرسے کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ دوسری پڑھائی کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا ہے۔ میٹرک کے بعد اب آئی سی ایس کے لیے شام کی کلاسز میں داخلہ لے رکھا ہے۔ گھر میں کمپیوٹر کی تعلیم کا ماحول پہلے سے موجود ہے۔ ابو کمپیوٹر پروگرامر ہیں۔ آپی بھی بی سی ایس کر رہی ہیں۔ مجھے بہت آسانی ہے۔

''ساری مصروفیت کے باوجود میں اور طلحہ کرکٹ کے لیے تھوڑا بہت وقت نکال لیتے ہیں۔ کل سرکاری چھٹی تھی۔ ہم نے یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں میچ کھیلا اور جیتا۔ اچھی کارکردگی کی وجہ سے میں ایک بڑا کپ بھی گھر لے کر آیا۔ امی نے یہ کپ بھی میری دوسری ٹرافیوں کے ساتھ الماری میں سجا دیا ہے۔ میری کامیابی پر امی ابو کے چہرے پر جو خوشی نمودار ہوتی ہے وہ اس سارے دکھ درد کا ''مداوا'' بن جاتی ہے جو ڈیڑھ دو سال پہلے ہمیں بیماری کے سلسلے میں اٹھانا پڑا ہے۔''

آگے چل کر جولائی 2012ء کے حوالے سے ڈائری میں یہ تحریر موجود تھی۔ ''ابو نے وعدہ کر رکھا تھا کہ جب میں آئی سی ایس کا امتحان پاس کرلوں گا تو وہ مجھے میری من پسند ٹریٹ دیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ میں کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھانا چاہوں گا یا پھر مری وغیرہ کی سیر۔ لیکن رزلٹ آنے کے بعد میں نے ان کی توقع سے بڑھ کر چھلانگ لگائی۔ میں نے کہا کہ میں اپنا ایک دیرینہ سپنا پورا کرنا چاہتا ہوں۔ ان کے ساتھ کے ٹو کے بیس کیمپ تک جانا چاہتا ہوں۔ ابو ہماری کوئی بات ٹالتے نہیں ہیں چاہے اس کے لیے کتنی بھی دشواری اٹھانی پڑے۔ ویسے بھی انہیں میری طرف سے دہری خوشی ملی تھی۔ ایک تو آئی سی ایس کا رزلٹ، دوسرا عالم کورس کے دوسرے سال میں کامیابی۔ ابو رضامند ہوگئے۔ انہوں نے اپنے پرانے دوستوں سے رابطے کیے...... کوہ پیمائی کا سارا سامان جھاڑ پونچھ کر صاف کیا...... اور اس کا نتیجہ یہ ہے جی کہ اب میں اس وقت سطح سمندر سے قریباً 3900 میٹر کی بلندی پر کے ٹو کے بیس کیمپ میں موجود ہوں۔ ہماری چاروں جانب برف ہے۔ تیز یخ بستہ ہوائیں چل رہی ہیں اور ان ہواؤں میں ہمارے نیم گرم خیمے پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ میں ابو کے ساتھ اسی عظیم الشان چوٹی کے دامن میں موجود ہوں جس کی کہانیاں ہم ابو کی زبانی بچپن سے سنتے آئے ہیں۔ نیلگوں آسمان کو چھوتی ہوئی ''کے ٹو پیک'' ہمارے سامنے ہے۔ اس منظر کی دلکشی کو لفظوں

لطائف

سکھ بکرا ذبح کرنے لگا تو کنفیوز ہو گیا کہ پڑھنا کیا ہے؟

ایک لمحہ سوچنے کے بعد چھری چلاتے ہوئے جوش سے بولا۔ ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔''

٭٭٭

لڑکی آئس کریم کھاتے ہوئے بوائے فرینڈ سے بولی۔ ''مجھے کچھ ایسا کہو کہ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگ جائے۔''

لڑکا۔ ''میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

٭٭٭

دنیا میں دو نیٹ ورک سب سے فاسٹ ہیں۔

Female_2 _Email_1

ایک منٹ میں بات اِدھر کی اُدھر۔

٭٭٭

ایک ٹرک دوسرے ٹرک کو رسی سے باندھ کر لے جا رہا تھا۔

یہ دیکھ کے ایک سردار ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا اور کہنے لگا۔

''ایک رسی کو لے جانے کے لیے دو دو ٹرک۔''

٭٭٭

لڑکا بس اسٹاپ پہ کھڑی لڑکی سے بولا۔ ''ڈیئر کیا میں آپ کے گھر ڈراپ کر دوں اگر آپ کو کوئی پرابلم نہیں ہو تو؟''

لڑکی۔ ''جی بالکل۔''

لڑکا۔ ''جانا کہاں ہے؟''

لڑکی۔ ''لیاری جانا ہے۔''

لڑکا۔ ''باجی میرے خیال سے نامحرم لڑکی کو لفٹ نہیں دینی چاہیے اور مجھے نماز پڑھنے بھی جانا ہے۔''

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڑدی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ آج میری ایک بہت بڑی خواہش پوری ہوئی ہے۔"

22 دسمبر 2013ء "آج کل بالکل صحت یاب ہوں۔ آخری تھراپی کوئی ڈیڑھ سال پہلے ہوئی تھی۔ اب تو کسی طرح کی دوا بھی نہیں کھا رہا ہوں۔ ہاں کبھی کبھی چیک اپ کے لیے اسلام آباد میں گرین ہوپ اسپتال جاتا ہوں۔ اس اسپتال سے بہت سی اچھی یادیں وابستہ ہیں۔ ان یادوں میں سب سے نمایاں یاد اسپتال کے ایم ڈی مبشر رحیم صاحب کا مہربان چہرہ ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے ایک سال پہلے ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ اب ان کے سب سے بڑے بیٹے فہد صاحب خوش اسلوبی سے اسپتال کو چلا رہے ہیں۔

" آج کل میرے بی ایس سی کے سمسٹر چل رہے ہیں۔ دوسری طرف عالم کورس کا بھی چوتھا سال ہے۔ ابو میری کارکردگی سے بہت خوش ہیں۔ ابو کے آفس میں ہی انٹرن شپ کا پروگرام بن گیا ہے۔ امید ہے کہ وہیں پر اچھی جاب بھی آفر ہو جائے گی۔ امی آج کل وہی کچھ سوچ رہی ہیں جو تئیس چوبیس سالہ لڑکوں کی مائیں سوچتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں، اب میں بہت تھک گئی ہوں۔ مجھے ایک بہو کی ضرورت ہے۔ جو میرا دکھ سکھ سنے، میرا ہاتھ بٹائے۔ میں نے کہا۔ "امی دکھ سکھ سننے اور ہاتھ بٹانے کے لیے آپی جو موجود ہے۔"

وہ کہنے لگیں۔ "یہ کہیں اور دکھ سکھ سننے اور ہاتھ بٹانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ اسی سال اس کی شادی ہو جانی ہے، پھر میں بالکل اکیلی رہ جاؤں گی۔"

" امی سنجیدگی سے میرے بارے میں سوچ رہی ہیں۔ وہ انکل جمشید کی بڑی بیٹی سنبل کی بات کرتی ہیں۔ انکل جمشید سگے چچا تو نہیں ہیں لیکن رشتے میں چچا ہی لگتے ہیں۔ جب سے امی گھر میں سنبل کی بات کرنے لگی ہیں، میں بھی اسے ذرا غور سے دیکھتا ہوں اور وہ مجھے اچھی لگنے لگی ہے۔ مجھے اپنی امی کی پسند پر ہمیشہ یقین رہا ہے۔ انہوں نے جب بھی میرے لیے کوئی چیز چنی ہے، اچھی ہی چنی ہے شاید...... اسی وجہ سے...... یہ لمبے بالوں اور چمکیلی آنکھوں والی سنبل مجھے پسند آرہی ہے۔ بہت ہنس مکھ لڑکی ہے۔ جب بھی ہمارے گھر آتی ہے قہقہے سے بکھرنے لگتے ہیں۔ آپی کی طرح اسے بھی موبائل فون پر آنے والے "جوکس" سننے اور سنانے کا شوق ہے...... امی کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کرتی رہتی ہے۔"

کئی صفحے پلٹنے کے بعد اشفاق صاحب ایک صفحے پر آگئے جہاں ڈائری پر 28 فروری کی تاریخ لکھی تھی۔ تحریر اس طرح تھی۔ "آج ایک اور خوشی سے بھرپور دن ہے۔ بلکہ یہ مہینا ہی خوشی سے بھرپور رہا ہے۔ پندرہ تاریخ کو آپی کی شادی خوش اسلوبی سے انجام پائی ہے اور آج سنبل کے ساتھ میری منگنی ہوگئی ہے۔ ایک چھوٹی سی تقریب تھی لیکن بہت خوشگوار اور مزیدار۔ نئی نویلی دلہن آپی اور دولہا بھائی بھی اس تقریب میں بڑے جوش سے شریک ہوئے۔ سنبل بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اب اپنے منہ میاں مٹھو کیا بنوں، دیکھنے والے کہتے تھے کہ میں بھی خوب صورت لگ رہا ہوں۔ میرا قد چھ فٹ سے ایک آدھ انچ ہی کم ہے۔ سنبل میرے کان تک آرہی تھی۔ میں نے کہا۔ "تمہارا قد کان میں سرگوشی کرنے کے لیے بڑا مناسب ہے۔"

وہ بولی۔ "اور آپ کا سننے کے لیے۔"

" امی ابو ہم دونوں کو خوش دیکھ کر بہت خوش تھے۔ میں بی ایس سی بڑے اچھے نمبروں سے پاس کر چکا ہوں۔ آج کل ابو ہی کے آفس میں "انٹرن شپ" ہو رہی ہے۔ ابو کے آفس میں جاب تو آسانی سے مل سکتی ہے لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا راستہ خود بناؤں۔ جیسے ابو نے اپنے راستے خود بنائے اور کامیابیاں حاصل کیں۔ میں اپنے بل بوتے پر ابو اور امی کو کچھ بہت اچھا کر کے دکھانا چاہتا ہوں۔

" رات کے گیارہ بجے ہیں۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ڈائری لکھ رہا ہوں۔ ایمن اب تیسری کلاس میں ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے یہیں پر تھی۔ میری کمر پر جھولتی رہی ہے، کہہ رہی تھی...... بھیا! آپ کمانے لگے ہیں، مجھے نیا وڈیو گیم لے کر دیں۔ اب شاید وہ سونے کے لیے چلی گئی ہے۔ ابھی امی میرے پاس دودھ کا گلاس رکھ کر گئی ہیں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔ کہنے لگیں۔ "انیس! کوئی فون نہیں...... کوئی میسج نہیں...... کوئی رابطہ نہیں۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟ محنت اور صرف محنت...... میں بہت جلد تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

" میرے عالم کورس کے پانچ سال مکمل ہو چکے ہیں۔ دین کے علم نے میرے اندر ایک روشنی سی ابھر دی ہے۔ ایک ایسا اعتماد اور یقین بخشا ہے مجھے جس کا کوئی نعم البدل ہو ہی نہیں سکتا۔ آج کل میں نے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے۔ سب کہتے ہیں کہ ڈاڑھی مجھ پر بہت جچتی ہے۔ منگنی کی تصویریں بھی بہت خوب صورت آئی ہیں۔ امی ہر ایک کو دکھاتی پھرتی ہیں۔

میرا جی چاہتا ہے کہ میں بی ایس سی کے ساتھ عالم کورس کا فائدہ بھی اٹھاؤں۔ میرا ارادہ ہے کہ پکی جاب مل جائے گی تو تھوڑا سا ٹائم کسی مدرسے میں ٹیچنگ کے لیے دیا کروں گا۔ ارادہ ہے کہ یہ ٹیچنگ بغیر کسی معاوضے کے کروں

گا۔ ابو میں نے ابن ارادے سے استنے خوش ہیں کہ میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔''

کافی سارے صفحات پلٹنے کے بعد اشفاق صاحب ایک اہم صفحے پر آگئے یہاں تاریخ درج تھی 14 نومبر بروز پیر۔ اس تاریخ کی ڈائری کچھ اس طرح تھی۔ ''کیا زندگی اتنی خوب صورت بھی ہوسکتی ہے، کیا وقت اتنا مہربان بھی ہوسکتا ہے؟ کل اور پرسوں کے دن میری زندگی کے خوشگوار ترین دن تھے۔ پرسوں سنبل کے ساتھ میری شادی ہوئی ہے اور وہ سنبل جمشید سے سنبل انیس بن گئی ہے۔ ایک بہار کی طرح میری زندگی میں داخل ہوئی ہے اور چھا گئی ہے۔ ہمیشہ کی طرح میری امی کی پسند میرے لیے لاجواب ہے۔ کل ہمارا ولیمہ تھا۔ خوشیوں، رنگوں اور روشنیوں سے بھرپور، ایک یادگار تقریب۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس ساری تقریب میں اسلامی رنگ نمایاں تھا۔ میں کل ہی سنبل کے ساتھ اس کے گھر یعنی اپنے سسرال آگیا تھا۔ آج بھی وہیں ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے امی کا فون آیا تھا۔ ''انیس! بہت اداس ہوگئی ہوں۔ تم دور ہوتے ہو تو ایک دم اندر سے خالی ہوجاتی ہوں۔ کب لینے آئیں تمہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی آجائیں، لیکن آپ کی بہو شاید ابھی ایک دن اور رہنا چاہتی ہے۔''

سنبل نے میرے عقب سے گردن نکال کر ماؤتھ پیس میں کہا۔ ''نہیں امی جان! یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں بالکل تیار ہوں بلکہ اگر یہ نہیں آتے تو میں اکیلی آجاتی ہوں۔ دس منٹ کا تو رستہ ہے۔''

یہ بہت شوخ ہے اور امی کے ساتھ اور شوخ ہوجاتی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک میں اور سنبل ہنی مون کا پروگرام بنانے رہے ہیں۔ ابو کی طرح مجھے بھی پہاڑوں سے عشق ہے۔ جیسا کہ میں نے پیچھے لکھا ہے، میں کے ٹو کے کیمپ نمبر تین گیا ہوں اور کلب کی ٹیم کے ساتھ ملکہ پربت بھی دوبار سر کیا ہے۔ یہ بہت بڑی کامیابیاں ہیں اور مجھے ان پر فخر ہے۔ میں نے سنبل سے کہا ہے، ہم ''ہنی مون'' کے ٹو کے بیس کیمپ پر منائیں گے۔ وہ بولی۔ ''آپ کے ٹو کے اوپر ہی کیوں نہیں منا لیتے۔ گینز بک میں آپ کا نام آجائے گا۔''

''ہم دیر تک ہنستے رہے۔''

آگے چل کر انیس نے قریباً ایک سال بعد 3 دسمبر کی تاریخ میں لکھا تھا۔ ''زندگی میں غم اور خوشی، دھوپ اور چھاؤں کی طرح ہوتے ہیں۔ لیکن آج کل خوشیوں کی سنہری دھوپ میں ناخوشی کی پرچھائیاں سکڑ۔ ۔ ٹ کر رہ گئی ہیں۔

زندگی میں جیسے ہر طرف موسم گل ہے سب کچھ اچھا جا رہا ہے۔ سنبل کو پرندوں کا شوق ہے۔ اس نے چھت پر درجنوں نایاب طوطے اور چڑیاں رکھ چھوڑے ہیں۔ دوسری طرف مجھے پھولوں کا شوق ہے۔ خاص طور سے ایسے پھول جو پہاڑوں پر اگتے ہیں۔ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نایاب پھول لاتا ہوں اور باغیچے میں لگاتا ہوں۔ میں اور سنبل دونوں ایک دوسرے کے شوق سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پرندے ای کو بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ چند دن پہلے میں دو قیمتی طوطے لایا تھا۔ اس کے جواب میں آج سنبل نے مجھے دو خوب صورت پھول تحفے میں دیے ہیں۔ جی ہاں..... دو جڑواں پھول..... ایک ساتھ۔ ایک ننھی سی بیٹی اور ایک ننھا سا بیٹا۔ یہ دونوں بچے ایک آسانی تحفے کی طرح ہمارے گھر میں اترے ہیں، اور ہر طرف نور سا بکھر گیا ہے۔ بیٹی کو امی نے گھٹی پلائی ہے اور بیٹے کو ابو نے۔ دونوں کے نام ای نے رکھے ہیں۔ علیزا اور ذیشان۔ بڑی قسمت والے ہیں یہ بچے۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی میری پروموشن بھی ہوئی ہے۔ امید ہے تین چار مہینے بعد مجھے اپنے کام کے سلسلے میں آسٹریا بھی بھیجا جائے گا۔ یعنی Schengen ویزا۔ اس ایک ویزے پر پورا یورپ دیکھا جاسکے گا۔ شاید جاگتی آنکھوں کا ایک اور خواب پورا ہونے والا ہے۔''

ڈائری اب ختم ہو رہی تھی۔ کم اہم باتوں اور واقعات کو طائرانہ نظر سے دیکھتے ہوئے ہم ایک ایسے صفحے پر پہنچ گئے جس پر صرف ایک ماہ پہلے کی تاریخ درج تھی..... 28 جنوری۔ انیس نے لکھا تھا۔ ''پورے سات ماہ یورپ میں گزارنے کے بعد پرسوں پاکستان واپس آیا ہوں۔ جیسا کہ میں نے پیچھے بتایا ہے، پورے یورپ میں بہت گھوما پھرا ہوں۔ امریکا اور کینیڈا کا بھی ایک تیز رفتار دورہ کیا ہے۔ گھومنے پھرنے کی خواہش بڑی اچھی طرح پوری ہوئی ہے۔ اس سارے وقت میں ایک حسرت رہی ہے تو یہی کہ امی ابو میرے ساتھ نہیں تھے اور نہ سنبل اور باقی گھر والے۔ کاش اور کوئی نہیں تو ایمن ہی میرے ساتھ ہوتی۔ مجھے اس کے ساتھ گھومنے پھرنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ میں نے سب کو بہت بہت ''مس'' کیا ہے۔ کبھی کبھی بہت پریشان بھی رہا ہوں۔ اس ساری پریشانی کا مداوا یہاں آتے ہی سنبل نے کر دیا ہے۔ اس نے میرے باغیچے میں ایک اور پھول کا اضافہ کر دیا ہے۔ گول مٹول ستارہ آنکھوں والا گولو سا ذیشان۔ اس نئے پھول سے ہمارے آنگن کی سج دھج میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ میری آمد کی خوشی میں ابو نے گھر پر ایک گیٹ ٹو گیدر پارٹی رکھی تھی۔ یہ پارٹی ہمارے نئے بڑے گھر میں ہوئی ہے۔ بہت سے دیگر عزیز و اقارب اور احباب کے ساتھ ڈاکٹر آنٹی ثمینہ بھی آئی ہوئی تھیں۔ گزرتے ہوئے ماہ و سال نے انہیں تبدیل تو کیا ہے لیکن بہت زیادہ نہیں۔ وہ اب ہمیں اپنے گھر کے فرد کی طرح ہی لگتی ہیں۔ جب بھی گرین ہوپ اسپتال کا تصور ذہن میں آتا ہے تو آنٹی ثمینہ کا تصور بھی ذہن میں آجاتا ہے۔ یہ آنٹی ہی تو تھیں جنہوں نے ہمارے درد کو اپنے درد کی طرح محسوس کیا اور ہمیں گرین ہوپ اسپتال کا راستہ دکھایا۔ آج میں اور میرے اہلِ خانہ زندگی کی جن خوشیوں سے فیض یاب ہو رہے ہیں، ان کا حصول اللہ کی مدد اور گرین ہوپ اسپتال کی کوششوں سے ہی ممکن ہو سکا ہے۔''

اشفاق صاحب نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے ڈائری بند کر دی۔

تازہ چائے آگئی تھی۔ ہم دونوں چائے کے گھونٹ لیتے رہے اور اس ڈائری کے سحر میں کھوئے رہے۔ ایک نوجوان کی زندگی کے بہت سے نشیب و فراز ایک فلم کی طرح ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے تھے۔

چائے ختم کرنے کے بعد میں نے اشفاق صاحب سے کہا۔ ''جی جناب! بہت اچھی ڈائری منتخب کی ہے آپ نے۔ یقیناً پڑھنے والوں کو متاثر کرے گی۔ یقیناً یہ وہی ڈائری ہے جسے آپ خوش کن اور ہیپی اینڈ والی ڈائری کہہ رہے ہیں۔''

''ہاں، ایسا ہی ہے۔'' اشفاق صاحب نے تائید کی۔

''اس کا مطلب ہے کہ جو ڈائری ہیپی اینڈ والی نہیں ہے وہ زیادہ طویل نہیں ہوگی۔ آپ نے یہی کہا تھا نا کہ ایک ڈائری نسبتاً چھوٹی ہے۔''

''ہاں، ہے تو ایسا ہی۔'' انہوں نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ ڈائری کہاں ہے جناب؟''

انہوں نے پھر ایک لمبی سانس لی اور عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولے۔ ''طاہر..... وہ ڈائری نہیں ہے۔''

''نہیں ہے؟..... کیا مطلب..... اشفاق صاحب؟''

انہوں نے آنکھوں پر عینک جمائی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''یہ بس ایک ہی ڈائری ہے..... یہی ہیپی اینڈ والی ہے اور یہی دکھی اینڈ والی۔''

میں واقعی حیران تھا۔ ''میں کچھ..... سمجھ نہیں پایا اشفاق صاحب؟''

وہ عجیب انداز سے مسکرائے۔ ان کی آنکھوں میں

کوئی بھید سا تھا۔ انہوں نے سیاہ جلد والی ڈائری دوبارہ کھولی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ مختلف تاریخوں کو دیکھتے دیکھتے وہ اس تاریخ تک پہنچے جہاں انیس اور اس کے اہلِ خانہ کی پریشانیاں پورے عروج پر تھیں۔ وہ لاچاری کی تصویر نظر آرہے تھے۔ یہ تاریخ تھی..... 29 مئی 2009ء بروز جمعہ۔

اشفاق صاحب نے کہا۔ ''تم نے یہاں تک ڈائری پڑھی ہے طاہر!..... اور اس سے آگے بھی پڑھی ہے، تمہیں کچھ فرق محسوس ہوا ہے؟''

''کس..... طرح کا فرق..... اشفاق صاحب؟''

''یہ تم خود بتاؤ۔ تحریر کو غور سے دیکھو۔ تم خود بھی پڑھنے لکھنے والے بندے ہو۔ کیا فرق محسوس ہوتا ہے تمہیں؟''

میں بہ غور دیکھنے لگا۔ وہ چند سیکنڈ بعد خود ہی بول اٹھے۔ ''یہ دیکھو طاہر! معمولی سا فرق ہے لیکن موجود ہے۔ یہاں اس تاریخ تک ڈائری کی تحریر میں اور اگلی تحریر میں فرق ہے۔ یہ دیکھو۔ یہاں تک کی ساری تحریر ذرا ترچھے انداز میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اس کے بعد کے تمام صفحوں میں تحریر اس طرح ترچھی نہیں ہے۔ غور کرنے سے اس میں کچھ اور فرق بھی نظر آئیں گے۔ یہ تحریر انیس کے بجائے کسی اور نے لکھی ہے۔''

میں چکرا گیا۔ ''انیس نے..... کیوں نہیں لکھی؟'' میں نے پوچھا۔

وہ عجب درد بھرے انداز میں بولے۔ ''لکھنے کے لیے زندہ ہونا ضروری ہوتا ہے اور انیس اس تاریخ کے بعد زندہ نہیں تھا۔''

میں سرتاپا ہل گیا۔ ''اشفاق صاحب..... یہ کیا..... کہہ رہے ہیں آپ؟''

''ہاں طاہر۔'' انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''اس ڈائری میں 29 مئی 2009ء کی لکھی ہوئی تحریر انیس کی آخری تھی۔ چند دن بعد وہ مر گیا تھا۔''

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ وہ کینسر سے جانبر نہیں ہوا؟''

''نہیں۔''

''تو..... تو پھر، یہ باقی کی ڈائری..... یہ کس نے لکھی؟'' الفاظ میرے منہ میں ٹوٹ رہے تھے۔

''تم جب یہاں آئے تھے تو تم نے ایک مرد اور عورت کو یہاں سے نکلتے دیکھا تھا۔ تمہیں معلوم ہے وہ کون تھے؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اشفاق صاحب بولے۔

بادشاہ کی پسند

ایک بادشاہ نے اعلان کیا کہ جو میری پسند کا پھل لائے گا اسے اس پھل کے وزن کے برابر سونا انعام میں دیا جائے گا اور اگر پسند نہ آیا تو پھل لانے والے کو خود نگلنا پڑے گا۔ ایک مسلمان بیر لایا جو بادشاہ کو پسند نہ آئے تو اس نے وہ بیر آسانی سے نگل لیے۔ ایک ہندو سیب لایا، وہ بھی بادشاہ کو پسند نہ آیا اور بادشاہ نے ہندو کو سیب نگلنے کا حکم دیا۔ ہندو زور زور سے رونے لگا اور پھر اچانک ہی ہنسنے لگا۔ بادشاہ حیران ہوا اور اس سے ایسا کرنے کی وجہ پوچھی تو وہ بولا۔ ''روتا اس لیے ہوں کہ میں یہ سیب نہیں نگل سکتا اور ہنستا اس لیے ہوں کہ باہر ایک سردار جی تربوز لا رہے ہیں۔''

☆ ایک سکھ زمین دار کو مشاعرے کی صدارت کے فرائض پہلی مرتبہ تفویض کیے گئے۔ مشاعرے میں ایک شاعر کے پہلے ہی شعر کو بہت پسند کیا گیا اور سامعین نے مکرر مکرر کی صدائیں بلند کیں تو سردار جی مائیک پر ناگواری سے بولے۔ ''دیکھیے حضرات! آپ لوگ ایک ہی شعر کو ایک مرتبہ غور سے سنیں، شعرا کرام کو بار بار تنگ مت کریں۔''

مرسلہ۔ ناظم علی گورچانی، واجل

سنہری باتیں

☆ دنیا اگر ہاتھ سے نکل جائے تو بندہ غریب ہو جاتا ہے اور اگر یہ دنیا دل سے نکل جائے تو بندہ ولی بن جاتا ہے۔

☆ قابلیت اور کردار زندگی میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ قابلیت بلندی تک پہنچاتی ہے اور اچھا کردار ہمیشہ انسان کو بلند رکھتا ہے۔

☆ اچھے لوگوں سے کبھی کبھار کچھ غلط ہو جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ برے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسان ہیں۔

مرسلہ۔ ملک مزمل اسلم، میانوالی

"وہ انیس کی والدہ اور والد تھے...... تم نے اس عورت کو دھیان سے دیکھا تھا؟"

ایک دم میرے ذہن میں دو نہایت غمزدہ آنکھیں آگئیں۔ وہی آنکھیں جو عورت کے چہرے سے بالکل جدا نظر آتی تھیں۔ ان میں ایک خاموش غم تھا جو کسی جوت کی طرح جلتا تھا۔ میں ابھی تک ان آنکھوں کی کیفیت کو بھول نہیں پایا تھا۔

اشفاق صاحب نے کہا۔ "وہ بہت دکھی عورت ہے۔ سترہ سالہ بیٹے کو نہلا دھلا کر اور سفید لباس پہنا کر جنازے کی چارپائی پر لٹانا اور ہمیشہ کے لیے گھر سے رخصت کرنا کوئی آسان کام ہوتا ہے بھلا؟ اس عورت کو چند سال پہلے یہ کام کرنا پڑا تھا اور اس کے خاوند کو بھی کرنا پڑا تھا۔ وہ مرد ہے اور بہت حوصلہ مند ہے، وہ سنبھل گیا ہے...... لیکن یہ عورت ہے، ابھی تک اس بے پناہ دکھ کے حصار سے نکل نہیں سکی۔ بدلنے والے موسم، آنے والے تہوار اور خوشی کے سارے موقعے اسے اس کے جواں مرگ کی یاد دلاتے ہیں اور شاید آخری دم تک دلاتے رہیں گے۔"

میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "اشفاق صاحب! آپ ڈائری کی بات کر رہے تھے۔ 29 مئی کے بعد کی ڈائری انیس نے نہیں لکھی تو کس نے لکھی؟"

"اس کی ماں نے۔ اس عورت نے جسے تم نے دو تین گھنٹے پہلے دیکھا ہے۔ ہاں طاہر...... انیس کی ڈائری اس کی ماں نے مکمل کی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی زندگی کو تصور کی نگاہ سے دیکھتی رہی ہے۔ وہ حقیقت کی زندگی میں تو اس کے ساتھ نہ رہ سکی لیکن اس ڈائری میں اس نے اسے پروان چڑھایا ہے، جوان کیا ہے، اس کی تعلیم مکمل کی ہے، اس کے سر پر سہرا سجایا ہے، اس کے بچوں کی قلقاریاں سنی ہیں اور ان کے منہ چومے ہیں۔"

"اوہ گاڈ" میں اس کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا۔ کتنی ہی دیر بے یقینی کی کیفیت میں اشفاق صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ یہ کیا کہانی سنا رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے، یہ ایک ہی ڈائری ہے اور یہی سب سے خوشگوار، اور یہی سب سے دردناک ڈائری بھی ہے۔ جو پس منظر وہ بتا رہے تھے، اس کے مطابق تو شاید یہ بات ٹھیک ہی تھی۔

میں نے ڈائری کا وہ صفحہ پڑھنا شروع کیا جو بقول اشفاق صاحب انیس کا لکھا ہوا آخری روزنامچہ تھا۔ اس روزنامچے کے آخر میں انیس نے لکھا تھا۔ "ابو سے میری تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ کسی وقت تو ان کا دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مجھے اپنی بانہوں میں لے لیں...... اور کہیں دور لے جائیں۔ کسی ایسی جگہ جہاں کسی بیماری کے خوفناک پنجے مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔ یہ بہت برے دن ہیں، بہت ہی برے۔ کل ہم نے پھر ڈاکٹر ثمینہ سے ملنے جانا ہے۔ اللہ کرے کوئی راستہ نظر آجائے۔ آج تو ڈائری لکھنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا لیکن اپنا دھیان ہٹانے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ کسی گھر میں شاید ریڈیو بج رہا ہے۔ گیت کی آواز آرہی ہے۔ مجھے دل سے نہ بھلانا...... چاہے روکے یہ زمانہ......"

میں نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "انیس نے لکھا ہے کہ کل وہ پھر ڈاکٹر ثمینہ سے ملنے جارہے ہیں۔ تو کیا وہ اگلے دن ڈاکٹر ثمینہ سے ملنے گئے؟"

"ہاں گئے۔" اشفاق صاحب نے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"جو اس ڈائری میں نہیں لکھا...... اور جو حقیقت میں موجود ہے اور تمہیں پتا ہی ہے طاہر! حقیقتیں بڑی تلخ ہوتی ہیں۔ کڑوی، کسیلی اور کبھی کبھی بے رحم بھی۔ ان میں لچک نہیں ہوتی، انہونیوں کے لیے کشادہ راستے نہیں ہوتے...... تصورات کے رنگ نہیں ہوتے۔ یہ اکثر بے حس اور سفاک ہوتی ہیں۔ کسی کی طلاق کے کاغذ کی طرح، موت کے ٹیلی گرام کی طرح، قیدی کے بلیک وارنٹ کی طرح اور...... کینسر کی رپورٹ کی طرح......" وہ عجیب جذباتی انداز میں بول رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "اگلے روز انیس اور اس کے والدین اسپتال پہنچے تھے، ڈاکٹر ثمینہ سے ملے تھے۔ اس نے روکھے پھیکے اور لگے بندھے انداز میں جواب دیے...... بس جی حبیب صاحب، جو کچھ ہوا یہ کسی کے بس میں تو نہیں تھا۔ بیماری دب نہیں سکی۔ اب آپ کو "پروسیجر" فالو کرنا ہے اور وہ یہی ہے کہ بون میرو تبدیل ہو۔ ہمارے اسپتال میں اس کے اتنے اتنے اور "یہ یہ" خرچے ہوں گے۔ بہر حال آپ کہیں اور سے بھی پتا کرلیں...... وغیرہ وغیرہ۔"

"وہ بالکل پروفیشنل اور لاتعلق سی نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے عملے کی کسی بھی کوتاہی کے بارے میں بات کرنا بے کار تھا۔ اس کے بعد انیس کے اہلِ خانہ کی بھاگ دوڑ کا ایک اور سلسلہ شروع ہوا جو دس پندرہ دن جاری رہا۔ جواب ایک ہی تھا۔ بون میرو کی تبدیلی اور اتنے لاکھ روپے کا انتظام...... اور پھر بھی امید کی کرنیں معدوم۔ انیس کے والدین اور اس کے قریبی عزیزوں سے اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ بیماری بڑی خاموشی سے اسے دن بدن

ڈبو چتی چلی جارہی تھی۔ وہ ان کے سامنے تھا اور ان کے ہاتھوں سے نکل رہا تھا۔ مصائب اور ابتلا کے ان تاریک ترین دنوں میں انیس نے عمرے کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ اپنے بچے کی بے شمار دیگر خواہشوں کی طرح والد نے اس کی یہ خواہش بھی فوراً پوری کی۔ والد، والدہ، انیس اور انیس کے ایک تایا عمرے کے لیے گئے۔ خدا کے حضور سر جھکایا اور دعائیں کیں۔ یہ دعائیں اس طرح تو پوری نہ ہوئیں جس طرح یہ لوگ چاہتے تھے لیکن انہوں نے انیس کا باقی کا سفر آسان ضرور بنادیا۔ اس کے ساتھ اللہ نے ان سب لوگوں کو یہ بہت بڑی آزمائش جھیلنے کا حوصلہ بھی فراہم کیا۔ انیس کا باقی کا سفر کافی مختصر ثابت ہوا۔ وہ بہ ظاہر چل پھر رہا تھا لیکن اندر سے بیماری کے حملے اسے بسمار کرتے چلے جارہے تھے۔ انہی دنوں انیس نے یہ ارادہ بھی باندھا کہ وہ باقی کا قرآن پاک حفظ کرے گا اور عالم کا کورس بھی کرے گا لیکن اسے اپنے یہ ارادے پورے کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ بیماری سے لڑتے لڑتے نڈھال ہو چکا تھا اور پھر ایک دن وہ زخموں سے چور تھک کر گر پڑا۔ وہ کینسر سے اپنی طویل جنگ ہار گیا تھا۔ اسے برین ہیمرج ہوگیا۔ ناک سے خون رسنے لگا۔ بدحال والد نے اسے گاڑی میں ڈال کر اسپتال پہنچایا۔ وہ بے ہوش تھا...... اور آٹھ دن بے ہوش ہی رہا۔ کبھی ہوش میں نہ آسکا۔ اسپتال میں کئی دن اس کو مصنوعی تنفس دیا جاتا رہا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے حواس میں تو نہیں ہے لیکن شاید سن سب کچھ سکتا ہے۔ اب امید کی ہر کرن ڈوب چکی تھی۔ کسی بھی وقت کچھ ہوسکتا تھا۔ ایک دن غمزدہ والد آنسوؤں سے تر ڈاڑھی کے ساتھ اس کے قریب بیٹھ گئے۔ اس کے کان میں بولے۔ ''انیس جارہے ہو......؟ اچھا یار جاؤ۔ تم نے جانا ہی ہے۔'' پھر ذرا توقف سے بولے۔ ''وہاں پہنچو تو سب سے ہمارا سلام کہنا۔ ان سب سے جو ہم سے پہلے چلے گئے اور ہمیں بھی ایک دن جن کے پاس پہنچنا ہے......''

دیکھنے والوں کی آنکھیں نم ہوگئیں اور دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ انیس کی بند آنکھوں کے گوشوں سے دو آنسو نمودار ہوئے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا...... میں نے آپ کی بات سن لی میرے ابو۔

اور پھر وہ چلا گیا۔ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا۔ تاریخ تھی 8 اگست 2009ء اور وہ ہفتے کی دردناک سہ پہر تھی۔

اشفاق صاحب خاموش ہوگئے۔ ان کی پیشانی پر درد کی سلوٹیں تھیں۔ میں بھی گم صم بیٹھا رہا۔ اس انوکھی ڈائری میں چھپی کہانی پر غور کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ ''تو کیا وہ سب کچھ تصوراتی تھا اشفاق صاحب؟ میرا مطلب ہے ڈاکٹر ثمینہ کی مہربانیاں، وہ گرین ہوپ اسپتال، ایم ڈی مبشر رحیم، بون میرو کی تبدیلی......؟''

''ہاں طاہر...... وہ سب تصوراتی تھا۔ لیکن وہ ہو بھی سکتا تھا...... ہاں ہو نہ سکا۔ وہ سب کچھ انیس کے ساتھ ہی چلا گیا۔'' وہ چند لمحے خاموش رہے پھر بات جاری رکھتے ہوئے جذباتی انداز میں بولے۔ ''وہ سب کچھ انیس کے ساتھ ہی مرگیا۔ وہ شاندار اسپتال، خداترس مبشر رحیم۔ اس کے اسپتال کا دردمند، مہربان عملہ...... اور طاہر، اس کے ساتھ وہ سارے موسم اور تہوار بھی مرگئے جو انیس کی زندگی میں آئے تھے اور وہ سارے خوب صورت سفر جو اس نے کرنے تھے، اور وہ سالگرہیں جو اس نے منانی تھیں...... ہاں وہ سارے خوشی کے موقعے...... وہ ٹرافیاں، وہ کپ، وہ کامیابیاں، ڈگریاں، وہ سہرے کے پھول، وہ سب کا سب چلا گیا۔ ایک فرد جاتا ہے تو اس کے ساتھ اس کا سارا مستقبل بھی چلا جاتا ہے...... ہاں، ایسا ہی ہوتا ہے، انیس کے ساتھ نایاب پھولوں کی وہ کلیاں بھی مرگئیں جو اس کے گھر کے باغیچے میں کھلنا تھیں اور وہ پرندے بھی مرگئے جو اس نے اور سنبل نے پالنے تھے اور سنبل کی وہ ہنسی بھی جو ان کے آنگن میں گونجنا تھی...... اور اس کے ساتھ علیزا اور فیضان بھی اور ستارہ آنکھوں والا گول مٹول ذیشان بھی...... سب کا سب چلا گیا۔ کیا کیا خوب صورت امکانات تھے جو انیس اپنے ساتھ لے کر قبر میں جالیٹا۔''

کتنی ہی دیر ہم دونوں گم صم بیٹھے رہے۔ اس بے پناہ درد کو محسوس کرنے کی اپنی سی کوشش کرتے رہے جو سترہ سالہ انیس کے والدین اور بہن بھائیوں نے اس کے لیے جھیلا۔ ذہن میں آیا، اس وطن عزیز میں جانے اب بھی کتنے انیس درد کے اس دریا سے گزر رہے ہیں۔ تشخیص اور علاج کی ناکافی سہولتوں کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔ بدحال اسپتالوں میں دھکے کھا رہے ہیں اور اپنی بیماری کو پال رہے ہیں۔ وہ کینیڈا کے ''شیردانی'' کی طرح صحت یاب کیوں نہیں؟ کہاں ہے ہمارا دی گرین ہوپ اسپتال...... کہاں ہے؟

انیس چلا گیا ہے لیکن وہ جاتے جاتے ہم سب کے لیے ایک سوال چھوڑ گیا ہے اور وہ سوال یہی ہے۔ کہاں ہے وہ دی گرین ہوپ اسپتال...... وہ کہاں ہے اور اگر نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے؟ ہم سب کو انیس کے سوال کا جواب ڈھونڈنا ہے۔



جگادری

ملک صفدر حیات

محبت اور ایثار کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں لازم وملزوم ہیں لیکن... ایثار کے مقابل مفاد پرستی آجائے تو چاہے جانے کے دھوکے میں ایک تو برباد ہو ہی جاتا ہے جبکہ دوسرا بھی چند روزہ فتح کا جشن مناتے ہوئے ہر پل ایک انجانے خوف میں مبتلا رہتا ہے... گویا پکڑ جانے کے دھڑکے میں لاکھ کی خوشی خاک ہوجاتی ہے، کیونکہ ملک صفدر حیات جیسے آفیسرز مجرموں کو زیادہ دیر کھیلنے نہیں دیتے۔ بس سرا ہاتھ آنے کی دیر ہوتی ہے، حالات کی گتھی الٹ پلٹ ہوکر آپ ہی سلجھتی چلی جاتی ہے۔

زن اور زر کے شیدائی ایک عاشق کی
ناسرادیوں کا واقعہ



جذبات مثبت ہوں یا منفی، جب یہ بے قابو ...... ہوجائیں تو پھر تباہی اور بربادی ہی لاتے ہیں اور بعض اوقات تو خاندان کے خاندان اس کی نذر ہوجاتے ہیں۔ اسی لیے جوش میں ہوش قائم رکھنے کو کہا جاتا ہے کیونکہ وقت گزرنے کے بعد سوائے پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ زیرِنظر کہانی بھی اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔

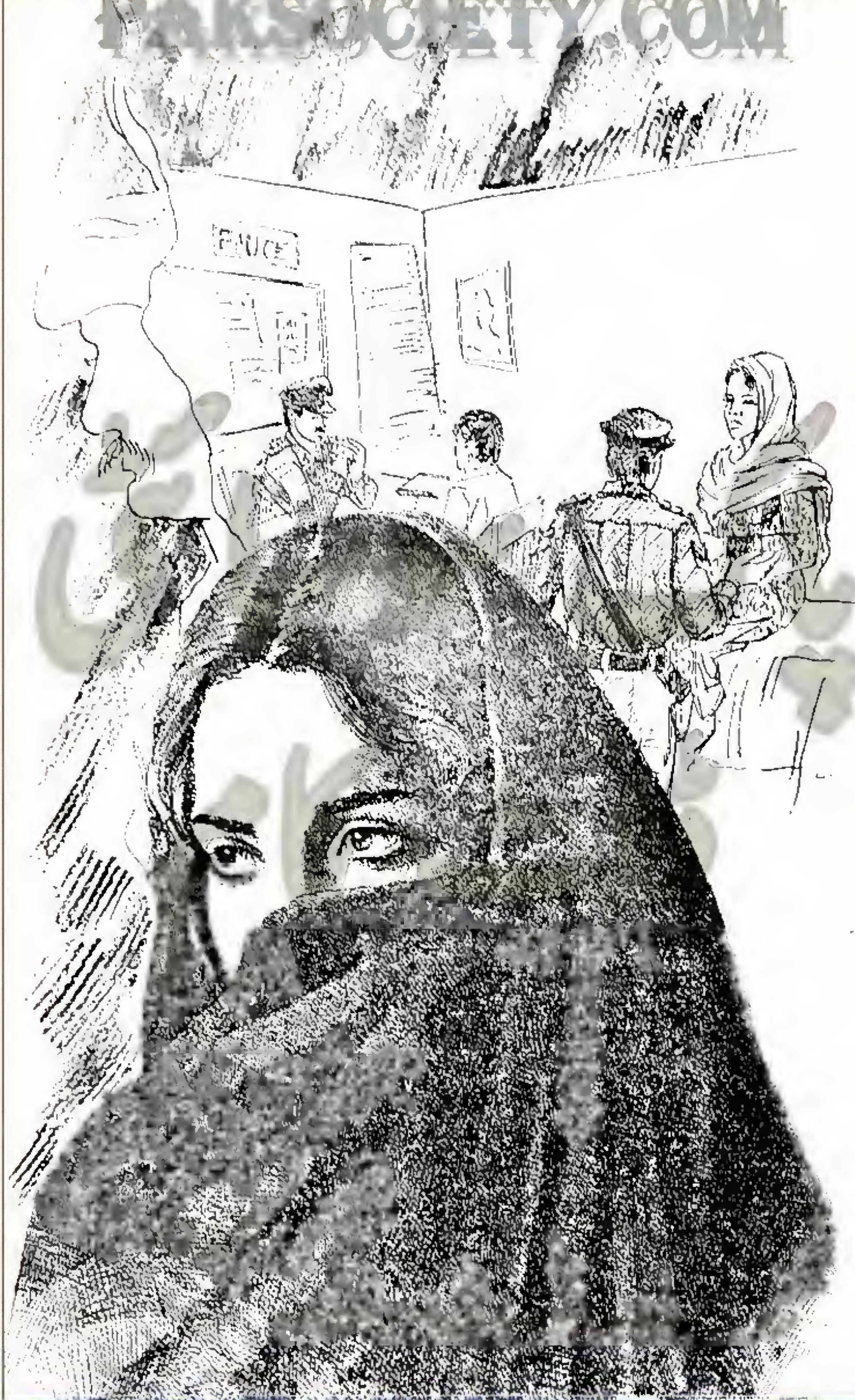
ان دنوں میں ضلع جھنگ کے ایک مضافاتی قصبے کے تھانے میں تعینات تھا۔ جنوری کا مہینا اپنے وسط سے گزر رہا تھا۔ سردی عروج پر تھی۔ ایک ٹھنڈی ٹھار صبح میں تیار ہوکر تھانے پہنچا تو ایک افسوسناک اطلاع میری منتظر تھی۔ ویسے تو محکمۂ پولیس اور خاص طور پر تھانہ ایک ایسی جگہ ہے کہ جہاں کوئی اچھی اور خوش کن خبر کم ہی سننے کو ملتی ہے۔ ہر طرف سے چوری، ڈکیتی، قتل وغارت گری، لوٹ مار، دنگا فساد اور اسی نوعیت کی سنگین اطلاعات کی بھرمار رہتی ہے اسی لیے جب کانسٹیبل نے میرے پاس آکر بتایا کہ ساتھ والے گاؤں میں قتل کی ایک واردات ہوگئی ہے تو یہ سن کر مجھے کوئی حیرت کا جھٹکا نہیں لگا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اطلاع فراہم کرنے والے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

''اس ساتھ والے گاؤں کا کوئی نام بھی ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ''موضع وزیر آباد......!''

چھوٹے بڑے پانچ گاؤں میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے جن میں ایک وزیر آباد بھی تھا۔ وزیر آباد کے ذکر پر آپ کہیں ضلع گوجرانوالہ کی تحصیل وزیر آباد نہیں سمجھ لیجیے گا۔ مذکورہ وزیر آباد ضلع جھنگ میں واقع ایک چھوٹا سا دور دراز گاؤں تھا جس کی آبادی لگ بھگ پانچ سو رہی ہوگی۔ وہاں سو، سوا سو سے زیادہ گھر نہیں تھے۔ وزیر آباد نامی یہ گاؤں میرے تھانے سے کم وبیش دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

''وزیر آباد میں کس کا قتل ہوا ہے؟'' میں نے کانسٹیبل کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے استفسار کیا۔



"قتل ہونے والی ایک نوجوان لڑکی ہے جناب۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔ "جو وزیرآباد ہی کی رہنے والی تھی۔ اس کی لاش گاؤں سے باہر جھاڑیوں میں پڑی ملی ہے۔ فیکا نے بدنصیب لڑکی کا نام صابری بتایا ہے۔"

"یہ فیکا کون ہے؟" میں نے چونک کر کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

"فیکا ایک کوچوان ہے جناب۔ ادھر وزیرآباد ہی کا رہنے والا ہے۔" اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "فیکا باہر برآمدے میں بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وزیرآباد کا ایک اور وسنیک شوکت بھی آیا ہے۔ یہ دونوں تانگے میں سوار ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔"

"ان دونوں کو میرے پاس بھیجو۔" میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"جی ملک صاحب......!" یہ کہتے ہوئے کانسٹیبل کمرے سے نکل گیا۔

جب میں اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا تو میں نے برآمدے میں دو تین افراد کو بیٹھے دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک نے مجھے سلام بھی کیا تھا۔ میں سر کی خفیف جنبش سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔

ایک منٹ کے اندر فیکا اور شوکت نامی وہ دونوں افراد میرے سامنے حاضر تھے۔ فیکا کوچوان ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا جبکہ اس کا ساتھی شوکت، سانولے رنگ کا ہٹا کٹا اور پستہ قامت بندہ تھا۔ میرے سوالات کے جواب میں انہوں نے مجھے جو تفصیل بتائی، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

مقتولہ لڑکی کا نام صابرہ بی بی عرف "صابری" تھا۔ وہ وزیرآباد ہی کی رہنے والی تھی۔ اس کی ماں آسیہ کا گاؤں کے اندر ایک بڑا تنور اور بھٹی (بھاڑ) تھی جہاں وہ گاؤں والوں کے لیے روٹیاں پکایا کرتی تھی اور بھٹی میں چنے، مکئی اور چاول وغیرہ بھی بھون کر دیتی تھی۔ صابری اس کام میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کا باپ جلال دین اکثر بیمار رہتا تھا۔ وہ کسی کام کاج کے قابل نہیں تھا اور سارا دن چارپائی پر پڑا حقہ گڑگڑاتا رہتا تھا اور...... اسی صابرہ عرف صابری کو گزشتہ رات کسی نے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس کی لاش گاؤں کے آخری کنارے پر واقع جھاڑیوں میں پڑی ملی تھی۔

صابری کی لاش کی دریافت کا سہرا شوکت کے سر جاتا تھا۔ آج علی الصباح اسی نے سب سے پہلے لاش کو دیکھا تھا۔ اس کے بعد ہی موضع وزیرآباد کے باسیوں کو اس سانحے کی خبر ہوئی تھی۔ میں نے پستہ قد شوکت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"تم اتنی صبح ان جھاڑیوں کی طرف کیا لینے گئے تھے؟"

"جناب! میں تو معمول کے مطابق رفع حاجت کے لیے کھیتوں کی جانب گیا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "واپسی میں ایک خاص بات نے مجھے جھاڑیوں کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"کون سی خاص بات؟" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"جناب! جب میں ان جھاڑیوں کے قریب سے گزرنے لگا تو ایک گرم زنانہ شال پر میری نظر پڑی۔" شوکت نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ "اس سبز رنگ کی شال کا ایک سرا جھاڑیوں کے اندر کہیں الجھا ہوا تھا اور دوسرا سرا باہر سے دکھائی دے رہا تھا۔ بس یہی بات مجھے جھاڑیوں کے اندر لے گئی۔ میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ وہ مجھے نظر آ گئی......"

بات ادھوری چھوڑ کر اس نے خوف زدہ انداز میں ایک جھرجھری لی تو میں نے فوراً سوال کیا۔ "کون نظر آ گئی؟"

"آسیہ ماچھن کی لڑکی صابری......" اس نے جواب دیا۔

"کیا مطلب!" میں نے گھور کر شوکت کو دیکھا۔ "کیا تم نے جیتی جاگتی صابری کو اپنی آنکھوں سے وہاں دیکھا تھا؟"

"نن...... نہیں...... سرکار......!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں صابری کی لاش کی بات کر رہا ہوں جی۔ اس کی لاش جھاڑیوں کے اندر بڑے بے ڈھنگے انداز میں پڑی ہوئی تھی۔"

"کیا تم نے صابری کی لاش کو چھو کر دیکھا تھا؟" میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ زندگی کی بازی ہار چکی ہے؟"

"تھانے دار جی! میں نے اس کی حالت کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔" شوکت نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ "کوئی بھی زندہ شخص اس ٹھنڈے ٹھار موسم میں، کھلے آسمان کے نیچے، جھاڑیوں کے اندر سونے سے تو رہا۔ میں نے اسے چھونے کی کوشش نہیں کی۔ بس، اس کی حالت ہی سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہے......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے

ہوئے بولا۔

''آپ وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے جب وہ منظر دیکھیں گے تو آپ کو میری بات کا یقین آجائے گا۔''

''میں ابھی آپ لوگوں کے ساتھ ادھر ہی جا رہا ہوں۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا۔''

میں نے مزید دس منٹ تک گھما پھرا کر شوکت سے مختلف سوالات کیے پھر ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

میرے تھانے سے موضع وزیر آباد کم وبیش دو میل کی دوری پر واقع تھا۔ ایک پتلا سا کچا راستہ سیدھا وزیر آباد تک جاتا تھا۔ اس راستے کی دونوں جانب کھیتوں کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ فیکا کوچوان نے جب ہمیں وزیر آباد پہنچایا، اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے۔ میں تانگے سے اتر کر فوراً وقوعہ کی سمت بڑھ گیا۔ فضا میں اچھی خاصی خنکی رچی بسی تھی۔ میری نگاہ جھاڑیوں پر تھی۔

وہ جھاڑیاں گاؤں کے آخری سرے سے شروع ہوکر لگ بھگ ایک فرلانگ آگے تک چلی گئی تھیں جن کے پہلو میں ایک نالا رواں دواں تھا۔ یہ نالا یقیناً موضع وزیر آباد کے کھیتوں کو سیراب کرنے کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق مذکورہ نالا پیچھے شمال مشرق میں بڑی نہر میں سے نکلتا تھا اور وزیر آباد کے پاس سے گزرتے ہوئے آگے جنوب مغرب کی سمت چلا جاتا تھا۔

صابری کی لاش جھاڑیوں کے اندر پچیس سے تیس گز کے فاصلے پر پڑی تھی۔ لاش کی حالت کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اسے زندگی کی قید سے آزاد ہوئے آٹھ سے دس گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں لاش کے قریب ہی اکڑوں بیٹھ کر بہ غور اس کا جائزہ لینے لگا۔

مقتولہ صابرہ کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کی گردن کی حالت اور باہر کو ابلی ہوئی آنکھیں اس امر کا بین ثبوت تھیں کہ دو مضبوط ہاتھوں نے بڑی بے دردی سے گلا دبا کر اس کی سانس کی آمد و شد کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ موت کے منہ میں جانے سے قبل صابری نے خود کو قاتل کے شکنجے سے نکالنے کے لیے بڑی جدوجہد کی تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے بال اور جگہ جگہ سے پھٹا ہوا لباس یہ کہانی سناتا تھا کہ قاتل نے جان لینے سے پہلے اس پر مجرمانہ حملہ بھی کیا تھا یا حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ صابری بڑی بے بسی کی موت ماری گئی تھی۔

میں نے حیرت بھری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ صابری گندمی رنگت کی حامل ایک متناسب شخصیت کی مالک تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر بیس اور بائیس کے درمیان رہی ہوگی۔ یہ عمر کسی بھی لڑکی یا لڑکے کے لیے بھرپور جوانی کی عمر ہوتی ہے۔ صابری بھی اپنی جوانی کی بہار پر تھی مگر کسی سفاک شخص نے بھری جوانی میں اس کی زندگی کی بہار کو خزاں کی نذر کر دیا تھا۔ مجھے پہلی فرصت میں اس درندہ صفت شخص کو تلاش کرنا تھا۔

صابری کی لاش کے تفصیلی معائنے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسا کہ تھانے میں شوکت مجھے بتا چکا تھا کہ اس نے ایک گرم سبز شال کو جھاڑیوں میں پھنسے دیکھا تھا۔ جائے وقوعہ پر درجن بھر افراد میں مقتول کی ماں آسیہ ماچھن بھی موجود تھی جس نے تصدیق کی کہ وہ سبز شال اس کی بیٹی ہی کی تھی۔ میں نے وہ شال منگوا کر صابری کی لاش کو ڈھک دیا اور قرب و جوار کا جائزہ لینے لگا۔ میری اس تفتیش کا مرکز و محور جھاڑیوں کا اندرونی حصہ تھا اور اس سلسلے میں کانسٹیبل نجیب بھی میری بھرپور مدد کر رہا تھا۔ میں ایک بات کا ذکر کرنا بھول گیا کہ مقتولہ صابری نے پھول دار سبز رنگ کی گرم قمیص پہن رکھی تھی۔ شلوار سفید لٹھے کی تھی اور پاؤں میں چمڑے کے پمپی ٹائپ جوتے تھے۔

اس تلاش میں دس سے پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک اہم سراغ میرے ہاتھ لگ گیا۔ وہ ایک پوٹلی تھی جو جھاڑیوں کی خاردار شاخوں میں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے مذکورہ پوٹلی کو شاخوں میں سے نکال لیا اور اس کا معائنہ کرنے لگا۔

پوٹلی کی گرہ کھلی ہوئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ پوٹلی کو اچھی طرح کھنگالنے کے بعد ادھر پھینکا گیا تھا۔ پوٹلی کے جائزے سے پتا چلا کہ اس کے اندر دو زنانہ جوڑے۔۔۔۔ تھے اور عورتوں کے استعمال کی چند اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ یقینی طور پر یہ پوٹلی مقتولہ صابری ہی کی ہوسکتی تھی۔ پوٹلی کی دریافت کے بعد اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ صابری ''فرار'' کے کسی پروگرام کے تحت گھر سے نکلی تھی مگر کس کے ساتھ.....؟

یہ ایک سنسنی خیز سوال تھا اور مزید ایک خوفناک سوال کو جنم دیتا تھا کہ..... کیا صابری کو اسی شخص نے موت کے گھاٹ اتارا تھا جس کے ساتھ اس نے بھاگنے کا پروگرام بنا

رکھا تھا یا یہ کسی تیسرے شخص کا کارنامہ تھا؟ یہ سوال درجنوں نئے سوالات پیدا کرتا تھا۔ پوٹلی کی دریافت نے صورتِ حال کو خاصا انکشاف انگیز بنا دیا تھا۔

میں نے کپڑوں والی پوٹلی مقتولہ صابری کی ماں آسیہ کو دکھائی اور پوچھا۔ ''کیا تم ان کپڑوں کو پہچانتی ہو؟''

''جی......!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''یہ کپڑے صابری ہی کے ہیں تھانے دار صاحب!''

''کپڑوں کی پوٹلی کے ساتھ گھر سے نکلنے کا مطلب سمجھتی ہو نا؟'' میں نے دھیمے مگر خاصے اٹل انداز میں دریافت کیا۔

جواب دینے سے پہلے اس نے گھبراہٹ بھری نظر سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جائے وقوعہ پر درجن بھر افراد موجود تھے لیکن میں اور آسیہ ان سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے۔ وہ بے حد الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

''تھانے دار جی! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب کیا ہے۔ پتا نہیں، کس ظالم نے میری جوان جہان بیٹی کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے......''

میں نے محسوس کرلیا کہ وہ دانستہ میرے سوال کا ''ٹو دی پوائنٹ'' جواب دینے سے کترا رہی تھی۔ میں نے اس کی جذباتی کیفیت اور ذہنی حالت کے پیشِ نظر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''آسیہ! تم اپنے گھر جاؤ۔ میں جائے وقوعہ کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد تمہارے پاس آرہا ہوں۔ پھر آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے......''

''جی اچھا!'' وہ ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی پھر پوچھا۔ ''صابری کی لاش......؟''

''صابری کی لاش......'' آسیہ کے ادھورے جملے کے جواب میں، میں نے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال جائے گی۔''

''پوسٹ مارٹم......'' اس نے خوف زدہ انداز میں مجھے دیکھا۔ ''مطلب یہ کہ آپ صابری کی چیر پھاڑ کرائیں گے......؟''

''یہ بہت ضروری ہے آسیہ بی بی!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی مدد سے صابری کے قاتل تک رسائی حاصل کرنے میں آسانی حاصل ہوگی۔''

اس نے مجھ سے جرح یا بحث کرنے کی کوشش نہیں کی اور دل گرفتہ انداز میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے مقتولہ صابری کی لاش کو کانسٹیبل حبیب کی نگرانی میں ضلعی اسپتال بھجوا دیا اور جائے واردات پر موجود لوگوں سے پوچھ تاچھ کرنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ کی کوشش کے بعد بھی جب مجھے اس سلسلے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی تو میں نے آسیہ کے گھر جانے کا فیصلہ کرلیا۔

جائے وقوعہ یعنی وہ جھاڑیاں جہاں سے صابری کی لاش ملی تھی، وہ موضع وزیر آباد کے آخری سرے پر واقع تھیں۔ وہاں سے مجھے گاؤں کے اندرونی حصے میں جانا تھا۔ میں نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ ایک فوری خیال نے مجھے رکنے پر مجبور کردیا۔ یہ خیال ایک مکان کو دیکھ کر میرے ذہن میں ابھرا تھا۔

وہ مکان موضع وزیر آباد کے آخری کنارے پر واقع تھا اور اس کے عقب میں بیس پچیس گز کے فاصلے سے جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ یعنی مذکورہ مکان جائے وقوعہ سے نزدیک ترین رہائش گاہ تھی۔ میرے جی میں آئی کہ عین ممکن ہے، اس گھر کے مکین میں سے کسی نے پچھلی رات جھاڑیوں کی طرف کوئی غیر معمولی سرگرمی دیکھی ہو۔ یہ بعید از امکان نہیں تھا۔ اگر میں ان لوگوں سے پوچھ گچھ کرتا تو صابری کے قتل کے حوالے سے کوئی سراغ ہاتھ آسکتا تھا۔

جب میں نے گاؤں کی سمت چلنا شروع کیا تھا تو چند افراد بھی میرے ساتھ ساتھ اسی جانب بڑھ رہے تھے۔ عین ممکن تھا، انہی میں اس گھر کا کوئی مکین بھی شامل ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ پورے گاؤں میں صابری کے قتل کا شور مچا ہو اور اس گھر کے مکینوں کو کوئی خبر ہی نہ ہو۔

میں نے اپنے دائیں بائیں موجود لوگوں کی، مذکورہ مکان کی طرف توجہ مبذول کرائی اور پوچھا۔ ''وہ گھر کس کا ہے؟''

''ماسٹر بھٹی کا جی......!'' میرے نزدیک کھڑے ایک شخص نے جواب دیا۔

''ماسٹر بھٹی؟'' میں نے سوالیہ نظر سے جواب دینے والے کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب! ماسٹر جی کا نام تو عارف بھٹی ہے مگر وہ ماسٹر بھٹی کے نام سے مشہور ہے۔''

ایک بات کا مجھے فوراً اندازہ ہوگیا کہ عارف بھٹی ان افراد میں شامل نہیں تھا ورنہ اپنے ذکر پر وہ اس وقت تک سامنے آچکا ہوتا۔ میں نے ان لوگوں پر سرسری سی نگاہ ڈالنے کے بعد استفسار کیا۔

''کیا ماسٹر عارف بھٹی اس وقت گھر میں ہوگا؟''

''نہیں جی۔'' ایک شخص نے نفی میں گردن ہلاتے

ہوئے بتایا۔ ”ماسٹر جی اس وقت اسکول میں ہوں گے۔“

صابری کے قتل کی خبر پورے گاؤں میں پھیل چکی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ افسوس ناک خبر اسکول میں بھی پہنچی ہوگی۔ قتل کی واردات ماسٹر عارف کے گھر کے پچھواڑے ہوئی ہے۔ بھٹی صاحب کو تو اسکول چھوڑ کر فوراً یہاں پہنچنا چاہیے تھا۔ وہ اب تک اسکول میں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟“

”جناب! میرا خیال ہے، ماسٹر بھٹی کو ابھی تک قتل کی اس واردات کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا ہوگا۔“ ایک شخص نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”وہ جب شام کو واپس وزیر آباد آئے گا تو اسے اس واقعے کی خبر ہوسکے گی۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اس شخص کی جانب دیکھا۔ ”کیا ماسٹر عارف وزیر آباد کے اسکول میں نہیں پڑھاتا.....“

”نہیں جناب! وزیر آباد میں کوئی اسکول ہے ہی نہیں۔“ اس شخص نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”ماسٹر بھٹی یہاں سے تین میل جنوب میں واقع ”کندن پور“ نامی گاؤں میں پڑھانے جاتا ہے اور واپسی میں اسے شام ہوجاتی ہے۔ ویسے وہ کہہ رہا تھا کہ عنقریب وزیر آباد میں بھی ایک چھوٹا اسکول کھلنے والا ہے۔“

”ہوں.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ”ٹھیک ہے، عارف بھٹی تو جب شام کو واپس آئے گا تو اس سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔ فی الحال، میں اس کے گھر والوں سے پوچھ تاچھ کر لیتا ہوں۔“

”گھر والوں سے.....؟“ میں جس شخص سے سوال جواب کر رہا تھا اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”ماسٹر عارف کے گھر والوں کے ذکر پر تم چونک کیوں گئے؟“

”اس لیے کہ اس کا تو گھر بار وہ خود ہی ہے۔“ اس شخص نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”ماسٹر بھٹی اس گھر میں بالکل اکیلا ہی رہتا ہے۔ وہ کندن پور کے اسکول گیا ہوا ہے تو اس وقت اس کے گھر پر تالا پڑا ہوگا۔“

”مطلب یہ کہ.....“ میں نے تصدیق طلب نظر سے اسے دیکھا۔ ”بیوی، بچے، بہن، بھائی، ماں باپ میں سے کوئی اس کے ساتھ نہیں رہتا۔“

میرے استفسار کے جواب میں مجھے جو معلومات فراہم کی گئیں، ان کے مطابق ماسٹر عارف بھٹی پچھلے چار سال سے اس مکان میں تنہا رہ رہا تھا۔ اس کے والدین یا بھائی بہن کہاں تھے، اس بارے میں یقینی طور پر ... کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ لوگ صرف اتنا جانتے تھے کہ اس نے شادی نہیں کی تھی لہٰذا اس کے بیوی بچے نہیں تھے۔ گاؤں والوں کو ماسٹر عارف سے یا اس کے کردار سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ سب کی نظر میں ایک امن پسند اور شریف النفس انسان تھا۔ وہ ایک خاموش طبع اور تنہائی پسند شخص کے طور پر مشہور تھا۔ عنایت حسین کریانہ فروش وزیر آباد کا واحد ہائشی تھا جس کی دکان پر کھڑے ہوکر ماسٹر بھٹی تھوڑی گپ شپ کرلیا کرتا تھا۔

ماسٹر عارف بھٹی کے حوالے سے حاصل ہونے والی یہ معلومات میرے لیے ناکافی تھیں۔ صابری کو بڑی ... بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور یہ سنسنی خیز واقعہ ماسٹر عارف کی رہائش گاہ سے محض بیس یا پچیس گز کے فاصلے پر رونما ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ عارف بھٹی قتل کی اس واردات پر ضرور روشنی ڈال سکتا تھا۔

میں نے وہاں موجود افراد پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور پوچھا۔ ”تم میں سے کوئی ایسا بھی ہے جس سے ماسٹر بھٹی کی روزانہ ملاقات ہوتی ہو؟“

”جی، تھانے دار صاحب.....!“ ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”میرا نام احمد علی ہے۔ سمجھ لیں کہ میں ماسٹر بھٹی کا پڑوسی ہوں۔ ہمارا روزانہ آمنا سامنا ہوتا ہے..... آپ دیکھ ہی رہے ہیں، ماسٹر جی کا مکان بالکل الگ تھلگ ہے۔ میں اس کا قریب ترین پڑوسی ہوں۔“

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جو بھی ہے وہ اب تمہیں ایک کام کرنا ہے احمد علی۔“

”جی حکم تھانے دار صاحب!“ وہ باادب باملاحظہ، ہمہ تن گوش ہوگیا۔

”تم نے ماسٹر بھٹی کی واپسی کا انتظار کرنا ہے۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”وہ جیسے ہی گھر پہنچے، اسے اپنے ساتھ لے کر سیدھا میرے پاس تھانے آجانا.....“

”جی.....جو آپ کا حکم ہو.....“ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں احمد علی!“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”میں ماسٹر عارف سے معمول کی پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری صرف اتنی سی ڈیوٹی ہے کہ تم اسے اپنے ساتھ لے کر تھانے آؤ گے۔“

”جی سرکار!“ وہ فرماں برداری سے بولا۔ ”میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔“

''شاباش!'' میں نے تعریفی نظر سے اسے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

وزیر آباد نامی وہ چھوٹا سا گاؤں لگ بھگ سو گھروں پر مشتمل تھا جن میں سے اسّی فیصد گھروں کی آبادی ایک جگہ اور بیس فیصد ذرا ہٹ کر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اکا دکا مکانات کی شکل میں تھی۔ ماسٹر عارف بھٹی کا مکان بھی اسی نوعیت کا تھا، آبادی سے چند گز کے فاصلے پر، جھاڑیوں کے ساتھ لگا ہوا۔ اس قسم کے چھوٹے گاؤں میں ہر کوئی دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ مجھے قوی امید تھی کہ میں بہت جلد صابری کے قتل کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوجاؤں گا، پھر قاتل مجھ سے بچ نہیں سکے گا۔

☆☆☆

آسیہ ماچھن کا گھر وزیر آباد کے اکثر مکانات کی طرح ایک چھوٹا سا کچا گھر تھا اور گاؤں کے وسط میں واقع تھا۔ اس خاندان میں صرف تین افراد تھے یعنی آسیہ، اس کا شوہر جلال دین اور اکلوتی بیٹی صابرہ بی بی عرف صابری جو کہ گزشتہ رات مقتولہ کا درجہ حاصل کر چکی تھی لہٰذا اب اس خاندان میں صرف دو افراد باقی بچے تھے۔ آسیہ اور اس کا دائمی مریض شوہر۔ جلال دین کو ٹی بی (تپ دق) کا مرض لاحق تھا۔ وہ دن بھر چارپائی پر پڑا کھانستا رہتا اور خون تھوکتا رہتا تھا۔ اس کی حالت کو دیکھ کر یہی لگتا کہ وہ چند ہفتوں یا چند مہینوں کا مہمان ہے۔ بہرحال، جلال دین سے کسی قسم کی پوچھ گچھ بے سود تھی اس لیے میں آسیہ کو لے کر اس کے گھر کی بیٹھک میں آگیا۔

آسیہ نے تنور اور بھٹی (بھاڑ) اپنے گھر کے صحن میں ہی لگا رکھی تھی۔ اس کے گھر کے باہر نصف درجن کے قریب مرد و زن موجود تھے جن میں زیادہ تر اس کے پڑوسی تھے۔ وہ سب صابری کے قتل کے حوالے سے بہت کچھ جاننا چاہتے تھے۔ یہ ان کا فطری تجسس تھا لیکن میں نے اس وقت تک ان میں سے کسی کو گھر کے اندر آنے کی اجازت نہیں دی جب تک میں نے آسیہ سے سوال و جواب کا سلسلہ مکمل نہ کرلیا۔

بیٹھک میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔ صابری کی موت کی خبر نے بوڑھے اور بیمار جلال دین کی حالت اور بھی زیادہ خراب کردی تھی اور اس نے صابری کے موضوع پر مجھ سے کوئی بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کی کھانسی کی آواز مسلسل بیٹھک کے اندر پہنچ رہی تھی۔

میں نے آسیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''آسیہ بی بی! تمہاری اکلوتی بیٹی کے نامعلوم قاتل نے [illegible] واقعی [illegible] افسوس ہے۔ لیکن صابری کو [illegible] وعدہ کرتا ہوں کہ صابری کے قاتل کو بہت جلد گرفتار کرکے عدالت سے سخت ترین سزا دلوانے کی کوشش کروں گا۔''

''جانے والوں کو کون واپس لا سکا ہے جناب!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''باقی کی زندگی تو مجھے صابری کے بغیر ہی گزارنا ہوگی۔ میری......'' وہ لمحے بھر کو توقف ہوئی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''میری دلی تمنا ہے کہ صابری کا قاتل عبرت ناک سزا پائے۔ اللہ اس شیطان کو غرق کرے...... ہمارا ہنستا بستا گھر اجاڑ دیا اس... کم بخت نے۔''

''اللہ یقیناً صابری کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچائے گا اور میں بھی اسے عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''لیکن...... اس کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی ضرورت پیش آئے گی۔''

''تعاون......؟'' اس نے چونک کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''کس قسم کا تعاون تھانے دار صاحب؟''

''صابری کے قاتل تک رسائی حاصل کرنے میں تم میری راہنمائی کرو گی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تمہاری مدد سے بہ آسانی قاتل تک پہنچ سکتا ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ ''میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ وہ ظالم جلد از جلد گرفتار ہوجائے مگر......!''

''مگر کیا آسیہ بی بی؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں۔''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''آسیہ بی بی! جائے وقوعہ کا میں نے بھی جائزہ لیا ہے اور تم نے بھی اپنی آنکھوں سے ہر شے کو دیکھا ہے۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی کہ مقتولہ صابری اپنی مرضی اور پروگرام کے مطابق گھر سے نکلی تھی۔ پوٹلی اور اس کے اندر موجود صابری کے کپڑے اور ذاتی استعمال کا دیگر سامان اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگنا چاہتی تھی اور اسی غرض سے وہ جھاڑیوں تک پہنچی تھی اور وہ ''کسی'' کوئی مرد ہی ہوسکتا ہے جس نے صابری کو جھاڑیوں میں ملنے کا کہہ رکھا ہوگا۔'' لمحاتی توقف کرکے میں

سننے نے ایک گہری سانس لی پھر آسیہ سے استفسار کیا۔
''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟''
''نہیں جی......'' وہ جز بز ہوکے ہوئے بولی۔'' کہہ تو آپ ٹھیک ہی رہے ہیں لیکن وہ مرد کون ہوسکتا ہے......''
''یہی تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''اگر اس شخص کا پتا چل جائے تو پھر یہ فیصلہ کرنا بہت آسان ہوجائے گا کہ آیا وہی شخص صابری کا قاتل ہے یا یہ کام کسی اور نے کیا ہے۔''
''میں اس بندے کے بارے میں آپ کو کیا بتا سکتی ہوں تھانے دار صاحب۔'' وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔''میں تو صابری کے ایسے کسی معاملے سے واقف ہی نہیں ہوں۔''
''تم صابری کی ماں ہو آسیہ بی بی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''ایک ماں ہونے کے ناتے تمہیں اپنی بیٹی کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا چاہیے تھی۔ یہ تمہارا فرض بنتا تھا؟''
''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جی۔'' وہ کمزور سے لہجے میں بولی۔''لیکن میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ مجھے صابری کے کسی چکر کا کوئی علم نہیں تھا۔''
اس کے الفاظ، چہرے کے اتار چڑھاؤ اور آنکھوں میں موجود تاثرات سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کسی وقت کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ صاف گوئی سے کام لے رہی تھی۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے آسیہ سے پوچھا''صابری کی کوئی رازدار سہیلی تو ہوگی جس کے ساتھ وہ اپنے دل کی ہر بات کرتی ہو......؟''
''اپنی ہم عمر لڑکیوں سے اس کی کم ہی بنتی تھی۔'' آسیہ نے جواب دیا۔''اس کی زیادہ دوستی شاکرہ کی بہو سے تھی۔''
''یہ شاکرہ کی بہو کون ہے؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔''اور کہاں رہتی ہے؟''
''شاکرہ میری پڑوسن ہے جی۔'' آسیہ نے بتایا۔ ''اس کی بہو کا نام رانی ہے۔ صابری کا رانی کے ساتھ بہت ملنا جلنا تھا۔ وہ دونوں بڑی گہری سہیلیاں تھیں۔''
''اچھا......!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''رانی تمہارے پڑوس میں رہتی ہے تو تم اسے یہاں بلالاؤ۔ مجھے یقین ہے، رانی صابری کے خفیہ معاملات سے بہ خوبی آگاہ ہوگی۔''
''آپ ٹھیک کہتے ہیں جی۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔''لیکن فوری طور پر رانی سے ملنا ممکن نہیں تھانے دار صاحب۔''
''کیوں ممکن نہیں آسیہ بی بی؟'' میں نے تعجب خیز نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
''رانی کافی دنوں سے اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔'' آسیہ نے بتایا۔
''اس کا میکا وزیرآباد سے باہر کہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''جی ہاں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''رانی کا میکا موضع فرمان کوٹ ضلع شیخوپورہ میں ہے جناب۔''
''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔''اس کی واپسی کا امکان کب تک ہے؟''
''شاکرہ بتا رہی تھی، اس کا بیٹا پرویز دو چار دن میں اپنی بیوی اور بیٹے کو لینے شیخوپورہ جائے گا۔'' آسیہ نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔''رانی کا پانچ سال کا ایک بیٹا ہے جس کا نام منصور ہے۔''
''اس کا مطلب ہے، رانی سے فوری طور پر پوچھ گچھ نہیں ہوسکتی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس سے دو چار دن بعد ہی ملاقات متوقع ہے یا پھر......''
''یا پھر کیا جی......؟'' وہ چونک کر مجھے تکنے لگی۔
میں نے اس کی تسلی کے لیے وضاحت کردی۔''یا پھر میں رانی کے گھر والے کو آج ہی شیخوپورہ روانہ کردوں۔''
''جی...... یہ کام آپ ہی کرسکتے ہیں۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔
میرے ذہن میں کافی دیر سے وہ پوٹلی گھوم رہی تھی جو جھاڑیوں کے بیچ اُلجھی ہوئی ملی تھی اور مذکورہ پوٹلی اس وقت میرے قبضے ہی میں تھی۔ میں نے وہ پوٹلی آسیہ کو دکھاتے ہوئے کہا۔
''آسیہ بی بی! تم اس بات کی گواہ ہو کہ جب یہ پوٹلی میرے ہاتھ لگی تو اس کی گرہیں وغیرہ کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے تمہارے سامنے اس کی تلاشی لی تھی۔ اس میں دو جوڑی کپڑوں کے علاوہ صابری کے ذاتی استعمال کا چھوٹا موٹا سامان تھا۔ میرا یہ اندازہ ہے کہ اس پوٹلی کو اچھی طرح کھنگالنے کے بعد کسی نے جھاڑیوں کی طرف پھینکا تھا جیسے اسے کسی قیمتی شے کی تلاش ہو۔'' میں نے لمحاتی توقف کرکے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔
''تم اس بارے میں کیا کہتی ہو؟''
''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے تھانے دار صاحب......!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔
''لیکن تم نے دیکھا کہ پوٹلی میں کوئی بھی قیمتی شے

موجود نہیں تھی......"

"جی......!" اس نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے، قاتل کو جس چیز کی تلاش تھی وہ اس کے ہتھے لگ گئی تھی۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "جبھی وہ پوٹلی کو وہاں پھینک کر فرار ہو گیا تھا۔"

"لیکن ایسی قیمتی شے بھلا کیا ہو سکتی تھی؟" آسیہ کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

"طلائی زیورات وغیرہ......" میں نے معنی خیز نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "صابری کے پاس کس قسم کے اور کتنے زیورات تھے؟"

"اس کے پاس صرف سونے کی بالیاں تھیں۔" آسیہ نے بتایا۔ "جو وہ ہر وقت کانوں میں پہنے رہتی تھی۔ آپ نے دیکھا تھا یا، مرنے کے بعد بھی وہ بالیاں صابری کے کانوں میں موجود تھیں۔"

میں نے کہا۔ "ہاں...... میں نے دیکھا تھا۔"

وہ پُرتشویش انداز میں بولی۔ "کہیں اسپتال والے اس کی بالیاں غائب تو نہیں کر دیں گے......؟"

اس کا ذہن صابری کی بالیوں میں الجھ گیا تھا اور اس سلسلے میں بہت دور تک سوچ رہا تھا۔ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اسپتال پہنچائی جانے والی لاش کی ایک ایک چیز کا باقاعدہ اندراج کیا جاتا ہے۔ بالیاں کہیں نہیں جائیں گی لیکن......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ٹٹولتی ہوئی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تمہارے گھر میں کوئی اور طلائی زیورات بھی رکھے ہوئے ہیں؟"

"ہاں ہیں۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"مثلاً کیا کیا......؟"

"میرے ذاتی زیورات ہیں۔" اس نے بتایا۔ "جھمکے، دو انگوٹھیاں اور چار چوڑیاں۔ میں نے سوچا ......" اس کی آواز بھرا گئی۔ "جب صابری کی شادی کروں گی تو یہ سارا زیور اسی کو چڑھا دوں گی مگر صابری......" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک سسکی لی اور خاموش ہو گئی۔

"تم نے ابھی مجھے اپنے جن زیورات کے بارے میں بتایا ہے......" میں نے آسیہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "وہ تمہارے گھر میں ہی رکھے ہوئے ہیں یا......"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ فکرمندی سے بولی۔ "گھر ہی میں رکھے ہوئے ہیں تھانے دار صاحب۔"

"جاؤ...... اور انہیں چیک کر کے آؤ۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

وہ متعجب نظر سے مجھے تکنے لگی۔ "مم...... میں سمجھی نہیں جناب......"

"تم نے گھر کے اندر اپنے سونے کے زیورات کو جہاں بھی رکھا ہوا ہے۔" میں نے نپے تلے الفاظ میں کہا۔ "اس جگہ کو جا کر چیک کرو اور واپس آ کر مجھے بتاؤ کہ زیورات وہاں موجود ہیں یا نہیں؟"

"آپ...... تو ڈرانے والی باتیں کر رہے ہیں تھانے دار صاحب۔" وہ متوحش انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ "سوہنا رب خیر کرے......"

"سوہنا رب تو خیر ہی کرتا ہے آسیہ بی بی!" میں نے بوجھل آواز میں کہا۔ "مگر جب انسان کو خود ہی اپنی خیر منظور نہ ہو تو پھر اسے تباہ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"جی...... میں دیکھتی ہوں جا کر......!" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "آپ بیٹھیں...... میں آتی ہوں ابھی......"

یہ ضروری نہیں تھا کہ میرا دماغ جن خطوط پر سوچ رہا تھا، حقیقت بھی ویسی ہی ہو لیکن میرے تجربے میں یہی آیا تھا کہ گھر سے بھاگنے والی ننانوے فیصد لڑکیوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ساتھ قیمتی زیورات ضرور رکھ لیں تاکہ تنگی ترشی کے دنوں میں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے۔ وہ قیمتی زیور چاہے ان کا اپنا ہو یا وہ گھر کے کسی فرد کا زیور اڑا لے جائیں۔ آسیہ کے مطابق مقتولہ صابری کا ذاتی زیور دو طلائی بالیوں تک محدود تھا جو بوقتِ قتل اس کے کانوں میں موجود تھیں لیکن کپڑوں والی پوٹلی کو جس انداز میں کھکھوڑا گیا تھا، اس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ قاتل کو اس پوٹلی میں کسی اہم قیمتی شے کی تلاش تھی۔

مجھے زیادہ دیر تک آسیہ کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اسے بیٹھک سے روانہ ہوئے بہ مشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ اس کی شکل مجھے دوبارہ نظر آئی اور اس پر نگاہ پڑتے ہی میں چونک اٹھا۔

وہ بری طرح بوکھلائی ہوئی تھی۔ صابری کی المناک موت نے تو پہلے ہی اسے نڈھال کر رکھا تھا اور اب اس نڈھالی میں احساسِ زیاں بھی شامل ہو گیا تھا۔ اس نے بیٹھک میں قدم رکھتے ہی بکھری ہوئی آواز میں کہا۔

"تھانے...... دار صاحب...... میرا...... سارا

زیور..... اپنی جگہ سے غائب ہے..... ہم..... میں تو لٹ گئی جی.....!''

☆☆☆

صابرہ بی بی عرف صابری کی موت چودہ اور پندرہ جنوری کی درمیانی شب واقع ہوئی تھی۔ میں نے پندرہ جنوری کی صبح موقع کی ضروری کارروائی نمٹانے کے بعد مقتولہ صابری کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دیا تھا۔ اسی روز میں نے رانی کے شوہر پرویز کو بھی حکم دے دیا تھا کہ اگلے روز وہ اپنی بیوی کو وزیر آباد لے آئے تاکہ میں اس سے اہم پوچھ گچھ کر سکوں۔

آسیہ بی بی کے طلائی زیورات کی گمشدگی اس امر کو تقویت پہنچاتی تھی کہ صابری گاؤں کے کسی مرد کے ساتھ بھاگنے کا پروگرام بنا کر گھر سے نکلی تھی۔ یہ اس کی بدقسمتی کہ وہ دردناک موت کا شکار ہوگئی۔ اس کے قاتل تک، اس وقت تک رسائی ممکن نہیں تھی جب تک یہ معلوم نہ ہو جاتا کہ مقتولہ کے عشق و محبت کے معاملات کس شخص کے ساتھ چل رہے تھے..... اور یہ جان کاری صرف اور صرف رانی ہی مجھے دے سکتی تھی۔ اسی مقصد کی خاطر میں نے رانی کو فوراً وزیر آباد بلانے کا بندوبست کیا تھا۔ مقتول کا کوئی راز رانی سے چھپا ہوا نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے گزشتہ روز جائے وقوعہ پر ماسٹر بھٹی کے ''پڑوسی'' احمد علی کو یہ ڈیوٹی سونپی تھی کہ ماسٹر جیسے ہی کندن پور سے واپس آئے، وہ اسے اپنے ساتھ تھانے لے آئے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں رات کو کافی دیر تک اپنے کمرے میں موجود رہا تھا۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ یا تو احمد علی کو میری ہدایات یاد نہ رہی ہوں..... یا پھر گزشتہ رات ماسٹر بھٹی کندن پور سے واپس ہی نہ آیا ہو۔ یہ دونوں صورتِ حال خاصی تشویش ناک تھیں۔

سولہ جنوری کی صبح میں ان خیالات کے ساتھ تھانے آیا کہ کسی اہلکار کو وزیر آباد بھیج کر احمد علی کو بلا لوں گا تاکہ حقیقت کا پتا چل سکے لیکن اس بلاوے کی نوبت نہیں آئی اور جیسے ہی میں نے تھانے کے برآمدے میں قدم رکھا، احمد علی ایک دراز قامت اور سانولی رنگت والے شخص کے ساتھ چوبی بینچ پر بیٹھا نظر آیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''سلام تھانے دار صاحب!'' وہ ایک ہاتھ کو سیلوٹ کے انداز میں ماتھے پر سجاتے ہوئے بولا۔ ''رات کو ماسٹر جی کافی دیر سے واپس آئے تھے۔ اس وقت اندھیرا پھیل رہا تھا اور بہت زیادہ دھند بھی تھی اس لیے میں رات کو آپ کے پاس نہیں آسکا.....'' پھر اس نے اپنے دراز قد ساتھی کی طرف دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ماسٹر جی نے بھی یہی کہا کہ صبح تھانے چلیں گے۔''

مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ احمد علی کا ساتھی ہی دراصل ماسٹر عارف بھٹی تھا کیونکہ احمد علی کی بات کے اختتام پر اس نے گردن کی اثباتی جنبش کے ساتھ مجھے سلام بھی کیا تھا۔

''آؤ میرے ساتھ.....!'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

عارف بھٹی اور احمد علی میری تقلید میں قدم اٹھانے لگے۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے احمد علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''احمد علی! تم ادھر برآمدے ہی میں بیٹھو.....!''

وہ فوراً میرا اشارہ سمجھ گیا اور جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اچھا جی.....!''

میں ماسٹر عارف کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوگیا۔

ماسٹر عارف بھٹی جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں، سانولی رنگت والا ایک دراز قامت شخص تھا جس کی عمر چالیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی خاموشی اور ٹھہراؤ پایا جاتا تھا۔ ایسے لوگ بہت ہی محتاط اور کم آمیز ہوتے ہیں۔

اس نے گرم شلوار قمیص پر اونی جرسی پہن رکھی تھی اور خود کو سردی سے مزید محفوظ رکھنے کے لیے گلے میں گرم مفلر بھی لپیٹ رکھا تھا۔

میں چند لحات اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ماسٹر صاحب! آپ نے صابری کو پیش آنے والے واقعے کے بارے میں تو سن لیا ہوگا؟''

''جی ہاں..... بہت ہی افسوس ناک واقعہ ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''بے چاری صابری کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔''

''یہ واقعہ آپ کے گھر کے پچھواڑے چند گز کے فاصلے پر رونما ہوا ہے ماسٹر صاحب!'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟''

''مجھے تو پچھلی رات کو اس واقعے کے بارے میں پتا

چلا ہے جناب۔'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں کل صبح جب گھر سے نکلا تھا تو وزیر آباد میں ہر طرف امن وامان نظر آتا تھا۔''

فیکا کوچوان کے ساتھ شوکت نامی جو شخص گزشتہ روز مجھ سے ملنے تھانے آیا تھا، اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے علی الصباح صابری کی لاش کو جھاڑیوں میں دریافت کیا تھا اور ظاہر ہے اس کے بعد یہ اندوہناک خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی ہوگی۔ شوکت کے بیان کا حوالہ دینے کے بعد میں نے ماسٹر عارف سے پوچھ لیا۔

''آپ اسکول جانے کے لیے کل کتنے بجے گھر سے نکلے تھے؟''

''میں بہت جلدی گھر سے نکل جاتا ہوں تھانے دار صاحب!'' اس نے جواب دیا۔ ''فجر کی نماز کے بعد میں ناشتا کرتا ہوں اور پھر اسکول کے لیے روانہ ہوجاتا ہوں۔ میرا اسکول وزیر آباد سے تین میل دور کندن پور نامی گاؤں میں واقع ہے اور راستہ بھی کچا اور خاصا ناہموار ہے۔ اسی لیے مجھے کافی جلدی گھر سے نکلنا پڑتا ہے اور واپسی میں بھی خاصی دیر ہوجاتی ہے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا، ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''کل صبح جب میں اسکول کے لیے گھر سے روانہ ہوا، اس وقت تک صابری کو پیش آنے والے واقعے کی خبر عام نہیں ہوئی تھی۔''

''آپ تین میل کا یہ فاصلہ کیسے طے کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنی سائیکل پر جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ابھی بھی میں اور احمد علی اسی سائیکل پر سوار ہوکر آپ کے پاس آئے ہیں اور یہاں سے سیدھے واپس وزیر آباد جائیں گے کیونکہ اس واقعے کے بعد مجھے اسکول سے چھٹی کرنا ہوگی۔''

''میں نے صابری کی لاش کا بہ غور معائنہ کیا ہے ماسٹر صاحب!'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''اور مجھے یقین ہے، اس بدنصیب کو رات کے درمیانی حصے میں گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے اور غالب امکان اس بات کا ہے کہ قتل کرنے سے قبل اس پر مجرمانہ حملہ بھی کیا گیا ہے۔ مقتولہ کا جابہ جا پھٹا ہوا لباس اس امر کا ثبوت ہے کہ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے اچھی خاصی مزاحمت کی تھی۔'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔

''کیا وقوعہ کی رات آپ اپنے گھر پر موجود تھے؟ میں چودہ اور پندرہ جنوری کی درمیانی رات کا ذکر کررہا ہوں جب صابری کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا؟''

''جی ہاں.....'' ماسٹر بھٹی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں اس رات اپنے گھر میں ہی تھا۔''

''جائے وقوعہ آپ کے مکان سے چند قدموں کے فاصلے پر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ نے اس رات اپنے گھر کے پچھواڑے، جھاڑیوں میں کوئی غیر معمولی سرگرمی محسوس کی؟''

''جی ہاں..... محسوس کی۔'' اس نے بڑی سادگی سے بتایا۔

عارف بھٹی کے جواب نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میں نے اضطراری انداز میں پوچھا۔ ''کیسی سرگرمی؟''

''سردیوں کے موسم میں میرے ساتھ ایک مسئلہ ہوتا ہے تھانے دار صاحب.....!'' وہ گہری سنجیدگی سے بتانے لگا۔ ''مجھے رات میں ایک دوبار رفع حاجت کے لیے اٹھنا پڑتا ہے حالانکہ میں رات میں پانی بھی نہیں پیتا ہوں، تو جناب.....!''

لمحاتی توقف کرکے اس نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا ہو کہ میں اس کی بات کا یقین کررہا ہوں یا نہیں۔ میں نے کسی قسم کا ردعمل ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا اور یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''وقوعہ کی رات بھی جب میں رفع حاجت کے لیے اٹھا تو مجھے گھر کی عقبی جھاڑیوں میں عجیب سی سرگرمی محسوس ہوئی تھی لیکن میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی کیونکہ اس وقت مجھے شدید نیند آرہی تھی۔ میں لحاف میں گھس کر دوبارہ سوگیا۔''

ماسٹر بھٹی کی مبہم مگر انکشاف انگیز باتوں نے میرے رگ وپے میں سنسنی دوڑا دی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے جلد ہی اس کیس کا کوئی اہم سرا میرے ہاتھ آنے والا ہے۔

''بھٹی صاحب.....!'' میں نے ماسٹر عارف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''آپ رفع حاجت کے لیے اپنے گھر سے باہر گئے تھے یا.....؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''جی ہاں، میں گھر سے باہر گیا تھا۔''

''گھر کی عقبی جانب..... جھاڑیوں کی سمت؟''

میرے استفسار میں تیزی آ گئی۔

''جی...... بالکل۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔''اس مقصد کے لیے ان جھاڑیوں سے زیادہ مناسب اور کوئی مقام ہو ہی نہیں سکتا۔''

''کیا آپ جھاڑیوں کے اندر گئے تھے؟''

''نہیں جناب! میں نے جھاڑیوں کے اندر جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔'' اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔''میرا کام جھاڑیوں کے باہر ہی ہو گیا تھا۔''

''یہ وہی وقت تھا جب آپ نے جھاڑیوں کی سمت عجیب سی سرگرمی محسوس کی تھی؟'' میں نے بہ دستور اس کے چہرے پر نگاہ جمائے ہوئے کہا۔''کیا آپ اس سرگرمی کی کچھ وضاحت کریں گے؟''

''جھاڑیوں کے اندرونی حصے سے عجیب سی خرخراہٹ کی دھیمی آوازیں ابھر رہی تھیں۔'' اس نے بتایا۔ ''جیسے کوئی جاندار غرا رہا ہو یا پھر جیسے کوئی مشکل سے سانس لے رہا ہو جیسا کہ دمے کے کسی مریض کی سانس چلتی ہے۔''

''اتنی واضح گڑبڑ کے بعد بھی آپ چونکے نہیں۔'' میں نے تعجب خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔''ایسا محسوس ہوتے ہی آپ کو تو تشویش میں مبتلا ہو جانا چاہیے تھا......؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں ایسا کر نہیں سکا۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

وہ اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔''میرے ایسا نہ کر سکنے کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ نمبر ایک...... جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں، اس وقت مجھے شدید نیند آ رہی تھی اور میری پہلی خواہش یہی تھی کہ جلدی سے گرم بستر میں گھس کر سو جاؤں۔ نمبر دو......!'' لمحاتی توقف سے اس نے اپنی سانس کو ہموار کیا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس وقت میں یہی سمجھا تھا کہ کوئی شب بیدار جانور اپنی مادہ کو گھیر گھار کر ان جھاڑیوں کی طرف لے آیا ہے اور اسے راضی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے ان کے معاملے پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور جلدی سے گھر میں داخل ہو کر نیند سے ناتا جوڑ لیا......''

''کاش! آپ نے اس وقت اس مخصوص خرخراہٹ پر توجہ دی ہوتی۔'' میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔''تو مجھے یقین ہے، صابری کو بے بسی کی موت مرنے سے بچایا جا سکتا تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب ایک سفاک قاتل گلا گھونٹ کر آسیہ ماچھن کی بیٹی صابری کو موت کے گھاٹ اتار رہا تھا۔''

''لیکن جناب! مجھے اس بات کا کوئی پتا تھوڑی تھا۔'' وہ سادگی سے بولا۔''اس میں میرا کیا قصور ہے......''

''میں آپ کو قصور وار نہیں ٹھہرا رہا۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔''میں نے تو ایک امکان کا ذکر کیا ہے۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

مزید پندرہ بیس منٹ تک ہمارے درمیان گفتگو جاری رہی۔ میں نے ماسٹر بھٹی کو اس حوالے سے بھی ٹٹولنے کی کوشش کی کہ آیا وہ صابری کے کسی معاشقے سے بھی واقف ہے یا نہیں مگر اس سلسلے میں اس نے اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ اپنی ذات میں مگن رہنے والا ایک تنہائی پسند شخص تھا اور گاؤں والوں کے معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ میں نے اس تاکید کے ساتھ اسے تھانے سے جانے کی اجازت دے دی۔

''ماسٹر صاحب! سنجیدہ اور لیے دیے رہنا بہت اچھی بات ہے لیکن انسان کو اپنے ماحول سے اس قدر بھی نہیں کٹ جانا چاہیے کہ لوگ اسے خود پسند اور مغرور سمجھنے لگیں......''

''جناب......!'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔''وزیر آباد کے لوگوں کے ساتھ میرے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ وہ میری بہت عزت کرتے ہیں۔ وہ مجھے مغرور یا خود پسند نہیں سمجھتے۔''

''وہ آپ کی عزت اور احترام اس لیے بھی کرتے ہیں کہ آپ ایک استاد ہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔''اس لیے آپ پر بھی لازم ہے کہ ان کے دکھ درد اور خوشی میں شامل رہا کریں۔''

''جی...... میں کوشش کروں گا۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

''اور اس کوشش کی فی الحال بہت زیادہ ضرورت ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔''خاص طور پر جب تک صابری کے قتل کا معما حل نہیں ہو جاتا۔ آپ گاؤں کے لوگوں کے ساتھ گھلیں ملیں گے تو ہو سکتا ہے، اس سلسلے میں کوئی اہم سراغ ہاتھ لگ جائے۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا۔

''آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا......؟''

''جی...... اچھی طرح سمجھ رہا ہوں......'' وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

ماسٹر بھٹی کی ذات کے حوالے سے میرے ذہن میں

بہت سے سوالات تھے۔ وہ لگ بھگ چالیس سال کا تھا اور اکیلا رہتا تھا۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ وزیر آباد میں رہائش اختیار کرنے سے پہلے وہ کہاں رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ، بہن بھائی اور دیگر عزیز رشتے دار کہاں تھے۔ اس نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی تھی اور اگر شادی کی تھی تو اس کی بیوی کہاں تھی۔ وہ رہتا وزیر آباد میں تھا اور وہاں سے تین میل دور کندن پور نامی ایک گاؤں میں پڑھانے جاتا تھا۔ آخر وہ کندن پور ہی میں رہائش کیوں نہیں رکھ لیتا...... وغیرہ وغیرہ!

میں نے سوچا، فرصت سے بیٹھ کر ماسٹر بھٹی کو کریدنے کی کوشش کروں گا۔ وہ مزید کچھ دیر صابری کی المناک موت کے حوالے سے بات چیت کرتا رہا پھر مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ سولہ جنوری کا باقی دن بھی اسی قتل کی انکوائری کی نذر ہو گیا۔ گزشتہ روز میں نے رانی کے شوہر پرویز کو تاکید کی تھی کہ وہ آج یعنی سولہ جنوری کو شیخوپورہ جائے اور پہلی فرصت میں اپنی بیوی کو لے کر آجائے۔ مقتولہ کی ماں آسیہ سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کی روشنی میں رانی، صابری کے کسی خفیہ عشقیہ معاملے سے پردہ اٹھا سکتی تھی۔

مجھے اس بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا تھا کہ مقتولہ صابری کسی مرد کے ساتھ فرار ہونے کا منصوبہ لے کر گھر سے نکلی تھی۔ آسیہ کے طلائی زیورات کا غائب ہو جانا بھی اس امر کی تصدیق کرتا تھا۔ جھاڑیوں کے اندر سے کپڑوں والی جو پوٹلی دستیاب ہوئی تھی، وہ بھی یہی کہانی سنا رہی تھی کہ قاتل نے کسی قیمتی شے کی تلاش میں مذکورہ پوٹلی کو کھنگال ڈالا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ مجھے یہ پتا لگانا تھا کہ آیا قاتل وہی شخص تھا، صابری جس کے ساتھ بھاگنے کے لیے گھر سے نکلی تھی یا وہ کوئی اور ہی تھا۔ یہ اسی وقت پتا چل سکتا تھا جب مقتولہ صابری کے عاشق کے بارے میں مصدقہ معلومات حاصل ہو جاتیں لیکن میں شیخوپورہ سے رانی کی واپسی تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

میں نے اپنے عملے کے ایک بندے کی وزیر آباد میں ڈیوٹی لگا دی کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کرے کہ گاؤں میں سے کوئی شخص غائب تو نہیں۔ کانسٹیبل فاروق نے مجھے یقین دلایا کہ وہ بہت جلد مجھے حوصلہ افزا رپورٹ دے گا۔ میں نے اسے تاکید کے ساتھ وزیر آباد روانہ کر دیا کہ وہ یہ کام سادہ لباس میں رہتے ہوئے انجام دے گا۔ کانسٹیبل فاروق نے میری ہدایت پر عمل کرنے کی یقین دہانی کرادی۔

☆☆☆

سترہ جنوری کی دوپہر صابری کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش اسپتال سے تھانے پہنچ گئی۔ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ نے میرے بہت سے اندازوں کی تصدیق کر دی۔ بدنصیب صابری کی موت چودہ اور پندرہ جنوری کی درمیانی شب واقع ہوئی تھی۔ اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور اس سے پہلے صابری پر مجرمانہ حملہ بھی کیا گیا تھا۔ موت کا وقت نصف شب بتایا گیا تھا۔ اس بات میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ صابری کا قاتل وہی شخص تھا جس نے اس پر مجرمانہ حملہ کیا تھا۔

اسی رپورٹ میں درج ایک نہایت ہی اہم لائن نے مجھے بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا۔ بڑے واضح الفاظ میں لکھا گیا تھا کہ مقتولہ کے ہاتھوں کے ناخنوں میں انسانی گوشت کے ریشے پھنسے ملے تھے جن کے لیبارٹری ٹیسٹ سے پتا چلا تھا کہ وہ کسی مرد کی جلد کے ریشے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مقتولہ نے خود کو قاتل کے ظلم اور زیادتی کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے قاتل کو بری طرح نوچنے کی کوشش کی تھی۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس نے قاتل کے چہرے یا گردن کو اپنے ناخنوں کی مدد سے کھرچنے کی سعی کی تھی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہی تھی جبھی قاتل کی جلد کے ریشے اس کے ناخنوں کے اندر موجود پائے گئے تھے۔

یہ خاصا سنسنی خیز انکشاف تھا۔ قاتل اگر اس وقت وزیر آباد گاؤں کے اندر موجود تھا تو اس کے چہرے یا گردن پر یقیناً مقتولہ کے ناخنوں کی ”کارکردگی“ دیکھی جاسکتی تھی۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو وزیر آباد روانہ کیا تاکہ آسیہ تھانے آکر اپنی اکلوتی بیٹی کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش لے جائے۔ سہ پہر کے وقت آسیہ تھانے میں موجود تھی۔ میں نے لاش کی حوالگی کے ضمن میں رسمی سی کاغذی کارروائی کرنے کے بعد صابری کی لاش اس کے سپرد کر دی۔ اس کے جانے سے پہلے میں نے اس سے چند سوالات بھی کیے۔

”آسیہ! پچھلے دو دنوں سے تم گھر کے اندر ہی بیٹھی ہو یا باہر نکلنے کا بھی موقع ملا ہے؟“

”گھر کے اندر بند ہو کر تو وقت نہیں گزر سکتا تھانے دار صاحب!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”باہر تو نکلنا پڑتا ہے مگر...... میں نے کوئی کام نہیں کیا۔ تنور اور بھٹی دونوں ٹھنڈے پڑے ہیں۔“

”گھر سے باہر نکلی ہو تو لوگوں سے ملنا جلنا بھی ہوا

ہوگا......'' میں نے اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ ''خاص طور پر گاؤں کے جوانوں اور مردوں سے تو ضرور سامنا ہوا ہوگا؟''

''جی ہاں...... بالکل......!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''م...... مگر...... آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' بات کے اختتام پر اس کی آنکھوں میں حیرت ابھر آئی تھی۔

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیا تم نے کوئی ایسا لڑکا یا مرد دیکھا ہے جس کے چہرے یا گردن پر نوچنے کے نشانات ہوں...... جیسے کھرونچے وغیرہ......؟''

''نن...... نہیں۔'' اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔ ''تھانے دار جی......!'' وہ تشویش بھرے انداز میں مستفسر ہوئی۔ ''آخر بات کیا ہے؟''

میں نے آسیہ کی الجھن دور کرنے کے لیے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں مقتولہ کے ناخنوں کے حوالے سے درج سنسنی خیز انکشاف کی وضاحت کردی اور آخر میں اپنے سوال کو بھی دہرادیا۔

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں جناب! میں نے ایسے کسی بندے کو نہیں دیکھا۔''

''نہیں دیکھا تو دیکھنے کی کوشش کرنا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مطلب یہ کہ اپنی آنکھیں اور دماغ کے دروازے کھلے رکھنا۔ جس شخص نے بھی تمہاری بیٹی کو موت کے گھاٹ اتارا ہے، اس کے چہرے یا گردن پر کھرونچوں کے نشانات ضرور ہوں گے۔''

''جی، ٹھیک ہے...... میں آپ کی ہدایت کو یاد رکھوں گی۔'' وہ فرماں برداری سے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہارے پڑوس کی کیا رپورٹ ہے؟''

''جی...... میں سمجھی نہیں؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''میں یہ پوچھ رہا ہوں......'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا پڑوسی پرویز اپنی بیوی رانی کو لینے شیخوپورہ گیا یا نہیں؟''

''جی...... وہ آج صبح ہی شیخوپورہ گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اس کی واپسی کب تک ہوگی؟''

''اسے کل آجانا چاہیے۔'' آسیہ نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پرویز جب اپنی بیوی رانی کو لے کر وزیرآباد پہنچ جائے تو تم پرویز کو میرے پاس بھیج دینا۔'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور ہاں...... پرویز سے کہنا کہ وہ رانی کو ساتھ لے کر تھانے آئے۔''

''جی...... آپ جیسا کہہ رہے ہیں میں ویسا ہی کروں گی۔'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلادی۔

میں نے بھی.... مقتولہ صابری کی لاش آسیہ کے حوالے کردی۔ رات کو میں تھانے سے اٹھنے ہی والا تھا کہ وہ کانسٹیبل وزیرآباد سے واپس آگیا جسے میں نے گاؤں سے غائب ہونے والے کسی شخص کا پتا لگانے کا فریضہ سونپا تھا۔ میں نے کانسٹیبل فاروق کو فوراً اپنے پاس بلالیا۔

''ہاں بھئی...... کیا خبریں ہیں؟'' میں نے فاروق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ملک صاحب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وزیرآباد گاؤں میں پانچ سو کے قریب لوگ آباد ہیں اور میری تحقیق کے مطابق یہ تمام افراد اس وقت گاؤں کے اندر موجود ہیں سوائے ایک بندے کے......''

میں نے سوالیہ نظر سے فاروق کی طرف دیکھا۔ ''کون سا بندہ؟''

''حنیف عرف حنیفو!'' اس نے بہ دستور ٹھہرے ہوئے انداز میں ہی.... جواب دیا۔ ''حنیفو پانچ روز پہلے اپنی خالہ سے ملنے لاہور گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔''

''پانچ دن پہلے......!'' میں نے کانسٹیبل کے الفاظ کو گمبھیر انداز میں دہرایا۔ ''یعنی وقوعہ سے دو روز قبل...... بارہ جنوری کو؟''

''جی، میری یہی معلومات ہیں۔''

''اور اس حنیفو کی واپسی کب تک متوقع ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا ملک صاحب۔'' کانسٹیبل نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''حنیفو کے گھر والوں سے میری بات ہوئی ہے۔ ان کے مطابق حنیفو من موجی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ کل ہی واپس آجائے اور یہ بھی ممکن ہے، ایک ہفتہ اور وہاں رک جائے۔''

''اچھا...... وہ اتنا ہی لاٹ صاحب ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''حنیفو کے گھر والوں کا تاریخ اور جغرافیہ کیا کہتا ہے......؟''

"حنیفو کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے جناب۔" کانسٹیبل نے بتایا۔ "اس کا باپ فضل دین کمہار عرف فضلو بابا وزیر آباد میں چاک مشین پر مٹی کے برتن تیار کرتا ہے مثلاً روغنی ہانڈیاں، مٹکے، گھڑے، لوٹے اور آب خورے وغیرہ......!"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے......" میں نے ہاتھ کے اشارے سے کانسٹیبل فاروق کو مزید بولنے سے روک دیا اور پوچھا۔ "یہ حنیفو کام کاج کیا کرتا ہے؟"

"چاک مشین کے کاموں میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے جناب۔" کانسٹیبل نے بتایا۔ "اس کے باپ فضلو بابا نے کہا ہے کہ حنیفو کام پر زیادہ توجہ نہیں دیتا۔ اس کا دل گھومنے پھرنے کے کاموں میں زیادہ لگتا ہے۔"

"وزیر آباد میں حنیفو کی شہرت کیسی ہے؟"

"اکثر لوگ اسے کام چور، ہڈحرام اور آوارہ سمجھتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "حنیفو گھر میں، بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہے اور وہ اکلوتا بیٹا بھی ہے۔ اس سے چھوٹی دو بہنیں ہیں، زاہدہ اور ریحانہ۔ یہ دونوں لڑکیاں اپنے باپ کا بھرپور ہاتھ بٹاتی ہیں۔ حنیفو اپنی ماں نزہت بی بی کا بڑا لاڈلا ہے۔ نزہت گھر میں کسی کو اس کے خلاف بولنے نہیں دیتی۔"

"جبھی حنیفو کے مزاج نوابانہ ہو گئے ہیں۔" میں نے تلخی بھرے انداز میں کہا۔ "لگتا ہے، ماں کے لاڈ پیار نے اسے حد سے زیادہ بگاڑ دیا ہے۔ اسے اپنے بوڑھے باپ کی مدد کرنا چاہیے اور اسے آوارہ گردی ہی سے فرصت نہیں۔ خیر......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ حنیفو جب بھی میرے ہاتھ چڑھا، میں اس کے کان ضرور کھینچوں گا۔" کانسٹیبل فاروق اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

میں نے دکان داری سمیٹی اور تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی جانب قدم بڑھا دیے جو تھانے کے پچھواڑے ہی واقع تھا۔

☆☆☆

میں رات کو سونے کے لیے گرم بستر میں گھسا تو صابری مرڈر کیس کی سوچ میرے ذہن سے مسلسل چپکی ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ نے میرے تمام تر خدشات اور اندازوں کی تصدیق کر دی تھی۔ بس ایک اندازے کا شرمندۂ تعبیر ہونا باقی تھا اور وہ تھا قاتل کا ناخنوں سے نچا ہوا چہرہ یا گردن اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ مقتولہ کے ہاتھ کے ناخنوں سے ملنے والے انسانی جلد کے ریشے اس امر کا بین ثبوت تھے کہ مقتولہ نے اپنے ساتھ ہونے والے ظلم و زیادتی کی راہ میں مزاحمت پیش کرتے ہوئے حملہ آور کے چہرے یا گردن کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہوگا۔

اگر مقتولہ نے اس وحشی قاتل سے اپنی عزت اور جان کا بچاؤ کرتے ہوئے اپنے ناخنوں کا استعمال کیا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اسے حلق کے استعمال کا خیال نہ آیا ہو۔ یقیناً وہ روئی پیٹی اور چیخی چلائی بھی ہوگی۔ اس کی پکار کا ارتعاش فضا میں ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف بھی گیا ہوگا اور ان جھاڑیوں سے قریب ترین مقام ماسٹر عارف بھٹی کا گھر تھا۔ اگر اس نے وقوعہ کی رات اپنے گھر کی عقبی سمت جھاڑیوں کے اندر "خرخراہٹ" کی آواز سنی تھی تو بدنصیب صابری کی چیخ و پکار اس کی سماعت تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام کیوں رہی تھی؟

"کیا عارف بھٹی نے صابری کو پیش آنے والے جان لیوا واقعے کے حوالے سے مجھ سے دروغ گوئی سے کام لیا ہے......؟"

میرے دماغ میں سر اٹھانے والے اس سوال نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جب کوئی انسان غلط بیانی سے کام لیتا ہے تو وہ یا تو اپنے کسی جرم کی پردہ پوشی کی کوشش کر رہا ہوتا ہے یا پھر آپ کو دھوکا دے کر کوئی بہت بڑا مقصد حاصل کرنے کی تگ و دو میں ہوتا ہے...... تو کیا ماسٹر عارف بھٹی نے بھی اپنے کسی گناہ یا جرم کو چھپانے کے لیے، جھاڑیوں میں پیش آنے والے افسوس ناک واقعے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تھا......؟

اس سوال کے ساتھ ہی ماسٹر عارف کا چہرہ میرے تصور میں گھوم گیا۔ اس تخیلاتی منظر نے مجھے نرم اور گرم بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا کیونکہ میرے تصور کی آنکھ ماسٹر عارف کی گردن پر جا کر رک گئی تھی۔

وہ تھانے میں جب مجھ سے ملنے آیا تھا تو اس نے سرتاپا گرم لباس پہن رکھا تھا اور خود کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے اس نے اپنے گلے میں گرم مفلر بھی لپیٹ رکھا تھا۔ موسم سرما میں گرم ٹوپی، دستانے اور مفلر کا استعمال کوئی غیر معمولی اور اچنبھے کی بات نہیں۔ میرے چونکنے کا سبب یہ تھا کہ ماسٹر عارف بھٹی نے اس مفلر کو بڑے بے ڈھنگے انداز میں اپنی گردن کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ کیا وہ اپنی گردن کے کسی عیب کو لوگوں کی نظروں سے چھپانا چاہتا تھا؟

یہ بہت ہی طاقتور سوال تھا اور ماسٹر عارف کی ذات کو شک کے مضبوط دائرے کے اندر بند کرتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ وزیر آباد کے آخری سرے پر ایک مکان میں تنہائی کی زندگی گزار رہا تھا۔ وزیر آباد کا کوئی رہائشی اس کے بارے میں مکمل معلومات نہیں رکھتا تھا۔ ماسٹر کی زندگی میں عورت کا گزر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ تجرد کی زندگی گزار رہا تھا۔ کہیں سردیوں کی ٹھنڈی ٹھار رات میں، کسی نازک لمحے نے اس کے قدموں میں لغزش تو پیدا نہیں کر دی تھی؟ کہیں اس نے تو صابری کو......!

میں اس سے آگے مزید نہیں سوچ سکا کیونکہ یہ سوچنے کا نہیں، عمل کرنے کا وقت تھا۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد سادہ مگر گرم لباس میں، ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں موجود تھا۔ حوالدار ایوب باجوہ نے مجھے دوبارہ تھانے میں دیکھا تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ سیدھا میرے کمرے میں چلا آیا اور پوچھنے لگا۔

''ملک صاحب! خیریت تو ہے نا۔ آپ اس وقت؟''

''کیا اس وقت میں تھانے نہیں آسکتا؟'' الٹا میں نے اسی سے پوچھ لیا۔ ''کیا محکمہ جاتی کارروائی کے لیے کوئی وقت مخصوص ہے اور یہ کام رات میں کرنے کی ممانعت ہے......؟''

''میرے پوچھنے کا یہ مطلب نہیں تھا تھانے دار صاحب!'' وہ میری سنجیدگی کے پیشِ نظر جلدی سے بات کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''عام حالات میں آپ اس وقت تھانے آتے نہیں، کہیں......؟''

''تمہارا اندازہ درست ہے۔'' میں نے اس کے ادھورے جملے کے جواب میں سر کو اثباتی جنبش دی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت حالات عام نہیں ہیں اسی لیے مجھے اپنے کوارٹر سے باہر قدم نکالنے کی ضرورت پیش آئی اور اب میرا تھانے سے بھی باہر جانے کا ارادہ ہے......''

''کہاں......'' اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ ''کس طرف ملک صاحب؟''

''موضع وزیر آباد کی طرف۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''اور تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔''

''کوئی خاص بات ہے وہاں؟'' وہ متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''خاص اور عام...... تمام باتیں راستے میں کریں گے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''تم فوری طور پر وزیر آباد چلنے کی تیاری کرو۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''جو آپ کا حکم......''

پندرہ بیس منٹ کے بعد میں اور حوالدار ایوب باجوہ دو گھوڑوں پر سوار ہو کر وزیر آباد نامی اس چھوٹے سے گاؤں کی سمت رواں دواں تھے۔

راستے بھر حوالدار ایوب باجوہ اور میں، صابری کے بہیمانہ قتل کے حوالے سے بات چیت کرتے رہے۔ باجوہ اس کیس کے سلسلے میں اب تک ہونے والی کارروائی سے پوری طرح آگاہ تھا۔ جب میں نے ماسٹر عارف بھٹی کی گردن کے گرد لپٹے ہوئے مفلر کا حوالہ دے کر ماسٹر پر اپنے شک کا اظہار کیا تو وہ بھی میرا ہم خیال نکلا۔

''ملک صاحب! میں آپ کے خیالات کی تائید کرتا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ہوسکتا ہے، وقوعہ کی رات جب ماسٹر عارف اپنے مکان کے پچھواڑے جھاڑیوں کی طرف گیا تو اس نے وہاں مقتولہ کو دیکھ لیا ہو اور اس کی نیت خراب ہوگئی ہو......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! ماسٹر عارف ایک ایسا شخص ہے جس کی زندگی میں عورت کہیں نظر نہیں آتی۔ موسم سرما کی ٹھنڈی ٹھار رات، تنہائی، خاموشی، ویرانی اور تاریکی میں کھڑی ایک جوان لڑکی تو فرشتوں کا ایمان بھی ڈانواں ڈول کر سکتی ہے، ماسٹر عارف کس کھیت کی مولی ہے......''

''اس کھیت کا سراغ ہم بعد میں لگائیں گے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پہلے تم فوراً توبہ استغفار کرو۔''

''توبہ استغفار......!'' اس نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''توبہ کس لیے جناب۔ میں نے ایسا کیا کیا ہے؟''

''تم نے فرشتوں کی شان میں گستاخی کی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا۔ ''مجھے بڑی شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ میرا خدا مجھے معاف کرے۔ استغفراللہ......!''

ہمارے درمیان چند لمحات خاموشی سے گزر گئے۔ پھر حوالدار دوبارہ ماسٹر بھٹی کے موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! ماسٹر بھٹی پر شک تو مجھے بھی ہے۔

اب اگر اس کی گردن پر کھرونچوں کے نشانات بھی مل جاتے ہیں تو پھر یہ شک یقین میں بدل جائے گا۔

''ماسٹر کی گردن کے گرد لپٹا ہوا مفلر کھلوانا اور وہاں تین چار روز پہلے لگنے والے کھرونچوں کو ڈھونڈنا مشکل ثابت نہیں ہوگا۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اور اگر وہ صابری کے قتل اور آبروریزی میں ملوث ہے تو اسے کیفرِکردار تک پہنچانا بھی میرے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ثابت ہوگا لیکن.....''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو حوالدار نے ترت پوچھا۔ ''لیکن کیا ملک صاحب..... آپ بولتے بولتے اچانک رک کیوں گئے؟''

''لیکن یہ کہ.....'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''ابھی تک میرا ذہن اس سوال کا جواب تلاش نہیں کرسکا کہ صابری کس بندے کے ساتھ بھاگنے کے لیے گھر سے نکلی تھی اور..... اس کی پوٹلی میں جو طلائی زیور تھا وہ کہاں غائب ہوگیا۔ اس کیس کی زنجیر میں سے چند کڑیاں ابھی مل نہیں رہیں۔ اس بات میں تو کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ مقتولہ صابری فرار کے پروگرام کے ساتھ گھر سے نکلی تھی۔ کوئی بندہ ان جھاڑیوں میں اس سے ملاقات کرنے والا تھا۔ وہ اپنے عاشق سے مل پائی یا نہیں، اس حقیقت کا پتا چلانا ضروری ہے اور اس شخص کا سراغ لگانا بھی نہایت اہم ہے جو صابری کو برباد کرنے اور موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد طلائی زیورات کے ساتھ منظر سے غائب ہوچکا ہے۔ وہ شخص صابری کا عاشق بھی ہوسکتا ہے اور کوئی تیسرا بندہ بھی.....!''

''جناب! صابری کا عاشق اور قاتل ماسٹر عارف بھی تو ہوسکتا ہے۔'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''یہ بھی تو ممکن ہے، ماسٹر اور صابری میں خفیہ معاملات چل رہے ہوں اور اس سے پہلے بھی وہ آپس میں ملتے رہے ہوں۔''

''یہ ناممکن نہیں ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ماسٹر عارف بھٹی اور صابری کے درمیان عاشقانہ تعلقات ہوسکتے ہیں لیکن ماسٹر بھٹی کا صابری کو برباد کرنے کے بعد قتل کرنا سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ صابری، ماسٹر بھٹی سے معمول کی ملاقات کے بعد واپس جارہی ہو اور جھاڑیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے کسی سفاک شخص نے اس پر حملہ کردیا ہو اور..... اسے برباد کرنے کے بعد طلائی زیورات لے اڑا ہو؟''

''میں اس انداز میں نہیں سوچ سکتا ایوب!'' میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''اس امر کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ صابری کسی مرد کے ساتھ فرار ہونے کی نیت سے گھر سے نکلی تھی اور اگر وہ مرد ماسٹر بھٹی ہی تھا تو پھر صابری کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آنا چاہیے تھا اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ صابری، ماسٹر عارف سے ملاقات کے بعد واپس جارہی تھی تو کسی درندہ صفت شخص نے اس پر حملہ کیا ہوگا تو یہ کسی بھی صورت ممکن دکھائی نہیں دیتا کیونکہ جن جھاڑیوں کے اندر سے صابری کی لاش ملی ہے، وہ ماسٹر بھٹی کے مکان کے عقب میں واقع ہیں اور ان کے آگے ایک نالا بہتا ہے۔ ماسٹر سے ملاقات کے بعد واپسی پر ان جھاڑیوں کی طرف جانے کی کوئی تک نہیں بنتی تھی۔ اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ.....'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''صابری اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہونے کے لیے اپنے گھر سے نکلی۔ اس کے عاشق نے ان جھاڑیوں کی طرف آنے کو کہا ہوگا۔ صابری، عاشق سے پہلے وہاں پہنچ گئی ہوگی۔ وہ اپنے عاشق کا انتظار کررہی ہوگی۔ یہ وہی وقت ہوگا جب ماسٹر بھٹی رفع حاجت کی غرض سے جھاڑیوں کی طرف گیا ہوگا۔ اس نے اندھیرے میں صابری کو دیکھ لیا ہوگا۔ تاریک رات میں ایک تن تنہا لڑکی کو پاکر اس کی نیت میں فتور پیدا ہوگیا ہوگا۔ وہ بہلا پھسلا کر یا ڈرا دھمکا کر یا زور زبردستی سے صابری کو جھاڑیوں کے اندر لے گیا ہوگا پھر اس پر مجرمانہ حملہ کردیا ہوگا اور اپنا مذموم مقصد پورا کرنے کے بعد، بدنامی کے خوف سے اس نے گلا دبا کر صابری کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا مگر.....'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے ایک بار پھر متوقف ہوا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ان تمام تر ''ہوگا'' کا تعلق وقتی مفروضوں پر ہے اور اگر یہ تمام مفروضے حقیقت ثابت ہوجاتے ہیں تو پھر دو باتیں لازمی ہیں.....''

''کون سی دو باتیں ملک صاحب؟'' حوالدار پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''نمبر ایک.....'' میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ماسٹر بھٹی کی گردن پر صابری کے ناخنوں کے کھرونچے موجود ہونا چاہئیں۔ نمبر دو..... اگر ماسٹر کے گھر کی تلاشی لی جائے تو آسیہ کے طلائی زیورات وہیں سے برآمد ہونا چاہئیں۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' حوالدار نے تائیدی لہجے میں کہا۔

''مزید تصدیق کے لیے میں ماسٹر کی جلد کا لیبارٹری ٹیسٹ بھی کروا سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مقتولہ صابری کے ناخنوں میں سے قاتل کی جلد کے ریشے ملے ہیں۔ ان ریشوں سے ماسٹر کے ریشوں کا موازنہ سنسنی خیز نتائج کو جنم دے سکتا ہے......''

ہم اسی انداز میں گفتگو کرتے ہوئے وزیرآباد پہنچ گئے۔ وہ سردیوں کا موسم تھا اور لگ بھگ آدھی رات کا عمل۔ ہر طرف گہری تاریکی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہم گھوڑوں کو ہلکی چال چلاتے ہوئے ماسٹر عارف بھٹی کے دروازے تک پہنچ گئے۔

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ پورا گاؤں گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ ان کے گاؤں میں پولیس کس مشن پر ہے۔ وہ لوگ آرام وہ گرم بستروں میں دبکے دن بھر کی تھکن کو جسم وجاں سے نکالنے میں ''مصروف'' تھے۔

ہم نے گھوڑوں کو ایک طرف کھڑا کیا اور ماسٹر عارف بھٹی کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ میں دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور حوالدار سے کہا۔ ''ایوب! تم دروازے پر دستک دو......''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

میں اندھیرے میں جس مقام پر کھڑا تھا، وہاں سے ماسٹر بھٹی کا دروازہ مجھے صاف نظر آرہا تھا مگر وہ دروازہ کھولنے پر مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ حوالدار نے بڑے دھواں دھار انداز میں دستک دی۔ ''کھٹ کھٹ'' اور ''تھپ تھپ'' کی مخصوص آواز رات کی خاموش تاریکی میں بہت دور تک پھیلتی چلی گئی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے حوالدار دستک کے عمل کو دہرانے لگا۔

چوتھی دستک پر مکان کے اندر ایک خمار آلود مردانہ آواز ابھری۔ ''کون ہے...... اتنی رات کو......؟''

میں نے اس آواز کو پہچاننے میں ایک لمحہ ضائع نہیں کیا۔ وہ ماسٹر عارف بھٹی کی آواز تھی۔ وہ یقیناً دستک کی آواز پر گہری نیند سے بیدار ہوا تھا اور غالباً گھر کے صحن میں سے گزر کر دروازے کی جانب آرہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور کھلے ہوئے دروازے میں عارف بھٹی کی صورت نظر آئی۔ حوالدار کو باوردی اپنے سامنے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے چونکا مگر اس چونکنے میں خوف وہراس یا گھبراہٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ میری نگاہ غیرارادی طور پر سب سے پہلے ماسٹر کی گردن کی جانب اٹھی۔ اس نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی لہٰذا میری نگاہ کا مقصد پورا نہ ہو سکا۔ ویسے بھی ماسٹر کی گردن کے معائنے کے لیے تھوڑی بہت روشنی کا ہونا بہت ضروری تھا۔

''کیا بات ہے جناب......!'' وہ حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''سب خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت نہیں ہے ماسٹر صاحب!'' میں نے چہک کر کہا اور تاریکی سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ ''بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

''کیسی گڑبڑ ملک صاحب؟'' وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔

''ماسٹر صاحب! کیا آپ کے گھر میں کوئی بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اتنی اہم بات یہاں سردی میں کھڑے کھڑے تو ہو نہیں سکتی......''

''جی آپ اندر آجائیں۔'' وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے رضا کارانہ انداز میں بولا۔ ''میرا پورا گھر آپ کے لیے حاضر ہے۔''

ماسٹر عارف کا رویّہ اور اس کے لہجے میں شامل اعتماد اس بات کا ثبوت فراہم کرتا تھا کہ آدھی رات کو اپنے دروازے پر پولیس کی آمد نے اسے کسی قسم کی گھبراہٹ یا بوکھلاہٹ میں مبتلا نہیں کیا تھا یعنی اس کے دل میں کوئی چور نہیں تھا۔ بہ الفاظِ دیگر وہ کسی نوعیت کی مجرمانہ کارروائی کا حصہ نہیں تھا اور اسی بات نے میرے ذہن میں کھٹکا پیدا کر دیا تھا۔ حقیقت کیا تھی، وہ تھوڑی دیر میں کھلنے والی تھی۔

میں حوالدار ایوب کے ساتھ عارف بھٹی کے گھر میں داخل ہوا تو...... اس نے بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھائی اور معتدل انداز میں بولا۔

''آئیں جی میرے ساتھ......!''

ہم ماسٹر بھٹی کی معیت میں قدم اٹھانے لگے۔ وہ سیدھا ہمیں اپنے بیڈروم میں لے گیا۔ ایک چارپائی پر اس کا گرم بستر بچھا ہوا تھا۔ بستر پر لحاف بھی نظر آرہا تھا۔ مذکورہ کمرے میں بستر والی چارپائی کے سوا اور کوئی بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔

ماسٹر نے اپنے بستر کی جانب اشارہ کیا اور سرسری انداز میں بولا۔ ''آپ بیٹھیں۔ میں قمیص پہن لوں، پھر

بات کرتے ہیں۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے گرم چادر کو اپنے جسم سے جدا کر کے چارپائی کے ایک کنارے پر رکھ دیا۔ کمرے میں لالٹین روشن تھی اور اس کی روشنی میں میری آنکھ نے جو منظر دیکھا، اس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ماسٹر کے بدن سے چادر ہٹتے ہی پتا چلا کہ وہ اس وقت محض ایک شلوار اور بنیان میں ملبوس تھا۔ بے ساختہ میں نے اس کی گردن پر نظر ڈالی تو میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ماسٹر عارف بھٹی کی گردن پر چار پانچ روز پہلے لگنے والے کھرونچوں کے نشانات موجود تھے جن پر کھرنڈ آچکے تھے......

''ایک منٹ ماسٹر صاحب......!'' میں نے تیز آواز میں کہا۔ ''قمیص بعد میں بھی پہنی جاسکتی ہے۔ پہلے آپ میرے پاس آئیں۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''جی...... کیا مطلب؟''

مطلب سمجھانے کی غرض سے میں آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر تھا جب ہم ماسٹر عارف بھٹی کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ راستے بھر بڑی بڑی قسمیں کھا کر مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ صابری کو پیش آنے والے افسوسناک واقعے سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے تھانے پہنچا کر ہی دم لیا۔ اس کے گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے حتی الامکان اس کے مکان کی تلاشی بھی لی تھی لیکن مجھے جس شے کی کھوج تھی، وہ کہیں سے برآمد نہیں ہو سکی تھی۔ یعنی آسیہ کے گمشدہ طلائی زیورات......

ویسے ایک بات ہے کہ میں ماسٹر بھٹی کی خانہ تلاشی سے ہرگز مطمئن نہیں تھا۔ یہ کام دن کی روشنی میں بڑی تسلی سے کرنے کا تھا اور میں اگلے روز اس کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ تھانے پہنچتے ہی میں نے ماسٹر عارف کو اپنے کمرے میں سامنے بٹھالیا اور خاصے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''اگر صابری کے قتل میں تم ملوث نہیں تو پھر تمہاری گردن پر کھرونچوں کے یہ نشانات کیسے ہیں۔ اس پر ظاہر ہونے والے کھرنڈ سے پتا چلتا ہے کہ یہ زخم چار پانچ روز پہلے تمہیں لگے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟''

''نہیں جناب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ''میری گردن پر یہ زخم پندرہ جنوری کی سہ پہر کو لگے تھے......''

صابری کو چودہ اور پندرہ جنوری کی درمیانی شب برباد کرنے کے بعد موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم پندرہ جنوری کی سہ پہر کا ذکر اس لیے تو نہیں کر رہے تاکہ صابری کی موت کے حوالے سے تم پر شک نہ کیا جائے؟''

''نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''میں آپ سے غلط بیانی نہیں کر رہا۔ پندرہ جنوری کو جب میں کندن پور سے واپس اپنے گاؤں آرہا تھا تو چند افراد نے اچانک مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ یہ زخم انہی کے دیے ہوئے ہیں۔ ان کھرونچوں کے علاوہ انہوں نے میرے بازوؤں، ٹانگوں اور کمر پر بھی چوٹیں لگائی تھیں۔ آپ کہیں تو میں اپنے بدن کے مختلف حصوں پر نمودار ہونے والے نیل آپ کو دکھا سکتا ہوں۔''

''ضرور......!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں وہ نیل دیکھنا چاہوں گا۔''

اگلے چند منٹ میں ماسٹر عارف نے اپنے بدن کے وہ مقامات مجھے دکھا دیے جہاں چوٹوں کے نتیجے میں نیل کے نشانات ابھر آئے تھے۔ اسے واقعتا بری طرح زدوکوب کیا گیا تھا۔ اس معائنے کے اختتام پر اس نے کہا۔

''اسی ناخوشگوار واقعے کی وجہ سے اس دن مجھے گھر پہنچنے میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ اب تو آپ کو میری بات کا یقین آگیا ہوگا؟''

''مجھے کسی بات کا یقین دلانا اتنا آسان نہیں ہے ماسٹر جی۔'' میں نے درشت انداز میں کہا۔ ''ابھی بہت سی ضروری تفتیش باقی ہے۔''

''جی...... کس قسم کی تفتیش؟'' وہ گھبراہٹ آمیز انداز میں مجھے تکنے لگا۔

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم ان حملہ آوروں کو جانتے ہو جنہوں نے پندرہ جنوری کی سہ پہر اسکول سے گھر آتے ہوئے تم پر تشدد کیا تھا؟''

''نہیں جناب! میں انہیں نہیں جانتا۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ سب میرے لیے اجنبی تھے۔''

''ماسٹر بھٹی! تم ایک صلح جو، امن پسند اور اپنے کام سے کام رکھنے والے انسان ہو۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کسی کو تم سے کیا دشمنی

ہوسکتی ہے.....؟''

''اس نکتے پر میں نے بھی بہت غور کیا ہے جناب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔''بس، ایک ہی بات سمجھ میں آرہی ہے۔''

''کون سی بات؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔''تمہاری نظر میں یہ مذموم کارروائی کس دشمن کے اشارے پر کی گئی ہوگی؟''

اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔''جناب! میں کندن پور کے پرائمری اسکول میں چوتھی جماعت کو پڑھاتا ہوں۔ ششماہی امتحان میں، میں نے ایک زمیندار نسیم اعوان کے بیٹے منصور اعوان کو فیل کر دیا تھا۔ میں نے کیا فیل کیا تھا، وہ کمبخت پڑھائی میں اتنا نالائق اور نکما ہے کہ اسے رعایتی نمبروں سے بھی پاس نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نسیم اعوان کندن پور کا ایک طاقتور زمیندار ہے اور اس نے لوگوں پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے بہت سے غنڈے بھی پال رکھے ہیں۔ نسیم اعوان مجھ سے ملنے اسکول آیا تھا اور اس نے منصور کو پاس کرنے کے لیے مجھ پر دباؤ ڈالنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن میں نے اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مجھے شک ہے جناب......'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میرا دھیان تو نسیم اعوان ہی کی طرف جارہا ہے۔ عین ممکن ہے، مجھے عبرت ناک سبق سکھانے کے لیے اس نے اپنے غنڈوں سے یہ کارروائی کرائی ہو......''

''اگر ایسا ہے بھی تو میں پھر بھی کسی اور انداز میں اپنی تسلی کرنا چاہوں گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔''تمہارے پاس صبح تک کا وقت ہے، یعنی دو سے تین گھنٹے۔ اگر تم صابری کے قتل میں کسی بھی طرح ملوث ہو تو سچ بولنے کا فیصلہ کرلو۔ میں کل صبح جب تھانے آؤں تو اس سلسلے میں تمہیں ہاں یا نہ میں جواب دینا ہوگا۔''

''جناب......!'' وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔''میرا جواب ''نہ'' میں ہے۔ اب بھی اور صبح بھی۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر بھی اپنے بیان پر ثابت قدم رہ سکتا ہوں کہ میں نہ تو صابری کے قتل میں ملوث ہوں اور نہ ہی اس حوالے سے مجھے کوئی خبر ہے۔''

''دو تین گھنٹے اچھی طرح سوچ بچار کرنے کے بعد جواب دو گے تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔'' میں نے ڈانٹ آمیز لہجے میں کہا۔''اگر کل صبح بھی تمہارا جواب ''نہ''

نروان

ایک روز جب بابا اکیلے بیٹھے تھے تو میں ان کے سامنے آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا اور بولا۔''بابا! آپ سب لوگوں سے بار بار نروان کا ذکر کرتے ہیں، یہ نروان کیا ہوتا ہے؟''

بابا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا۔''بیٹا! نروان میں نر کا مطلب ہے بغیر اور وان کا مطلب ہے ہوا۔'' پھر کہنے لگے۔''تم نے کبھی تالاب دیکھا ہے؟ جب ہوا چل رہی ہو اور اس کی سطح پر لہریں پیدا ہوگئی ہوں، اس وقت نہ تو اردگرد کے ماحول کا عکس ہی تالاب میں نظر آتا ہے اور نہ تالاب کی تہ میں پڑی کوئی چیز دکھائی دیتی ہے لیکن جب ہوا تھم جائے تو باہر کی ساری دنیا اس میں نظر آنے لگتی ہے اور خود اس کی تہ بھی ابھر کر سطح پر آجاتی ہے۔ بس یہی حال انسان کا ہے۔ جب تک وہ خواہشات کی زد میں رہے گا اسے نہ تو باہر کا کوئی علم حاصل ہوگا اور نہ ہی اندر کی کائنات اس پر منکشف ہوسکے گی۔ خواہشات کی آندھی رک جائے تو سمجھو بینائی مل گئی، نروان حاصل ہوگیا۔''

ڈاکٹر وزیر آغا کے نروان سے اقتباس

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڈوی، کراچی

فرائض

ایک شخص جو امریکا میں نوکری کر رہا تھا اور آج کل چھٹی پر آیا ہوا تھا، ایک روز بڑا خوش گھر آیا اور بیوی سے بولا۔''ہمیں امریکی شہریت مل گئی ہے۔ اب ہم وہاں رہیں گے۔''

بیوی جو برتن دھو رہی تھی، اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔''لو اب تم برتن دھو، میں ذرا شاپنگ کرنے جارہی ہوں۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

میں ہوا تو پھر تمہیں لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے اسپتال بھیجنا ہوگا۔ تفتیشی معاملات میں قسمیں اٹھانے سے بات نہیں بنا کرتی ماسٹر بھٹی!''

''لیبارٹری ٹیسٹ!'' اس نے خوف زدہ انداز میں مجھ سے سوال کیا۔'' آپ کس سلسلے میں میرا لیبارٹری ٹیسٹ کرانا چاہتے ہیں......؟''

''اس امر کی تصدیق کے لیے کہ تمہاری گردن پر لگنے والے کھرونچے مقتولہ صابری کے ناخنوں کی پیداوار ہیں یا جیسا تم کہہ رہے ہو وہی سچ ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے قدرے درشت لہجے میں کہا۔'' مقتولہ کے ناخنوں میں سے انسانی جلد کے جو ریشے ملے ہیں، ان کا موازنہ تمہاری جلد کے نمونے سے کیا جائے گا۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔''

وہ تشویش بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے حوالدار ایوب باجوہ کو اپنے پاس بلا کر ماسٹر عارف بھٹی کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''باجوہ جی...... ماسٹر بھٹی آج کی رات تمہارا مہمان ہے۔ اس کی زیادہ خاطر تواضع کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس، اسے یہ سمجھانے کی کوشش کرنا کہ سچ بولنے ہی میں اس کی بھلائی چھپی ہے۔''

''او کے ملک صاحب!'' ایوب باجوہ نے جھک کر کہا اور ماسٹر بھٹی کو اپنے ساتھ لے گیا۔

میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

ساری رات بھاگ دوڑ میں گزر گئی تھی۔ تھکن سے بدن چور چور ہو رہا تھا لیکن میں سونے کا رسک نہیں لے سکتا تھا حالانکہ جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ بستر پر گر کر ایسی گہری نیند سو جاؤں کہ دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ رہے مگر ان لحات میں، میں دل کی بات نہیں مان سکتا تھا کیونکہ یہ میرا سراسر گھاٹے کا سودا ہوتا۔ اذانِ فجر میں آدھ پون گھنٹا باقی تھا۔ اگر میں سو جاتا تو یقیناً فجر کی نماز نکل جاتی اور یہ مجھے کسی بھی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔ میں نے نمازِ فجر کی ادائیگی کے بعد سونے کا فیصلہ کیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر تازہ ترین صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔

یہ ٹھیک ہے کہ ماسٹر عارف بھٹی کی گردن پر پائے جانے والے کھرونچوں کے کھرنڈ بردار نشانات، صابری کی عبرت ناک موت کے حوالے سے بہت سارے سوالات کو جنم دیتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ماسٹر کا رویہ مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبور کرتا تھا۔ مجرموں سے نمٹنے کا میرا سالہا سال کا تجربہ تھا جو کہتے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی کہ سامنے والا سچ بول رہا ہے یا دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے۔ عادی مجرم بعض اوقات اپنے تجربے اور چہرے کے تاثرات سے مجھے جزوی طور پر دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتے تھے لیکن میں بہت جلد ان کی کامیابی کو ناکامی میں بدل دیا کرتا تھا۔ عارف بھٹی کا شمار پیشہ ور عادی مجرموں میں نہیں ہوتا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات اور عمومی رویّہ مجھے یہی بتا رہا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ بہرحال، تفتیش کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی لازمی تھا۔

میں انہی خیالات کے ساتھ ذہنی کبڈی کھیل رہا تھا کہ قریبی مسجد میں مؤذن نے اذانِ فجر بلند کی۔ میں نے ذہن کو جھٹکا اور ایک نئے دن کے آغاز کے لیے بارگاہِ الٰہی میں حاضری کی تیاری کرنے لگا۔

☆☆☆

اگلے روز دو ایسے واقعات رونما ہوئے کہ ''صابری مرڈر کیس'' کا پانسا پلٹ گیا۔ میں قدرے تاخیر سے تیار ہو کر تھانے پہنچا تو کانسٹیبل نجیب فوراً میرے کمرے میں آگیا۔ نجیب وہی کانسٹیبل تھا جو وقوعہ کی کارروائی میں میرے ساتھ پیش پیش رہا تھا۔ وہ میرے اشارے پر سامنے آکر بیٹھا تو میں نے اس کی کیفیت کے پیشِ نظر پوچھ لیا۔

''کیا بات ہے نجیب! تم خاصے الجھے ہوئے دکھائی دیتے ہو؟''

''ملک صاحب! مجھ سے ایک بھول ہو گئی۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔'' میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں......''

''معاف کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ تو میں بعد میں کروں گا نجیب۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔'' پہلے یہ بتاؤ تم کس بھول کا ذکر کر رہے ہو؟''

اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہاں سے ایک لاکٹ برآمد کرتے ہوئے بولا۔'' یہ بھول جناب......!'' اس کے ساتھ ہی اس نے مذکورہ لاکٹ میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے سوالیہ نظر سے نجیب کو دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ سے وہ لاکٹ لے لیا۔ وہ ایک پانچ کونوں والا لگ بھگ ایک انچ سائز کا ستارہ تھا جس کے ایک کونے میں زنجیر بھی پروئی ہوئی تھی۔ زنجیر اور لاکٹ سنہری رنگ کے تھے مگر ہاتھ میں لیتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ زنجیر اور لاکٹ

سونے کے نہیں بلکہ چاندی کے تھے جن پر سونے کا پانی چڑھا کر طلائی بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ قدرتی طور پر مجھ میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ میں کسی بھی زیور کو ہاتھ میں لیتے ہی یہ جان جاتا ہوں کہ وہ سونے کا ہے یا نہیں۔ مجھے زیور کا لمس ہی اس کی حقیقت سے آشنا کر دیتا ہے۔ اسی طرح قیمتی پتھر بھی میرے ہاتھوں میں آتے ہی اپنی اصلیت کا بھانڈا پھوڑ دیتے ہیں۔

میں نے مذکورہ لاکٹ کو گھما پھرا کر دیکھا۔ اس کی زنجیر کا ہک ٹوٹا ہوا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ یا تو اسے کھینچ کر کسی کے گلے سے اتارا گیا تھا یا زنجیر کے کہیں پھنس جانے سے وہ گردن سے جدا ہو گیا تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے کانسٹیبل کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''یہ کیا ہے...... اور اس کا تمہاری بھول سے کیا تعلق ہے؟''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! وقوعہ کے روز جب میں جائے واردات کا جائزہ لے رہا تھا تو یہ لاکٹ مجھے جھاڑیوں کے بیچ پڑا ملا تھا۔ میں اس وقت آپ سے کئی گز کے فاصلے پر تھا۔ میں نے لاکٹ کو اٹھا کر جیب میں رکھ لیا کہ آپ کے پاس پہنچ کر دکھاؤں گا لیکن پھر یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی۔ کل رات جب میں گھر گیا تو میری بیوی نے یہ لاکٹ مجھے دیا۔ کل دن میں اس نے میری وردی دھوئی تھی اور حسبِ عادت کپڑوں کو پانی میں ڈالنے سے پہلے اس نے میری تمام جیبوں کو اچھی طرح کھنگالا تھا۔ پتلون کی ایک جیب میں سے اسے یہ لاکٹ مل گیا......''

اس لاکٹ کی دریافت ایک سنسنی خیز انکشاف تھا۔ یہ لاکٹ دو میں سے کسی ایک شخص کی ملکیت ہو سکتا تھا۔ نمبر ایک قاتل، نمبر دو مقتولہ۔ میں نے لاکٹ کو اپنے ہاتھوں میں ادھر سے ادھر کرتے ہوئے نجیب سے پوچھا۔

''جائے وقوعہ کی کارروائی پندرہ جنوری کو عمل میں آئی تھی اور آج انیس جنوری ہے۔ تمہاری بیوی نے اٹھارہ جنوری کو وردی دھوئی۔ کیا وہ گندے کپڑوں کو اتنے دن پڑے رہنے دیتی ہے؟''

''وہ اپنی مرضی کی مالک ہے ملک صاحب۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''وہ اگر ایک ہفتہ اور بھی میری وردی کو نہ دھوتی تو میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ میرے بچوں کی ماں ہے اور سارے بچے بھی اسی کے حمایتی ہیں۔ میں نے اپنی سہولت کے لیے تین وردیاں بنوا رکھی ہیں تاکہ ہمیشہ صاف ستھری یونیفارم میں ڈیوٹی کروں......''

لمحے بھر کو رک کر اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''ملک صاحب! آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا......؟''

''بالکل......!'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا پھر تحکمانہ انداز میں اضافہ کیا۔ ''حوالدار سے کہو کہ ماسٹر بھٹی کو لے کر میرے پاس آ جائے۔''

''جی ملک صاحب......!'' کانسٹیبل نجیب نے مجھے سلام کیا اور کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد حوالدار ایوب، ماسٹر بھٹی کے ساتھ میرے پاس پہنچ گیا۔ ماسٹر کی آنکھیں نیند کی طلب کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا، باجوہ نے اسے ایک لمحے کے لیے بھی سونے نہیں دیا تھا۔ میں نے حوالدار کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''باجوہ! کیا خبریں ہیں، تمہاری بات ماسٹر جی کی سمجھ میں آئی یا نہیں؟''

باجوہ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں جناب! یہ اپنی بات پر ڈٹا ہوا ہے کہ صابری کو پیش آنے والے افسوس ناک واقعے سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں......''

''ہوں......!'' میں نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا۔

''میں تو کہتا ہوں جناب......'' حوالدار تجویز دینے والے انداز میں بولا۔ ''ماسٹر کی سچائی کو ناپنے کے لیے اس کی جلد کا لیبارٹری ٹیسٹ کروا ہی ڈالیں۔''

''لیبارٹری ٹیسٹ بھی اپنے وقت پر ضرور ہوگا۔'' میں نے ماسٹر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اس سے پہلے ایک اور ٹیسٹ ضروری ہے۔''

''کون سا ٹیسٹ ملک صاحب؟'' حوالدار سوالیہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

ماسٹر بھٹی نے بھی الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے باجوہ کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ماسٹر بھٹی سے دریافت کیا۔ ''تمہارا لاکٹ کہاں ہے ماسٹر جی؟''

''لاکٹ......!'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''وہ ستارے کی ساخت کا چاندی کا لاکٹ جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے۔'' میں نے یک ٹک اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔

"جناب! آپ..... کیسی باتیں کر..... رہے ہیں۔"
اس کے الفاظ سے الجھن بھری حیرت مترشح تھی۔ "میں نے تو..... کبھی کوئی لاکٹ پہنا ہی نہیں۔"

"تم نے کبھی لاکٹ پہنا ہی نہیں....." اسی کے الفاظ کو دہراتے ہوئے میں نے میز کی دراز میں سے وہ لاکٹ برآمد کرلیا جو کانسٹیبل نجیب نے تھوڑی دیر پہلے مجھے دیا تھا۔ میں نے مذکورہ لاکٹ کو ماسٹر بھٹی کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔ "اس لاکٹ کو پہچانتے ہو؟"

"جی نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلادی۔

"کیا یہ تمہارا نہیں ہے؟" میں نے کڑے لہجے میں سوال کیا۔

"بالکل نہیں جناب۔" وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔

"تو پھر یہ مقتولہ صابری کا ہوگا۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "یہ لاکٹ انہی جھاڑیوں کے اندر سے ملا تھا جہاں مقتولہ صابری کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ یہ قاتل یا مقتولہ میں سے ہی کسی کا ہوسکتا ہے۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب۔" وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ "میں نے خود کبھی لاکٹ نہیں پہنا اور یہ لاکٹ صابری کا ہے یا نہیں، مجھے اس کا بھی کوئی علم نہیں....."

"ٹھیک ہے....." میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "جب تک اس لاکٹ کا معما حل نہیں ہوجاتا، تم سرکاری مہمان کی حیثیت سے میرے تھانے کی حوالات میں مقیم رہو گے اور مطمئن رہو کہ اس قیام کے دوران میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔"

"اور جناب....." حوالدار نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "وہ لیبارٹری ٹیسٹ.....؟"

"اس کے بارے میں، میں بعد میں فیصلہ کروں گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابھی تو میں وزیرآباد جارہا ہوں۔ اگر یہ لاکٹ مقتولہ صابری کا ہے تو اس کی ماں آسیہ اس کی تصدیق کرسکتی ہے۔" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر معنی خیز انداز میں ماسٹر بھٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے وہاں وزیرآباد میں اور بھی ایک دو ضروری کام ہیں..... سنا ہے، عنایت حسین کریانہ فروش سے ماسٹر بھٹی کی بڑی گہری دوستی ہے۔ میں اس سے ایک بھرپور ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

ماسٹر عارف نے چونک کر میری طرف دیکھا تاہم وہ کچھ بولا نہیں۔ حوالدار نے بھی کوئی تبصرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا اور یہ کہتے ہوئے ماسٹر کو میرے کمرے سے لے گیا۔

"ملک صاحب! میں آپ کے لیے تانگے وغیرہ کا بندوبست کرتا ہوں۔"

یہ سچ ہے کہ میں وزیرآباد نامی اس چھوٹے سے گاؤں میں ماسٹر بھٹی کے واحد تعلق دار عنایت حسین کو ٹٹولنے کا ارادہ رکھتا تھا اور لاکٹ کے حوالے سے آسیہ سے بھی تصدیق بہت ضروری تھی تاہم وزیرآباد جانے کا میرا بنیادی مقصد ماسٹر بھٹی کے گھر کی تسلی بخش انداز میں تلاشی لینا تھا۔ گزشتہ رات تاریکی اور لالٹین کی ملگجی روشنی کے باعث میں نے طلائی زیورات کی تلاش میں جو بھی کارروائی کی تھی، میں اس سے مطمئن نہیں تھا۔ میں نے اس کے مکان کو تالا لگا کر چابی اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ ماسٹر بھٹی کی خانہ تلاشی، آسیہ سے ستارے والے لاکٹ کے حوالے سے استفسار، عنایت حسین کریانہ فروش سے پوچھ گچھ کے علاوہ مجھے پرویز پھل فروش کی بھی خبر لینا تھی کہ وہ ابھی تک شیخوپورہ سے اپنی بیوی رانی کو لے کر واپس کیوں نہیں آیا۔ رانی وزیرآباد کی وہ واحد عورت تھی جو مقتولہ صابری کے خفیہ معاملات کے بارے میں معلومات فراہم کرسکتی تھی۔

☆☆☆

جب میں کانسٹیبل نجیب کے ساتھ وزیرآباد میں داخل ہوا تو سامنے سے مجھے پرویز پھل فروش آتا دکھائی دیا۔ اس کی نظر بھی مجھ پر پڑ گئی تھی۔ میں نے کوچوان سے تانگا روکنے کے لیے کہا۔ پرویز تیز قدموں سے چلتے ہوئے تانگے کے قریب آگیا اور اضطراری لہجے میں بولا۔

"تھانے دار صاحب! اچھا ہوا، آپ خود ہی یہاں آگئے....."

"اگر خود ہی یہاں نہیں آتا تو کیا برا ہوجاتا؟" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ جی..... میں آپ کو بلانے ہی جارہا تھا۔" وہ جلدی سے بولا۔

"مگر تمہیں تو اپنی بیوی رانی کے ساتھ میرے پاس آنا تھا۔" میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ "وہ کہاں ہے.....؟"

"وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں....." اس نے بتایا۔ "اسی لیے تو میں اکیلا ہی آپ کو بلانے جارہا تھا۔"

"رانی چلنے پھرنے کے قابل نہیں۔" میں نے

چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا اس کے پاؤں میں مہندی لگی ہے؟"

"مہندی نہیں جناب، بیسن کا لیپ لگا ہے......" اس نے بتایا۔

"بیسن کا لیپ......!" میں نے الجھن بھری آواز میں پوچھا۔ "تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"جناب! میں کل رات کو رانی کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "یہی سوچا تھا، آج صبح رانی کو لے کر آپ کے پاس تھانے آؤں گا مگر انسان جو سوچتا ہے ضروری نہیں وہ پورا بھی ہو جائے......" اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"آج صبح وہ نہانے کے لیے پانی گرم کر رہی تھی کہ کھولتے ہوئے پانی والی دیگچی اس کے پاؤں پر گر گئی۔ دونوں پاؤں کی کھال بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ فوری طور پر جلے ہوئے پاؤں پر بیسن کا لیپ کر دیا گیا ہے۔ یہ ہے ساری کہانی۔"

"بیسن کا لیپ کر کے تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔" میں نے پُرمعنی انداز میں گردن ہلائی۔ "ٹھیک ہے، رانی سے ملاقات کے لیے پہلے تمہارے گھر ہی چلتے ہیں۔"

رانی، مقتولہ صابری کی رازدار سہیلی بھی اور پڑوسن بھی۔ چند منٹ بعد میں رانی کے پاس موجود تھا۔ اس کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ پُرکشش نقوش کی مالک ایک جاذبِ نظر عورت تھی۔ میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

"رانی! مجھے تمہارے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا دہرا افسوس ہے۔ ایک تو تمہاری عزیز سہیلی کو کسی وحشی درندے نے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا اور دوسرے تمہارے پاؤں جل گئے۔"

"پاؤں جلے ہیں تو چند دن میں ٹھیک بھی ہو جائیں گے تھانے دار صاحب۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "لیکن مجھے صابری کی موت کا بڑا دکھ ہے۔"

"دکھ ہونا بھی چاہیے۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ "یقیناً تمہاری اولین خواہش یہ ہوگی کہ میں جلد از جلد صابری کے قاتل کو گرفتار کر کے عبرت ناک سزا دلواؤں؟"

"جی...... میرا دل تو یہی چاہتا ہے۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

"رانی! یہ اسی صورت ممکن ہے جب تم میرے ساتھ تعاون کرو گی۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "تمہاری مدد کے بغیر میں صابری کے قاتل تک نہیں پہنچ سکتا۔"

"میں بھلا تعاون کیوں نہیں کروں گی۔" وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ "بتائیں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔"

"میں اس بندے کا نام جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے براہِ راست رانی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "جس کے ساتھ صابری محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھی۔ جب تک وہ شخص سامنے نہیں آئے گا، صابری کے قاتل تک رسائی ممکن نہیں ہو سکے گی۔"

"جی...... وہ...... وہ......!" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔

"کیا وہ؟" میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

"وہ حنیفو سے پیار کرتی تھی......" بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

اس کے انکشاف نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اضطراری انداز میں دریافت کیا۔ "تم فضلو کمہار کے بیٹے حنیفو کی بات کر رہی ہو نا؟"

"جی...... جی وہی۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔"

حنیف عرف حنیفو وہ واحد نوجوان تھا جو گاؤں میں موجود نہیں تھا۔ میری اطلاعات کے مطابق حنیفو بارہ جنوری کو اپنی خالہ سے ملنے لاہور گیا تھا اور ابھی تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی جبکہ صابری کو پیش آنے والا واقعہ چودہ اور پندرہ جنوری کی درمیانی شب کا تھا۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے اپنی جیب میں سے ستارہ شکل کا وہ لاکٹ نکالا اور رانی کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا تم اس لاکٹ کو پہچانتی ہو؟"

لاکٹ پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک اٹھی تھی۔ میرے سوال کے جواب میں وہ جلدی سے بولی۔ "یہ لاکٹ حنیفو کا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اس کے گلے میں دیکھا ہے...... آپ کو یہ کہاں سے ملا؟"

"انہی جھاڑیوں میں سے جہاں صابری کی لاش پڑی تھی......" میں نے جواب دیا۔

"اوہ......!" وہ ایک گہری سانس خارج کر کے

رہ گئی۔

میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''اس لاکٹ کی جھاڑیوں میں موجودگی سے پتا چلتا ہے کہ چودہ اور پندرہ جنوری کی درمیانی رات حنیفو موضع وزیر آباد آیا تھا۔ اس نے جھاڑیوں میں صابری کو آنے کا کہہ رکھا تھا۔ وہ صابری کو اپنے ساتھ بھگا لے جانا چاہتا تھا۔ صابری اسی قسم کی تیاری کے ساتھ گھر سے نکلی تھی۔ اس کے بعد جھاڑیوں کے اندر کیا واقعہ پیش آیا، اس کی تفصیل میں حنیفو کمہار کی زبانی سنوں گا۔ بہرحال.....'' میں لمحے بھر کو رکا، ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''رانی! تمہارے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔'' میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''تم آرام کرو، میں چلتا ہوں۔''

میرے تجزیے نے اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔ وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''صابری اکثر یہ تو ذکر کیا کرتی تھی کہ حنیفو اسے لاہور شہر میں رکھنے کی باتیں کرتا ہے لیکن انہوں نے گاؤں سے بھاگنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا، اس کی مجھے کوئی خبر نہیں۔''

''مجھے تمہاری بات کا یقین ہے رانی۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''تم اپنے ذہن کو بلاوجہ الجھانے کی کوشش نہ کرو۔ ممکن ہے حنیفو نے صابری کو سختی سے منع کر رکھا ہو کہ فرار کے منصوبے کی کسی کو بھنک نہیں پڑنا چاہیے۔''

وہ متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں رانی کے گھر سے نکل کر آسیہ کے پاس آیا اور اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا پھر میں سیدھا فضلو کمہار کے گھر پہنچ گیا۔ فضلو اور اس گھر کے دیگر افراد کا متفقہ بیان یہی تھا کہ حنیفو بارہ جنوری کو اپنی خالہ سے ملنے لاہور گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ انہوں نے لاکٹ کے حوالے سے تصدیق کر دی تھی کہ وہ ہر وقت حنیفو کے گلے میں رہتا تھا۔ میں نے ان لوگوں سے حنیفو کی لاہور والی خالہ رشیدہ کے گھر کا پتا لے لیا اور ان الفاظ کے ساتھ وہاں سے واپس آ گیا۔ ''تم سب لوگ مل کر دعا کرو کہ حنیفو چودہ اور پندرہ جنوری کی درمیانی رات وزیر آباد نہ آیا ہو ورنہ اس کی خیر نہیں......''

حنیفو کے حوالے سے جو سنسنی خیز معلومات مجھے حاصل ہو چکی تھیں، ان کا تقاضا یہی تھا کہ میں پہلی فرصت میں اس کی گردن ناپنے لاہور روانہ ہو جاؤں۔ میں نے عنایت حسین کریانہ فروش سے ملاقات اور ماسٹر عارف بھٹی کے مکان کی تلاشی کا پروگرام فی الحال مؤخر کر دیا اور اسی روز دوپہر کے بعد پوری تیاری کے ساتھ لاہور جانے والی بس پر سوار ہو گیا۔

☆☆☆

دریائے راوی کے کنارے پر آباد ''شاہ درہ'' اس زمانے میں ایک چھوٹا سا محلہ ہوا کرتا تھا۔ آج کل تو یہ طول وارض میں دور دور تک پھیل چکا ہے۔ مغرب سے تھوڑی دیر پہلے میں شاہ درہ میں تھا۔ میں نے سب سے پہلے متعلقہ تھانے جا کر تھانہ انچارج کو اپنی آمد کی غرض وغایت سے آگاہ کیا۔ تھانہ انچارج ..... نے اپنے مکمل تعاون کا نہ صرف مجھے یقین دلایا بلکہ ایک سادہ لباس پولیس اہلکار کو میرے ساتھ جانے کا حکم بھی دے دیا۔ میں خود بھی اس وقت عوامی لباس میں تھا۔

حنیفو کی گرفتاری میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جب ہم لوگ حنیفو کی خالہ رشیدہ کے گھر پہنچے تو افرادِ خانہ رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ میں نے فوراً حنیفو کو ہتھکڑی پہنا دی۔

حنیفو کی خالہ اور خالو اس بات پر حیران بلکہ معترض تھے کہ میں ان کے بھانجے کو کیوں گرفتار کر رہا ہوں۔ جب میں نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا تو انہیں یقین نہیں آیا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں جب انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ حنیفو پندرہ جنوری کی دوپہر ان کے پاس پہنچا تھا تو حنیفو کے مجرم ہونے میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں رہی۔ وہ وزیر آباد سے بارہ جنوری کا نکلا ہوا تھا تاکہ صابری کے قتل کے حوالے سے اس کی طرف کسی کا دھیان نہ جائے۔ اس نے خاصی چالاکی دکھائی تھی لیکن اس کی چال کامیاب نہ ہو سکی۔

ابتدائی تفتیش شاہ درہ کے تھانے میں ہوئی پھر میں اسے اپنے ساتھ لے کر آدھی رات کے وقت تھانے پہنچ گیا۔ گرفتاری کے وقت ہی حنیفو کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اس کی ایک ایک حرکت سے اس کا جرم ٹپک رہا تھا لہٰذا اپنے تھانے میں آ کر مجھے اس کی زبان کھلوانے کے لیے زیادہ ''محنت'' نہیں کرنا پڑی۔ ویسے بھی جب کوئی مجرم اپنے جرم کے ثبوت کے ساتھ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پھر اس کے پاس ''اقبالِ جرم'' کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ حنیفو نے بھی رات دو بجے زبان کھول دی۔ میں نے فوراً اس کا اقبالی بیان قلم بند کر لیا۔ یہاں پر میں اس کے بیان کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

اس خبیث آوارہ گرد حنیفو کی نیت میں ابتدا ہی سے فتور تھا۔ اسی لیے وہ بارہ جنوری کو وزیر آباد سے نکل گیا تھا تاکہ صابری کو پیش آنے والے واقعے کے حوالے سے کسی کا اس کی طرف دھیان نہ جائے۔ یہ دو دن اس نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر گزار لیے تھے اور پھر واردات کے بعد وہ لاہور روانہ ہوگیا تھا۔ وہ صابری کو محبت کے جھوٹے خواب دکھا دکھا کر یہاں تک لے آیا تھا کہ وہ اس کی خاطر گھر سے فرار ہونے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ اس عیار نے فرار کا منصوبہ ایسے وقت میں بنایا تھا جب صابری کی عزیز از جان اکلوتی سہیلی رانی گاؤں میں موجود نہیں تھی۔ اسے اس امر کا خدشہ تھا کہ عین وقت پر رانی کوئی بھی گڑبڑ کرسکتی تھی۔ بہرحال منصوبے کے مطابق جب صابری جھاڑیوں میں پہنچی تو حنیفو نے اسے اس کام کے لیے راضی کرنے کی کوشش کی جس سے اس کی ہوس کی تکمیل ہوتی۔ صابری اس کا مطالبہ سن کر ہتھے سے اکھڑ گئی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس کا محبوب کس قسم کی خواہش کا اظہار کررہا ہے۔ حنیفو نے طلائی زیورات پر تو ہاتھ صاف کرنا ہی تھا مگر وہ صابری کے وجود سے بھی مستفید ہونا چاہتا تھا۔ جب اس نے صابری کو بدکتے ہوئے دیکھا اور وہ اسے چھوڑ کر واپس جانے لگی تو حنیفو کو اپنا منصوبہ خاک میں ملتا نظر آیا۔ صابری کی واپسی سے اس کی اصلیت کا بھانڈا پھوٹ جاتا اور یہ اسے کسی قیمت پر منظور نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے صابری کو... بے بس کردیا۔ صابری نے مزاحمت میں اپنے ہاتھوں کا استعمال کیا اور حنیفو کی گردن پر اس کے ناخنوں نے چتر کاری کردی۔ میں اس بات کا ذکر کرنا بھول گیا کہ حنیفو کی گردن پر بھی ناخنوں کے کھرونچوں کے نشانات پائے گئے تھے جن پر کھرنڈ آچکا تھا۔

اپنی ہوس کی تکمیل کے بعد حنیفو، صابری کو زندہ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا چنانچہ اس نے صابری کا گلا دبا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور طلائی زیورات سمیٹ کر جائے وقوعہ سے نو دو گیارہ ہوگیا۔

جب میں نے اس سے مذکورہ طلائی زیورات کی بابت سوال کیا تو اس نے بتایا کہ ان زیورات کو اس نے موم جامہ میں اچھی طرح لپیٹ کر نالے کے کنارے ایک جگہ زمین میں دبا دیا تھا تاکہ جب صابری کے بہیمانہ قتل کا معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے تو وہ اطمینان سے زیورات کو نکال کر لاہور کے کسی سنار کے ہاتھ فروخت کرکے رقم کھری کرلے۔

جھاڑیوں کے اختتام پر پانی کا ایک نالا رواں دواں تھا۔ طلائی زیورات کو حنیفو نے اسی نالے کے کنارے درختوں کے نیچے زمین میں دبایا تھا۔ میں نے اس کی نشاندہی پر مذکورہ زیورات کو برآمد کرلیا۔ آسیہ کے زیورات تو مل گئے مگر اس کی اکلوتی بیٹی صابری اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھن گئی۔ صابری کو برباد کرکے موت کے گھاٹ اتارنے والا شخص میرے قبضے میں آچکا تھا لہٰذا اسے ایک عبرت ناک انجام سے دوچار کرنا مجھ پر لازم تھا۔

میں نے حنیف عرف حنیفو کمہار نامی اس جگادری کے خلاف بڑا سخت چالان تیار کرکے اسے عدالت کے حوالے کردیا۔ کوئی ایک سال تک یہ مقدمہ چلتا رہا پھر حنیفو عدالت سے سزائے موت پا کر جیل چلا گیا۔

آخر میں، میں ان تمام نوجوان لڑکیوں کو یہ نصیحت کروں گا جو کسی نہ کسی انداز میں پیار و محبت کے کھیل میں مصروف ہیں۔ انہیں پہلی فرصت میں بلاخوف و خطر اپنے والدین کو اس معاملے سے آگاہ کردینا چاہیے۔ وہ ناراض ہوں گے، ڈانٹ ڈپٹ کریں گے اور حد سے گزر گئے تو جان لے لیں گے۔ پروانہ کریں کیونکہ اپنا اگر مارتا ہے تو مار کر سائے میں پھینکتا ہے، محبوب کے ہاتھوں دھوکا کھانے والی لڑکیوں کا انجام صابری جیسا ہوتا ہے اور ایک بات ذہن نشین کرلیں کہ کسی محبوب کے چہرے پر یہ نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کوئی حنیفو جیسا جگادری ہے یا عاشقِ صادق......!

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے ماسٹر عارف بھٹی کو اسی روز بے حد معذرت کے ساتھ تھانے سے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ بہ وقتِ رخصت، اس کے چہرے پر متضاد تاثرات تھے۔ ایک ملزم کی حیثیت سے تھانے کی حوالات میں اس نے جو وقت گزارا تھا، اس کی کوفت اس کے چہرے اور آنکھوں میں ہویدا تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہی آنکھوں میں اور چہرے پر باعزت رہائی کی خوشی بھی دیکھی جاسکتی تھی۔ وہ بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت میں آگیا تھا۔

بعدازاں جب ماسٹر بھٹی سے میری قدرے بے تکلفی ہوگئی تو میں نے اس کے جداگانہ طرزِ زندگی کے بارے میں بھی کریدا تھا۔ کچھ احتراز، کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اس نے مجھے اپنے جیون کی منفرد کہانی سناڈالی تھی، اس وعدے کے ساتھ کہ میں اس کی کہانی کو آگے نہیں بڑھاؤں گا سو...... میں اس سلسلے میں لب کشائی نہیں کرسکتا۔

عارف بھٹی سے کیا ہوا وعدہ نبھانا مجھ پر لازم ہے۔

(تحریر: حسّام بٹ)



عطر شیشہ

ڈاکٹر شیر شاہ سید

اس ترقی یافتہ دور میں آج بھی بعض جگہ انسان کی رسائی محدود ہے... انسانیت اتنی مجبور ہے کہ مرضی سے تن ڈھانک سکتی ہے، نہ شکم سیری حاصل ہوسکتی ہے۔ وہ بھی سترہ سال سے اذیت بھری زندگی گزار رہی تھی کہ اچانک آنے والے زلزلے نے بہت کچھ تباہ کرنے کے ساتھ اس کے گہرے زخموں پر مرہم بھی رکھ دیا۔ جانے یہ حیرت کا مقام ہے یا افسوس کا کہ دیہی زندگی آج بھی بنیادی سہولتوں سے محروم اور... زلزلوں کی منتظر ہے۔

زندگی کو تہ و بالا کرنے والے واقعے کے عبرت اثر نتائج کا احوال

اسے عطر شیشہ سے لایا گیا تھا۔

ایبٹ آباد سے مظفر آباد کے راستے پر مانسہرہ سے نکل کر جب پہاڑی سلسلے شروع ہوتے ہیں، بڑی بڑی اونچی چوٹیوں کو پھلانگتے ہوئے سرسبز وادیوں سے گرتے ہوئے جھرنوں، نالوں، ندی کے کنارے سفر کرتے ہوئے ایک چھوٹی سی جگہ عطر شیشہ کے نام سے آتی ہے۔ عطر شیشہ کے پاس کسی چھوٹے سے گاؤں سے ایمبولینس کے رضا کار اسے لے کر آئے تھے۔

اس کے گھر کا کوئی فرد نہیں بچا تھا۔ نہ باپ، نہ ماں، نہ بھائی، نہ بھابی اور نہ ہی گھر کے تینوں بچے۔ زلزلہ سب کو اپنے ساتھ لے گیا، صرف وہی اس گھر کی زندہ قبر تھی۔ اسے زلزلے نے تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا مگر زلزلے کے فوراً بعد جب وہ اپنی پوری قوت سے اپنے ہی گھر کے ملبے کو ہٹا رہی تھی تو گرتے ہوئے گھر کی ایک دیوار کا حصہ اس پر آن گرا اور اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔

مانسہرہ کے بی ڈی او اسپتال میں وہ بستر پر پڑی ہوئی تھی اور اس کا بستر گیلا تھا اور اس کے پاس سے سخت بدبو آ رہی تھی۔ میں نے ہی سب سے پہلے اسے دیکھا تھا۔ اس کی عمر پینتیس چھتیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس علاقے کے رہنے والوں ہی کی طرح وہ گوری چٹی خوب صورت سی عورت تھی۔ اس کے جسم پر کوئی بہت اچھے کپڑے نہیں تھے اور نہ ہی کسی قسم کا زیور تھا۔ وہ ایمبولینس کے اسٹریچر پر بے ہوش پڑی ہوئی دھیرے دھیرے سانس لے رہی تھی۔

ایمبولینس کے رضا کاروں کی گاڑی جب گاؤں پہنچی تو گاؤں کے کچے مکانوں کی دیواریں بری طرح گری ہوئی تھیں۔ ان چھوٹے چھوٹے گھروں کے مکین اپنے گھروں کے باہر بے کسی اور بے بسی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ گاؤں کا واحد پکا مکان زمیں بوس ہوا تھا اور اس گھر کی واحد بچ جانے والی حمیدہ بی بی گھر کی ایک دیوار کے گرنے سے اپنے دونوں پیروں پر چل نہیں سکتی تھی۔ گاؤں والوں نے دیوار کے نیچے سے اسے اٹھا کر ایک چارپائی پر لٹا دیا تھا جہاں وہ مسلسل درد سے کراہ رہی تھی۔

ایمبولینس میں موجود ڈاکٹر نے حمیدہ کے دونوں پیروں کے نیچے لکڑی کے پھٹے لگا کر، پیروں کو سیدھا کر کے پٹی سے باندھ دیا اور درد سے نجات کے لیے انجکشن لگا کر اسے مانسہرہ کے اسپتال بھیجا تھا۔ ہڈیوں کی صحیح حالت کا تو ایکسرے کے بعد ہی پتا چلتا، فوری طور پر رضا کار نرسوں نے اسے صاف کپڑے پہنا کر وارڈ میں ایک بستر پر لٹا دیا، وہاں ہی اس کے پیروں کے زخم کو صاف کر کے پٹی باندھ دی گئی۔ اینٹی بائیوٹک سے فوری علاج بھی شروع کر دیا گیا تھا۔ فی الحال اس کا چلنا پھرنا ممکن نہیں تھا تو ایک نرس نے پیشاب کی نلکی لگا دی تاکہ بار بار جانے کی ضرورت نہ پڑے۔ میں نے اسے پھر سے درد سے بچاؤ کا ایک انجکشن لگا دیا تاکہ اس کی تکلیف تو کم ہو۔

اسپتال میں مسلسل مریض آ رہے تھے۔ اوپر اور نیچے جتنے بھی بستر تھے ان پر اور زمین پر ہر طرف مریض پڑے ہوئے تھے۔ اب صرف زخموں والے مریضوں کی مرہم پٹی کی جا رہی تھی۔ زیادہ زخمی مریضوں کو ایبٹ آباد اور اسلام آباد کی طرف بھیجا جا رہا تھا۔

دو ہزار پانچ کا زلزلہ بڑی تباہی لے کر آیا، پاکستان ہندوستان کی سرحدوں کی دونوں جانب، خوب صورت کشمیر کی وادی میں، زلزلے، طوفان، سیلاب، بہار، خوشبو، سردی، گرمی، ہوا، سرحدوں کا احترام نہیں کرتے ہیں۔ پاسپورٹ ویزا اور سفری دستاویزات کا خیال نہیں رکھتے۔ جب زمین کے نیچے..... بہت نیچے دھرتی کے پرت آپس میں ٹکراتے ہیں تو ان کا اثر اوپر تک ہوتا ہے۔ زمین ہل جاتی ہے، پہاڑ گر جاتے ہیں، چٹانیں لڑھک جاتی ہیں، نالے ندی، دریا راستے بدل دیتے ہیں، وہ زمین کے اوپر کھینچی ہوئی لکیر، کنٹرول لائن اور جھنڈوں کا خیال نہیں رکھتے۔ سرحد ہندو مسلمان نہیں ہوتی، خوشبو تو خوشبو ہوتی ہے، بالکل بدبو کی طرح ہر طرف ہر سو پھیل جاتی ہے۔

دو ہزار پانچ کے زلزلے میں یہی ہوا تھا۔ سرحد کے دونوں جانب لاکھوں مکان گر گئے، پہاڑوں نے وادیوں کا نقشہ بدل دیا اور دریا اپنے راستے بھول گئے۔ ہزاروں لوگ اپنی جان سے چلے گئے، دونوں ملک اپنے اپنے مضبوط فوجیوں، بے شمار ہتھیاروں اور ایٹم بموں کے باوجود اپنے زخمی، سسکتے بلکتے شہریوں کی امداد کو نہیں پہنچ سکے، ماؤں نے اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں میں بلکتے ہوئے، سسکتے ہوئے، مرتے دیکھا۔ نوزائیدہ بچے زخمی اور مرتی ہوئی ماؤں کی چھاتیوں سے لپٹے ہوئے امداد کی راہ تکتے رہے۔

سرحدوں کی دونوں جانب سے اس قسم کی بے شمار کہانیاں سننے کو ملی تھیں، انسان جب بن رہا تھا تو بھی مجبور تھا، اب بن گیا ہے تب بھی مجبور ہے۔ میں اس جیون کے کھٹراگ کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

دوسرے دن ایکسرے کی فلمیں آ گئیں۔ حمیدہ بی بی کے دونوں پیروں میں گھٹنے سے نیچے کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اسپتال میں کراچی اور لاہور سے ہڈیوں کے مشہور ماہر ڈاکٹر آ گئے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ اس وقت تو دونوں پیروں میں پلاسٹر چڑھا دیا جائے تو تھوڑے دنوں میں دونوں ہڈیاں جڑ جائیں گی۔ پلاسٹر اترنے کے بعد فزیوتھراپی کر کے حمیدہ بی بی چلنے پھرنے کے قابل

ہوجائے گی۔

پلاسٹر چڑھانے کی تیاری ہورہی تھی کہ نرس نے مجھے بتایا کہ پیشاب کی نلکی کے باوجود حمیدہ بی بی کا پیشاب ہر وقت بہتا رہتا ہے، اس کا خیال تھا کہ پلاسٹر کے بعد تو بستر پر ہی لیٹی رہی گی اور پیشاب رس رس کر پلاسٹر کے اندر تک جائے گا اور اس سے دوسرے مسائل شروع ہوجائیں گے۔ زخم گندہ ہوگا، اس میں انفیکشن ہوجائے گا، بیماری سے ایک اور بیماری پیدا ہوجائے گی۔

یہ نرس آسٹریلیا سے زلزلہ زدگان کی خدمت کرنے آئی تھی جب ایبٹ آباد، پشاور، اسلام آباد کے بہت سارے ڈاکٹر اپنے پرائیویٹ مریضوں کو دیکھ رہے تھے، جب کراچی لاہور جیسے بڑے شہروں کے بڑے بڑے ڈاکٹر کیمپوں میں تصویریں کھنچوا رہے تھے اور فلمیں بنوا رہے تھے، اخباروں میں تصویریں چھپوا رہے تھے اور ٹیلی ویژن پر اپنی فلمیں چلوا رہے تھے۔ اس وقت آسٹریلیا کی یہ نرس، اپنے اسپتال سے دور، دوا اور پیسے جمع کر کے پاکستان کے زلزلہ زدہ علاقے میں زلزلہ زدگان کی مدد کرنے آئی تھی۔

پورا علاقہ بہت سارے دوسرے ملکوں کے ڈاکٹروں نرسوں سے بھرا ہوا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں کی ایجنسیاں خیرات اور امداد لے کر آئی تھیں، ایسا نہیں تھا کہ پاکستان کے ڈاکٹر نہیں آئے تھے۔ آئے تھے مگر اتنے نہیں جتنے آنے چاہیے تھے۔ زلزلے نے انسانوں کی دوسری شکل بھی دکھائی جو افسوس ناک بھی تھی اور خوفناک بھی۔

زلزلے کے فوراً بعد میں ایمبولینس کے رضا کاروں کے ساتھ جب مظفرآباد پہنچا تو مجھے پتا چلا کہ زلزلے کے دوسرے دن جب ملبے کے نیچے سے سسکتے ہوئے آہ و بکا کرتے ہوئے مرنے والوں کی آوازیں آرہی تھیں تو کچھ لوگ تباہ شدہ کاروں میں سے پہیے، کیسٹ پلیئر اور جو بھی سامان تھا، مختلف طریقے سے نکال کر لے گئے۔ ٹوٹے ہوئے گھروں میں جہاں کے مکین مرگئے یا بھاگ گئے وہاں سے باضابطہ سامان ٹرکوں میں ڈال کر نکل گئے تھے، جب پوری وادی میں مرے ہوئے آدمیوں، دبے ہوئے

انسانوں کے جسموں کی باس پھیل رہی تھی اس وقت کچھ لوگ ان مرتے ہوئے سڑتے ہوئے لوگوں کی خوب صورت بیٹیوں کو امداد کے بہانے بہلا پھسلا کر اغوا کر چکے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بے سہارا معصوم بچوں کی کھیپ پاکستان کے دوسرے شہروں میں پہنچا دی گئی تھی۔ کیسے انسان تھے یہ لوگ؟ کیسا جہان تھا یہ؟

زمین کے اندر لوگ مر کے سڑ رہے تھے، جن کی باس سے فضا بوجھل تھی۔

نرس پٹریشیا کے توجہ دلانے پر جب حمیدہ سے بات ہوئی تو حمیدہ نے بتایا کہ سترہ سال پہلے اس کے پہلے حمل میں مرا ہوا بچہ پیدا ہوا جس کے بعد سے اسے پیشاب بہنے کی مسلسل بیماری ہے۔ ہر وقت پیشاب آنے کی وجہ سے اس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا تھا، جس کے بعد وہ اپنے ماں باپ کے گھر عطر شیشہ واپس آگئی تھی۔

تھوڑے دنوں تک گھر میں رہی مگر اس کے پاس سے مسلسل بدبو آنے کی وجہ سے اس کے بھائی کی بیوی نے یہ انتظام کیا تھا کہ اس کے لیے گھر سے باہر ایک کچا کمرا بنوا دیا تھا جہاں وہ اپنے پیشاب سے لتھڑے ہوئے جسم اور بدبو کے ساتھ رہتی تھی۔ شاید یہی مناسب انتظام تھا، شکر ہے اسے گھر سے نہیں نکالا۔

اس رات بھی وہ اپنے اسی کمرے میں گھر کے باہر تھی، جب زلزلہ آیا، جب زمین ہلی، جب پہاڑ ڈھیر ہوئے، وادیاں بکھر گئیں، عمارتیں گر گئیں، لوگ اجڑ گئے، خاندان بچھڑ گئے چند لمحوں میں سب کچھ ڈھیر ہوگیا۔

''مرنا تو مجھے چاہیے تھا ڈاکٹر صاحب، میری زندگی تو ویسے ہی بے کار ہے۔ میں بچ گئی اور وہ مر گئے۔'' اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کی لڑیاں اس کے گالوں کو مسلسل تر کر رہی تھیں۔ ''وہ لوگ تو ٹھیک تھے، ان کے جسم میں تو کوئی خرابی نہیں تھی، ناپاک میں ہوں، نماز میں نہیں پڑھ سکتی، سیپارے کو ہاتھ میں نہیں لگا سکتی اور مردہ لوگ گئے، پاک لوگ، صاف لوگ۔'' وہ آہستہ آہستہ بین کر رہی تھی۔

میں نے جب اس کا اندرونی معائنہ کیا تو مجھے پتا چلا کہ اس کی پیشاب کی تھیلی پر چھوٹا سا تقریباً ایک سینٹی میٹر کا سوراخ ہے، جہاں سے پیشاب مستقل بہہ رہا تھا۔ یہ تو بہت معمولی سا سوراخ تھا۔ مشکل سے آدھے گھنٹے کا آپریشن، میرا دل جیسے اندر سے رو دیا، سترہ سال سے یہ لڑکی گھر کے باہر جانوروں کے اصطبل میں جانوروں کی طرح محض اس لیے رہ رہی ہے کہ کوئی اسے کسی سرجن کے پاس نہیں لے گیا کہ اس کا آپریشن ہو جاتا۔ ایک چھوٹا سا آپریشن، کسی بڑے خرچے کے بغیر۔ پھر یہ ٹھیک ہو جاتی، نہ اس کا شوہر اسے چھوڑتا، نہ یہ سسرال چھوڑ کر میکے آتی اور نہ ہی اسے گھر کے باہر ایک کچے کمرے میں رہنا پڑتا۔ اس کے بچے ہوتے، اس کا گھر ہوتا اور یہ بھی ساری مغرور ماؤں کی طرح اپنے بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں خوش رہتی۔ اس وقت میں نے نہیں سوچا تھا کہ اگر گھر میں رہتی تو شاید زلزلے میں مر جاتی۔

''تمہیں کوئی ڈاکٹر کے پاس نہیں لے گیا علاج کے لیے...... تاکہ تم صحیح ہو جاؤ؟'' میں نے سوال کیا تھا۔

''گئی تھی ڈاکٹر صاحب میں۔ اماں بادا مجھے لے گئے تھے کوئی ڈاکٹروں کی ٹیم آئی تھی فرانس سے، جو مظفر آباد کے فوجی اسپتال میں اس بیماری کا علاج کر رہے تھے۔ میرے بادا کو کسی نے بتایا اور ہم لوگ عطر شیشہ سے وہاں پہنچے تو اسی دن ڈاکٹر واپس جا چکے تھے۔ فوجی اسپتال میں پینتالیس مریضوں کا آپریشن کیا تھا ان لوگوں نے۔ سارے مریض موجود تھے وہاں پر اور سب ٹھیک ہوگئے تھے۔ میری تو اس وقت بھی قسمت خراب تھی۔ کچھ بھی نہیں ہوسکا اور ہم لوگ واپس آگئے۔ اس امید کے ساتھ کہ دو سال کے بعد ڈاکٹر پھر آئیں گے۔ میرے بابا مسلسل پتا کرتے رہے تھے مگر نہ ڈاکٹر دوبارہ آئے اور نہ ہی میرا آپریشن ہوسکا۔''

مگر ہم لوگوں نے اس کا آپریشن کر دیا تھا، پہلے اسے کراچی منتقل کیا پھر دونوں پیروں کا آپریشن کرتے لوہے کی پلیٹوں سے ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑ دیا گیا۔ کسی پلاسٹر کی ضرورت نہیں تھی۔ آپریشن کے تیسرے چوتھے دن سے ہی وہ سہارے سے چل سکتی تھی اور چھ ہفتوں کے بعد پیشاب کی تھیلی کے آپریشن کی بھی منصوبہ بندی کر لی گئی تھی۔

کراچی میں ہی اس کا آپریشن کر دیا گیا اور دو ہفتے کے بعد اس کا پیشاب بہنا بھی بند ہوگیا، وہ ایک مکمل عورت بن چکی تھی۔

اس کی پھوپی اسے گھڑی دوپٹہ سے لینے آئی تھی۔ عطر شیشہ سے دور مظفر آباد کے ایک اور چھوٹے سے گاؤں میں وہ بیاہ کے گئی تھی۔ حمیدہ بی بی اس کے بھائی کے خاندان کی آخری نشانی تھی۔

اسپتال سے گھر جانے کا منظر بڑا جذباتی تھا۔ نئے جوڑے میں ملبوس، صاف ستھرے کپڑوں میں تین بڑے

آپریشنوں کے بعد اور زلزلے کے غم سے ٹوٹی ہوئے بچے، باوجود حمیدہ بی بی اس دن بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کے لیے اسپتال میں کیک کٹا، اسپتال کا عملہ اس سے ملا، اسے گلے سے لگایا، دعائیں دیں اور آبدیدہ آنکھوں کے ساتھ نرسوں نے اسے الوداع کیا۔

ایسے مریض جو اسپتال میں دو دو تین تین مہینے رہتے ہیں نرسوں سے ان کی خوب دوستی ہوجاتی ہے اور اکثر یہ دوستیاں ساری زندگی چلتی رہتی ہیں۔ مجھے ایسا ہی لگا جیسے وہ بھی ہمارے اسپتال کی نرسوں کی آشنا رہے گی۔

تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد جب زلزلے کی دوسری یاد کو گزرے ہوئے شاید چار مہینے ہوئے تھے اور اس موقع پر ہم لوگوں کو اس کا خیال بھی آیا اور پھر اسے بھول بھی گئے مگر ایک دن دوپہر کو جب میں اسپتال سے نکل رہا تھا تو وہ اسپتال آئی، اپنے شوہر کے ساتھ۔

میں دیکھتے ہی اسے پہچان گیا اور یہ بات فوراً ہی میری سمجھ میں آگئی کہ وہ حاملہ ہے۔ مجھے یاد آیا کہ اس کی پھوپی کو میں نے سمجھایا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو سکے حمیدہ بی بی کی شادی کردیں۔ وہ بالکل نارمل ہے۔ بس یہ کرنا ہوگا کہ بچے کی پیدائش اسپتال میں آپریشن کے ذریعے ہوگی، وہ اپنے شوہر کے ساتھ اسی لیے آئی تھی۔

سارے اسپتال نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کا شوہر زاہد اچھا آدمی تھا اور حد سے زیادہ باتونی بھی۔ زلزلے میں اس کی بیوی اور دونوں بچے مر گئے تھے، وہ کسی کام سے ایک رات پہلے پنڈی گیا تھا، ادھر بالاکوٹ میں سارا گھر زندہ دفن ہوگیا۔ زاہد حمیدہ بی بی کے پھوپا کا دور کا رشتے دار تھا۔

حمیدہ سے شادی کے بعد وہ بہت خوش تھا۔ حمل کے چالیسویں ہفتے پہ میں نے ہی آپریشن کرکے بچہ پیدا کیا، تیسرا بچہ اور ان دونوں کی زندہ اولاد۔ وہ دونوں دیر تک روتے رہے۔ کبھی غم کے آنسو، کبھی خوشی کی پھیلی ہوئی بھیگی سی مسکراہٹ۔ اسپتال سے جانے سے ایک دن پہلے وہ دونوں میرے کمرے میں میرے لیے مٹھائی کا ڈبا لے کر آئے تھے، ساتھ میں حمیدہ بی بی میری بیوی کے لیے ہاتھ سے کاڑھی ہوئی ایک بہت خوب صورت قمیص لے کر آئی تھی، جو اس نے مجھے دینا تھی۔

ہم لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے، زاہد کو باتیں کرنے کا شوق تھا، وہ بے تکان مسلسل بولتا رہا تھا۔ میں اس دن فارغ تھا اور بات سے بات نکلتی چلی جارہی تھی۔

کشمیر کی باتیں، مانسہرہ، ایبٹ آباد کے زلزلے کی سچ کی کہانی۔ بالاکوٹ کیسے زمین میں دھنسا، لوگ کیا کر رہے ہیں، سرکار نے ہر ایک کو پیسا دیا ہے، اسکول دوبارہ بن رہے ہیں، سڑکیں واپس آرہی ہیں اور سیاسی لوگ سرکاری لوگوں سے مل کر لوٹ مار بھی کررہے ہیں۔

باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ سیکڑوں سال پہلے ایک قافلہ مظفرآباد جاتے ہوئے پہاڑوں کے درمیان ایک وادی میں رات کے پڑاؤ کے لیے رک گیا تھا۔ صبح جب قافلہ تیار ہوکر نکلا اور آدھے دن کی مسافت پوری کرلی تو سالار قافلہ کی بیٹی نے اپنے باپ کو بتایا کہ پچھلے پڑاؤ پر قدرتی چشمے کے کنارے وہ عطر کی شیشی اور آئینہ بھول کر آگئی ہے۔ اس کی آنکھوں کے تلملاتے آنسوؤں نے سالار قافلہ کا راستہ روک لیا تھا۔ اسی وقت جنگل میں پڑاؤ ڈال دیا گیا اور دو پیادے روانہ کیے گئے کہ وہ اس بچی کا عطر اور شیشہ لے کر آئیں۔

”یہ سالوں پہلے کا واقعہ ہے، ڈاکٹر صاحب! اس وقت ہمارے بزرگ ہماری بیٹیوں کا اسی طرح خیال رکھتے تھے۔ اس واقعے کے بعد اس جگہ کا نام ہی عطر شیشہ پڑ گیا۔ آج کے عطر شیشہ میں سترہ سال تک حمیدہ بی بی زلزلے کا انتظار کرتی رہی۔ زلزلہ آیا تو ایمبولینس والے آئے اور جب وہ رضا کار آئے تو آپ ملے... اور آپریشن ہوا۔ آپریشن ہوا تو حمیدہ کے جسم سے پیشاب بہنا بند ہوا، پیشاب بہنا بند ہوا تو حمیدہ نجس سے، ناپاکی سے پاک ہوگئی۔ آج حمیدہ دوبارہ زندہ ہوگئی ہے جناب..... زلزلے کی وجہ سے۔

”عطر شیشہ جیسے ہزاروں گاؤں دیہاتوں میں بالاکوٹ سے باغ تک بشام سے سوات تک گڑھی ڈوپٹہ سے چشمہ بہہ تک، سرحدوں کے اس طرف آزاد کشمیر میں اور سرحدوں کے اس طرف غلام کشمیر میں ہماری بچیوں بیٹیوں کے لیے کوئی نظام نہیں ہے۔ وہ بچہ جنم دیتے ہوئے مرجاتی ہیں، بانجھ ہوجاتی ہیں، زخمی ہوجاتی ہیں، ان کے جسم میں سوراخ ہوجاتا ہے، ان کا پیشاب بہتا رہتا ہے۔“

اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ”ان دیہاتوں میں سرحد کے دونوں طرف کیا صرف زلزلوں کی ضرورت ہے ڈاکٹر صاحب۔“

میں حیران نظروں سے اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔

محفلِ شعر و سخن



٭ عبدالجبار رومی انصاری ..... ملتان روڈ، لاہور

دردِ عشق ہے ہر کسی میں اتنا دم نہیں
وہ ہیں ہماری جان یہ بات بھی کم نہیں

٭ محمد عثمان انصاری ..... نیوسینٹرل جیل ملتان

تناؤ ان میں آجائے تو دھاگے ٹوٹ جاتے ہیں
ذرا سی بات پہ دیرینہ رشتے ٹوٹ جاتے ہیں
ہزاروں خواہشیں ترتیب پاتی ہیں خیالوں میں
مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو سپنے ٹوٹ جاتے ہیں

٭ مسز بابر عباس، ماہین بابر ..... گلیانہ روڈ کھاریاں

وہ عالم تھا تمہاری کھوج میں میری نگاہوں کا
تمہارے بعد میں نے دن گزارے آنکھ میں اکثر

٭ بختاور بلوچ ..... بلوچستان

ریزہ ریزہ ٹوٹ چکا ہوں اندر سے
مگر سے باہر گردن تان کے چلتا ہوں

٭ رمضان پاشا ..... گلشن اقبال، کراچی

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ پی لیا میں نے

٭ زاہد چودھری ..... ترانڈی، ٹوبہ ٹیک سنگھ

کوشش کے باوجود بھی تو بھولتا نہیں
تیرے بغیر کیا کروں کچھ سوجھتا نہیں
ہوتی ہے صبح و شام مگر اس کے باوجود
ہے چاند تیری یاد کا جو ڈوبتا نہیں

٭ محمد یوسف سانول ..... نور پور تھل، خوشاب

ملے نہ زہر تو پی لیتے ہیں لہو اپنا
خالی نہیں رہتے جام کبھی سقراطوں کے

٭ ڈاکٹر ناہید شیخ ..... سیٹلائٹ ٹاؤن، سرگودھا

دل کی بازی کو جیتنے والے
میں تہی دست تجھ کو کیا دوں گا
دکھ کو تو نہ قریب سے دیکھے
دل کی گہرائی سے یہ دعا دوں گا

٭ محمد اسلم ..... خانیوال

نہ جانے کیوں ہمیں اس دم تمہاری یاد آتی ہے
جب آنکھوں میں چمکتے ہیں ستارے شام سے پہلے

٭ احسان سحر ..... میانوالی

آنسو، آہیں، تنہائی، ویرانی اور غمِ مسلسل
اک ذرا سا عشق ہوا تھا کیا کیا وراثت دے گیا

٭ امتیاز علی ..... سرگودھا

محبت کے جہانوں کا عجب دربار دیکھا ہے
جہاں پر قسمتوں کا فیصلہ اکثر ہار ہوتا ہے
یہاں پہ عاشقوں کی بے بسی دیکھی نہیں جاتی
یہاں قیدِ حیات ہی حکمِ سرکار ہوتا ہے

٭ احمد علی صدیقی ..... نیوسینٹرل جیل ملتان

بچھڑ کے مجھ سے حبیب میرے اداس ہونا تو لوٹ آنا
اکیلے پن کی پہاڑ راتیں نہ کاٹ سکنا تو لوٹ آنا

❋ راجہ ابرار خان...... نیو سینٹرل جیل ملتان
وقت خود ہی بتائے گا کہ میں زندہ ہوں ابھی
کب وہ مرتا ہے جو زندہ رہے کردار کے ساتھ
آمیرے دوست ذرا دیکھ میں ہارا تو نہیں
میرا سر بھی تو پڑا ہے میری دستار کے ساتھ

❋ وقاص امین...... لاہور
دل ہر مقامِ شوق سے آگے نکل گیا
دامن کو کھینچتی رہی منزل جگہ جگہ
نقشِ پا تھا میرے لیے تیرا آستاں
آئی نظر مجھے تیری محفل جگہ جگہ

❋ ریاض بٹ...... حسن ابدال
وہ میرے حال پہ رویا بھی مسکرایا بھی
عجیب شخص ہے اپنا بھی ہے پرایا بھی
بہت مہین تھا پردہ لرزتی پلکوں کا
مجھے چھپایا بھی اس نے مجھے دکھایا بھی

❋ سدیہ منظور...... یوحنا آباد، لاہور
تڑپتے ہیں جب نیند کے لیے تو بس یہی دعا نکلتی ہے
بہت بُری ہے یہ محبت کسی دشمن کو بھی نہ ہو

❋ زوہیب احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی
میرے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا ہے محسن
دعا کرنا وہ دل نہ ہو

❋ محمد اشفاق سیال...... شورکوٹ سٹی
یہ فخر تو حاصل ہے، برے ہیں کہ بھلے ہیں
دو چار قدم ہم بھی تیرے ساتھ چلے ہیں
جلنا تو چراغوں کا مقدر ہے ازل سے
یہ دل کے کنول ہیں کہ بجھے ہیں نہ جلے ہیں

❋ راجہ ثاقب محمود جنجوعہ...... پنڈ دادن خان
کوئی آج تک نہ سمجھ سکا یہ اصول گلشنِ زیست کا
وہی پھول نذرِ خزاں ہوا جسے اعتمادِ بہار تھا

❋ مہرین ناز...... حیدرآباد
نیندوں میں پھر رہا ہوں ایسے ڈھونڈتا ہوا
شامل جو ایک خواب میرے رت جگے میں تھا

❋ شبانہ حسن...... لاہور
اس درد کی تحویل میں رہتے ہوئے ہم کو
چپ چاپ بکھرنا ہے، تماشا نہیں کرنا

❋ مرزا طاہر الدین بیگ...... میرپور خاص
وہی مانوس خوشبو آرہی ہے
پرایا شہر بھی لگتا ہے اپنا
خلیل آجائیں گے اک دن پرندے
شجر اپنے ہیں اور سایہ ہے اپنا

❋ محمد اقبال اداس...... گلیانہ روڈ کھاریاں
تمہیں خبر نہ ہوئی اور تمہاری گلیوں سے
گزر گئی مری خواہش کفن سجائے ہوئے
محاذِ عشق پہ زخموں نے کام آنا تھا
تمام عمر بتائی بدن سجائے ہوئے

❋ بابر عباس...... گلیانہ روڈ کھاریاں
نظر میں تو تو ہے دل میں تیرے خیال کی رت
ٹھہر گئی ہے یہاں پر ترے وصال کی رت
یہی کہ جس میں محبت کے سات رنگ کھلیں
یہی خوشی کی بھی رت ہے یہی ملال کی رت

❋ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ...... خانیوال
غم تو اس کا ہے کہ وہ عہدِ وفا ٹوٹ گیا
بے وفا کوئی بھی ہو تم نہ سہی ہم ہی سہی

❋ ناصر علی صدیقی...... رحیم یار خان
نہ جانے کون دعاؤں میں یاد رکھتا ہے
میں ڈوبتا ہوں سمندر اچھال دیتا ہے

❋ رضوان تنولی کریڑوی...... اورنگی ٹاؤن، کراچی
ممکن نہیں مجھ سے یہ طرزِ منافقت
دنیا تیرے مزاج کا بندہ نہیں ہوں میں

❋ سید محی الدین اشفاق...... فتح پور، لیہ
مخالف وقت اور ہر بدگماں کو روک رکھا ہے
ہر ایک حاسد کی زہریلی زباں کو روک رکھا ہے
اترتی ہی نہیں مجھ پہ اسی لیے کوئی آفت
مری ماں کی دعا نے آسماں کو روک رکھا ہے

❋ اسد عباس...... سرگودھا
وہ تجھے بھولے ہیں تو تجھ پر بھی لازم ہے میر
خاک ڈال، آگ لگا، نام نہ لے، یاد نہ کر

❋ احمد حسن عرضی خان...... قبولہ بائی پاس
بھول جانے کی ایک حد ہوتی ہے نا
اس حد کو چھو رہے ہو تم

☆ سید عقیل ..... دبئی

یادیں عزیز ہیں مگر تسکینِ دل کہاں
تیرے بغیر جینا، واقعی عذاب ہے

☆ ادریس احمد خان ..... ناظم آباد، کراچی

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

☆ محمد قدرت اللہ نیازی ..... حکیم ٹاؤن، خانیوال

اس کی آنکھیں سوال کرتی ہیں
میری ہمت جواب دیتی ہے

☆ اظہر حسین بچار ..... ہزاری، جتوئی

محبت میرا اور تیرا مسئلہ تھا نا!
یہ دنیا بیچ میں کہاں سے آگئی

☆ جنید احمد ملک ..... گلستانِ جوہر، کراچی

بن بلائے آجاتا ہے سوال نہیں کرتا
یہ تیرا خیال، آخر کیوں میرا خیال نہیں کرتا

☆ نعیم الحسن شاہ ..... اسلام آباد

کبھی ٹوٹا نہیں دل سے تیری یاد کا طلسم
گفتگو جس سے بھی ہو خیال تیرا ہی رہتا ہے

☆ قاری وقاص ملاح ..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

اس قدر ظرف تو رکھتے ہیں زمانے والے
زندگی چھین کے جینے کی دعا دیتے ہیں

☆ عاصم اقبال جسپال ..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

مقتل میں دونوں ہاتھ کٹنے کے باوجود
عباس تیرے ہاتھ میں بازی ہے آج تک

☆ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان ..... فورٹ عباس

واعظ منبر و مسند پہ نہ اترا اتنا
یہ بتا کیا کسی دل میں ہے جگہ بھی تیری

☆ حسنین عباس، کمیل عباس ..... گلیانہ دوڈ کھاریاں

راستے میرے بھی صحرا کی طرح اس کو سمجھ آتے نہیں
آنکھ اس کی بھی بہت انجان ہے سنسان جنگل کی طرح

☆ سید تنویر احمد، عتیق الرحمان، لیاقت علی ..... فیصل آباد

تشنگی جم گئی پتھر کی طرح ہونٹوں پر
ڈوب کر بھی ترے دریا سے میں پیاسا نکلا

☆ منا علی ..... شہداد پور، سندھ

وہ بڑے ضبط بڑے حوصلے والی لڑکی
جب تجھے یاد کرتی ہے تو رو پڑتی ہے

☆ محمد ماجد علی گچہ ..... کلول ضلع بھکر

تم نے سمجھا ہی نہیں اور نہ سمجھنا چاہا
ہم نے چاہا بھی کیا تم سے، تمہارے سوا

☆ ایم افضال انصاری ..... ڈنگہ

یہ پیار کے رشتے بھی بڑے انمول ہوتے ہیں
تعلق ٹوٹ بھی جائے تو چاہت پھر بھی رہتی ہے

☆ محمد امجد ریاض ..... چیچہ وطنی، اقبال نگر

اندیشۂ جدائی بھی تھا، یقینِ وفا بھی
اک خوف نے جینے نہ دیا اک یقین نے مرنے نہ دیا

☆ ذاکر علی گورچانی ..... داجل براجن پور

ٹھٹھرتی ہوئی رتوں کا لشکر بھی آگیا
جاتے ہوئے برس کا دسمبر بھی آگیا

☆ قیصر اقبال گچہ ..... کلول، بھکر

رخصت کے وقت آنکھ سے بہتا تھا سیلِ خوں
منظر یہ دیکھنے کو سمندر بھی آگیا

☆ انعم کمال ..... حیدر آباد

دل گم صم، زباں خاموش، یہ آنکھیں نم کیوں ہیں
جب اسے پایا ہی نہیں تو آج کھونے کا غم کیوں ہے

☆ یمنیٰ جاوید ..... ملتان

مخلص ہیں تو تنہا ہیں
مطلبی ہوتے تو ہجوم ہوتا

☆ اظہر حسین ..... کراچی

شکوے تو یوں کرتے ہو مجھ سے
جیسے صرف میرے ہی ہو

کوپن برائے شمارہ جنوری 2015

محفلِ شعر و سخن

نام : ------------------------

پتا : ------------------------



پاگل عورت

تنویر ریاض

جیون ساتھی اور... شریک حیات کا مطلب یہی ہے کہ جب تک حیات چلتی رہے کوئی ساتھ بھی رہے لیکن... جب بدقسمتی سے کوئی ایک داغ مفارقت دے جائے تو ایسے میں دل کو سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور جب کوئی مشکل سے بھی دل کو سنبھال نہ پائے تو زندگی ہی ساتھ چھوڑ دیتی ہے... وہ بھی ایک ایسی ہی پاگل عورت تھی جو تنہا رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

دلنشین لمحات میں وقت گزارنے والی ایک بیوی کی بے بسی

وہ سرخ بالوں والی عورت مجھے پہلی نظر میں ہی اچھی نہ لگی لیکن میں اسے برداشت کرنے پر مجبور تھی کیونکہ یہ جگہ ہی ایسی تھی کہ ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی ہر طرح کے لوگوں سے نمٹنا ہوتا تھا۔ اس عورت نے روسی یا یونانی زبان کے بجائے انگریزی میں بات کرنے کو ترجیح دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''میں معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ یہاں کوئی کمرا مل جائے گا؟''

''شاید یہ ممکن نہ ہو کیونکہ اس وقت ہم سوگ کی کیفیت میں ہیں۔''

''اوہ۔'' اس نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سڑک پر آگے چل کر تمہیں رہنے کے لیے جگہ مل

جائے گی۔ وہاں تم مسز ڈیروی سے مل سکتی ہو۔“

وہ عورت تھوڑا سا مزید قریب ہوتے ہوئے بولی۔

”میں نے سنا ہے کہ تم...... میرا مطلب ہے کہ تمہارا گھر قابلِ اعتبار ہے۔“

”قابلِ اعتبار۔“ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ شاید مجھ سے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ میری انگریزی اچھی تھی لیکن پھر بھی کبھی کبھی غلطی ہو جایا کرتی تھی۔ ہمارے سرائے نما مکان میں کئی خوبیاں تھیں۔ یہ محفوظ ہونے کے علاوہ پُرسکون اور سستا بھی تھا۔ میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”شاید ایسا ہی ہو۔ میں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا۔“

”مسز جونز کا یہی کہنا ہے کہ تم لوگ قابلِ بھروسا ہو۔ وہ میری دوست ہے۔ وہ بھی پگ سود کا کی رہنے والی ہے اسی نے مشورہ دیا ہے کہ مجھے یہاں قیام کرنا چاہیے۔“

اس غیر ملکی عورت کا بے لگام انداز دیکھ کر میں تھوڑا سا خوفزدہ ہو گئی۔ باہر سڑک کے کنارے ایک بڑی سی کوچ کھڑی تھی۔ اس کا ڈرائیور اور ایک دوسرا شخص بڑے غور سے ہمیں باتیں کرتا دیکھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں مزید محتاط ہو گئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس عورت سے نام پوچھا۔

”مسز للی اسکار یوروف۔ تم مجھے صرف للی بھی کہہ سکتی ہو۔“

”مجھے تاسیا کہتے ہیں۔“ میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور اسے انتظار کرنے کے لیے کہا پھر میں گھر میں گئی اور ماں کو مسز اسکار یوروف کا پیغام پہنچا دیا۔

سیاہ نقاب کے پیچھے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ قدرے برہم ہوتے ہوئے بولی۔ ”اور تم نے تسالیا جونز کی دوست کو باہر دروازے پر کھڑا کر دیا۔“

”تم نے ہی تو کہا تھا کہ کسی مہمان کو کمرا نہیں دینا ہے۔“

”تم بہت ہی بدتمیز لڑکی ہو۔ جاؤ اسے اندر لے کر آؤ۔“

میں دروازے کی طرف جانے کے لیے مڑی۔ سیڑھیوں کی دیوار کے ساتھ ہی میری بہن ایکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پاس سے گزری تو اس نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ”بدتمیز لڑکی۔“ میں بھنا کر رہ گئی اور سوچنے لگی کہ جلدی سے میری شادی ہو تو ان لوگوں سے جان چھوٹے۔

میں نے باہر آ کر کہا۔ ”اندر آ جاؤ مسز اسکار یوروف...... مجھے افسوس ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑا۔“

”میں صرف ایک یا دو راتیں قیام کروں گی۔“ اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ بھی تمہارے لیے تکلیف دہ ہوگا؟“

”اس بارے میں ماں ہی کچھ کہہ سکتی ہے۔“

ماں اور ایکی اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مسز اسکار یوروف نے گھر کے اندرونی اندھیرے حصے پر نگاہ ڈالی اور بولی۔ ”میں تمہارے غم میں برابر کی شریک ہوں۔“

ماں نے تغلیسا سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”شکریہ۔“

”پاپا کافی عرصے سے بیمار تھے۔“ ایکی نے کہا۔

”مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔“

”تم تسالیا جونز کو کیسے جانتی ہو؟“ ماں نے اس عورت سے پوچھا۔

”میں ایک بار اس کے یہاں قیام کر چکی ہوں جبکہ میرے شوہر کو دو مرتبہ اس کے یہاں رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس نے ہمارے ساتھ گھر کے لوگوں جیسا سلوک کیا تھا۔“

”تمہارے شوہر اب کہاں ہیں؟“

مسز اسکار یوروف نے نظریں جھکالیں اور فرش پر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ میسا چوسٹس میں گھر پر میرا انتظار کر رہا ہوگا۔“

”اس نے تمہیں تنہا یورپ کا سفر کرنے کی اجازت دے دی؟“ ماں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں، وہ بہت اچھا آدمی ہے۔“

”گویا تم امریکن ہو۔“ میری بہن نے کہا۔ ”ہمارے یہاں زیادہ تر ٹریولز کے لوگ آتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی آئرش یا اسکاٹش بھی آ جاتا ہے لیکن امریکن کوئی نہیں آیا۔“

”کیا تم مجھے بوسٹن کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو؟“ میں نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔

”اور میں نیویارک کے متعلق جاننا چاہتی ہوں۔“ میری بہن بولی۔

”اگر اجازت ہو تو میں اپنا سامان کمرے میں رکھ دوں۔“ وہ ہمارے سوالوں کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ”میں اس طویل سفر کے بعد بہت تھک گئی ہوں۔“

”بالکل۔“ میری ماں نے تھوڑا سا شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”میری بیٹیوں کی بات کا برا مت ماننا۔ دراصل شوہر کی وفات کے بعد سے ہم نے کسی کو یہاں نہیں ٹھہرایا۔“

وہ سیڑھیوں کے نیچے ایک کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ وہ ہمارے گھر کا سب سے بڑا کمرا تھا جس کے ساتھ ایک علیحدہ باتھ روم بھی تھا۔

مسز اسکار یوروف کو کمرا پسند آ گیا۔ اس نے ماں کو پیشگی کرایے کے طور پر کچھ رقم دی اور باہر کھڑی ہوئی کوچ کی طرف چل دی۔ ہم نے سامان اٹھانے میں اسے مدد دینے کی

پیشکش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس کے بجائے کوچ کا ڈرائیور اور دوسرا شخص اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے بیگ لیے نمودار ہوئے اور میں سوچنے لگی کہ ایک عورت اتنے سامان کے ساتھ کیسے سفر کر سکتی ہے۔

''کیا یہ واقعی شادی شدہ ہے؟'' میں نے ایمی کے کان میں سرگوشی کی۔

''ہاں، اس نے شادی کی انگوٹھی پہن رکھی ہے۔''

''مجھے یقین نہیں آتا...... یہ عورت اپنے شوہر کے بغیر یورپ کا سفر کیسے کر رہی ہے۔ مسز جونز اس بارے میں بہتر طور پر بتا سکتی ہیں۔''

ان آدمیوں نے مسز اسکاریوروف کا سامان رکھا اور باہر چلے گئے۔ جب واپس آئے تو انہوں نے پانچ فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا سرخ رنگ کا لکڑی کا بکس اٹھا رکھا تھا۔ وہ دونوں کافی مضبوط اور توانا تھے لیکن وہ بکس بہت بھاری تھا جس کی وجہ سے انہیں اٹھانے میں مشکل پیش آ رہی تھی اور جب انہوں نے اسے کمرے کے فرش پر رکھا تو زوردار آواز آئی جس کی گونج پورے گھر میں سنائی دی۔

مسز اسکاریوروف اپنے آدمیوں کو مزدوری دینے باہر گئی تو ہم دونوں بہنوں نے آنکھوں آنکھوں میں اشارے کیے۔ ایمی نے میرے کان میں سرگوشی کی تو میں نے اس کا مذاق اڑایا لیکن بعد میں اس کی بات درست ثابت ہوئی۔ اس رات میں چائے بنانے کے لیے نشست گاہ سے گزری تو مجھے مسز اسکاریوروف کے کمرے میں روشنی نظر آئی اور اس کے ساتھ ہی میں نے موسیقی کی ہلکی سی آواز بھی سنی۔ چائے بنانے کے بعد میں نشست گاہ میں ہی ماں کی ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر موسیقی سننے لگی۔ ہمارے درمیان بہ مشکل دس فٹ کا فاصلہ تھا لیکن بیچ میں صرف ایک انچ موٹے دروازے نے اسے دو مختلف دنیاؤں میں تقسیم کر دیا تھا۔ للی کا کمرا روشن اور پُرسکون تھا جبکہ میں اندھیرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر میں نے اس کے شوہر کے بارے میں سوچا۔ میں حیران تھی کہ اس نے شوہر کے بغیر اتنا طویل سفر کس طرح طے کر لیا؟

میں وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ آنکھ کھلی تو رات کے تین بج رہے تھے۔ للی کے کمرے کے دروازے سے روشنی کی لکیر نظر آ رہی تھی البتہ موسیقی کی آواز تھم چکی تھی لیکن مجھے لگا کہ اب بھی اس کے کمرے سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ میں کرسی سے اٹھی اور دروازے سے کان لگا کر سننے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''مجھے معاف کر دو اینڈرسن۔'' مجھے شک ہوا کہ شاید سننے میں غلطی ہوئی ہو لیکن دوسری بار اس کی آواز واضح طور پر سنائی دی اور وہ یہی جملہ دہرا رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد کمرے کی بتی بجھ گئی اور صبح تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔

دوسرے دن اس نے مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ اسے امریکا کے لیے واپسی کا ٹکٹ خریدنا تھا اور وہ بحیثیت ترجمان مجھے ساتھ لے جانا چاہ رہی تھی۔ ہم دونوں شہر کی چوڑی سڑکوں پر چلتے ہوئے بندرگاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ بہار کی ایک روشن صبح تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے فرحت اور تازگی کا احساس دلا رہے تھے۔ میں وقتی طور پر اس دکھ کو بھول گئی جس نے بابا کی موت کے بعد ہمارے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ راستے میں اس نے اپنے شوہر کا ذکر چھیڑ دیا۔

''میرے شوہر نے اپنے آپ کو کام کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ وہ آثارِ قدیمہ کا ماہر ہے۔''

''گویا وہ نوادرات جمع کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں جن کی کوئی تاریخی اہمیت ہو۔'' اس نے کہا اور یوں لگا جیسے اس کے حلق میں کچھ پھنس گیا ہو۔ اس نے فوراً ہی منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

میں اسے اس کیفیت میں دیکھ کر گھبرا گئی اور اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہوا مسز اسکاریوروف؟''

اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا اور بولی۔ ''کچھ نہیں مجھے لگا جیسے چکر آ گیا ہو۔'' پھر وہ آگے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے سیڑھیاں چڑھنے اترنے سے ڈر لگتا ہے۔''

اس کی آواز بھرا گئی لیکن میں سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ ہم ان سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے جو اونچائی پر واقع مرکزی شہر سے بندرگاہ کی جانب اتر رہی تھیں۔ یہ کسی سڑک کے مانند چوڑی تھیں۔

''میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔ یہ ایک عجیب تجربہ تھا۔ یہ سیڑھیاں سمندر سے اتنی اونچائی پر تھیں کہ وہاں سے جہاز اور نیچے کھڑے ہوئے لوگ بہت چھوٹے نظر آتے تھے۔ تقریباً دو سو سیڑھیاں طے کر کے جب ہم نیچے پہنچے تو بری طرح تھک چکے تھے لیکن مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے میرا شکریہ ادا کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور تیزی سے ایک عمارت کی جانب بڑھ گئی لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں جا کر معاملہ مزید خراب ہو جائے گا۔ میں نے مترجم کے فرائض انجام دیتے ہوئے کلرک کا سوال للی کے سامنے دہرا دیا۔ ''وہ جاننا چاہتا ہے کہ اس بکس میں کیا ہے؟''

"صرف میری ذاتی اشیا۔ ویسے بھی اوڈیسہ ایک فری پورٹ ہے پھر یہ سوال کیوں کیا جارہا ہے؟"

میں نے یہی بات کلرک سے کہی تو وہ سر ہلاتے ہوئے روسی زبان میں بولا۔ "اوڈیسہ گزشتہ چالیس سال سے فری پورٹ نہیں ہے۔ جس کسی نے تمہیں یہ بات بتائی ہے وہ ابھی تک ماضی میں رہ رہا ہے۔ اب تمہیں کرائے کے علاوہ تمام ٹیکس بھی ادا کرنے ہوں گے۔" اس نے ہمارے دیے ہوئے کاغذ پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس بکس میں رکھے ہوئے سامان کی تفصیل بتانا ہوگی۔"

میں نے للی سے کہا۔ "یہ فری پورٹ نہیں ہے اور تمہارا بکس بہت بڑا ہے۔ اس لیے وہ اس میں رکھے ہوئے سامان کی تفصیل چاہتے ہیں۔"

"صرف کپڑے، جوتے اور اسی طرح کی کچھ دوسری اشیا۔" اس نے قدرے بے پروائی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اس فارم میں ان چیزوں کا اندراج کردو۔" میں نے کلرک سے ایک فارم لے کر اس کی طرف بڑھادیا۔

کلرک اس کی گھبراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔ "اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری کمپنی کسی بھی سامان کو کھول کر دیکھنے کا حق محفوظ رکھتی ہے۔"

میں نے یہی بات للی کو بتائی تو وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ "یہ تو غیر قانونی ہوگا۔"

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "غالباً کپتان یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ اپنے جہاز پر کیا سامان لے کر جارہا ہے۔"

"تم بھی ان کی طرف داری کررہی ہو؟"

"میں کسی کی طرف داری نہیں کررہی۔ بلکہ سمجھا رہی ہوں۔"

"مغرور لڑکی۔" اس کا رویہ یکسر تبدیل ہوگیا اور وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "مجھے تمہاری بہن کے ساتھ آنا چاہیے تھا۔"

"وہ بھی تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ قانون کی پابندی سب پر لازم ہے۔"

"رہنے دو۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔" وہ اپنے بیگ سے بہت سے روبل نکالتے ہوئے بولی۔ "اس سے پوچھو کہ میرے سامان کی بکنگ کا کتنا کرایہ ہوگا۔"

"تم مجھے غلط کام کرنے کی ترغیب دے رہی ہو۔"

"یہ کاروبار ہے۔ اس سے پوچھو کہ وہ اس کام کے کتنے پیسے لے گا؟"

"میں ایسا نہیں کرسکتی۔"

"تمہیں کرنا ہوگا۔" وہ آگ بگولا ہوتے ہوئے بولی۔ "نتالیا جونز کہتی ہے کہ تم قابل بھروسا ہو۔"

"وہ ٹھیک ہی کہتی ہے لیکن میں یہ کام نہیں کروں گی۔"

للی کے حلق سے ایک غراہٹ نکلی پھر اس نے خود ہی وہ نوٹ کلرک کی طرف بڑھادیے۔ اس نے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ "نیت۔"

"وہ کہہ رہا تھا۔ "نہیں۔"

"ٹھیک ہے اگر یہ نہیں مان رہا تو میں کوئی دوسری کمپنی دیکھ لوں گی جو گاہکوں کی عزت کرنا جانتی ہو۔" اس نے غصے میں آکر نوٹ اپنے بیگ میں رکھے اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "اگر میں کل روانہ نہ ہوسکی تو یہ مت سمجھنا کہ اسی مقبرے میں قیام کروں گی جسے تم سرائے گھر کہتی ہو۔ یہاں ایسے مسافر خانے بھی ہیں جو اپنے مہمانوں سے بہتر سلوک کرتے ہوں گے۔"

یہ کہہ کر وہ طوفانی انداز میں دروازے کی طرف بڑھی اور اسے اتنی زور سے بند کیا کہ عمارت کی کھڑکیاں بھی لرز گئیں۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے قہقہے لگانا شروع کردیے۔ کلرک مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ عورت فرانسیسی ہے؟"

"نہیں، امریکن۔"

میں عمارت سے باہر آئی تو وہ کافی دور جاچکی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ واپسی میں اسے سیڑھیاں چڑھنے کے لیے میری مدد کی ضرورت کیوں محسوس نہیں ہوئی۔

☆☆☆

میں اپنے کمرے میں بیٹھی کاپی پر پنسل سے لائنیں بنارہی تھی۔ اس وقت نہ جانے میرے ذہن میں کس طرح للی کا چہرہ آگیا اور میں نے غیر شعوری طور پر اسے کاغذ پر منتقل کردیا۔ ابھی میں اس تصویر کو مکمل کرنے میں مصروف تھی کہ میں نے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی۔ دروازے پر للی کھڑی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک میوزک باکس تھا۔

"کیا میں اندر آسکتی ہوں؟"

"نہیں۔" میں نے رکھائی سے جواب دیا۔ اس کے باوجود وہ اندر چلی آئی اور میرے برابر میں بستر پر بیٹھ گئی۔ میں نے جلدی سے اپنی کاپی بند کردی۔

للی نے میوزک باکس اپنی ٹانگوں پر رکھا اور بولی۔ "یہ میرے شوہر نے دیا تھا۔ مجھے خدشہ ہے کہ سفر کے دوران اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ اسے تمہارے پاس

چھوڑ دوں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

وہ بہت خوب صورت میوزک باکس تھا۔ اس کے بیرونی حصے پر چمک دار سبز رنگ کی پالش تھی جبکہ وسط میں ایک پیتل کے ہینڈل والی دراز نصب تھی اور اوپری سطح پر چھوٹے چھوٹے پانچ پورسلین کے گھوڑے نصب تھے۔ اس نے ایک بٹن دبایا اور میرے پسندیدہ موسیقار کی دھن بجنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی وہ گھوڑے بھی حرکت میں آگئے جو انگریزی کے ہندسے آٹھ کی شکل میں ایک دوسرے کے آگے پیچھے چل رہے تھے۔ ہم دونوں نے وہ پوری دھن سنی اور اس دوران میں سوچتی رہی کہ یہ میوزک باکس اس کے شوہر نے تحفے میں دیا ہے اور وہ اسے میرے پاس چھوڑ کر جارہی ہے جس نے چند گھنٹے قبل مجھے مغرور لڑکی کے خطاب سے نوازا؟ اس نے میرے گھر کو مقبرہ کہا۔ کیا وہ سمجھتی ہے کہ میں اس کے کہے ہوئے الفاظ بھول گئی تھی؟ کیا وہ تحفے کی صورت میں مجھے رشوت دے رہی تھی؟

''کچھ اور سنو گی؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔''

''میں کل جارہی ہوں۔ ہمیں اچھے دوستوں کی طرح جدا ہونا چاہیے۔ بندرگاہ پر مجھ سے حماقت سرزد ہوگئی تھی جس کا مجھے افسوس ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ میں کن حالات سے گزر رہی ہوں۔'' اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ شاید اگلے روز کا سورج نہ دیکھ پاؤں۔ تم ابھی صرف چودہ سال کی ہو اور تمہیں نہیں معلوم کہ محرومی کیا ہوتی ہے۔''

میں اپنی پندرھویں سالگرہ سے پہلے ہی باپ اور بھائی سے محروم ہو چکی تھی۔ اس لیے اچھی طرح جانتی تھی کہ تنہائی کا عذاب کیا ہوتا ہے لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔

وہ بستر سے اٹھی اور میوزک باکس میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں اسے یہاں چھوڑے جارہی ہوں۔ تمہارا جب جی چاہے سن لینا۔''

''مسز اسکاریوروف۔'' میں نے بہ آواز بلند کہا۔ ''اگر تم اسے یہاں چھوڑ کر گئیں تو میں اسے اٹھا کر باہر پھینک دوں گی۔''

اس نے میوزک باکس اٹھایا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میساچوسٹس میں اس کا شوہر تھا یا نہیں لیکن اس وقت وہ یہاں تنہا تھی اور لگتا تھا کہ اپنے اندر کوئی غم چھپائے ہوئے ہے۔ مجھے اس سے وقتی طور پر ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ میں بستر سے نیچے اتر آئی اور لکڑی کے فرش پر لیٹ گئی۔ سخت سطح پر لیٹنے سے میری کمر کا کھنچاؤ کم ہوجاتا تھا۔ پاپا کے مرنے کے بعد یہ میرا روزانہ کا معمول تھا لیکن اس رات لکڑی کا فرش برف کی طرح ٹھنڈا ہورہا تھا۔ میں اس کی وجہ نہ جان سکی۔ مئی کے مہینے میں اس ٹھنڈ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میری بہن برابر میں ہی سو رہی تھی۔ اچانک ہی وہ اٹھ بیٹھی اور کہنے لگی۔ ''تم نے کوئی آواز سنی؟''

''نہیں۔''

اس کے ساتھ ہی دو زوردار دھماکے ہوئے پھر ایک زوردار چیخ سنائی دی۔ ایسی خوفناک چیخ میں نے زندگی میں کبھی نہیں سنی تھی۔ ہم دونوں تیزی سے نیچے کی طرف بھاگے جہاں میری ماں پہلے سے کھڑی ہوئی تھی مرکزی دروازہ کھلا ہوا تھا اور بارش کی تیز بوچھاڑ اس کے ذریعے گھر میں داخل ہورہی تھی لیکن ہماری توجہ کا مرکز للی کے کمرے کا دروازہ تھا جس کے قبضے...... چوکھٹ سے علیحدہ ہوگئے تھے اور وہ ٹوٹی ہوئی حالت میں دیوار کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔ جبکہ لکڑی کے ٹکڑے پورے فرش پر پھیلے ہوئے تھے۔

میں نے اندھیرے میں ٹٹول کر سوئچ تلاش کیا۔ روشنی ہوتے ہی میری نگاہ اس کے بستر پر گئی۔ للی وہاں موجود نہیں تھی۔ ہم نے ہر کمرا، ہر الماری اور گھر کا ہر کونہ دیکھ لیا لیکن للی کا کہیں پتا نہیں تھا۔ مما اور ایمی اسے ڈھونڈنے باہر سڑک پر گئیں۔ عام طور پر وہاں پولیس کا سپاہی گشت پر ہوتا تھا۔ اگر اس نے للی کو جاتے ہوئے دیکھا ہو تو شاید وہ اس بارے میں کچھ بتادے۔ ہم میں سے کسی ایک کو تو گھر میں رہنا تھا۔ اس لیے میں رک گئی۔ ویسے بھی مجھے رات کے وقت باہر نکلتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ سردی میں کمی واقع ہوگئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے فضا میں گوشت کی بو کا احساس ہوا۔ شاید پڑوسی ہماری کھڑکی سے متصل اپنے صحن میں بچھیا کا گوشت خشک کررہے ہوں گے۔ یہ سوچتے ہی میری بھوک چمک اٹھی۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص یا چند لوگ دروازہ توڑ کر اندر آتے اور للی کو اٹھا کر لے جاتے۔ میں نے ٹوٹے ہوئے دروازے کو غور سے دیکھا۔ اسے ہتھوڑے اور کلہاڑی کی مدد سے کئی منٹوں میں چوکھٹ سے الگ کیا گیا ہوگا۔ کیا للی اکیلے یہ کام کرسکتی تھی؟ اس پاگل عورت سے کچھ بعید نہیں تھا۔ میں نے لیمپ کی روشنی اس بڑے صندوق پر ڈالی۔ پورے کمرے میں وہی ایک چیز ایسی تھی جسے چھیڑا نہیں گیا تھا اور نہ ہی اسے اپنی جگہ سے ہٹانے کی کوشش کی گئی تھی۔

میں لِلی کی چیزیں جمع کرنے لگی۔ اس کا میوزک باکس غائب تھا لیکن میرے ہاتھ ایک ڈائری ایک تصویر اور ایک کتاب لگ گئی جس میں اس علاقے کے جغرافیہ کے بارے میں معلومات درج تھیں۔ میں اس صندوق پر بیٹھ گئی اور لیمپ کی روشنی میں تصویر کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس میں للی فیشن ایبل لباس میں ایک پُرکشش مرد کے بازو میں بازو ڈالے کھڑی ہوئی تھی جو عمر میں اس سے دس سال بڑا تھا۔ یہ یقیناً اس کا شوہر اسکار یوروف ہوگا۔ وہ میرے تصور سے بھی زیادہ ہینڈسم تھا۔ میں نے وہ تصویر ایک طرف رکھ دی اور کتاب کے صفحات پلٹنے لگی۔ اس کے تیسرے صفحے پر سالانہ رکنیت حاصل کرنے والوں کی تصاویر تھیں۔ ان میں سے ایک کے نیچے لکھا ہوا تھا...... اینڈرسن اسکار یوروف پی ایچ ڈی، دو عہدے کے اعتبار سے آثارِ قدیمہ سوسائٹی...... کا خزانچی تھا۔ اس کتاب میں اور بھی کئی مضامین تھے جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے بعد میں نے ڈائری کھول کر دیکھی۔ للی کی تحریر پڑھنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی لیکن اس کے چند صفحات پلٹنے کے بعد ہی میں اس کی سچائی کے بارے میں مشکوک ہوگئی۔ ڈائری میں بیان کردہ واقعات کے مطابق جب للی نے اپنا یورپ کا سفر شروع کیا تو اس کا شوہر بھی ہمراہ تھا جبکہ اس نے بتایا تھا کہ وہ اسے میا چوسٹس میں گھر پر ہی چھوڑ آئی ہے۔ وہ سمندری اور زمینی راستوں سے سفر کرتے ہوئے ایک مخصوص مقام تک آئے۔ اس کے بعد بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں ملا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ مسٹر اسکار یوروف اسے چھوڑ کر چلے گئے ہوں۔ وہاں سے وہ مشرق میں واقع پانچ سو میل دور فولادی صنعت کے مرکز گئے جہاں انہوں نے نیشنل ہوٹل میں قیام کیا۔ اس ڈائری میں درج شدہ اہم واقعات للی کے الفاظ میں کچھ یوں لکھے تھے۔

پندرہ مئی: یہاں پہنچنے کے چوتھے روز اینڈرسن نے یوکرائن کے مضافاتی علاقے میں جانے کا پروگرام بنایا۔ اس سفر کے لیے اس نے مسز جونز سے کرائے پر گھوڑا اور بگھی حاصل کی اور ہم ہوٹل سے روانہ ہوگئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم شہر کی حدود سے باہر نکل آئے اور فولاد کے کارخانوں کی دھواں اگلتی چمنیاں پیچھے رہ گئیں۔ چاروں طرف دور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا اور لگتا تھا جیسے ہمارے علاوہ اس راستے پر سفر کرنے والا اور کوئی نہیں۔ جب ہمیں کافی دیر تک کوئی چھکڑا یا کوئلہ لے جانے والی گاڑی نظر نہ آئی تو اینڈرسن نے سڑک چھوڑ کر بگھی کو کھیتوں میں اتار دیا۔ کچے راستے پر چلنے کی وجہ سے جھٹکے محسوس ہونے لگے اور مجھے ڈر ہوا کہ کہیں بگھی کا کوئی پہیہ زمین میں نہ دھنس جائے۔ جب میں نے اس خدشے کا اظہار اینڈرسن سے کیا تو وہ بے پروائی سے بولا۔ ''یہاں کی زمین اتنی گیلی نہیں کہ پہیے اس میں دھنس جائیں۔''

جلد ہی اینڈرسن کو ایک پسند کی جگہ نظر آگئی اور ہم دوپہر کے کھانے کے لیے سرسبز و شاداب گھاس پر اتر گئے۔ میں نے ایک خشک جگہ پر چادر بچھائی اور اینڈرسن بگھی کے عقبی حصے سے کھانے پینے کا سامان نکال کر لے آیا۔ اس نے بڑے سلیقے سے کھانے کے ڈونگے، پیالے اور وائن کی بوتل چادر پر سجادی۔ کھانے کے بعد ہم دونوں اسی چادر پر لیٹ گئے اور باتیں کرنے لگے جس کا ہمیں بہت کم موقع ملتا تھا۔ مجھ پر رومانی موڈ طاری ہوگیا۔ میں اس کی جانب سے کسی پیش قدمی کی توقع کر رہی تھی لیکن وہ اچانک ہی اٹھ بیٹھا اور بولا۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ بگھی کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک میوزک باکس تھا جس میں سے موسیقی کی دھن سنائی دے رہی تھی اور اس کی اوپری سطح پر چھوٹے چھوٹے پلاسٹک کے گھوڑے ایک دائرے میں چکر لگا رہے تھے۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا اور باکس مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ''یہ دس سال سے زیادہ پرانا نہیں ہوسکتا۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''گھر کے لیے ہمیشہ نئی چیزوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔''

''ہاں لیکن مجھے یہ پسند آگیا اس لیے خرید لیا۔ وعدہ کرو کہ کسی کو اس بارے میں نہیں بتاؤ گی۔''

''کوئی عورت کسی کو عمر نہیں بتاتی۔ یہ تحفہ مجھے پسند آیا۔''

''یہ میں نے یہ ایک نوادرات کی دکان سے خریدا تھا۔ ان کے یہاں ایسی کئی نادر اشیا ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے وہاں سے ایک اور چیز بھی خریدی تھی۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور بولا۔ ''ہم اسے میوزیم میں جمع کرادیں گے۔''

''یہ تو ایک چمچ ہے۔''

''ہاں۔ سترھویں صدی کا چمچ۔'' اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک ابھر آئی تھی۔

ہم نے سہ پہر کے قریب اپنا سامان سمیٹا اور وہاں سے چلنے کی تیاری کرنے لگے۔ میں انگلش ٹاؤن جاکر گرم پانی سے غسل کرنا چاہ رہی تھی لیکن اینڈرسن نے بگھی کا رخ مغرب کی جانب موڑ دیا اور بولا۔ ''میرے دوست گیریٹ کا

اصرار ہے کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک جگہ ضرور دیکھوں۔ گزشتہ بار بھی میں وہاں نہیں جاسکا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"بالکل نہیں بلکہ یہ میرے لیے ایک ایڈونچر ہوگا۔"

"اچھی لڑکی۔" اس نے میرا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

ہم مزید ایک گھنٹے تک سفر کرتے رہے۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اینڈرسن نے بگھی کے دونوں طرف نصب لالٹینیں روشن کردیں اور گیریٹ کی بتائی ہوئی سمت کے بارے میں بڑبڑانے لگا۔ مجھے لگا کہ ہم راستہ بھول گئے ہیں لیکن اینڈرسن کو چیلنج قبول کرنا پسند تھا اور میں ایک اچھی بیوی کی طرح اس کا ساتھ دینے پر مجبور تھی۔ تب میری نظر ایک مجسمے پر پڑی جو اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے سرسبز قطعۂ زمین پر ایستادہ تھا۔ اینڈرسن نے گھوڑے کی باگیں کھینچیں اور خوشی سے چلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے اسی کی تلاش تھی۔"

وہ سیاہ گرینائٹ سے بنا ہوا کسی جنگجو کا مجسمہ تھا جس کی کمر کے ساتھ تلوار لٹکی ہوئی تھی۔

"کپ چک!" اینڈرسن بگھی سے اترتے ہوئے بولا۔ "گیریٹ نے مجھے اسی کے بارے میں بتایا تھا۔" وہ مجسمے کے قریب گیا۔ مجسمے کا منہ کھلا ہوا تھا جیسے وہ چیخ مار رہا ہو۔

"مجھے تو یہ بھوکا معلوم ہوتا ہے۔" میں اس کا کھلا ہوا منہ دیکھ کر بولی۔

"یہ گزشتہ ایک ہزار سال سے یہاں ایستادہ ہے اور اس جگہ کی حفاظت کررہا ہے اور اس نے کئی بیرونی حملہ آوروں کو یہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔"

"اس نے کچھ نہیں دیکھا ڈیئر۔ یہ محض پتھر کا ایک مجسمہ ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن مقامی لوگ اسے ایک سنگِ میل سمجھتے ہیں اور احتراماً مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔"

"ہم اسے رابرٹ کا نام دے دیتے ہیں۔ اب تم اسے خدا حافظ کہہ کر چلنے کی تیاری کرو۔"

"للی! تم بگھی سے میرا اوزاروں کا تھیلا لے آؤ۔ ابھی آسمان پر تھوڑی سی روشنی باقی ہے۔"

"ڈارلنگ! دیر ہورہی ہے۔ انگلش ٹاؤن تک پہنچتے پہنچتے آدھی رات ہوجائے گی۔"

"ہاں لیکن یہ کام بھی ضروری ہے۔"

مجبوراً مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔ میں گاڑی سے تھیلا نکال کر لائی اور اس کے حوالے کرتے ہوئے بولی۔ "تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟"

اس نے تھیلے سے ایک چاقو نکالا اور مجسمے کی بنیاد کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔ "میں گیریٹ کو غلط ثابت کرنا چاہ رہا ہوں۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ مجسمے غار کیوسے برآمد ہوئے ہیں جبکہ مجھے یقین ہے کہ یہ بحیرۂ آزوف کے آس پاس تھے۔" یہ کہہ کر اس نے چاقو سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چھیل کر رومال میں جمع کرنا شروع کردیے اور بولا۔ "دیکھتے ہیں کہ ہم دونوں میں کون حقیقی ماہر آثارِ قدیمہ ہے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے پتھروں سے یہ بات ثابت کرسکو گے؟"

"شاید میں ایسا نہ کرسکوں لیکن بونر یہ کام کرسکتا ہے۔ تم اس سے سوسائٹی کے ڈنر میں مل چکی ہو۔ وہی جس نے زرد رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔"

اس نے اپنا کام ختم کیا اور رومال کی پوٹلی بنا کر اپنی جیب میں رکھ لی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور بولی۔ "کیا اب ہم یہاں سے روانہ ہوسکتے ہیں؟"

"میں اس کی پیمائش لینا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے کہ اس کا خاکہ تیار کرنا پڑے لیکن اس پرانی لالٹین کی روشنی میں یہ کام نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے ہمیں صبح کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"اوہ۔" میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہم رات کہاں گزاریں گے؟"

"یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ایک پون چکی ہے۔ وہاں ہمیں رات گزارنے کی جگہ مل سکتی ہے۔"

اینڈرسن کا خیال درست ثابت ہوا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم پون چکی سے متصل ایک چھوٹے سے کاٹیج کے دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔ گھر کے مالک ملر اور اس کی بیوی نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے پانچ بچے بھی ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ اینڈرسن نے کرایہ طے کیا اور انہوں نے رات گزارنے کے لیے ہمیں اپنا کمرا دے دیا۔ اس چھوٹے سے کاٹیج میں کوئی دوسرا کمرا نہیں تھا اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ کہاں سوئیں گے۔ میزبانوں نے ہمارے لیے کھانا تیار کیا، جو گوشت کے پارچوں اور آلو کے چپس پر مشتمل تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے گھر کی بنی ہوئی واڈکا بھی پیش کی جس کا ذائقہ کسی حد تک وھسکی سے ملتا جلتا تھا۔

سولہ مئی: صبح ہماری آنکھ جلد کھل گئی۔ ایک بار پھر انہوں نے ناشتے سے ہماری تواضع کی جو خاصا لذیذ تھا لیکن میں نے دیکھا کہ اینڈرسن کا موڈ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ اس نے

ناشتے کے دوران بہت کم بات کی۔ بگھی میں سوار ہوتے وقت بھی اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ کچھ دور جانے کے بعد میں نے اس سے ناراضگی کی وجہ پوچھی تو وہ پھٹ پڑا۔ "مجھے ان لوگوں سے ایسے سلوک کی توقع نہیں تھی۔"

"میں سمجھی نہیں۔ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟ ان کا رویہ تو بہت اچھا تھا۔"

اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے وہ قدیم چمچ نکالا اور میرے حوالے کردیا۔ اس کی حالت دیکھتے ہی میں سمجھ گئی کہ یہ ملر کے بچوں کی شرارت تھی۔ چمچ کا ہینڈل پوری طرح مڑ گیا تھا اور اس میں کسی بھاری نکیلی چیز سے سوراخ کردیے گئے تھے۔ میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔ "جو ہوا سو ہوا، بچے ایسی شرارتیں کرتے ہی ہیں۔"

"تم نہیں جانتیں کہ یہ کتنا قیمتی اور نایاب چمچ ہے۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں وہ مجسمہ نصب تھا۔ میں نے اینڈرسن کا موڈ بحال کرنے کے لیے کہا۔ "لگتا ہے کہ رابرٹ ہم سے بھی پہلے جاگ چکا ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے بگھی سے فیتہ نکالا اور ہر زاویے سے مجسمے کی پیمائش لینے لگا۔ وہ اپنے کام میں اتنا منہمک تھا کہ اس نے ایک مرتبہ بھی میری طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ میں اپنی بوریت دور کرنے لیے بگھی سے اتری اور دوسری پہاڑی کی جانب چل دی۔ دوسری جانب وادی کے دامن میں ایک تالاب تھا جس کے کنارے دو بکریاں پانی پی رہی تھیں۔ میں نے کنارے پر سے کچھ پتھر اٹھائے اور انہیں تالاب میں ایک ایک کرکے پھینکنے لگی۔ مجھے اس کھیل میں لطف آرہا تھا کہ اچانک ہی ایک چیخ سنائی دی۔ میں فوراً ہی مڑی اور تیزی سے پہاڑی چڑھتی ہوئی بلندی تک پہنچ گئی۔ میں نے دیکھا کہ اینڈرسن بگھی میں بیٹھا اپنے ہاتھ پر ایک پرانا کپڑا لپیٹ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "اس نے مجھے کاٹ لیا۔"

"کیا؟" میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ اس کے دانت بہت تیز اور نکیلے ہیں۔ پیمائش لیتے وقت میرا ہاتھ بے دھیانی میں ان کے نیچے چلا گیا۔ لگتا ہے کہ زخم گہرا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ جب تک یہ کام ختم نہ ہوجائے، میں تمہیں دیکھتی رہوں۔"

وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا جو کئی گھنٹے

جاری رہا اور ہم سہ پہر کے بعد ہوہوکا کی جانب روانہ ہوگئے۔ راستے میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا البتہ شام کے وقت میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی تو اینڈرسن نے اپنی جیکٹ مجھے پہنادی۔ اس کی جیب میں وہ پوٹلی بھی تھی جس میں مجسمے سے توڑے گئے چھوٹے پتھر رکھے ہوئے تھے۔ سارے راستے میں اپنے پہلو میں ان کی چبھن محسوس کرتی رہی۔

بالآخر ہم اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ اینڈرسن کرائے کی بگھی واپس کرنے چلا گیا اور میں اپنے کمرے میں آگئی۔ میں نے محسوس کیا کہ جیکٹ کی جیب میں رکھے پتھروں نے صرف اس کے اندرونی حصے کو ہی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ میرے لباس کے کچھ حصے کو بھی پھاڑ دیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اینڈرسن ان قیمتی پتھروں کو کبھی نہیں پھینکے گا۔ لہٰذا میں نے انہیں ایک موٹے تولیے میں لپیٹ کر میوزک باکس کی دراز میں رکھ دیا۔

ہوٹل کے عقب میں ایک ریستوران تھا۔ ہم ہمیشہ وہیں کھانا کھاتے تھے۔ اس رات ہماری میز پر ایک ریٹائرڈ فوجی افسر بھی موجود تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے عمدہ لباس زیب تن کر رکھا تھا اور اس کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ہر معاملے میں واضح رائے رکھتا ہے۔ اینڈرسن کا مزاج بھی کچھ ویسا ہی تھا اس لیے بہت جلد وہ دونوں آپس میں گھل مل گئے۔ صورت حال اس وقت خراب ہوگئی جب اینڈرسن نے مسز جونز سے پوچھا کہ اس علاقے کا نام انگلش ٹاؤن کیوں ہے جبکہ وہاں زیادہ تر لوگ ویلز کے رہنے والے نظر آرہے ہیں۔

''اگر تم انگریزی بولتے ہو تو انگریز ہی کہلاؤ گے۔'' مسز جونز کے بجائے اس افسر نے جواب دیا۔

اینڈرسن بھی خاموش رہنے والا نہیں تھا۔ وہ تڑخ کر بولا۔ ''ضروری نہیں۔ ہم بھی انگریزی بولتے ہیں لیکن امریکن ہیں۔''

''دونوں میں کوئی فرق نہیں۔''

''بالکل ہے۔'' اینڈرسن نے کہا۔ اس کے بعد وہ تقریباً دس منٹ تک دونوں قوموں کے درمیان ثقافتی، سیاسی اور معاشی فرق کو واضح کرتا رہا۔ اس دوران وہ فوجی افسر لاتعلق بنا بیٹھا رہا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس نے اینڈرسن کے بیان کردہ نکات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ جب اینڈرسن نے اپنی بات ختم کی تو اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔

''دونوں ایک جیسے ہیں۔'' اس کے چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ ابھری اور وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''البتہ ایک فرق ضرور ہے۔ اگر انگریز چور ہیں تو امریکن ان کے مقابلے میں دوگنا زیادہ چور ہیں۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''انہوں نے پہلے انڈینز کی زمین پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد انگریزوں کا علاقہ بھی ہتھیالیا۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ کسی روسی کو اس بارے میں لیکچر دینا چاہیے۔''

''میں صاف صاف کہہ رہا ہوں مسٹر اینڈرسن کہ تم چور ہو۔''

اس موقع پر مسز جونز نے مداخلت کرنے کی کوشش کی لیکن اینڈرسن اور اس روسی کے درمیان تکرار بڑھتی گئی پھر اچانک ہی میرے شوہر نے روسی زبان میں بولنا شروع کردیا۔ اس پر وہ روسی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور اس نے اتنی زور سے چلا کر جواب دیا جسے سن کر اینڈرسن اور مسز جونز کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس نے جو کچھ کہا میرے شوہر نے اسے ماننے سے انکار کردیا۔ مسز جونز نے ایک بار پھر اس روسی سے جانے کے لیے کہا اور وہ مجھ پر ایک قہر آلود نظر ڈالتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اینڈرسن نے مجھے بتایا کہ روسی نے اسے ڈوئل لڑنے کا چیلنج دیا ہے۔ یہ سن کر میں مضطرب ہوگئی۔ کمرے میں پہنچ کر بھی اینڈرسن بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہا۔

''تم نے سنا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اس نے مجھے چور کہا جبکہ وہ مجھے جانتا بھی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے کہ وہ تمہیں نہیں جانتا لیکن کیا اس چیلنج کے بعد ہم محفوظ ہیں؟ شاید مسز جونز پولیس کو اطلاع دے دے۔''

مجھے لگا کہ اس نے میری بات نہیں سنی۔ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''ٹھیک ہے اگر میں چور ہوں تو اس کا فائدہ بھی اٹھانا چاہیے۔'' وہ بستر کے گرد چکر لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''گیریٹ کو متاثر کرنے کے لیے اس سے اچھا تحفہ نہیں ہوسکتا۔ ویسے بھی اوڈیسہ ایک فری پورٹ ہے۔ کسی کو سامان کی نقل و حرکت سے کوئی فرق نہیں۔''

''تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟''

''میں نے ہوٹل کی لابی میں ایک پرانے جہاز کا ڈھانچا دیکھا ہے۔ میں اس کی کچھ چیزیں چرالوں گا۔ ویسے تو مسز جونز لابی میں چکر لگاتی رہتی ہے لیکن میں اسے چکما دے کر اپنا کام کرلوں گا۔''

میرا کلیجا اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اینڈرسن مت جاؤ۔ اس شخص نے تمہیں ڈوئل کا چیلنج دیا ہے اور تم جانتے ہو کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔''

''یہ سب دکھاوا ہے میری جان۔ ڈوئل کرنے والے زمین پر فائر کرتے ہیں اور بعد میں دوستوں کی طرح رخصت ہو جاتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں آدھی رات تک واپس آ جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے میرے گال پر بوسہ دیا اور چلا گیا۔

آدھی رات گزر گئی اور وہ نہ آیا تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں نے مسز جونز کو جگایا اور کہا کہ وہ پولیس کو اطلاع کر دے۔ اس نے مجھے انتظار کرنے کے لیے کہا اور میں اب تک اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ واپس آ جاؤ اینڈرسن۔

سترہ مئی: صبح کے چار بج گئے لیکن اینڈرسن واپس نہیں آیا لیکن میں تنہا نہیں ہوں، یہ مجھے اب پتا چلا ہے۔ وقفے وقفے سے یہ میوزک باکس بجنا شروع ہو جاتا ہے۔ مجھے اسے چابی دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ یہ خود بخود بجنا شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید اس کے اسپرنگ میں کوئی خرابی ہو گئی ہو لہٰذا میں نے اسے لاک کر دیا لیکن جب بھی اپنے شوہر کو یاد کر کے رونے لگتی ہوں تو یہ دوبارہ بجنا شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے اس کا اسپرنگ نکال دیا۔ اس کی مشین کو ناکارہ بنا دیا لیکن یہ بجتا رہا اور اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ یہ میری زندگی کی آخری سانس تک یونہی بجتا رہے گا۔

یہ اس کے لکھے ہوئے آخری الفاظ تھے۔ اس کے بعد اگلے چار صفحات غائب تھے۔ آخری اندراج بیس تاریخ کو کیا گیا تھا جب للی ہمارے گھر آئی تھی۔ یہ ایک مختصر سی وصیت تھی جس کے مطابق اس کی تمام چیزوں کی وارث اس کی ایک بہن تھی جو مارتھا کے انگوروں کے باغ میں کام کرتی تھی۔ اس وصیت میں اس کے شوہر کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

میں نے ڈائری بند کر دی اور جو کچھ پڑھا تھا، اسے سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ شاید میری انگریزی اتنی اچھی نہ ہو۔ شاید کچھ الفاظ کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو لیکن میں اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ للی ایک پاگل عورت تھی۔ یہ ڈائری، ٹوٹا ہوا دروازہ اور اس کا غائب ہو جانا اس کی تصدیق کر رہا تھا۔

اب میرا تجسس بڑھ گیا۔ میں جاننا چاہ رہی تھی کہ اس صندوق میں کیا ہے اور للی اسے چھوڑ کر کیوں چلی گئی۔ میں صندوق کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کی اونچائی میری کمر کے برابر تھی۔ میں نے اس کی ہموار سطح پر ہاتھ پھیرا تو میری انگلیاں اس کے کونوں پر لگے ہوئے پیتل کے ٹکڑوں سے ٹکرائیں۔ ہر ایک کے نیچے تار کا پھندا لگا ہوا تھا۔ میں نے ان میں سے ایک کو کھینچا تو کلک کی آواز آئی پھر میں نے یہی عمل بقیہ تین تاروں کے ساتھ بھی دہرایا تو اس کا ڈھکنا تھوڑا سا اوپر اٹھ گیا۔ میں نے اسپرنگ ہٹا کر پورا ڈھکنا اٹھا دیا۔

صندوق کے اندر ایک سیاہ رنگ کا ربر کا تھیلا رکھا ہوا تھا جس کی لمبائی صندوق کے برابر تھی اور اسے سلائی کے ذریعے بند کیا گیا تھا۔ ایک بار پھر وہی ناگوار بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی جو یقیناً پڑوس کے کسی گھر میں پکنے والے گوشت کی نہیں تھی۔ میں تھوڑا سا ہچکچائی۔ للی کے علم میں لائے بغیر تھیلے کو کھولنا ٹھیک نہیں تھا لیکن میں جانتی تھی کہ وہ اب واپس نہیں آئے گی۔ میں سلائی کے ذریعے جوڑے ہوئے تھیلے کو الگ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ میرا دل تیزی سے... دھڑک رہا تھا۔ اس وقت نہ جانے مجھ میں کہاں سے غیر معمولی طاقت آ گئی ورنہ عام حالات میں مجھ جیسی لڑکی کے لیے اتنی مضبوطی سے سلے ہوئے تھیلے کو کھولنا ممکن نہ تھا۔

تھیلا آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوا۔ اس کے ٹانکے ربر کی اندرونی سطح تک چلے گئے تھے۔ میں نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوری سلائی ادھیڑ ڈالی اور اس میں رکھے ہوئے سامان کو دیکھتے ہی میری چیخ نکل گئی۔ میری نظروں کے سامنے انسانی گوشت اور پتھروں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا جو آپس میں ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے۔ کاش میں یہ سب نہ دیکھتی۔

میں دہشت کے عالم میں کمرے سے بھاگی اور ماں سے جا کر لپٹ گئی۔ میرا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور خوف کے مارے گھگی بندھ گئی تھی۔ ماں میری یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے حواس مجتمع کیے اور اسے صندوق کی بابت بتایا تو وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''ہمیں فوراً پولیس کو مطلع کرنا چاہیے۔''

''لیکن للی......؟'' میں نے پوچھا۔

میں اور امی اسے ڈھونڈتے ہوئے بندرگاہ تک چلے گئے تھے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اس نے پل پر سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے ہاتھ میں میوزک باکس تھا جو آخری وقت تک بجتا رہا۔

''پاگل عورت۔'' میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ اس نے شوہر کی لاش کو بھی آثارِ قدیمہ سمجھ کر اپنے ساتھ رکھنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکی تو خود بھی اس کے پاس چلی گئی۔



محی الدین نواب

تیرہویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے ڈاڈا جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمعہ اور چاچی نئی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا۔ چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ اس رات زلیخا نے اسے ایک قیمتی ہار بھی تحفتاً دیا تھا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہوبہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کر کے قتل کروادیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگادیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جگی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل وجان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد کو شادی کے لیے ایک لاکھ کی ضرورت تھی۔ محبوب نے زلیخا کے دیے ہوئے ہار کو ایک لاکھ میں خریدنے کی پیشکش کی لیکن مراد راضی نہ ہوا۔ اسی دوران مراد کے گھر چوری کی واردات ہوئی اور چور نقد رقم کے ساتھ زلیخا کا وہ ہار بھی لے گئے لیکن پکڑے گئے یوں مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چانڈیو استعفا دے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکریٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ جو کہ جیلر کی بیٹی ہے دیگر دو ساتھی بہرام اور دارا اکبر کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی اور اس سے شادی اسے ورغلا کر ماروی سے دور کررہی تھی جبکہ ماروی پر بھی دباؤ تھا کہ وہ محبوب سے شادی کرلے لیکن دونوں اپنے عشق پر قائم تھے۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار تھا اور حتیٰ کہ جب ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہوگئی جس میں سمیرا بھرپور مدد کررہی تھی تاکہ محبوب ماروی کی مدد سے باز آجائے مگر اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہوکر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہوگیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور جگی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ایک موقع پر مرینہ مراد کا پیچھا کرتے ہوئے راستے میں ماروی تک پہنچ گئی اور محبوب سے فون پر اپنے باپ کے ذریعے رابطہ کرایا تو اسی خبر سے محبوب میں نئی زندگی دوڑ گئی۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ مگر قسمت کی دیوی مراد پر مہربان تھی جو مرینہ کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا، اتفاق سے راستے میں ماروی چاچی اور چاچا کے ساتھ اس کے ہاتھ لگ جاتے ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہوجاتا ہے کہ مرینہ ماروی کو جام تھارو کے چودھری کے پاس لے جارہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوجاتا ہے۔ محبوب اور مراد کے جگہ بدل لینے سے حالات بھی بدلتے جارہے تھے۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مرجاتا ہے۔ ماروی کا علاج ہوتا ہے مگر ماروی محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچان پارہی تھی۔ اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ ادھر غیرملکی ایجنٹ نے مراد کو قتل کرنے کا حکم دیا اس پر عمل ہوا تاہم وہ بچ گیا۔ مراد نے ایک ایجنٹ کو پکڑلیا۔ ایجنٹ بلا مراد کے ساتھ مل گیا۔ مراد مرکوٹ میں تھا۔ پولیس نے مراد کو چاروں طرف سے گھیرلیا بعد اسی دوران مرینہ نے دھاوا بول دیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ مراد مرینہ کے رستے میں پھر رکاوٹ بن گیا۔ اس نے خفیہ معاہدے کی مائیکرو فلم حاصل کرلی۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر جگ دیو مراد

کو سرحد پار کرانے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ مرینہ آبادی والوں کو اطلاع کر دیتی ہے۔ جگ وچو مارا جاتا ہے اور مراد مرینہ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ مرینہ گولیاں مار کر مراد کو زخمی کر دیتی ہے اور اسے اپنا اسیر بنا لیتی ہے۔ ادھر ماروی کے چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ جاتی ہے۔ مرینہ مراد کو اپنا اسیر بنانے کے بعد اس سے بدلہ لینا چاہتی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کرنے والی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ مرینہ کے جانے کے بعد وہاں سے اٹھ کر لنگڑاتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ دُرگا پرساد ایک صوفے پر بیٹھا بریف کیس میں نوٹوں کی گڈیاں رکھ رہا تھا۔ کہیں بہت بڑی ڈیلنگ کرنے جا رہا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ”ابھی میں باتھ روم میں شاور لے رہا تھا۔ تمہاری آواز وہاں تک آ رہی تھی۔ بادل کی طرح خوب گرج رہے تھے۔ کیا مرینہ سے جھگڑا کر رہے تھے؟“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”نہیں۔ مرینہ بہت اچھی ہے۔ میں اس سے جھگڑا کر ہی نہیں سکتا۔ اس وقت فون پر بول رہا تھا۔ یہ دھیان نہیں رہا کہ میری آواز باہر جا رہی ہوگی۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آئندہ محتاط رہوں گا۔“

اسی وقت دُرگا پرساد کی دھرم پتنی شانتا اپنی بیٹی مونیکا کے ساتھ آئی۔ وہ بیمار تھی۔ ڈاکٹر سے دوائیں لے کر آ رہی تھی۔ مونیکا اسے سہارا دے کر اس کے بیڈ روم تک لے جا رہی تھی۔ شانتا نے اس سے الگ ہو کر کہا۔ ”بس بیٹی! میں چلی جاؤں گی تم نارنگ کو دیکھو۔ کہاں ہے؟“

باپ نے کہا۔ ”وہ کرکٹ کھیلنے گیا ہے۔ میں نئی پارٹی کو پیمنٹ کرنے جا رہا ہوں۔ شام تک آؤں گا۔“

پھر وہ مسکراتا ہوا مونیکا کے پاس آیا۔ اس کے رخسار کو تھپتھپا کر بولا۔ ”ہماری بیٹی چپ ہے۔ بھئی تم چہکتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔“

وہ ماں کے پاس آ کر اس کے شانے سے لگ کر بولی۔ ”ممی بیمار ہیں۔ زیادہ بولتی ہوں تو ڈانٹنے لگتی ہیں۔“

وہ شانتا سے بولا۔ ”بھئی یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ہماری بیٹی کے چہکنے سے تو گھر میں رونق رہتی ہے۔ کیوں مراد! تم اس کی باتیں سنتے رہتے ہو نا؟“

مراد نے کہا۔ ”مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔ اتنی بڑی کوٹھی کی دیواروں سے پوچھیں۔ دن ہو یا رات اس کی آواز سات سروں کی طرح گونجتی رہتی ہے۔“

مونیکا فوراً ہی ماں کی طرف سے پلٹ کر مراد کے بازو سے لگ کر بولی۔ ”ہائے پاپا! مراد نے کیسی تعریف کی ہے۔ میری آواز میں سات سروں کی راگنی ہے۔“

وہ بولا۔ ”ہاں بیٹی! مراد نے سچ کہا ہے۔ تم بولتی ہو تو کانوں میں رس گھولتی ہو۔“

مراد بہت خوش تھا۔ وہ جیسے تھوڑی دیر میں مرینہ کے ذریعے ماروی تک پہنچنے والا تھا۔ اس وقت بڑے موڈ میں تھا۔ اپنے میزبان کی فیملی میں گھل مل رہا تھا۔ لیکن ان لمحات میں ذرا گڑبڑا گیا۔ مونیکا آ کر اس کے بازو سے لگ گئی تھی۔

جب سے مرینہ نے اپنے وجود کو اس سے متعارف کرایا تھا تب سے دوسری عورتیں چور خیالوں میں خود ہی متعارف ہونے لگی تھیں۔ ایک کے بعد دوسری کتاب کہتی تھی کہ میرے اوراق میں بھی دلچسپ کہانیاں ہیں۔

مونیکا کا وجود بھی بازو سے لگ کر یہی کہہ رہا تھا۔ وہ بڑی آہستگی سے اس سے الگ ہو کر بولا۔ ”یہ اکثر گاتی گنگناتی رہتی ہے۔ بہت شوخ اور چنچل ہے۔ ہم سب کے سامنے ناچتی تھرکتی رہتی ہے۔ واقعی اس کے دم سے گھر میں رونق رہتی ہے۔“

شانتا نے کہا۔ ”اسے امیر خسرو کی بہت سی پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں یاد ہیں۔“

پھر وہ بیٹی سے بولی۔ ”مونیکا! کوئی پہیلی بجھواؤ۔“

وہ بولی۔ ”ایک پہیلی ہے۔ آپ سب کو بوجھنا ہے۔“

پھر وہ مراد کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”دن رات گلے پڑتا ہے..... کیا کہوں اچھا لگتا ہے سدا چپک کر رہتا ہے، ہاں جب پیچھا چھڑاؤ تب..... تب پیچھا چھوڑتا ہے..... بولو بولو..... وہ کون ہے؟“

ماں نے پیار سے بیٹی کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو تو پگلی کو..... کیسی پہیلی بجھوا رہی ہے؟ ذرا عقل نہیں ہے۔ سنتے ہو جی! جتنی جلدی ہو سکے اس کی شادی کر دو۔“

مونیکا نے کہا۔ ”اومی! باتیں نہ بناؤ پہیلی بوجھو۔“

ماں نے کہا۔ ”اور کون گلے پڑے گا..... تیرا ساجن۔“

مونیکا نے مراد کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ”میری بھی سمجھ میں یہی آتا ہے جو تمہاری ممی نے کہا ہے۔“

وہ بولی۔ ”اونو۔ ساجن نہیں..... گلے کا ہار۔“

دُرگا پرساد نے تالی بجا کر بیوی سے کہا۔ ”شانتا! کتنا صاف ستھرا جواب ہے اور تم بات کو کدھر لے جا رہی تھیں۔“

وہ مونیکا کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''میری بچی نادان ہے۔ اس کی شادی کی باتیں نہ کرو۔''

مونیکا مسکرا کر چور نظروں سے مراد کو دیکھ رہی تھی۔ شائستہ نے کہا۔ ''یہ بوڑھی ہوجائے گی تب بھی آپ اسے بچی ہی سمجھتے رہیں گے اور یہ ہمارے سر پر بیٹھی رہے گی۔ اس کے رشتے آرہے ہیں۔ آپ کب تک ٹالتے رہیں گے؟''

وہ بریف کیس اٹھا کر بولا۔ ''میں لیٹ ہو رہا ہوں۔ ابھی تم سے بحث نہیں کروں گا۔''

وہ وہاں سے جانے لگا۔ شائستہ نے کہا۔ ''آپ شام کو آئیں۔ آج فیصلہ ہوگا۔ رشتے پر رشتے آرہے ہیں اور پتا جی ہیں کہ لاڈلی بیٹی کو دودھ پیتی بچی سمجھ رہے ہیں۔''

وہ وہاں سے جاچکا تھا۔ شائستہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے... بیڈروم کی طرف جانے لگی۔ مراد نے مونیکا سے پوچھا۔ ''بھوک لگی ہے؟''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ مراد نے مسکرا کر پوچھا۔ ''فیڈر لا کردوں؟''

دودھ پیتی بچی ہنسنے لگی۔ وہ اپنے بیڈروم کی طرف جانے لگا۔ مونیکا اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری وہ کہاں ہے؟''

''وہ لندن جانے والی ہے۔ ٹکٹ لینے گئی ہے۔''

وہ خوش ہوکر تالی بجا کر بولی۔ ''اس کا مطلب ہے بہت دنوں کے بعد آئے گی؟''

وہ کمرے میں پہنچ کر بولا۔ ''ہاں۔''

وہ اچھل کر پھر تالی بجا کر بولی۔ ''پھر تو بڑا مزہ آئے گا۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم خوش کیوں ہو رہی ہو؟''

''ہم اکیلے میں خوب باتیں کریں گے۔ تمہاری وہ رہتی ہے تو ذرا دور رہنا پڑتا ہے۔ میں فری ہوکر بول نہیں سکتی۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''اچھا اب جاؤ۔ وہ آرہی ہوگی۔''

''ہاں جانا ہوگا لیکن وہ آئے گی تو گاڑی کی آواز آئے گی۔'' پھر وہ جاتے جاتے پلٹ کر بولی۔ ''مجھے چور نظروں سے دیکھتے رہتے ہو۔ میں کیا سمجھتی نہیں ہوں۔'' وہ پریشان ہوکر سوچنے لگا۔ 'مجھے کیا ہوگیا ہے؟ میں ایسا تو نہیں تھا؟' مرینہ خیالوں میں آکر ورق ورق دکھائی دینے لگی۔ ساقی ترے شراب کی یہ کیسی بدمستی ہے؟ واقعی وہ خرابی کی طرف چل پڑا تھا۔ ماروی تو فیصلہ سنا چکی تھی۔ اس فیصلے کے مطابق وہ بازی ہار گیا تھا لیکن ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ بچپن کی محبت ہے اس کا حسین وجود صرف اسی کے لیے ہے۔ کیا ہوا کہ مرینہ اس کی زندگی میں آگئی؟ اور کوئی آجائے تب بھی کیا قیامت آجائے گی؟ مرد پھر مرد ہے۔ ہر سمت میدان مارتا ہے لیکن پلٹ کر اپنی منکوحہ کے پاس آتا ہے اور اس کی منکوحہ صرف ماروی ہوگی اور کوئی نہیں ہوگی۔ وہ تو بس ایک ہی بات جانتا تھا کہ ماروی صرف اور صرف اس کے لیے پیدا ہوئی ہے۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں آئی تھی پھر دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد بستر پر آکر گر پڑی اور دھاڑیں مار مار کر بڑی دیر تک روتی رہی تھی۔ ذرا غبار نکلا تو چپ چاپ سسکیاں لیتی رہی۔

یہی ہوتا ہے۔ آنسوؤں کا دریا پہلے زور و شور سے بہتا ہے۔ پھر اس کی روانی میں اعتدال آجاتا ہے۔ صبح سے دوپہر ہوگئی تو آنسو رکتے رکتے تھم گئے۔

وہ اتنی دیر تک سوچتی بھی رہی تھی۔ یہ بات تو اچھی طرح سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کے باوجود گناہ کا مرتکب ہونے کے باوجود وہ نامراد اس کے دل میں گھسا ہوا ہے۔

وہ اس سے کبھی نفرت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ فی الحال اس سے لاتعلق ہونا چاہتی تھی۔ اس نے جو فیصلہ کیا تھا' اس کے مطابق مراد سے اپنا ہاتھ چھڑا کر محبوب کے ہاتھ میں دینا تھا اور یہ بہت ہی مشکل مرحلہ آن پڑا تھا۔ اب سوچ رہی تھی' کس دل سے ایسا کر سکے گی؟

دروازے پر دستک ہوئی پھر ختی چاچی کی آواز سنائی دی۔

''ماروی! دروازہ کھولو۔''

اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ختی نے اندر آکر کہا۔ ''صبح سے یہ وقت ہوگیا ہے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت بھی گزر گیا ہے۔ سائیں تمہارے انتظار میں بھوکے بیٹھے ہیں۔''

وہ چونک گئی۔ ''یا خدا..... اوہ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں سمجھ رہی تھی' چلے گئے ہیں۔''

''کیسے سمجھ رہی تھیں' کیا نہیں جانتیں کہ وہ تمہاری خاطر ساری دنیا کو بھول جاتے ہیں۔ اپنے گھر کا راستہ بھی انہیں یاد نہیں رہتا۔''

"ہاں وہ بہت اچھے ہیں۔ میں ان سے جتنی بھی محبت کروں کم ہے۔ لیکن... مراد نے یہ کیا کیا ہے چاچی...... میں نے جو فیصلہ کیا ہے' اس پر کیسے عمل کروں؟ اسے کیسے دل سے نکال دوں؟ تم ہی بولو چاچی...... کیا تم اسے دل سے نکال سکو گی؟"

"نہیں بیٹی! میں نے اسے بھی گود میں کھلایا ہے۔ دن رات اس کے دکھ سکھ میں شریک رہی ہوں۔ میں بھی پریشان ہوں' ہم کبھی اسے دل سے نہیں نکال سکیں گے۔"

"تم ماں کی طرح ہو۔ اولاد گمراہ ہو جائے' کوئی غلطی کرے یا بڑا گناہ کرے تو ماں اسے چھوڑتی نہیں ہے۔ کوئی عورت بھی اپنے گمراہ مرد کو نہیں چھوڑتی۔ اسے سیدھے راستے پر لانے کی کوششیں کرتی ہے۔ اس سے لڑتی جھگڑتی ہے لیکن اس سے الگ نہیں ہوتی۔ ہائے چاچی...... میں کیسے الگ ہو جاؤں؟"

وہ چاچی سے لپٹ گئی۔ گلے لگ کر رونے لگی۔ منی نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ "چپ ہو جاؤ' رونے سے بات نہیں بنے گی۔ ہم اپنے مراد کو نہیں چھوڑیں گے۔ کوئی بات بنائیں گے۔ آنسو پونچھو اور سائیں کے پاس چلو۔"

چاچی کی باتوں سے اطمینان ہوا۔ وہ آنسو پونچھتی ہوئی واش روم میں آئی۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر فریش ہو کر چاچی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگئی۔

سمیرا اور معروف جا چکے تھے۔ وہ محبوب کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے پوچھا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

ماروی نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ اتنی بڑی غلطی کر بیٹھے گا۔ یہ تو ہم کہہ رہے ہیں کہ اس نے غلطی کی ہے۔ ساری دنیا تو کہے گی کہ اس نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔"

وہ بولی۔ "گناہ کئی طرح سے ہوتے ہیں' کچھ لوگ عیاش ہوتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر گناہ گار بنتے ہیں۔ کچھ لوگوں سے مجبوراً گناہ سرزد ہو جاتے ہیں۔"

"میں نہیں مانتا کہ مجبور ہو کر گناہ کیا جاتا ہے۔"

"آپ مان لیں۔ مراد کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ مرینہ کیسی بدمعاش عورت ہے۔ اس نے پہلے تو مراد پر گولیاں چلا کر اسے زخمی کیا۔ پھر اسے ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ آپ سوچیں' وہ کس قدر مجبور ہو گیا تھا۔ ایسی حالت میں وہ کس طرح اس سے دور بھاگ سکتا تھا؟"

"میں پہلی بار سن رہا ہوں کہ ایک عورت نے ایسی زبردستی کی ہے۔ مرد عورتوں کے ساتھ ایسی زیادتی کرتے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "یہ بہت ہی مضحکہ خیز بات ہے۔ جو بھی سنے گا' وہ ہنسے گا۔ ماروی! اس کی باتوں میں نہ آؤ۔ سب ہی اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے بڑے ہی ڈرامائی انداز میں باتیں بناتے ہیں۔ تم ایک گناہ گار کے جھوٹ کو سمجھو۔"

وہ اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میری بات مانو' ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ وہ تمہاری ہمدردی اور محبت حاصل کرتے رہنے کے لیے محض باتیں بنا رہا ہے۔"

ایک ملازمہ بڑی سی ٹرالی میں کھانا لے آئی۔ ماروی نے محبوب کی طرف پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اگر مراد مجھ سے یہ کہتا تو میں بھی نہ مانتی۔ یہی کہتی کہ وہ اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے باتیں بنا رہا ہے۔ لیکن مجھے تو مرینہ نے بڑے فخر سے یہ بتایا ہے کہ اس نے کیسے زبردستی اسے زیر کیا ہے۔"

محبوب چپ چاپ کھانے لگا۔ ماروی نے کہا۔ "مرینہ کو تو کوئی شرم حیا نہیں ہے۔ اس نے تو جیسے بہت بڑی جنگ جیت لی ہے۔ وہ مراد کو جیت کر فخر کر رہی ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولے گی۔"

وہ لقمہ چباتے ہوئے بولا۔ "چلو۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہی ہے لیکن یہ مان لو کہ مراد تمہارے فیصلے کے مطابق اپنی پارسائی کھو چکا ہے' وہ تمہارے قابل نہیں رہا ہے۔"

وہ ذرا چپ رہی۔ لقمہ چباتی رہی پھر بولی۔ "عدالت میں بھی جب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ملزم نے اپنی مرضی سے جرم نہیں کیا ہے اسے گن پوائنٹ پر مجرم بنایا گیا ہے تو اسے الزام سے باعزت طور پر بری کر دیا جاتا ہے۔"

اس نے بڑی ٹھوس مثال دی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک چپ رہا۔ پھر بولا۔ "تمہارے دل میں کیا ہے؟ تم کیا چاہتی ہو؟"

وہ بولی۔ "آپ ہم سب سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ پہلے تو یہ مان لیں کہ اس نے اپنی مرضی سے غلطی نہیں کی ہے۔ آپ اپنے طور پر معلومات حاصل کریں تو معلوم ہو گا کہ وہ کسی خفیہ پناہ گاہ میں مرینہ کے رحم و کرم پر ہے۔ میں چاہتی ہوں' ہمیں اس کی مجبوری اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے اسے معاف کر دینا چاہیے۔"

وہ گلاس اٹھا کر ٹھہر ٹھہر کر پانی پینے لگا۔ ماروی بے چینی سے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ وہ بھی اس کا دل نہیں دکھاتا تھا۔ اس کی ہر بات مان لیا کرتا تھا۔ اسے اُمید تھی کہ اس کا دل رکھنے کے لیے وہ مراد کی ایک بڑی غلطی کو نظرانداز کردے گا۔

وہ گلاس کو میز پر رکھ کر بولا۔ ''جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا، تب سے اب تک تمہاری چاہت میں تمہاری طلب میں جیسے صدیاں گزار چکا ہوں۔ میرا ایک ایک دن ایک ایک رات کیسے گزری ہے، یہ میرا خدا جانتا ہے میں ہر نماز میں دعا مانگتا تھا کہ تم دل سے میری ہو جاؤ۔ آخر میری دعا قبول ہوئی۔ مراد نے تمہارے فیصلے کے خلاف بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ بے شک ہم اسے معاف کر دیں گے۔ تم ایمان سے بولو۔ اب کسی بھی روک ٹوک کے بغیر تم میری ہو۔ تمہیں میری شریکِ حیات بن جانا چاہیے۔ بولو مجھ سے نکاح قبول کرنا چاہیے یا نہیں؟''

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ''ہاں مگر..... میں دونوں کی بہتری چاہتی ہوں۔ میں آپ کی شریکِ حیات بننا چاہتی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مراد کو گمراہی سے بچانا چاہتی ہوں لیکن جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ میں نے آپ کو قبول کیا ہے اور اسے ٹھکرا دیا ہے تو وہ اور گمراہ ہو جائے گا۔''

''یعنی مجھے قبول نہیں کرو گی تو وہ راہِ راست پر آجائے گا؟''

''میں آپ کو دل سے قبول کر چکی ہوں۔ صرف اتنا چاہتی ہوں کہ آپ شادی اور نکاح کی جلدی نہ کریں۔ ہم ایک ماہ بعد شادی کریں گے۔ تب تک اسے موقع دیں گے کہ وہ مرینہ کے شکنجے سے اور جرائم کی دنیا سے نکل آئے۔''

محبوب نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر پوچھا۔ ''چلو مان لیتے ہیں، وہ جرائم کی دنیا سے اور مرینہ کے شکنجے سے نکل آئے گا..... تب کیا ہوگا؟''

''تب آپ تسلیم کریں گے کہ واقعی اسے جبراً گناہ گار بنایا گیا تھا اور وہ عادی مجرم نہیں ہے۔ اسی لیے تو جرائم کی دنیا سے نکل آیا ہے۔ پھر تو سیدھی سی بات ہے، آپ اسے نیک اعمال اور شرافت کا صلہ دیں گے؟''

''تم یہ کہہ رہی ہو کہ راہِ راست پر آنے کے بعد اس کا گناہ دھل جائے گا۔ تمہارے فیصلے کے مطابق پھر سے ہم دونوں ترازو کے دو پلڑوں کی طرح برابر رہیں گے۔ تم دونوں کو..... توجہ اور محبتیں دیتی رہو گی؟''

''ہاں۔ یہی ہونا چاہیے۔''

وہ خاموش رہا لیکن بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ ماروی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے کچھ بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''آپ چپ کیوں ہیں؟''

وہ اچانک ہی پھٹ پڑا... اس نے کھانے کی ٹرالی پر زور کا ہاتھ مارا تو کتنی ہی پلیٹیں، چمچے اچھل کر ادھر ادھر ہو گئے۔ وہ گرجتے ہوئے بولا۔ ''کیا بولوں؟ تم میرے صبر کو اور قوتِ برداشت کو کب تک آزماتی رہو گی؟ میں کب تک قربانیاں دیتا رہوں گا؟ کب تک جان و مال کا نقصان اٹھاتا رہوں گا اور اپنے دل کا خون کرتا رہوں گا؟

''تم نے کبھی محبت سے یہ سوچا نہیں کہ میں تمہاری خاطر کتنی بلندی سے پستی پر آگرا ہوں اور آج..... آج جبکہ مجھے صبر کا پھل مل رہا ہے، جبکہ تمہارے فیصلے اور ایمان کے مطابق تمہیں جیت چکا ہوں تو تم کتنی ناانصافی سے مجھے ہارنے کو کہہ رہی ہو۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو ماروی..... کہ کس طرح تم نے میری محبت کو عذاب بنا دیا ہے اور مراد کے پیار کو ثواب بنا رہی ہو۔

''تمہارے پاس انصاف کا وہ ترازو ہی نہیں ہے جس کے پلڑوں کو برابر رکھ سکو۔ تم اسے راہِ راست پر لانا چاہتی ہو۔ یہ بہت بڑی نیکی ہوگی۔ لیکن یہ نیکی کرنے کے لیے تم میرا گلا کاٹ رہی ہو۔''

وہ اس کی طرف سر جھکا کر بولا۔ ''کاٹو...... جب دل کٹ رہا ہو تو گردن کیا چیز ہے؟ اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی ہے کہ بچپن کی محبت دل میں گھسی ہوئی ہے وہ کبھی نہیں نکلے گی۔ تم مجھے محبت جیسی انمول چیز نہیں دے رہی ہو صرف میرے احسانوں کا صلہ دے رہی ہو۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ مجھ سے محبت نہیں کر رہی ہو۔ دکانداری کر رہی ہو۔

''آج میں اقرار کرتا ہوں کہ گدھا ہوں۔ پرلے درجہ کا گدھا۔ کسی دن وہ گدھا گاڑی والا مجھ پر بیٹھ کر تمہیں دلہن بنا کر لے جائے گا اور میں دیکھتا رہ جاؤں گا۔''

وہ بول رہا تھا اس کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کیسی ناقابلِ برداشت تکلیف میں مبتلا ہو کر بول رہا ہے۔

ماروی سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے دھاروں آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ کچھ نہیں بول رہی تھی۔ محبوب اتنی کھری اور کھری باتیں کہہ رہا تھا کہ جواباً کچھ بول نہیں سکتی تھی۔

چاچی نے کمرے میں آکر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''سائیں! چپ ہو جائیں۔ آپ بہت اچھے، بہت سچے ہیں۔''

وہ ماروی سے بولی۔ ''بیٹی! یہ تسلیم کرلو کہ سائیں جتنی

سچائی سے تمہیں چاہتے ہیں۔ تم اتنی سچی محبت نہیں کرتی ہو۔ ہاں، مگر خدا سے ڈرتی ہو۔ اس لیے ایک فرشتے کو محبت کے نام پر احسانات کا صلہ دے رہی ہو۔"

ماروی نے کہا۔ "میں تسلیم کرتی ہوں۔ میرا ضمیر کہتا ہے کہ محبوب کو احسانات کے بدلے محبت دینا چاہیے۔

"میں نے ان سے بہت کچھ لیا ہے تو محبت دے رہی ہوں۔ یہ لین دین والا سودا ہے اور یہ سراسر دکانداری ہے۔ مراد سے کوئی لین دین نہیں ہے۔ وہ راہِ راست پر رہے یا گمراہ ہوتا رہے دل سے نہیں جائے گا۔

"محبوب! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میرے فیصلے کے مطابق تم جیت چکے ہو۔ تم سے ناانصافی نہیں کروں گی۔ تم سے ہی نکاح قبول کروں گی۔ بس آخری بار اتنی سی اجازت دے دو کہ اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کروں۔ صرف ایک ماہ تک انتظار کرو۔ اس کے بعد جس دن کہو گے تمہاری منکوحہ بن جاؤں گی۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹہلنے کے انداز میں ذرا دور جا کر رک گیا پھر پلٹ کر بولا۔ "تم نے سچ کہہ دیا ہے کہ دل مراد کا ہی رہے گا۔ میں بھی صاف صاف کہہ دوں کہ دیوانہ ہوں دیوانہ رہوں گا۔ تمہاری طلب سے باز نہیں آؤں گا۔ ٹھیک ہے کہ دل مراد کا ہے۔ میں تمہیں دل کے بغیر حاصل کروں گا۔ میری خود اعتمادی یہ ہے کہ اپنے پیار کی سچائی سے ایک دن تمہارے دل میں بھی جگہ بنا لوں گا۔

"تم کہتی ہو میں آخری بار تمہاری بات مان لوں اور مراد کو راہِ راست پر لانے کی اجازت دوں۔ چلو جہاں اتنے عرصے تک تمہارا انتظار کیا، وہاں ایک مہینا اور سہی مجھے یقین ہے۔ یہ ایک ماہ تو کیا، تم ساری زندگی کوششیں کرتی رہو گی تب بھی اس کا قبلہ درست نہیں کر سکو گی۔

"دیکھو اس کے بعد پھر اپنے وعدے سے نہ پھرنا۔ میں تمہاری بات مان رہا ہوں۔ آج دو تاریخ ہے یاد رکھو۔ ٹھیک ایک ماہ بعد اگلے ماہ کی دو تاریخ کو برات لے کر آؤں گا۔"

یہ کہتے ہی وہ پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ ماروی دوڑتی ہوئی باہر آئی۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ رہا تھا۔ اس نے قریب آ کر کہا۔ "میں رات کے کھانے میں انتظار کروں گی۔"

وہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی بتا دو کس رشتے سے انتظار کرو گی؟"

"غصہ تھوک دیں۔ آپ کی ہونے والی شریکِ حیات ہوں۔ نہیں آئیں گے تو بھوکی رہوں گی۔"

وہ ایسا ہی پیار چاہتا تھا۔ غصہ ایکدم سے ہوا ہو گیا۔ اس نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آئی لو یو۔"

پھر وہ کار کو آگے بڑھا کر دور ہوتا چلا گیا۔ ماروی وہاں کھڑی دیکھتی رہی۔ جب کار نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ منی چاچی دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ چاچی کے ساتھ اندر آتے ہوئے بولی۔ "ایسا چاہنے والا کوئی نہ ہو گا آج پہلی بار غصہ دکھایا ہے لیکن بڑی محبت سے گئے ہیں، رات کو آئیں گے۔"

پھر وہ سینٹر ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کو اٹھا کر بولی۔ "مراد کا کیا کروں؟ پہلے اور طرح کا مجرم تھا اب گناہ گار بھی ہو گیا ہے۔"

وہ نمبر پنچ کرتے ہوئے بولی۔ "چاچی! کیا میں اسے سیدھے راستے پر لا سکوں گی؟ کیا وہ سدھر جائے گا؟"

"ارادے نیک ہوں تو اللہ مہربان ہوتا ہے۔ شیطانوں جیسی حرکتیں کرنے والے بھی انسان بن جاتے ہیں۔ تم کوشش کرو بیٹی!"

اس نے نمبر پنچ کرنے کے بعد فون کو کان سے لگایا۔ پھر انتظار کرنے لگی۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔

☆☆☆

مرینہ دہلی کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہاں پہنچتے ہی کال کرے گی۔ وہ واش روم میں تھا اور بیڈ پر رکھے ہوئے فون سے کالنگ ٹون چیخ رہی تھی۔

وہ تولیے سے منہ ہاتھ پونچھتا ہوا کمرے میں آتے ہوئے بولا۔ "آ رہا ہوں۔ جسٹ اے منٹ! ابھی آ رہا ہوں۔ جانتا ہوں دہلی پہنچ گئی ہو۔" اس نے بیڈ کے پاس آ کر فون کو اٹھا کر دیکھا تو دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ ننھی سی اسکرین پر ماروی کا نام تھا۔

وہ جلدی سے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر بولا۔ "ہائے ماروی! تم ہی کال کر رہی ہو نا؟ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟"

وہ سرد لہجے میں بولی۔ "میں ڈوب رہی ہوں مراد...... مجھے سچ سچ بتاؤ۔ ابھی تم کہاں ہو؟ سچ بولو تمہارے ساتھ صرف مرینہ ہے یا اور لوگ بھی ہیں؟ خدا کے لیے سچ بولو کیا تم واقعی زخمی ہو۔ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو؟ اور...... اور کیا اس عورت کے رحم و کرم پر ہو؟

"مراد! ابھی میں اہم باتیں کرنے والی ہوں۔ مجھ سے سچی محبت کرتے ہو تو ایک ذرا جھوٹ نہ بولو۔"

”میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ یہاں ایک بہت دولتمند شخص کی کوٹھی میں مرینہ کے ساتھ چھپا ہوا ہوں۔ اس کوٹھی میں اس شخص کی بیوی، ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ مجھ پر شبہ نہ کرو۔ میں مرینہ کے ساتھ تنہا نہیں رہتا ہوں اور اب وہ بھی نہیں ہے۔ میرے اطمینان کے لیے میرا کام کرنے آج رات کراچی جارہی ہے۔“

”وہ تمہارا کیا کام کرنے یہاں آرہی ہے؟“

”تم جانتی ہو۔ وہ کیسا شیطانی کھیل کھیلنے والی عورت ہے۔ وہ وہاں پہنچ کر محبوب کو تم سے دور کردے گی۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔ تم ہمارے معاملات میں اس بدمعاش عورت سے کام لے رہے ہو؟ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟“

وہ پریشان ہوکر بولی۔ ”یا اللہ.....! تم سچ مچ مجرم بن گئے ہو۔ مجرموں کی طرح احسان فراموش ہوکر ایک فرشتے کا گلا کاٹنا چاہتے ہو۔ شرم کرو۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”وہ فرشتہ نہیں ہے۔ بہروپیا ہے۔“

”اگر مجھے عزت آبرو سے رکھنے والا فرشتہ نہیں ہے تو پھر دنیا والوں کی طرح تم بھی بولو کہ میں ان کی داشتہ ہوں۔“

”بکواس مت کرو۔ تم بکنے والی لڑکی نہیں ہو۔“

”ایک مدت سے وہ کھلا رہے ہیں میں کھا رہی ہوں۔ وہ پہنا رہے ہیں، میں پہن رہی ہوں۔ کیا یہ سب کچھ لیے دیے بغیر ہورہا ہے۔ چلو اب اپنی زبان سے بولو کہ وہ فرشتہ نہیں ہیں۔ میں ایک شیطان کے ساتھ رہتی ہوں۔“

وہ پھنس گیا تھا۔ کچھ بول نہیں پارہا تھا۔ محبوب کو... بدمعاش اور مکار کہنے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کی ماروی ایک بدمعاش کے سائے میں بے داغ نہیں رہی ہے۔

”میں مانتا ہوں وہ فرشتہ ہیں۔ لیکن ابھی حالات کچھ اور ہوگئے ہیں۔ میرے گناہ گار بننے کی وجہ سے انہیں بہت اچھا موقع مل گیا ہے۔ اب وہ تمہارے پاس آتے جاتے رہیں گے اور مجھے گناہ گار اور بدمعاش کہہ کر طرح طرح کی باتیں بنا کر تمہیں میرے خلاف بھڑکاتے رہیں گے۔“

”میں کوئی نادان بچی نہیں ہوں۔ تم رقیب بن کر ایسا سوچ رہے ہو۔ وہ تمہارے خلاف نہیں بھڑکا رہے ہیں۔ تمہارے دماغ میں ایسی فضول باتیں کیوں آرہی ہیں؟ یہ تو تمہیں ماننا پڑے گا کہ تمہارے گناہ گار بننے کے بعد وہ میرے حقدار ہوگئے ہیں۔“

وہ چیخ کر بولا۔ ”میرے سوا کوئی تمہارا حقدار نہیں ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”چلاؤ مت۔ میں نے محبوب کو ایک ماہ کے لیے ٹال دیا ہے۔ ان سے کہا ہے کہ تم ایک ماہ کے اندر جرائم کی دنیا سے اور مرینہ کے شکنجے سے نہیں نکلو گے اور پہلے کی طرح... پُرامن اور شریفانہ زندگی نہیں گزارو گے تو آج سے ٹھیک ایک ماہ بعد وہ تاریخ کو ان سے نکاح قبول کرلوں گی۔“

”نہیں ماروی! تم ایسا نہیں کرو گی۔ میں مر جاؤں گا۔“

”خدا تمہیں سلامت رکھے۔ اگر میری بات مانو گے تو میں ان سے شادی نہیں کروں گی۔“

”میں تمہاری ہر بات مانوں گا، بولو کیا کہتی ہو۔“

”میں نے دعوے سے کہا ہے کہ تم ایک ماہ میں تمام شیطانوں سے پیچھا چھڑا کر راہ راست پر آجاؤ گے۔

”اب تو یہ تم پر ہے۔ مجھ سے محبت کرتے ہو تو جو میں نے کہا ہے وہ کرکے دکھاؤ۔“

”تم کہتی ہو تو ضرور جرائم کی دنیا سے نکل آؤں گا۔“

”تو سب سے پہلے یہ کرو کہ مرینہ کو یہاں آنے سے روکو۔ وہ یہاں آئے گی اور محبوب کو ذرا بھی نقصان پہنچائے گی تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ تم جلد ہی میری موت کی خبر سنو گے۔“

”ایسی باتیں نہ کرو۔ مریں کے تمہارے دشمن۔ وہ ایک ماہ تک تم سے شادی کی بات نہیں کرے گا۔ میں بھی ایک ماہ تک اسے نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ ابھی مرینہ کو وہاں جانے سے روک دوں گا۔ تم وعدہ کرو۔ میری ہو، میری ہی رہو گی۔“

”یہ تمہارے اعمال پر ہے۔ مجھے محبوب کی شریک حیات بننے سے روکنا چاہتے ہو تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ جلد سے جلد گناہوں کی دنیا سے نکل آؤ۔ اگر ایسا نہ کرسکے تو گویا مجھ سے دشمنی کرو گے۔ مجھے اپنے ہی ہاتھوں سے محبوب کی جھولی میں ڈالو گے۔“

”تم نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ جرائم کی دلدل میں دھنسنے والے آسانی سے نکل نہیں پاتے۔ کوشش کرنے سے کامیابی ضرور ہوتی ہے لیکن اچھا خاصا وقت لگتا ہے۔

”پھر یہ کہ میں زخمی ہوں۔ پتا نہیں یہ زخم کب بھریں گے اور میں کب اس خفیہ پناہ گاہ سے نکل پاؤں گا۔“

”تم اللہ کا نام لے کر پوری نیک نیتی سے توبہ کرو اور سب سے پہلے مرینہ سے نجات حاصل کرو۔ عورتوں سے دور رہو گے تو اللہ پاک ضرور کامیابی عطا کرے گا۔ میں فون بند کررہی ہوں۔ بعد میں کال کروں گی۔ ابھی یہ سمجھ لو اور لکھ

لو کہ تم مجرمانہ طور سے اور بندوق کے زور سے محبوب کو مجھ سے جدا نہیں کرسکو گے۔ جو گناہ سرزد ہو گیا ہے اسے بہترین اعمال سے دھو ڈالو۔ راہِ راست پر آجاؤ گے تو میں محبوب کی دلہن نہیں بنوں گی۔ تمہاری بھی نہیں بنوں گی۔ میں نے ان سے بھی کہا ہے۔ تم سے بھی کہہ رہی ہوں۔ میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دوں گی۔ دونوں کی محبوبہ بن کر رہوں گی۔ دور رہ کر بھی مجھ سے فون پر ملتے رہنا ہے تو اپنی ماروی کی قسم کھاؤ اور اسی لمحے سے بدل جاؤ۔

''مراد...... اخدا کے واسطے میرے بچپن کے مراد علی منگی بن جاؤ۔ ورنہ یاد رکھو۔ تم فون پر بھی میری آواز بھی سن نہیں سکو گے۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ سر جھکا کر اپنے فون کو دیکھنے لگا۔ پتا نہیں کب زخم بھرنے والے تھے۔ پتا نہیں کب پاکستان جاسکتا تھا۔ تب تک وہ فون ہی اسے ماروی تک پہنچاتا رہتا۔

ابھی ماروی نے سب سے اہم بات یہ کی تھی کہ وہ ایک ماہ کے اندر اپنے بہترین اعمال سے اسے جیت سکے گا۔ مجرمانہ پلاننگ پر عمل کر کے محبوب کو اس سے جدا نہیں کر سکے گا۔ ابھی سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کے لیے بڑی پیچیدگیاں تھیں۔ فی الحال مرینہ کو وہاں جانے سے روکنا تھا۔

اس نے فون پر اس کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر اس کی آواز سنائی دی۔ ''میں ابھی پہنچی ہوں۔ دہلی ائرپورٹ کے ایک ریسٹورنٹ میں مسٹر ہڈسن کے ساتھ اسنیکس لے رہی ہوں۔''

مرینہ! تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔''

''مسٹر ہڈسن بھی بہت ضروری باتیں کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مجھے فوراً لندن جا کر اپنی ڈیوٹی کا چارج لینا چاہیے۔ مجھے وہاں سے واپسی پر کراچی جانا چاہیے۔ ابھی نہ جاؤں۔''

مراد نے کہا۔ ''واہ کیا بات ہے۔ میں ابھی یہی کہنے والا تھا کہ کراچی نہ جاؤ۔''

وہ حیرانی سے بولی۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟''

''ابھی ماروی سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ فی الحال محبوب سے شادی نہیں کرے گی۔ محبوب اسے میرے خلاف نہیں بھڑکائے گا۔ میں بھی فی الحال اس کے خلاف کچھ نہیں کروں گا۔ ہمارے درمیان یہ بات ہو چکی ہے۔ اس لیے تم وہاں نہ جاؤ۔''

''تو پھر لندن چلی جاتی ہوں۔ وہاں کچھ روز ڈیوٹی کروں گی پھر بھرپور قانونی قوتوں کے ساتھ واپس آؤں گی اور تو اور تمہیں بھی مکھن کے بال کی طرح یہاں سے نکال کر لے جاؤں گی۔ کوئی تمہیں روک نہیں سکے گا۔ دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔''

''اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی مرینہ! تم جاؤ اور پوری قوت کے ساتھ واپس آؤ۔''

وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹ ایجنٹ ہیلری ہڈسن سے اہم باتیں کر رہی تھی۔ اور اپنے ڈیپارٹمنٹ کے متعلق تازہ ترین معلومات حاصل کر رہی تھی۔ اس لیے مراد سے زیادہ بات نہیں کی۔ رابطہ ختم کر دیا۔

مراد نے فون کو ایک طرف رکھتے ہوئے سوچا۔ ''یہ میں نے اچھا کیا کہ مرینہ کو وہاں جانے سے روک دیا ہے۔ اگر وہ وہاں پہنچ کر محبوب کو نقصان پہنچاتی تو ماروی اس سوکن بن جانے والی عورت کو کبھی برداشت نہ کرتی۔ مجھ سے اور زیادہ بدظن ہو جاتی۔ ماروی نے مجھے بہت بڑی آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا' میں ایک ماہ کے اندر دشمنی کرنے والے مجرموں سے کیسے پیچھا چھڑا سکوں گا؟

''یہ ممکن نہیں ہے۔ اوّل تو یہاں سے باہر نہیں جاسکوں گا۔ انٹیلی جنس اور آرمی والے مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ پھر یہ کہ میں لنگڑا کر چلتا ہوں۔ دوڑ نہیں سکتا۔ ہاتھوں میں گن لے کر جنگجو نہیں بن سکوں گا۔ مجھے یہ باتیں ماروی کو اچھی طرح سمجھانی تھیں۔ جب یہاں سے نکل ہی نہیں پاؤں گا تو کس طرح اس کے پاس پہنچوں گا اور ثابت کروں گا کہ جرائم کی دنیا سے نکل آیا ہوں۔''

وہ اٹھ کر ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا۔ ''دراصل میرے گناہ گار بننے کی وجہ سے ماروی کو دلی صدمہ پہنچا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اسے یقین دلانا ہوگا کہ مرینہ سے اب میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں یہ آسان ہے۔ میں کہہ دوں گا' وہ لندن واپس جاب کے لیے چلی گئی ہے۔ اب ہمیشہ وہیں رہے گی۔ میں بھی اسے قریب نہیں آنے دوں گا۔''

اس کے ضمیر نے کہا۔ ''کیوں جھوٹ بولو گے؟ وہ جلد ہی قانونی قوت حاصل کر کے آئے گی اور تم دشمنوں سے بہ آسانی نمٹنے کے لیے اسے گلے لگاؤ گے۔''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ ''ہاں۔ پاکستان میں عالی جناب جیسے اور بھی دشمن بڑے وسیع ذرائع کے مالک ہوں گے۔ ان سب سے نمٹنے کے لیے مرینہ کے قانونی ذرائع اور اختیارات میرے کام آئیں گے۔

"ماروی کہتی ہے مجھے ہوس پرست نہیں ہونا چاہیے۔ پارسا رہنا چاہیے لیکن دکھوں سے تنگ آ کر... دوران مرینہ ساتھ رہے گی۔ میں پارسا کیسے رہوں گا؟"

ذہن میں بات آئی کہ ابھی ماروی کو کال کرے۔ اسے پوری تفصیل سے اپنی مجبوریاں بتائے۔ جب تک زخم نہیں بھریں گے، وہ مجبوراً مرینہ کے ساتھ رہے گا پھر ایک ماہ کے اندر کیسے ثابت کرے گا کہ پارسائی کی زندگی گزار رہا ہے؟

اس نے فون اٹھایا پھر کال کرنے سے پہلے سوچنے لگا۔ "اگر یہ کہوں گا کہ مرینہ کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوں تو پھر وہ ایک ماہ کی دی ہوئی مہلت ختم کر دے گی۔ اس نے محبوب سے میرے لیے جو دعویٰ کیا ہے وہ کھوکھلا ثابت ہو جائے گا۔

"جب میں اپنے بہترین اعمال کا ثبوت نہیں دے سکوں گا تو وہ ایک ماہ کی مہلت کوئی معنی نہیں رکھے گی پھر تو چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہوگا۔ وہ کل ہی محبوب کی دلہن بن جائے گی۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "نہیں مجھے فون پر ماروی سے سچ نہیں بولنا چاہیے۔ ابھی ایک ماہ تک اس نے شادی ٹال دی ہے۔ یہ میرے لیے اچھا ہے میرے لیے سوچنے سمجھنے کا، جھوٹ اور سچ بول کر ماروی کو اپنا بنائے رکھنے کا وقت مل رہا ہے۔ میں بہت مجبور ہوں۔ موجودہ حالات میں کیا کروں؟ اپنی ماروی کو چالبازی سے ہی جیتنا ہوگا۔"

فون سے کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے اٹھا کر ننھی سی اسکرین کو دیکھا۔ ماروی پکار رہی تھی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ "ہاں بولو ماروی؟"

"میں کیا بولوں؟ پہلے تم بولو مرینہ کو یہاں آنے سے روک رہے ہو یا نہیں؟"

"میں نے اسے منع کر دیا ہے۔ ویسے بھی لندن سے اچانک اسے کال کیا گیا ہے اسے فوراً وہاں اپنی ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔ وہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہے۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟ وہ چلی گئی ہے نا؟"

"تمہاری قسم جا چکی ہے۔ اب یہاں نہیں آئے گی وہاں اپنے فرائض ادا کرتی رہے گی۔"

"خدا کا شکر ہے۔ تمہارے حق میں بہتر ہو رہا ہے۔ اب تو میں محبوب سے کہہ سکوں گی کہ تم مرینہ سے تو کیا کسی بھی عورت سے بات تک نہیں کرتے ہو۔"

"تم یقین کرو میں قسم کھا چکا ہوں۔ آئندہ عورتوں سے بات کرنے سے پہلے ہی وہ ہار کر ان کا...

اسی وقت مونیکا کی سریلی آواز سنائی دی۔ وہ ایک فلمی گیت گنگناتی ہوئی آ رہی تھی۔ ماروی نے پوچھا۔ "یہ... یہ تو کسی لڑکی کی آواز ہے؟ یہ کون گنگنا رہی ہے؟"

وہ پریشان ہو گیا۔ جھوٹ اسی طرح کھلتا ہے۔ وہ جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا۔ "یہ... یہ مونیکا ہے۔ میں جن کے بنگلے میں چھپا ہوا ہوں، یہ ان کی بیٹی ہے۔ ابھی دس برس کی ہے۔ ٹیوشن پڑھ کر آ رہی ہے۔ اسے گانے کا بہت شوق ہے۔"

ماروی نے کہا۔ "اسے فون دو۔ میں بات کروں گی۔"

وہ اور پریشان ہو گیا۔ بھید کھلنے والا تھا۔ وہ اب نہیں گنگنا رہی تھی۔ چپ ہو گئی تھی۔ مراد نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ اس نے فون پر ہاتھ رکھا پھر مونیکا سے کہا۔ "یہ میری ہونے والی بیوی ہے۔ اس کا شبہ دور کرو۔ یہ بتاؤ، کیا دس برس کی بچی بن کر بول سکتی ہو؟"

وہ کمسن بچی کی آواز اور انداز میں بولی۔ "ہاں انکل! میں دودھ پیتی بچی بن کے بھی بول سکتی ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "اچھا کمرے سے باہر جاؤ اور دور سے گنگناتی ہوئی آؤ۔"

وہ ایک بچی کی آواز اور لہجے میں بولی۔ "انکل...... ! یہ کیا چکر ہے۔ اپنی بیوی کو الو بنا رہے ہیں؟"

"کوئی چکر نہیں ہے۔ وہ ذرا شکی ہے۔ اس کا شک دور کر رہا ہوں۔ پلیز تم باہر جاؤ۔ میں آواز دوں گا۔"

وہ باہر چلی گئی۔ مراد نے فون پر کہا۔ "ہیلو ماروی! میں نے اسے بلایا ہے۔ وہ آ رہی ہے۔"

پھر اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے آواز دی۔ "مونیکا...... ! کہاں ہو، آ بھی جاؤ۔"

ماروی نے اپنے فون سے سنا پھر وہی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ مراد اس سے کہہ رہا تھا۔ "آؤ مونیکا! یہ میری ہونے والی دھرم پتنی ہیں۔ ان سے بات کرو۔"

چند لمحوں کے بعد اس کی آواز سنائی دی۔ "نمستے آنٹی! میں مونیکا بول رہی ہوں۔ انکل آپ سے بات کرنے کو کہہ رہے ہیں۔ میں ٹھیک سے بات نہیں کر سکوں گی مگر ہاں گانا سنا سکتی ہوں۔ آپ بتائیں میں کیسا گاتی ہوں۔"

وہ ایک فلمی گیت گانے لگی۔ ماروی نے تھوڑی دیر تک سننے کے بعد کہا۔ "واہ تم تو بہت اچھا گاتی ہو۔ ماشاء اللہ تمہاری آواز میں بہت مٹھاس ہے۔"

''آنٹی پتا ہے میں اسی مٹھاس کے کارن گانا نہیں گاتی۔ مکھیاں آنے لگتی ہیں۔''

ماروی کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ ''آنٹی! میں جاؤں؟''

وہ بولی۔ ''ہاں جاؤ۔''

مونیکا نے مراد کو فون دیا۔ اس نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا پھر بولا۔ ''ہاں ماروی! بولو یہ بچی کیسی ہے؟ مجھے تو اپنی باتوں سے ہنساتی رہتی ہے۔''

اسی وقت مونیکا نے دوپٹے کا پردہ اُٹھا دیا۔ مراد نے بچی کہا تھا۔ اچانک جوان ہوگئی تھی۔

ماروی نے کہا۔ ''یہ بچی بڑی شوخ اور شریر ہے۔''

''تمہارا شبہ تو دور ہوگیا ہے نا؟''

''ہاں میں مطمئن ہوں۔''

''تم یقین کرلو۔ مرینہ لندن چلی گئی ہے اور یہاں گھر میں کوئی جوان لڑکی نہیں ہے۔''

ایسے ہی وقت مونیکا قریب ہوکر اس سے لگ گئی۔ اسے چار سو چالیس کا جھٹکا لگا۔ وہ شعلہ بدن کہہ رہا تھا۔

''سیّاں موہے جھوٹے بے ایمان۔''

ماں اپنے کمرے میں بیمار پڑی تھی۔ باپ گھر میں نہیں تھا۔ بھائی کھیلنے گیا تھا جانے کتنے دنوں کے لیے مرینہ کی دیوار گر چکی تھی۔ وہ پہلی بار آکر بڑی بے باکی سے بدن کو بدن سے متعارف کرا رہی تھی۔

وہ بھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''مم۔ ماروی مم۔ میں پھر کسی وقت بات کروں گا۔''

وہ حیرانی سے بولی۔ ''یہ تمہاری آواز کیوں لرز رہی تھی۔ تمہیں اچانک کیا ہوگیا ہے؟''

مونیکا نے پنجوں کے بل ذرا اونچی ہوکر اس کے چہرے سے چہرے کو ملایا۔ وہ بولا۔ ''میری طبیعت اچانک خراب ہو رہی ہے۔ جب سے گولیاں لگی ہیں۔ تب سے کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے۔ سر چکرانے لگتا ہے میں پھر کسی وقت بات کروں گا۔''

اس نے جواب سنے بغیر فون کا سوئچ آف کیا اور اسے بیڈ پر پھینک دیا پھر اسے دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا۔

یہ عورتیں کیا ہوتی ہیں؟

اچانک ہی قدموں تلے آکر پھسلنے پر مجبور کردیتی ہیں۔

ماروی نے پہلے ہی سمجھایا تھا اس پھسلن کی طرف قدم نہ بڑھائے جو قدموں تلے آکر اوندھے منہ گرا دیتا ہے۔ گناہ کیا ہے؟ دنیا کا سب سے زیادہ لذت پہنچانے والا پھل ہے۔ اسے ایک بار چکھنے والا بار بار کھانے کے لیے پاگل ہوتا رہتا ہے۔ گناہ کچھ سوچنے سمجھنے اور یاد کرنے کے قابل نہیں چھوڑتا۔ وہ گناہوں سے دامن بچانے والا صرف اپنی ماروی کو طلب کرنے والا مرینہ کا پڑھایا ہوا سبق پڑھتا چلا گیا۔ جب وہ چلی گئی تب اس نے ماروی کو یاد کیا۔

وہ بچپن کی محبت تھی۔ یاد کرتے ہی پیار کی پاکیزگی کے ساتھ آجاتی تھی۔ اس نے آتے ہی بڑے صدمے سے اسے دیکھا پھر کہا۔ ''تم اتنے غلیظ ہوگئے ہو کہ پاکیزگی تمہارے قریب آ ہی نہیں سکتی پھر میں کیسے آؤں؟

''بچپن کی معصومیت اور جوانی کا وعدہ کہ ہم پاک رہیں گے۔ کہاں ہے وہ محبت کی داستان' جو صاف ستھری تھی۔

''کیا تم ابھی اس بستر سے اٹھ کر قبلہ رو ہوکر سجدہ کرسکو گے؟ جب سجدے سے دور ہوئے تو خدا سے دور ہوئے اور جب خدا تمہارا نہ ہوا تو ماروی تمہاری کیسے ہوگی؟

''اگر اب بھی تمہارے اندر تھوڑا سا ایمان ہے تو ایمانداری اور انصاف سے مان لو کہ تم مجھے ہار گئے ہو۔ اب مجھ پر صرف محبوب کا حق ہے۔

''خدا سے ڈرو۔ دل میں ایمان رکھ کر فون اٹھاؤ۔ مجھے کال کرو اور مجھ سے سچ سچ کہہ دو کہ میری لاعلمی میں مجھے دھوکا دے رہے ہو اور گناہوں کی دلدل میں دھنستے چلے جا رہے ہو۔ وہ مراد میرا سچا عاشق مر چکا ہے۔ کیا یہ جھوٹا مکار عاشق ابھی مجھے کال کرے گا؟''

وہ خیالی اسکرین سے گم ہوگئی۔ خیالوں میں کہہ دیا کہ اس کے جھوٹ فراڈ اور بے حیائی سے واقف ہے۔ اگر وہ بچپن کی ماروی کو اب بھی دل و جان سے چاہتا ہے تو فون اٹھائے اور سچ اگل دے۔

وہ بیڈ پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ سچ بول کر اسے رقیب کی دلہن نہیں بنا سکتا تھا۔ پریشان ہوکر ایڑیاں رگڑتے ہوئے بستر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''کیا کروں؟ وہ ایک عورت لذتوں سے آشنا کرگئی۔ اب دوسری آگئی ہے۔ عیاشی کا سلسلہ شروع ہوچکا ہے اور بھی آئیں گی تو لذتوں میں گرفتار ہوتا رہوں گا۔ میرے اندر رقصِ ابلیس کا آغاز ہوچکا ہے۔

''ماروی! میں تم سے کہتا ہوں کسی طرح مجھے یہاں سے نکالو اور محبوب کو اس چار دیواری میں پہنچاؤ۔

''محبوب پر ناز ہے تو میرے زخم اسے دو۔ ہاہر دشمنوں کی فوج کھڑی کردو۔ اسے میری طرح اٹھنے اور بھاگنے کے قابل نہ رہنے دو۔ پھر دیکھو گی کہ وہ بھی پارسا نہیں رہ

سکے گا۔ تم جانتی ہو میں ایسا نہیں تھا' جیسا ہو گیا ہوں۔ محبوب بھی ایسا نہیں ہے لیکن میرے حالات سے دو چار ہو کر ایسا ضرور ہو جائے گا۔

"لیکن تم نہیں مانو گی۔ رقیب مجھ پر کیچڑ اچھالتا رہے گا۔ تمہیں بہکاتا رہے گا۔ دنیا والے نصیحتیں کرتے رہیں گے لیکن کوئی مجھے دلدل سے نہیں نکالے گا۔

"اب بے حیا گناہ گار اور خطرناک مجرم بن ہی گیا ہوں۔ مجھے افسوس ہے۔ میں ابھی تم سے جھوٹ بولتا رہوں گا۔ حالات مجبور کر رہے ہیں۔ تمہیں محبوب سے دور رکھنے کے لیے پارسا بن کر دھوکا دیتا رہوں گا۔ میرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ مجھے حالات کی بھٹی میں جلنے دو' تپنے دو۔ میں کندن ہو جاؤں گا۔

"خدا دیکھ رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں اپنی مرضی سے گناہ گار نہیں بنا۔ مجھے جبراً بنایا گیا ہے۔ اس کے باوجود سزائیں پا رہا ہوں۔

"میرا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو آزماتا ہے۔ وہ معبود میرے اندر ضرور تبدیلی لائے گا۔ مجھے جھوٹ' فریب اور گناہوں سے بچائے گا۔ ابھی میں بدترین حالات سے گزر رہا ہوں تو یقیناً آزمائشوں سے گزر رہا ہوں۔"

☆☆☆

محبوب ریوالونگ چیئر پر آہستہ آہستہ ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا۔ آدمی الجھا ہوا ہو' اپنی سوچ اپنا فیصلہ ایک جگہ نہ ہو تو وہ بیٹھے بیٹھے بھی ادھر سے ادھر بھٹکتا رہتا ہے۔ وہ ماروی کا دل رکھنے کے لیے راضی ہو گیا تھا کہ مراد کو ایک ماہ تک آزمایا جائے گا۔ اس کے بعد وہ دو تاریخ کو برات لے کر آئے گا اور اسے دلہن بنا کر لے جائے گا۔ وہ ماروی کی بات مان کر خود کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ اگر مراد ایک ماہ کے اندر... راہِ راست پر آ جاتا تو اس کے گناہ معاف ہو جاتے بلکہ اسے معاف کر دیا جاتا تو وہ پھر سے پارسا کہلاتا۔

سمیرا اور معروف میز کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ معروف نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دو تاریخ کو برات نہیں لے جاؤ گے' مراد کے گناہ دھل جائیں گے تو دلہن بننے والی سے محروم ہو جاؤ گے۔"

محبوب نے کہا۔ "ہاں مگر ایسا نہیں ہوگا۔ وہ میری شریکِ حیات ضرور بنے گی۔"

"تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ مراد ناکام رہے گا؟"

"اس لیے کہ وہ زخمی ہے۔ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہے۔

"وہاں کی انٹیلی جنس اور آرمی والے اسے تلاش کر رہے ہیں' وہ اپنی خفیہ پناہ گاہ سے باہر نہیں نکل سکے گا۔ مرینہ اسے اپنے شکنجے سے نکلنے نہیں دے گی۔ وہ ایسی دلدل میں دھنسا ہوا ہے کہ نہ خود نکل سکے گا نہ کوئی اسے نکال سکے گا۔"

معروف نے کہا۔ "واہ صاحبزادے واہ! اُدھر سے مراد نے فون پر جو دکھڑا سنایا' اس پر تم نے اور ماروی نے یقین کر لیا۔

"ذرا عقل سے سوچو کیا ماروی کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے وہ وہاں سے جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ کیا تم اپنی آنکھوں سے دیکھنے وہاں جا سکتے ہو کہ وہ واقعی زخمی ہے؟ اور انڈین بارڈر کی آرمی اسے تلاش کر رہی ہے؟"

وہ پریشان ہو کر پھر ریوالونگ چیئر پر ادھر سے ادھر ہونے لگا۔ معروف نے کہا۔ "وہ وہاں بیٹھے بیٹھے ڈراما لے کر رہا ہے۔ تم دیکھ لینا ابھی کچھ دنوں میں یہاں آئے گا اور کہے گا کہ وہ مرینہ کو ٹھکرا کر آیا ہے۔ کسی عورت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ جرائم کی دنیا سے بھی نکل آیا ہے۔ پھر یہ کہ مجرمانہ زندگی گزارنے والا گولیوں کے زخم کھاتا رہتا ہے۔ کوئی پرانا زخم دکھا کر خود کو سچا ثابت کرے گا کہ بے چارہ وہاں بے یار و مددگار زخمی پڑا تھا۔"

سمیرا نے کہا۔ "ماروی تو اسے بچپن سے چاہتی ہے۔ اس پر اندھا اعتماد کرتی ہے۔ وہ جو بولتا ہے اس پر یقین کر لیتی ہے۔ آپ نے کیسے یقین کر لیا کہ وہ سچا ہے؟ جھوٹ نہیں بول رہا ہے اور ماروی کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اسے دھوکا نہیں دے رہا؟"

محبوب نے میز پر جھک کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ معروف نے کہا۔ "ماروی نے ایک سیدھا سا فیصلہ کیا تھا کہ دونوں میں سے جو اس کے عشق سے باز آ کر کسی دوسری کی طرف مائل ہو جائے گا' وہ اس کا عاشق اور طلب گار نہیں رہے گا۔ پھر وہ اپنے دوسرے عاشق کی دلہن بن جائے گی۔ یہ بازی تم جیت چکے تھے محبوب!"

سمیرا نے پوچھا۔ "پھر آپ نے اپنے پیروں پر خود ہی کلہاڑی کیوں ماری ہے؟"

محبوب نے تصور میں ماروی کو دیکھا پھر کہا۔ "وہ رو رہی تھی کہہ رہی تھی مراد کو زبردستی گناہ گار بنایا گیا ہے۔ لہٰذا اسے گناہ سے باز آنے اور سنبھلنے کا ایک موقع دینا نیکی ہے۔"

سمیرا نے کہا۔ "آپ کیوں نہیں سمجھتے' وہ رو رہی تھی

کہ آپ کی دلہن بن جائے گی تو بچپن کا یار چھوٹ جائے گا۔
وہ رو رہی تھی کہ آپ کی دلہن نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس نے
آنسوؤں کا ہتھیار استعمال کر کے اپنے یار کو موقع دیا ہے کہ
وہ یہاں آئے اور اسے آپ کی دلہن بننے سے بچا لے۔''

''پلیز سمیرا...... ! ماروی ایسی سوچ نہیں رکھتی ہے۔ تم
اس کے متعلق ایسا نہ سوچو۔ میں یہ تو مانتا ہوں کہ وہ مراد کو
بچپن سے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے اور مجھے احسانات
کے بدلے محبتیں دے رہی ہے۔ کتنی ہی لڑکیاں اپنی پسند
کے خلاف شادیاں کرتی ہیں پھر شادی کے بعد اپنے مجازی
خدا کو دل سے چاہنے لگتی ہیں۔

''ماروی کے متعلق میرا یہی یقین ہے وہ شادی کے بعد
مجھے دل سے چاہنے لگے گی لیکن میں یہ نہیں مانوں گا کہ وہ
ایک ماہ کی مہلت حاصل کرنے اور مراد کو اپنے پاس بلانے
کے لیے مجھے دھوکا دے رہی ہے اور آنسوؤں کا ہتھیار
استعمال کر رہی ہے۔''

ماروی سے اس کا عشق اس کا اعتماد ایسا مستحکم اور غیر
متزلزل تھا کہ دونوں کو تھوڑی دیر کے لیے چپ لگ گئی۔

دونوں خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے
لگے۔ ان کی نظریں بے بسی سے کہہ رہی تھیں کہ اس دیوانے
کو کیسے سمجھائیں؟

پھر معروف نے کہا۔ ''یہ ماروی کے خلاف کوئی بات
تسلیم نہیں کرے گا۔ تم نہ بولو۔ میں اس سے پوچھتا ہوں۔''

اس نے محبوب سے کہا۔ ''میری ایک بات کا جواب
دو۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مراد وہاں زخمی نہیں ہے، اسے
کوئی پولیس تلاش نہیں کر رہی ہے، وہ مرینہ کے ساتھ وہاں
عیاشی کر رہا ہے اور یہاں پارسا بن کر ماروی کو حاصل کرنے
آجائے تو تم کیا کرو گے؟

''اگر وہ راہِ راست پر نہیں آیا ہوگا تو یہاں ماروی کو
حاصل کرنے کے لیے گولیاں چلائے گا۔ کیونکہ اس کے
ہاتھوں میں دن رات بندوق رہنے لگی ہے۔ وہ عادی مجرم ہو
چکا ہے اور اگر وہ سچ مچ پارسا بن کر آئے گا تو تم ماروی کو دلہن
نہیں بنا سکو گے۔ ماروی کے فیصلے کے مطابق تم اسے جیت
کر اپنی غلطی سے ہار جاؤ گے۔ یہ کیسی نادانی ہوگی؟''

''میں اس لیے ہار جاؤں گا کہ میرا رقیب گمراہی
سے راہ راست پر آجائے گا۔ معروف صاحب! یہ تو مان
لیں کہ مراد پہلے ایسا نہیں تھا۔ مرینہ نے اسے جبراً گناہ
گار بنایا ہے۔''

وہ چپ ہو گیا۔ فون سے کالنگ ٹون ابھرنے
لگی۔ بھی اسکرین پر ماروی کا نام روشن تھا۔ اسے یوں لگا
جیسے اب تک دھوپ میں بیٹھ کر بحث کرنے کے بعد ٹھنڈی
چھاؤں مل رہی ہے۔ اس نے فون کو کان سے لگا کر بڑی
محبت سے کہا۔ ''ہائے ماروی!''

سمیرا نے چونک کر فون کی طرف دیکھا۔ اسے پتھر
آ کر لگا تھا۔ ادھر سے ماروی نے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں
کہ مراد کا ایک بیٹا اپنی نانی رابعہ خاتون کے پاس پرورش
پا رہا تھا۔''

''ہاں میں جانتا ہوں زلیخا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔
اس نے مراد کے بچے کو جنم دیا تھا۔''

اس بات پر سمیرا اور معروف اپنی جگہ سیدھے ہو کر
بیٹھ گئے۔ توجہ سے اس کی باتیں سننے لگے۔ وہ فون پر پوچھ
رہا تھا۔ ''بات کیا ہے؟ تم مراد کے اس بیٹے کی بات کیوں
کر رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''محبوب! یہ افسوس ناک اطلاع ہے کہ
رابعہ خاتون کا انتقال ہو گیا ہے۔''

محبوب نے کہا۔ ''اوہ۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت
فرمائے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ وفات پا گئی ہیں؟''

''رابعہ خاتون کے بھائی عظمت شاہ یہاں
میرے پاس آئے ہیں۔ مراد کے بیٹے کے متعلق کچھ
ایسی باتیں کر رہے ہیں کہ آپ کی موجودگی ضروری ہے۔
آپ ابھی آجائیں۔''

''ابھی آ رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔''

وہ فون بند کر کے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''معروف
صاحب! مراد کے بیٹے کا کوئی مسئلہ ہے۔ عظمت شاہ وہاں
ماروی کے پاس آیا ہے۔ کیا آپ چلیں گے؟''

معروف نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں ضرور......''

سمیرا نے محبوب سے کہا۔ ''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو
میں بھی چل سکتی ہوں؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

وہ تینوں دفتری عمارت سے باہر آ کر کار میں بیٹھ
گئے۔ جب کار آگے بڑھنے لگی تو معروف نے کہا۔ ''تم
تھوڑی دیر پہلے کہہ رہے تھے کہ مرینہ نے مراد کو جبراً گناہ
گار بنایا ہے۔''

وہ بولا۔ ''بے شک یہی بات ہے۔''

''اور تم نے ابھی کہا تھا کہ مرینہ سے پہلے مراد پارسا
تھا جبکہ برسوں پہلے زلیخا کو میلا کر چکا ہے۔''

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔ ''زلیخا

اپنی مرضی سے گناہ گار بننے آئی تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ اس نے مراد سے زبردستی کی تھی اسے مجبور کیا تھا۔''

''واہ کیا بات ہے محبوب! وہ بے چارہ جہاں جاتا ہے عورتیں اس پر جبر کرتی ہیں اور وہ معصوم مجبور ہو جاتا ہے۔''

''معروف صاحب! اس کے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت ہم شروع سے جانتے ہیں۔''

''کس نے کہا کہ اس کے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔ یہ تو وہ خود ہی کہہ رہا تھا کہ زلیخا نے زبردستی کی تھی۔ کیا آپ یا اور کوئی دیکھنے گیا تھا کہ وہ اس کے پاس گئی تھی یا وہ اس کی عزت سے کھیلنے گیا تھا۔ بے شک وہ بھی راضی ہو گئی ہو گی۔ لیکن دوسرے دن وہ حویلی سے اور اس گوٹھ سے اس لیے نہیں بھاگا کہ ماروی کا سچا عاشق تھا۔ بلکہ اس لیے فرار ہوا کہ اسی رات بھید کھل گیا تھا۔ زلیخا کے بھائی اسے مار ڈالنا چاہتے تھے۔ اس نے بھاگ کر اپنی جان بچائی تھی۔''

محبوب ڈرائیو کرتے ہوئے خاموشی سے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ یہ درست تھا کہ انہوں نے اس وقت بھی مراد کا بیان سن کر اس پر بھروسا کیا تھا۔

معروف نے کہا۔''چلو وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے وہ ایسا گلفام ہے کہ عورتیں زبردستی اس پر دھاوا بول دیتی ہیں۔ بات ہے پارسائی کی۔ ماروی کو اپنے فیصلے کے مطابق دو میں سے کسی ایک پارسا عاشق سے شادی کرنا چاہیے۔ جو پارسا نہیں ہے اسے ٹھکرا دینا چاہیے۔ اب تو ایک بار نہیں دو بار اس کی عیاشی کا ثبوت سب کے سامنے آ چکا ہے۔''

''ابھی جا رہے ہو تو ماروی سے پوچھو۔ کیا وہ جب بھی کہیں منہ کالا کرے گا تو اسے معصوم اور مجبور سمجھ کر معاف کر دیا جائے گا؟'' اس نے محبوب کو ناراضگی سے دیکھا پھر کہا۔''عقل کی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ سامنے کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ ماروی کے عشق نے تمہیں عقل سے پیدل کر دیا ہے۔''

محبوب نے کوٹھی کے احاطے میں پہنچ کر گاڑی روک دی۔ ادھر رابعہ اور حشمت جلالی کا مختصر سا قصہ یہ تھا کہ حشمت اپنی اس دولتمند بیوی کی جائداد کا مالک بننے کے لیے اسے بڑی رازداری سے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ روز اس کے کھانے میں زہر کا ایک قطرہ ملاتا تھا۔ وہ سلو پوائزن اسے بہت آہستہ آہستہ دو چار مہینوں میں ہلاک کرنے والا تھا۔ اس سے پہلے ہی رابعہ نے اسے ایک دن کھانے میں زہر ملاتے دیکھ لیا۔ وہ دم بخود رہ گئی، اس نے شور نہیں مچایا۔ بڑی ذہانت اور رازداری سے اس کی چال اسی پر الٹ دی۔ وہ اسی زہر کو حشمت کے کھانے میں ملانے لگی اور وہ لاعلمی میں کھاتا رہا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا تو وقت بہت گزر چکا تھا۔ تقریباً تین ماہ تک اس کی لاعلمی میں زہریلی خوراک اس کے پیٹ میں جاتی رہی۔

وہ ماروی سے دشمنی کرنے والا وڈیرا چار ماہ پہلے اپنی زندگی ہار گیا تھا۔ اپنی تمام خود غرضیوں اور مکاریوں کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

زلیخا نے اپنی وفات سے پہلے مراد سے ہونے والے بیٹے کو اپنی ماں کے پاس بھیج دیا تھا تاکہ اسے مراد قبول کرلے یا وہ بچہ اپنی نانی کے پاس پرورش پاتا رہے۔ رابعہ کے دونوں بیٹے اپنے باپ کی طرح خود غرض، بے رحم ورندے تھے۔ ماں کو سلو پوائزن دینے کے سلسلے میں وہ باپ کے ہم راز تھے۔ راجہ ان بیٹوں سے نفرت کرتی تھی۔ اس نے اپنی تمام جائداد اپنے نواسے کے نام لکھ دی تھی۔ نواسے کا نام شہزاد رکھا گیا تھا اور وصیت یہ تھی کہ شہزاد کے جوان ہونے، باشعور اور قابل ہونے تک رابعہ کا قابل اعتماد بھائی عظمت شاہ اس کی جائداد کا نگراں رہے گا۔

رابعہ کی زندگی بھی مختصر ہو گئی تھی۔ وہ بھی تقریباً ایک ماہ تک زہریلی خوراک کھاتی رہی تھی۔ وہ پچھلے ہفتے اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔

اس نے بھائی عظمت شاہ سے کہا تھا کہ مراد کو تلاش کرے اور اس سے معلوم کرے کہ وہ اپنے بیٹے کی پرورش خود کرنا چاہتا ہے یا اسے ننھیال میں رکھنا چاہتا ہے۔ آئندہ مراد کے فیصلے کے مطابق اس کا بیٹا پرورش پائے گا۔

ڈرائنگ روم میں محبوب، معروف، سمیرا، چاچی متی اور جھمرو مختلف صوفوں پر بیٹھے تھے۔ عظمت شاہ ایک صوفے پر بیٹھا اپنی مرحومہ بہن رابعہ کی آخری وصیت پڑھ کر سنا رہا تھا۔

ماروی اپنے بیڈ روم سے نکل کر وہاں آ گئی۔ اس کے بازوؤں میں دو برس کا ایک بچہ تھا۔ وہ اسے سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ مراد جانے کتنی دور تھا لیکن اس وقت اس کا ننھا منا سا جو اس کے کلیجے سے آ کر لگ گیا تھا۔ سمیرا نے اس کو اور بچے کو دیکھا پھر محبوب کو دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرانے لگی۔ محبوب بھی بچے کو اس کی دھڑکنوں سے لگا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس وقت ماروی کے چہرے سے ایسے جذبے پھوٹ رہے تھے جیسے مراد کو دھڑکنوں سے لگا رکھا ہو۔ اس نے ایک بار بچے کو چوما بھی تھا۔

اس وقت ماروی کے خواب و خیال میں بھی یہ نہیں تھا

کہ وہ محبوب کے سامنے مراد کو اہمیت دے رہی ہے۔ وہ جو اندر سے محبت ہوتی ہے' وہ لاشعوری طور پر بے اختیار ظاہر ہو رہی تھی۔

عظمت شاہ نے وصیت پڑھنے کے بعد محبوب سے کہا۔ ''میں نے سوچا آپ مراد کے ہم شکل ہیں۔ اس کا مقدمہ لڑتے رہے ہیں۔ مجھے آپ کے پاس جانا چاہیے لیکن...''

اس نے چاچی چاچا کو دیکھ کر کہا۔ ''میں ان بزرگوں کو برسوں سے جانتا ہوں۔ مراد ان کے ہی ساتھ رہتا تھا۔ سوچا کہ مراد یہیں ہوگا اس لیے یہاں چلا آیا۔''

پھر اس نے ماروی کی گود میں بچے کو دیکھ کر کہا۔ ''بچے کی پرورش میرے لیے مشکل ہے۔ میری بیوی اور بچوں کا مزاج ایسا ہے کہ میں کیا بتاؤں۔ میں اپنی بہن کی اس ننھی سی امانت کو کانٹوں میں نہیں رکھوں گا اور مراد یہاں نہیں ہے۔ چاچی کہتی ہیں' وہ دو چار دنوں میں بھی آسکتا ہے اور دو چار مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔

''چاچی! اس کی پرورش میرے گھر میں نہیں ہو سکے گی۔ میں چاہتا ہوں' ان کے آنے تک شہزادے کو آپ سنبھالیں۔''

چاچی سے پہلے ماروی نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ یہ میرا شہزادہ ہے۔ میں اسے سنبھالوں گی۔ آپ اسے کانٹوں میں نہیں رکھنا چاہتے اور میں اس کے پاؤں میں کانٹا چبھنے نہیں دوں گی۔''

معروف نے کہا۔ ''تم نہیں سنبھالو گی۔ چاچی سنبھالیں گی کیونکہ ایک ماہ بعد تم پرائی ہونے والی ہو۔''

وہ بولی۔ ''ہاں تو کیا ہوا! میں بچے کو ساتھ لے جاؤں گی۔''

سمیرا نے کہا۔ ''لڑکیاں میکے سے بہت کچھ لے جاتی ہیں۔ جہیز میں سوئی دھاگے سے لے کر تاج محل تک لے جاتی ہیں لیکن کوئی کنواری دلہن گود میں بچہ لے کر نہیں جاتی۔''

وہ بچے کو سینے سے اور بھینچ کر فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ''میں تو جہاں جاؤں گی' اسے لے جاؤں گی اور کون کہتا ہے کہ میں ایک ماہ بعد پرائی ہو جاؤں گی؟''

محبوب نے چونک کر اسے دیکھا۔ یوں لگا جیسے وہ اگلے ماہ کی دو تاریخ کو شادی سے انکار کر رہی ہو۔

اس نے محبوب سے کہا۔ ''آپ بولیں؟ میں تو آپ کی ہوں' آپ کی ہی رہوں گی۔ کیا آپ دلہن بنا کر پرائی کر دیں گے؟''

وہ خوش ہو گیا۔ فوراً ہی بولا۔ ''نہیں ماروی! تم پہلے سے بھی زیادہ اپنی ہو جاؤ گی۔''

اس نے بچے کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اس کے چہرے کو اپنے چہرے سے لگایا۔ بچے سے یہ اپنایت سمیرا کو دکھائی پھر کہا۔ ''یہ میرا تاج محل ہے سمیرا! ایک کنواری دلہن اپنے ساتھ یہ تاج محل لے جائے گی۔ تم نے سن لیا ہے اور اچھی طرح سن لو محبوب صاحب منع نہیں کریں گے۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''ہرگز نہیں۔ تمہاری ہر خوشی، میری خوشی ہے۔ میں تو تم سے بھی... صرف ایک ہی خوشی چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ دو تاریخ کو میری دلہن بن جاؤ۔''

''آپ کو زبان دے چکی ہوں' اگر مراد ناکام اور نامراد رہا تو اپنی زبان پر قائم رہوں گی۔''

عظمت شاہ نے کہا۔ ''میں بچے کی طرف سے مطمئن ہو گیا ہوں۔ مجھے اجازت دیں۔ میں جا رہا ہوں۔ جب مراد آئے گا تو میں اس سے معلوم کروں گا کہ تمام جائداد وہ سنبھالے گا یا میں نگراں بن کر رہوں گا۔''

وہ محبوب، معروف اور چاچا سے مصافحہ کر کے بچے کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی معروف نے کہا۔ ''ماروی! ہمارے محبوب کو دیکھ رہی ہو' یہ کیسا دل والا ہے۔ اپنے رقیب کی اولاد کو تمہاری گود میں برداشت کر رہا ہے۔''

چاچی نے کہا۔ ''صرف اتنا ہی نہیں' سائیں اجازت دے رہے ہیں کہ تم دلہن بن کر اسے اپنے ساتھ لے جا سکو گی۔''

ماروی نے محبوب کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں فخر کرتی ہوں کہ ان کے جیسا چاہنے والا مجھے نصیب ہوا ہے۔''

معروف نے کہا۔ ''تم بھی اپنے فیصلے پر قائم رہ کر محبوب کو فخر کرنے کا موقع دو۔''

''میں اپنے فیصلے پر قائم ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''قائم نہیں ہو۔ تمہارے فیصلے کے مطابق گناہ گار کو تمہاری زندگی سے نکل جانا چاہیے۔ لیکن تم اس کے گناہ کو نظر انداز کر رہی ہو۔''

وہ بولی۔ ''محبوب سے میری بات ہو گئی ہے۔ اب اس معاملے میں ہم بحث نہیں کریں گے۔''

وہ بولا۔ ''وہ مرینہ کے ساتھ گناہ گار بن گیا ہے تو کوئی بات نہیں ہے جبکہ اس نے ایک نہیں دو بار گناہ کیا ہے۔

تمہارے فیصلے کے مطابق برسوں پہلے ہی اس کی پارسائی ختم ہوگئی تھی اور اس گناہ کا پھل ابھی تمہاری گود میں ہے۔ تمہارے کہنے سے محبوب نے اس کے ایک گناہ کو نظرانداز کیا۔ کیا اس کا دوسرا گناہ بھی معاف کراؤ گی؟"

"ہم سب جانتے ہیں' زلیخا نے اسے مجبور کیا تھا۔"

"کیا ہر جگہ عورتیں اسے مجبور کرتی ہیں؟"

"اس بے چارے کے نصیب میں یہی ہے تو وہ کیا کرے گا؟"

"وہ بے چارہ ہماری نظروں سے اوجھل رہ کر گناہ کرنے پر مجبور ہوتا رہے گا اور تم اسے معاف کرتی رہو گی؟"

"اب ایسا نہیں ہوگا۔ اس نے میری قسم کھائی ہے۔"

"اس نے تمہیں محبوب کی دلہن بننے سے روکنے کے لیے قسم کھائی ہے۔ جھوٹ اور فریب کے بغیر کوئی مجرم زندہ سلامت نہیں رہتا۔ جھوٹ بولتا رہے گا، دھوکا دیتا رہے گا تب ہی جرائم کی دنیا میں سلامت رہ سکے گا۔"

وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "اب وہ مجرموں کی دنیا میں نہیں ہے۔ وہاں سے نکل رہا ہے۔"

"تم کیسے جانتی ہو؟ کیا وہاں دیکھنے گئی ہو؟ وہ جھوٹ بولتا ہے تم سنتی ہو اور مان لیتی ہو۔"

"آپ کیسے کہتے ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے؟ کیا آپ وہاں دیکھنے گئے ہیں؟"

"میں نے کہا نا' وہ مجرموں کے ساتھ ہے ان کے ساتھ چھپا ہوا ہے۔ مرینہ بھی وہیں ہے اور وہ تمہیں یقین دلا رہا ہے کہ اسے چھوڑ چکا ہے۔ خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ جھوٹ نہیں بولے گا تو تمہارا اعتماد حاصل نہیں کر سکے گا۔"

"وہ سچ بول رہا ہے یا دھوکا دے رہا ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے میں انڈیا نہیں گئی۔ آپ بھی نہیں گئے۔ لہٰذا اس کے جھوٹ سچ کے متعلق بحث فضول ہے۔"

پھر وہ محبوب سے بولی۔ "ایک ماہ کے اندر جھوٹ اور سچ سامنے آجائے گا۔ ہم انتظار کریں گے۔ آئندہ میں مراد کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کروں گی۔"

اتنا کہہ کر اس نے کسی کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ بچے کو سینے سے لگا کر وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

کوئی قیدی آہنی سلاخوں کے پیچھے اتنا مجبور اور بے بس نہ ہوگا جیسے وہ ہوچکا تھا۔ اسے اپنی ماروی کے سامنے نیکی' شرافت اور پارسائی ثابت کرنی تھی لیکن وہ ایک خفیہ پناہ گاہ میں تھا' جہاں گناہ سے توبہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس محفوظ چار دیواری میں پہلے مرینہ اس سے کھیل رہی تھی۔ وہ گئی تو مونیکا کھیلنے آگئی تھی۔ جب بندہ گناہوں کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے' تب ہی سے یہ آزمائش شروع ہوجاتی ہے کہ توبہ کرے گا یا نہیں؟ توبہ پر قائم رہ سکے گا یا نہیں؟

ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ وہ واپس آسکتا تھا۔ گناہ میں بڑی لذت بڑی کشش ہوتی ہے۔ مونیکا جاتے جاتے کہہ گئی تھی' رات کو آئے گی۔ یعنی لذتیں پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ خود پیچھا چھڑانا پڑتا ہے لیکن کیسے چھڑائے؟

اگر دل میں خوفِ خدا ہو تو بچنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ گناہ سے صاف انکار کیا جا سکتا ہے۔ اس نے سوچا' ابھی مونیکا کے پاس جائے اور اس سے صاف صاف کہہ دے کہ.....

وہ سوچتے سوچتے رک گیا۔ فون کی کالنگ ٹون اسے پکار رہی تھی۔ اس نے ادھر دیکھا تو جیسے اپنی جانِ حیات کو دیکھا۔ ننھی سی اسکرین پر اس کا نام مسکرا رہا تھا۔

اس نے فون اٹھا کر دل میں کہا۔ "جو کشش میری ماروی میں ہے' وہ دنیا کی کسی عورت میں نہیں ہے۔"

اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "میری جان! تم آتی ہو تو جان میں جان آجاتی ہے۔ ایک نئی زندگی مل جاتی ہے۔"

وہ بولی۔ "آج مجھے بھی ایک نئی زندگی' نئی خوشی ملی ہے۔ ہائے مراد! مجھے ایک ایسا انمول تحفہ ملا ہے جس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ جبکہ یہ تحفہ تم سے ہی ملا ہے۔ میں تو اسے سینے سے لگا کر نہال ہو رہی ہوں۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ تمہیں کوئی انمول تحفہ ملا ہے اور وہ بھی مجھ سے؟"

"ہاں۔ یہ میری گود میں مسکرا رہا ہے۔"

"کیا تم کوئی پہیلی بجھوا رہی ہو؟"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "یہ جیتی جاگتی سانس لیتی ہوئی پہیلی ہے۔ اسے بوجھو تو جانوں۔"

"خوش رہو ماروی! کتنے عرصے بعد تمہاری سریلی ہنسی سن رہا ہوں۔ تم سدا یوں ہی ہنستی کھلکھلاتی رہو۔"

فون پر اس کی ہنستی ہوئی آواز سنائی دی وہ پچکارتے ہوئے بولی۔ "بولو بیٹے با..... با..... بابا....."

پھر ایک بچے کی معصوم سی آواز سنائی دی۔ "با..... با....."

مراد نے پوچھا۔ "یہ کس کا بچہ ہے؟"

"تمہارا ہے۔ کسی اور کا ہوتا تو کیا اسے گود میں لیتی؟"

"یہ...یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میرا بچہ کہاں سے آگیا؟"

"کیا زلیخا کو بھول گئے؟"

اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بے یقینی سے بولا۔ "کیا کہہ رہی ہو.....؟ یہ...یہ زلیخا سے ہونے والا بچہ تمہارے پاس.....؟ نہیں یہ تمہارے پاس کیسے آگیا؟"

"یہ اپنی نانی رابعہ خاتون کے پاس پرورش پا رہا تھا۔ افسوس رابعہ خاتون وفات پا چکی ہیں۔ اس کا بھائی عظمت شاہ اس بچے کو لے کر چاچی اور چاچا کے پاس آیا تھا۔"

وہ عظمت شاہ، رابعہ خاتون اور اس کی وصیت کے متعلق تفصیل سے بتانے لگی۔ وہ سن رہا تھا اور یہ سوچ کر جھینپ رہا تھا کہ اس کا بھولا ہوا پہلا گناہ بچے کی صورت میں ایک اشتہار بن کر سب کے سامنے آگیا ہے۔

ادھر سے ماروی نے کہا۔ "میں نے اتنی ساری باتیں کہہ دیں اور تم چپ ہو۔ کیا اور سننا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ محبوب نے میرے بچے کو دیکھا ہے؟"

"ہاں۔ میں نے عظمت شاہ کے سامنے محبوب کو بلایا تھا۔ سمیرا اور معروف صاحب بھی آئے تھے۔"

"انہوں نے میرے ایک اور گناہ کو اُچھالا ہوگا۔"

وہ بولی۔ "محبوب صاحب تو چپ تھے۔ معروف صاحب کہہ رہے تھے کہ ایک بار نہیں، دو بار تمہاری پارسائی داغ دار ہو چکی ہے۔ میرے فیصلے کے مطابق اب تم میرے حقدار نہیں رہے۔"

"میں ان کا منہ توڑ دوں گا۔"

"تمہیں اپنی غلطی اور بے حیائی پر غصہ آنا چاہیے۔ دوسروں کا منہ توڑنے سے پہلے اپنا منہ سیدھا کر لو۔ معروف صاحب تو کیا ساری دنیا یہی کہے گی کہ تم مجھے ہار چکے ہو۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں نے پھر ان سب کے سامنے کہہ دیا ہے کہ مراد کو سنبھلنے کا موقع دیا گیا ہے۔ اگر وہ ایک ماہ کے اندر سنبھل نہ سکا تو میں محبوب کی دلہن بن جاؤں گی۔"

"ایسا نہ کہو ماروی! میں تمام رکاوٹیں توڑ کر خطرات سے کھیلتا ہوا تمہارے پاس آجاؤں گا۔ پھر میں یہ نہیں سوچوں گا کہ آری والے مجھے گولی مار دیں گے۔ تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ میں دیارِ غیر میں کہاں مرکھپ گیا ہوں؟"

"مریں گے تمہارے دشمن۔ خبردار! کوئی خطرہ مول لے کر یہاں نہ آنا۔ اپنی ماروی کو پرائی ہونے سے روکنا چاہتے ہو تو میرے بھروسے کی لاج رکھو۔ میں نے بڑے اعتماد سے کہا ہے کہ تم میرے پہلے والے مراد بن جاؤ گے۔"

"ہاں ماروی! میں بن کر دکھاؤں گا۔"

"میں جانتی ہوں۔ تم دل میں ٹھان لو گے تو پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکال لاؤ گے لیکن....."

"جب مجھ پر اعتماد ہے تو پھر یہ لیکن کیا؟"

"لیکن یہ کہ تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھتے رہو۔ تم ناکام ہو سکتے ہو۔ پھر مجھے مجبور ہو کر اپنے فیصلے کے مطابق محبوب کی منکوحہ بننا ہی پڑے گا۔"

"ماروی! یہ زبردستی کا سودا ہوگا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں تم صرف مجھے چاہتی ہو۔"

"بے شک۔ یہ حقیقت محبوب صاحب بھی جانتے ہیں کہ میں دل و جان سے تمہیں چاہتی ہوں۔ صرف ان کے احسانات کے بدلے ان سے نکاح قبول کر لوں گی۔"

"ماروی! اگر تم نے ان سے نکاح قبول کیا تو میں جرائم کی دنیا سے واپس آتے آتے پھر لوٹ جاؤں گا۔ کسی دن تم سنو گی کہ میں گولیوں سے چھلنی ہو کر ختم ہو گیا ہوں۔"

"میں کیا کروں گی؟ چھپ چھپ کر روتی رہوں گی۔ تم سے اور کیا امید رکھوں، تم مجھے رُلاتے رہنے کے کام کر کے دنیا سے جاؤ گے۔ کیا یہی تمہاری محبت ہے؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟"

"تعجب ہے۔ سیدھا سا راستہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سیدھے راستے پر آجاؤ۔ ایک بار مجھے یقین ہو جائے کہ تم نے عورتوں سے پیچھا چھڑا لیا ہے۔ اب تمہاری پارسائی پر حرف نہیں آئے گا پھر دیکھ لینا دنیا کی کوئی طاقت ماروی کو تم سے جدا نہیں کر سکے گی۔"

"میں تمہاری ہوں۔ صرف تمہاری ہی رہوں گی۔ اب یہ تو تمہارے اعمال پر ہے۔ اچھی طرح سمجھو تم کیا بونے والے ہو اور کیا کاٹنے والے ہو؟"

"تم درست کہتی ہو۔ اب میں وہی کام کروں گا جو مجھے تمہاری طرف لے جائے گا۔"

"اب بچے کی بات کرو۔ اس کا نام شہزاد علی منگی ہے۔ بالکل شہزادہ لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے تم جھانکتے رہتے ہو اور میں ان آنکھوں کو چومتی رہتی ہوں۔"

"تمہاری باتوں سے ایسا لگتا ہے کہ میرے بیٹے نے مجھ سے زیادہ تم پر قبضہ جما لیا ہے۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "ہاں۔ وعدہ کرو۔ اسے میرے ہی پاس رہنے دو گے۔ اگر میں پرائی ہو جاؤں گی تب بھی

مجھ سے چھین کر نہیں لے جاؤ گے۔ ہائے مراد...... یہ تم ہو۔ خدا نہ کرے تمہیں ہار جاؤں۔ ایسا ہوا تو ہار کر بھی شہزاد کی صورت میں تمہیں جیت لوں گی۔ یہ میری جان کے ساتھ رہے گا۔''

''میری جان! اتنا پیار تو شاید زلیخا بھی اسے نہ دیتی۔ یہ تمہارا ہے۔ تمہارا ہی رہے گا۔''

''بس میں نے شہزاد کو مانگنے کے لیے تمہیں فون کیا تھا۔ ویسے میں پہلے سے جانتی تھی، تم اسے میرے ہی پاس رہنے دو گے۔ اب میں اسے سُلانے جا رہی ہوں۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ فون خاموش ہو گیا۔ ماروی پھر دور ہو گئی۔ وہ اسی پناہ گاہ کے ایک کمرے میں تنہا رہ گیا۔ اسے پہلی بار یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی تک اپنی بیوی بچے کے ساتھ تھا۔ ماروی کو بیوی ہی سمجھتا تھا اور بچہ بھی اپنا تھا۔ وہ اتنی دیر تک اپنے فیملی ماحول میں تھا۔ وہ ماحول ایک جھلک دکھا کر گزر گیا تھا۔ اسے یہ سمجھا گیا تھا کہ وہ واقعی اپنا قبلہ درست کرے گا تو پھر یہی بیوی ہو گی اور اس کی گود میں اس کے اپنے ہی بچے ہوں گے۔ اس کی بہتری اور خوشحالی اسی میں ہے کہ وہ مرینہ کے اور مونیکا کے دیے ہوئے غلیظ ماحول سے نکل آئے۔

اس نے تھوڑی دیر پہلے ماروی کا فون آنے سے پہلے یہی سوچا تھا کہ اب ان کے ساتھ راتیں کالی نہیں کرے گا۔ حتی الامکان سنبھلنے کی کوشش کرے گا۔ ابھی جا کر مونیکا سے بات کرے گا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے کمرے سے نکل کر لنگڑاتا ہوا مونیکا کے پاس آ گیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی خوش ہو گئی۔ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ ''میں تو تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دیکھ رہی ہوں، میری بھی کشش ہے۔ تم بھی میرے دیوانے ہو گئے ہو۔ جبھی میرے پیچھے چلے آئے ہو۔''

وہ اس کی بانہوں کو گردن سے الگ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں کہنے آیا ہوں یہ اچھا نہیں ہے۔ یہ پاپ ہے اور ہمیں پاپ سے بچنا چاہیے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ مرد کیا ہوتا ہے۔ میں تو مر جاؤں گی پر تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔''

وہ آگے بڑھ کر پھر اس سے لگ گئی۔ وہ خود کو چھڑا کر پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''میں آخری بات کہنے آیا ہوں۔ ابھی اپنے کمرے میں جاؤں گا اور دروازے کو اندر سے بند رکھوں گا۔ تم کب تک دروازے پر دستک دو گی؟ تمہارے ممی اور پاپا جاگ جائیں گے۔ تمہیں واپس جانا ہو گا۔''

وہ ذرا پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''کیا سچ کہہ رہے ہو؟ مجھے لذتوں سے آشنا کر کے تڑپنے کے لیے اکیلا چھوڑ دو گے۔''

''جو غلطی ہو چکی ہے اسے بھول جاؤ۔ میں اللہ سے معافی مانگ رہا ہوں۔ تم بھگوان سے مانگو۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟ مجھے آدمی روٹی کھلا کر کہتے ہو میں پیٹ نہ بھروں۔ بھوکی رہوں؟''

وہ اس کا گریبان پکڑ کر بولی۔ ''سچ بولو۔ مجھ سے بیزار کیوں ہو گئے ہو؟ میرے اندر کوئی کمی ہے؟ کمی ہے تو بتاؤ میں اور زیادہ خوش کروں گی۔''

''کوئی کمی نہیں ہے۔ تم بہت سندر اور بھرپور جوان ہو۔ جس پر نظر ڈالو گی وہ تمہاری طرف کھنچا چلا آئے گا۔ کسی اور سے دوستی کرو مجھے بھول جاؤ۔''

''جب تم نہیں رہو گے تو کسی اور کے بارے میں سوچوں گی اور رہو گے کیوں نہیں؟ پاپا کہہ رہے تھے باہر تمہاری موت ہے۔ مہینوں تک کہیں جا نہیں سکو گے۔''

وہ پھر گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''تم میرے نصیب سے یہاں رہنے آئے ہو۔ یہاں سے جا نہیں سکو گے۔ ہاتھ کی ریکھا پڑھ سکتے ہو تو پڑھ لو۔ تم میرے لیے آئے ہو۔ ہمارے بھاگ (مقدر) میں جب تک لکھا ہے، میرے اندر کی آگ بجھاتے رہو گے۔''

وہ اسے ایک جھٹکے سے الگ کرتے ہوئے بولا۔ ''تم اچھی بات سمجھانے سے نہیں سمجھو گی۔ مگر میں گمراہی کو سمجھ گیا ہوں۔ میں تمہارے آنے کا راستہ ہی روک دوں گا۔''

وہ پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ وہ لنگڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ مونیکا دوڑتی ہوئی اس سے آگے نکل گئی۔ اس کے کمرے کے اندر آ گئی پھر بولی۔ ''آؤ۔ اب دروازہ بند کرو۔ میں تو اندر ہوں، کیسے روکو گے؟''

وہ پریشان ہو کر کھلے دروازے کو دیکھنے لگا۔ پھر عاجزی سے بولا۔ ''مونیکا! تم بہت اچھی ہو۔ میری بات مان لو۔ میں توبہ کر چکا ہوں۔ اگر تم یہاں سے نہیں جاؤ گی تو ابھی تمہاری ممی کو آواز دوں گا۔''

وہ ڈھٹائی سے بولی۔ ''چلو آواز دو۔ کبھی تو بھید کھلے گا کہ میں کنواری نہیں رہی ہوں۔ تم یہی چاہتے ہو تو آج ممی اور پاپا کو معلوم ہو جائے گا کہ تم ان کی بیٹی کی عزت سے کھلواڑ کر رہے ہو۔ پھر کیا ہو گا؟ یہاں مہمان بن کر جس تھالی میں کھا رہے ہو، اسی میں چھید کر رہے ہو۔ پاپا تو تمہیں گولی مار دیں گے یا پھر یہاں سے دھکے دے کر باہر کر دیں

کے۔ وہ چھپت راؤ سے اور ان کے بک ماسٹر سے کوئی شکایت نہیں کریں گے۔ بڑی رازداری سے آرمی والوں کے مخبر بن جائیں گے پھر سوچو کیا ہوگا؟''

سوچنا کیا تھا۔ درگا پرساد اسے اپنے گھر سے نکال کر آرمی والوں کا مخبر بن جاتا تو وہ باہر جاتے ہی حرام موت مارا جاتا۔

وہ شکست خوردہ انداز میں ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''ٹھیک ہے تم جاؤ۔ رات کو آؤ گی تو دروازہ کھلا رکھوں گا۔''

وہ جاتے ہوئے بولی۔ ''ابھی رات کے آٹھ بجے ہیں۔ پاپا گیارہ بجے تک پی کر ٹُن ہو جاتے ہیں۔ دوسرے دن ہی آنکھ کھولتے ہیں۔ ممی نیند کی گولیاں کھا کر سوتی ہیں۔ میں آدھی رات تک آؤں گی۔'' وہ دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ وہاں سے تنبیہہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے بولی۔ ''اگر دھوکا دو گے دروازہ نہیں کھولو گے تو شور مچانا شروع کردوں گی۔ یاد رکھو کہ دشمنی کرنا چاہوں تو صرف ایک فون کال کے ذریعے میں بھی مخبر بن سکتی ہوں۔ مجھے اپنا بنا کر رکھو۔ قسمت سے جان بچانے' سر چھپانے کی جگہ ملی ہے تو باہر جا کر مرنے کی غلطی نہ کرنا۔''

وہ وارننگ دے کر چلی گئی۔ وہ کھلے ہوئے خالی دروازے کو تکنے لگا۔ ان لمحات میں اسے اپنی کمزوری اور بے بسی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ ایک لڑکی اسے وارننگ دے کر گئی تھی اور وہ آدھی رات کو اسے مجبور کرنے والی تھی۔

وہ مٹھیاں بھینچ کر سوچنے لگا۔ ''مجھے کیا ہوگیا ہے؟ میرے اندر کا شہزور مراد کہاں مر گیا ہے؟ میں اتنا گر گیا ہوں کہ عورتیں مجھے ایک مچھر کی طرح تالی بجا کر مارتی ہیں اور میں ان سے زیر ہو جاتا ہوں۔

''مرینہ مجھے کمزور بنا کر پہلی بار گناہ کی دلدل میں لے آئی۔ میں آ گیا۔ میں اب بھی اس کا محتاج ہوں۔ اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس کے MET آفیسر ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ لعنت ہے مجھ پر ایک عورت کے کاندھوں پر سوار ہو کر دشمنوں کو زیر کرنا چاہتا ہوں۔ میری جواں مردی کہاں گئی......؟

''کہاں گئی میری جواں مردی......؟'

وہ خود کو لعنت و ملامت کر رہا تھا اور ٹہلنے کے دوران میں پاؤں پٹخ رہا تھا۔

ایک بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ اس کی زندگی میں گناہ کا پہلا چھینٹا زلیخا کی طرف سے آیا تھا۔ وہ تو آتے ہی ختم ہو گیا تھا لیکن وہ گناہ مرینہ کے ساتھ جاری رہنے والا تھا۔

وہ پھر آنے والی تھی لیکن اس کے جاتے ہی مونیکا آ گئی تھی۔ یہ سلسلہ آگے جاری رہنے والا تھا اور وہ ماروی کو دھوکا دیتا رہنے والا تھا۔ ماروی نے اسے خدا اور رسول ﷺ کا واسطہ دیا تھا۔ اپنی قسم دی تھی کہ وہ ایک ماہ کے اندر راہِ راست پر آ جائے۔ گناہ سے پھرنا ناممکن نہیں تھا۔ سوچنے لگا' اس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ دلدل سے نہیں نکل سکتا ہے تو نہ نکلے۔ ماروی سے جھوٹ بولتا رہے۔ اسے دھوکا دیتا رہے اور اس کے سامنے پارسا بن کر رہے۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ ایمان سے سوچے اور سمجھے' کیا ماروی سے اپنے گناہ چھپا سکتا ہے؟ ہاں چھپا سکتا ہے۔ خدا سے نہیں چھپا سکتا۔ وہ پروردگار سب دیکھ رہا ہے۔

پہلے یہ حقیقت اس کے ذہن میں نقش تھی۔ کوئی غلطی کرنے سے پہلے سنبھل جاتا تھا' اس کا ایمان آپ ہی آپ اسے اطلاع دیتا تھا کہ خدا دیکھ رہا ہے۔ اب تو وہ جیسے خدا کو بھول گیا تھا۔ سیدھی سی بات ہے۔ خدا کو حاضر و ناظر سمجھنے والا عورت سے دوستی نہیں کرے گا۔

کیا اپنے رب کی موجودگی میں گناہ کرے گا؟

اگر بصد مجبوری کرے گا تو اس شیطانی سلسلے کو جلد از جلد توڑ دے گا۔ بس یہی ایک یقین گناہ سے بچا سکتا ہے اور یقین یہ کہ خدا دیکھ رہا ہے۔

مراد کے دل میں بڑی شدت سے یہ بات آئی۔ ''اگر میں پوری ایمانی قوت سے یقین کروں کہ خدا دیکھ رہا ہے تو کیا واقعی گناہوں سے نجات حاصل کر پاؤں گا؟

''کیا آج رات مونیکا سے دامن بچا سکوں گا؟

''مرینہ میری اہم ضرورت بنتی جا رہی ہے۔ کیا اس سے نجات حاصل کر سکوں گا؟ مرینہ تو ابھی دور ہے مجھے مونیکا سے بچنا ہے۔ کیا وہ آئے گی تو اسے دور کر سکوں گا۔''

اس کے اندر سے آواز آئی' ہاں دور کر سکوں گا اگر میں صرف خدا سے خوف کھاؤں۔ صرف خدا سے...... اس بات سے نہ ڈروں کہ وہ ناکامی کی صورت میں شور مچائے گی' اپنے ماں باپ کو میرا دشمن بنا دے گی اور مخبری کر کے مجھے آرمی والوں کے حوالے کر دے گی۔

یہ ایسی باتیں ہیں' ایسی دھمکیاں ہیں جو مجھے کمزور بنا رہی ہیں۔ مجھے ایک دن مرنا ہے تو ڈرنا کیسا؟

اس نے آئینے کے پاس آ کر خود کو دیکھا پھر کہا۔ ''میں

وہی مراد ہوں نا؟ جو بلوچستان کے ایک ریسٹ ہاؤس میں مرینہ کے ساتھ تھا۔ وہ میرے ساتھ پہلی بار رات کالی کرنے والی تھی اور میں صرف ماروی کے نام رہنا چاہتا تھا۔

"میں جانتا تھا کہ اس کی بات نہیں مانوں گا تو وہ اپنی انسلٹ برداشت نہیں کرے گی۔ مجھے گولی مار دے گی۔ زخمی کرے گی اور میرے انکار کو اقرار میں بدل دے گی۔ ان دنوں میں نے کبھی بندوق نہیں پکڑی تھی۔ اس کے مسلح حواری مجھے ایک زخمی کتے کی طرح اس کے سامنے لاکر ڈال دیتے۔

"تب...... تب میں نے خدا پر بھروسا کیا تھا۔ اس وقت میرے دل میں صرف خدا کا خوف تھا۔ مجھے موت ڈرا نہ سکی۔ میں صرف ایک گن لے کر وہاں سے فرار ہوگیا۔ میں نے مرینہ سے پیچھا چھڑا لیا۔ گناہ کا مرتکب ہونے سے بچ گیا۔"

وہ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں وہی مراد ہوں... فرار ہونے والے اور اس کی توہین کرنے والے مراد کو مرینہ نے آخر زیر کرلیا۔ مجھے زخموں کی زنجیریں اور ہتھکڑی پہنا کر رات کالی کرلی۔ اپنی ضد پوری کرلی۔ واہ ری عورت تو ضد اور زبردستی پر آئے تو پہاڑوں کو گرا دیتی ہے، تو نے اس پہاڑ کو گرا ہی دیا اور میں کیسا احمق ہوں کہ اس کی زبردستی بھول کر اس کے TMET آفیسر بن کر آنے کا انتظار کررہا ہوں۔ اپنی ماروی کو دھوکا دے کر اس کے ساتھ جرائم کی دنیا میں رہنا چاہتا ہوں اور گناہوں کا سلسلہ بھی جاری رکھنا چاہتا ہوں۔

"شاباش ہے عورت! تو میری عقل کو کھا گئی ہے۔ میں یہ سامنے کی بات بھول رہا ہوں کہ مرینہ کے آتے ہی خدا کو بھول رہا ہوں۔ کبھی ایک ساعت کے لیے بھی یہ حقیقت ذہن میں نہیں آئی کہ خدا دیکھ رہا ہے۔"

وہ آئینے کی طرف سے پلٹ کر خلا میں تکنے لگا۔ اسے اپنی غلطیوں اور حماقتوں کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا باتھ روم میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر آیا تو نہا دھو کر پاک صاف ہو چکا تھا۔ وہ صاف لباس پہن کر قبلہ رو ہوگیا۔ اسے یاد نہیں آیا کہ کتنے عرصے بعد وہ اپنے رب کے آگے سجدہ کرنے آیا ہے۔ بہرحال وہ بڑے خشوع وخضوع سے عبادت میں محو ہوگیا۔ اس نے دل کے اندر جھانک کر یہ فیصلہ کیا کہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرے گا۔

عورتوں سے دور رہے گا تو گناہوں سے محفوظ رہے گا۔

جس کمرے میں مونیکا آنے والی تھی، اسی کمرے میں وہ اپنے رب کے آگے جھک رہا تھا اور خدا کے بھروسے پر دروازے کو بند رکھنے والا تھا۔ خواہ وہ میزبان اس کے دشمن بن جاتے، اسے اب کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ نماز کے بعد دعا مانگنے لگا۔ "یا اللہ تعالیٰ! میرے گناہوں کو معاف فرما۔ میں تیری دی ہوئی تمام سزاؤں سے گزر دوں گا۔ صرف ماروی سے جدا ہونے والی سزا مجھے نہ دے میرے معبود۔ میں نے گناہوں کی طرف جانے والی تمام کشتیاں جلا دی ہیں۔ مجھے صراطِ مستقیم پر چلتے رہنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین!

"اے میرے معبود، یہ میری پہلی اور آخری دعا ہے کہ ماروی کو میری شریکِ حیات بنادے۔ مجھے دیارِ غیر سے نکال دے۔ مجھے پاکستان پہنچادے۔ آمین!"

وہ دعا مانگ کر اٹھا تو دروازے پر دستک سنائی دی۔ شاہینا کہہ رہی تھی۔ "مراد! جلدی دروازہ کھولو۔ خطرہ ہے۔"

اس نے فوراً ہی آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ شاہینا نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "فوراً اپنا سامان سمیٹو اور تہ خانے میں جاؤ۔"

جلدی جلدی سامان سمیٹا گیا۔ مونیکا دروازے پر کھڑی مراد کو دیکھ رہی تھی۔ وہ آدھی رات کو اس کے پاس آنے والی تھی۔ اب سوچ رہی تھی، یہ کبھی ایک آدھ گھنٹے کے لیے چھپنے جاتا ہے۔ کبھی دن رات وہاں چھپا رہتا ہے۔ جب حالات سازگار ہوتے ہیں تب تہ خانے سے نکلتا ہے۔ اگر یہ ساری رات وہاں رہا تو میں کیسے رہوں گی۔

اس نے ماں سے پوچھا۔ "یہ ابھی واپس آجائیں گے نا؟"

ماں نے کہا۔ "پتا نہیں وہ کون لوگ ہیں۔ چمپت راؤ نے فون پر اتنا ہی کہا ہے کہ وہ سب سادے لباس میں ہیں۔ اس علاقے کی کوٹھیوں میں انکوائری کرتے پھر رہے ہیں۔ یہاں ہماری کوٹھی میں پہنچنے ہی والے ہیں۔"

وہ بولتی ہوئی مراد کو کمرے سے باہر کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف لے گئی۔ مونیکا وہاں تنہا رہ گئی۔ وہ اس جگہ آ کر کھڑی ہوگئی تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے مراد نے نماز پڑھی تھی اور دعائیں مانگی تھیں۔

مونیکا نہیں جانتی تھی کہ اس نے نماز پڑھی ہے اور اس نماز پڑھنے والے کے ذہن میں یہ ایمان پرور بات آئی کہ دعائیں اسے مونیکا سے دور لے گئی ہیں۔ اس نے سچے دل سے توبہ کی تھی۔ اب اس کے دل میں صرف خدا کا خوف تھا۔ ابھی وہ نہیں جانتا تھا کہ سچائی اور نیک نیتی آگے اور کیا

گل کھلانے والی تھیں۔

اس دنیا کا کارخانہ انسان کی تقدیر اور تدبیر سے چل رہا ہے۔ تدبیر کچھ ہوتی ہے۔ تقدیر کچھ ہوتی ہے' یوں ایک دوسرے کی ضد اور ٹکراؤ سے دنیا میں عجیب تماشے ہوتے رہتے ہیں۔

درگا پرساد کا تعلق سنڈیکیٹ دی ماسٹرز کے ماسٹر کو بوبو کے علاوہ ممبئی اور مدراس کے انڈرورلڈ والوں سے بھی تھا۔ اس نے اپنے اکثر معاملات کو خفیہ رکھنے کے لیے بڑی رازداری سے تہ خانہ بنایا تھا۔ اپنی کوٹھی کے اندر اور باہر سیکیورٹی کے سلسلے میں جدید الیکٹرانکل انتظامات کیے تھے۔

کوٹھی کے ہر کمرے میں خفیہ آڈیو ریکارڈنگ سسٹم رکھا تھا۔ کسی بھی بند کمرے میں کوئی بات رازداری سے کی جاتی تو وہ ریکارڈ ہو جاتی تھی۔ درگا پرساد وہ ریکارڈ ہونے والی باتیں بعد میں فرصت سے سن لیا کرتا تھا۔

مرینہ نے وہاں سے روانگی سے پہلے مراد کے پہلو میں بیٹھ کر اپنے اعلیٰ افسر جان انتھونی سے فون پر بات کی تھی۔ پھر اچانک فرنچ لینگویج بولنے لگی تھی' تاکہ مراد اس کے خلاف ہونے والی گفتگو کو بالکل ہی نہ سمجھ سکے۔

بعد میں درگا پرساد نے وہ ریکارڈنگ سنی تو اسے شبہ ہوا۔ وہ ریکارڈ کیا ہوا کیسٹ لے کر چمپت راؤ کے پاس آیا۔ پھر بولا۔ ''مجھے شبہ ہے کہ مرینہ مراد سے مخلص نہیں ہے اس سے اپنے راز چھپاتی ہے۔''

چمپت راؤ نے کہا۔ ''میں ابھی اپنے فرانسیسی زبان جاننے والے آدمی کو بلاتا ہوں۔ وہ اس گفتگو کا مکمل ترجمہ کرے گا تو ہمیں حقیقت معلوم ہو جائے گی۔''

تھوڑی دیر بعد وہ شخص آ گیا۔ وہ ریکارڈنگ سن سن کر لفظ بہ لفظ بولنے لگا یوں انہیں معلوم ہوا کہ سنڈیکیٹ ریڈ الرٹ اور کئی انڈرورلڈ والے مراد کو ہلاک کرنے کے لیے ڈھونڈ رہے ہیں۔ لندن کے جس ادارے میں مرینہ MET آفیسر تھی' اس کے ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی نے بھی ریڈ الرٹ والوں سے مراد کے سر کا سودا کیا تھا۔

معاہدہ یہ تھا کہ وہ مراد کو زندہ یا مردہ ریڈ الرٹ والوں کے سامنے پیش کریں گے تو اس کے عوض MET ڈیپارٹمنٹ کو پچاس لاکھ ڈالرز دیے جائیں گے۔

ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی فرانسیسی زبان میں مرینہ سے کہہ رہا تھا کہ وہ مراد کو ڈیپارٹمنٹ کے حوالے کر دے۔ وہ کہہ رہی تھی' جس دن مراد کے بچے کی ماں بننے کے آثار پیدا ہوں گے اس دن وہ مراد کو ان کے حوالے کر کے اپنے ڈیپارٹمنٹ کو پچاس لاکھ ڈالرز کا فائدہ پہنچائے گی۔

جان انتھونی اسے سمجھا رہا تھا کہ مراد کے معاملے میں دیر نہ کرے۔ وہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ وہ پچاس لاکھ ڈالرز حاصل نہیں کر سکیں گے لیکن مرینہ مراد کی دشمن بھی تھی اور دیوانی بھی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ مراد کے بچے کو اپنے وجود کے اندر لانے کے بعد ہی اسے حرام موت مرنے کے لیے ان کے حوالے کرے گی۔

درگا پرساد اور چمپت راؤ وہ تمام ترجمہ سنتے رہے اور مرینہ کی دوغلی یاری دوستی کو سمجھتے رہے۔ چمپت راؤ نے کہا۔ ''یہ عورت بہ ظاہر مراد کی دوست ہے لیکن در پردہ نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے دوست بنی ہوئی ہے۔''

درگا پرساد نے کہا۔ ''اگر چند دنوں میں اس کے پاؤں بھاری ہو جائیں گے تو وہ بچے کو پیٹ میں لیتے ہی مراد کو مرنے کے لیے ان کے حوالے کر دے گی۔''

''بہت ہی ذلیل اور کمینی عورت ہے۔ مراد کو اس کی کمینگی سے آگاہ کرنا ہوگا اور اس کی جگہ بدلنی ہوگی۔ مرینہ تمہاری کوٹھی کے تہ خانے میں کسی وقت بھی MET فورس کے مسلح آدمیوں کو پہنچا سکتی ہے۔''

دوسری طرف MET کے ڈائریکٹر جنرل نے اپنے سیکرٹ ایجنٹ ہیلری ہڈسن سے کہا۔ ''مرینہ جذباتی غلطی کر رہی ہے۔ کتنے ہی سنڈیکیٹس اور انڈرورلڈ والے جسے دیکھتے ہی گولی مار دینا چاہتے ہیں اسے وہ چھپا کر رکھے ہوئے ہے' وہ اس خطرناک قاتل کے بچے کی ماں بننے کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کی نادانی ہمیں ایک بہت بڑی رقم سے محروم کر دے گی۔

''نہ جانے کتنے خرانٹ جاسوس اس کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ وہ وہاں پہنچ سکتے ہیں' جہاں اس نے اپنے یار کو چھپا رکھا ہے۔ مسٹر ہڈسن' ان سے پہلے تمہیں مراد کو پکڑ کر لانا ہوگا۔''

ہڈسن نے کہا۔ ''مرینہ یہاں دہلی آئی ہوئی ہے۔ میں اسے دس بجے کی فلائٹ سے لندن روانہ کروں گا۔ پھر اسے پتا بھی نہیں چلے گا اور ہمارے آدمی جے پور میں مراد کو تلاش کرتے ہوئے اس کی خفیہ پناہ گاہ تک پہنچ جائیں گے۔

مرینہ نے جے پور سے دہلی کی فلائٹ کا ٹکٹ لیتے وقت ائرویز ایجنسی میں اپنا نام اور وہاں کا پتا لکھوایا ہوگا۔ ہمارے آدمی سب سے پہلے اس پتے پر جائیں گے۔''

ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔ "یہ کام ابھی ہونا چاہیے۔"

"ابھی مناسب نہیں ہے۔ مرینہ کو جہاز میں بیٹھ کر جانے دیں۔ یہاں اس کی موجودگی میں گڑبڑ ہوسکتی ہے۔"

"اسے ذرا بھی بھنک ملے گی کہ مراد کو جے پور میں تلاش کیا جارہا ہے تو وہ لندن نہیں جائے گی۔ واپس جے پور چلی جائے گی۔"

انہوں نے انتظار کیا۔ فلائٹ دس بجے روانہ ہونے والی تھی۔ وہ آٹھ بجے ائرپورٹ پہنچی۔ ادھر ہڈسن کے مسلح ماتحت جے پور کے ایک بنگلے میں پہنچ گئے۔ مرینہ نادان نہیں تھی۔ اس نے ٹکٹ لیتے وقت غلط پتا لکھا تھا۔ وہ لوگ وہاں پہنچ کر ناکام ہوئے تھے۔ اب مراد کو پورے علاقے میں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

ان کی سرگرمیوں نے چیپت راؤ اور درگا پرساد کو چونکا دیا تھا۔ انہوں نے فوراً ہی شانتا کو فون پر کہا کہ مراد کو تہ خانے میں پہنچادو۔ خطرہ ہے۔

یوں مراد اس تہ خانے میں پہنچ گیا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔ باہر قدم قدم پر موت تھی۔ حالات انتہائی سنگین تھے۔

مونیکا حالات کی سنگینی کو رنگینی میں بدلنے والی تھی۔ مراد نے دل سے توبہ کی۔ اپنے بدن کو لباس کو اور اپنی نیت کو پاک کیا تھا۔ نماز شروع کی تھی اب یہ ایمان سے سمجھنے والی بات تھی۔ پہلی نماز نے ہی اسے گناہ سے دور کردیا تھا۔ نہ وہ تہ خانے سے نکل کر اپنے کمرے میں جانے والا تھا' نہ رات کالی ہونے والی تھی۔ اب اس کی پارسائی کو کسی بھی طرح نقصان پہنچنے والا نہیں تھا۔

وسوسے اور اندیشے پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اس نے پریشان ہوکر سوچا۔ "آج تو بچ گیا۔ کل کیا ہوگا؟ میں ہمیشہ تہ خانے میں نہیں رہ سکوں گا۔ صبح تک خطرہ ٹل جائے گا تو اوپر اپنے کمرے میں جانا ہوگا۔ یا اللہ...! تب مونیکا سے کیسے پیچھا چھڑاؤں گا؟"

اب اسے اندر سے روشنی مل رہی تھی۔ جیسے الہام ہورہا تھا۔ اس کے ذہن میں بات آرہی تھی "جب طہارت سے' نیک نیتی سے اور نماز سے ایک رات کے لیے بلا ٹل سکتی ہے تو آئندہ نماز جاری رہے گی تو اسی طرح بلائیں ٹلتی رہیں گی۔"

یہ سیدھی سی بات سمجھ میں آنے والی تھی کہ نماز کے لیے پاکیزگی لازمی ہے اور پاکیزگی کے لیے لازمی ہے کہ دامن پر گناہ کا ہلکا سا دھبا بھی نہ پڑے۔

جنت کیسے بنی؟

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا۔

یارسول اللہ ﷺ جنت کس چیز سے پیدا کی گئی ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جنت کی تعمیر اس طرح ہوئی کہ ایک اینٹ سونے کی اور ایک اینٹ چاندی کی رکھی گئی اور ان اینٹوں کو تیز خوشبودار مشک سے بنے ہوئے مسالے سے جوڑا گیا، وہاں جو سنگریزے بچھے ہوئے ہیں وہ موتی اور یاقوت ہیں اور وہاں کی خاک گویا زعفران ہے۔ جو لوگ جنت میں پہنچیں گے وہ ہمیشہ عیش اور چین سے رہیں گے۔ انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انہیں موت نہیں آئے گی اور نہ ہی ان کے کپڑے پرانے اور خستہ نہیں ہوں گے اور ان کی جوانی کبھی زائل نہیں ہوگی۔

(جامع ترمذی، سنن الدارمی)

مرسلہ۔ طالب حسین طلحہ،

ہائی سیکیورٹی زون، نیو سینٹرل جیل ملتان

وہ دل کی گہرائیوں سے عہد کررہا تھا۔ ایسے وقت جیب میں رکھے ہوئے فون سے خاموش اشارہ موصول ہونے لگا۔ تہ خانے میں خاموشی لازمی تھی، ایک ذرا ہلکی سے آواز بھی اوپر پہنچ سکتی تھی اور دشمنوں کو متوجہ کرسکتی تھی۔ اسی لیے اس نے فون کو وائبریشن پر رکھا تھا۔ اسے جیب سے نکال کر دیکھا۔ چیپت راؤ میسج دے رہا تھا۔

اس نے بٹن دبا کر میسج کو پڑھا۔ اس نے لکھا تھا۔ "خطرہ بڑھ گیا ہے۔ فوراً تہ خانے سے نکل کر سرنگ میں جاؤ۔ وہاں سے گزرتے ہوئے آخری سرے کے دروازے پر آؤ۔ اسے کھول کر نکلو۔ میں وہاں انتظار کررہا ہوں۔ درگا پرساد کی کوٹھی نظروں میں آگئی ہے۔ تمہارا وہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ تمہیں وہاں سے دوسری جگہ منتقل کیا جائے گا۔ ابھی وہاں سے نکلو۔"

وہ میسج پڑھ کر حیران رہ گیا۔ اسے مونیکا سے اس جگہ سے ہمیشہ کے لیے نجات مل رہی تھی۔ وہ خوشی سے جھومتا ہوا سجدے میں گر پڑا۔

☆☆☆

چاروں طرف سے جکڑ بندی ہو۔ بندہ ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل نہ ہو۔ چار دیواری ایسی ہو کہ قبر کی طرح بند ہو۔ فرار ہونے کا ایک بھی دروازہ نہ ہو تو ایسی جگہ سے خدا ہی نکالتا ہے اور وہ نکل آیا۔ جہاں سے چیونٹی بھی نہیں نکل سکتی تھی۔ وہاں کی ایک سرنگ سے گزرتا ہوا تہ خانے کے پچھلے چور دروازے پر پہنچا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ اسے کھولتے ہی کھلے آسمان کے نیچے آگیا۔ کھلی فضا سے ہوا کے تازہ جھونکے آرہے تھے۔ اس نے ایک گہری لمبی سانس لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔

وہاں چمپت راؤ ایک ماتحت کے ساتھ لینڈ کروزر کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آؤ بیٹھو۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔ رام جانے دشمنوں نے کیسے تمہاری بو سونگھ لی ہے؟“

وہ اس کے ساتھ گاڑی کی اگلی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ ان کے چاروں طرف رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ایک تارکول کی سڑک کے اطراف دور تک بڑی بڑی کوٹھیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ چمپت راؤ نے گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”پتا نہیں دشمنوں کو کیسے تمہارا سراغ مل گیا ہے۔ اس پورے علاقے میں تمہیں تلاش کر رہے ہیں اور وہ بارڈر سیکیورٹی فورس والے نہیں ہیں۔“

مراد نے حیرانی سے پوچھا۔ ”پھر کون ہیں؟“

”ہم نے بڑی مغز ماری کے بعد معلوم کیا ہے یہ بلائے ناگہانی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق نہ ہم کبھی سوچ سکتے تھے۔ نہ تم سوچ سکتے ہو۔“

مراد اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔ ”مرینہ یہاں سے جانے سے پہلے تمہارے پاس تھی اور لندن MET ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر جنرل سے فون پر باتیں کر رہی تھی۔ کیا تم اس کی باتیں سن رہے تھے؟“

”ہاں۔ میں اس کی تمام باتیں سن رہا تھا۔“

”نہیں مراد...... تم سن رہے تھے مگر سمجھ نہیں رہے تھے۔ وہ اچانک فرانسیسی زبان بولنے لگی تھی۔“

”ہاں اُدھر ڈائریکٹر جنرل کے پاس ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ ڈائریکٹر نہیں چاہتا تھا کہ وہ ان کی پرائیویٹ گفتگو کو سمجھے اس لیے وہ فرنچ لینگویج بولنے لگی تھی۔“

”اوہ تو مراد! وہ نہیں چاہتی تھی کہ تم ان کی رازدارانہ باتوں کو سمجھو۔ وہ تمہارے سامنے تمہارے خلاف باتیں کر رہی تھی۔“

وہ بے یقینی سے بولا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”درگا پرساد کے بنگلے کے ہر کمرے اور کوریڈور میں خفیہ ریکارڈنگ سسٹم ہے۔ مرینہ فرانسیسی میں جتنی باتیں کر رہی تھی وہ سب ریکارڈ ہوگئی تھیں۔ میں نے اور درگا نے اس کا ترجمہ ہندی میں کرایا ہے، جانتے ہو وہ کیا بول رہی تھی؟“

وہ بتانے لگا کہ سنڈیکیٹ ریڈ الرٹ کے گن مین پاگلوں کی طرح مراد کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ انہوں نے کتنی ہی خطرناک تنظیموں اور انڈر ورلڈ کے ان داتاؤں سے پچاس لاکھ ڈالرز میں مراد کے سر کا سودا کیا ہے۔

MET کے ڈائریکٹر جنرل نے بھی ریڈ الرٹ والوں سے یہ سودا کیا ہے۔ وہ مرینہ سے کہہ رہا تھا کہ مراد کو اس کے حوالے کر دے۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ کو پچاس لاکھ ڈالرز کا فائدہ پہنچائے۔

اور مرینہ نے کہا ہے کہ وہ مراد کی دیوانی ہے یہ دیوانگی اس وقت ختم ہوگی جب وہ اس کے بچے کی ماں بنے گی۔

وہ ایک جونیئر مراد کو جنم دے کر اسے دھڑکنوں سے لگا کر مراد کو ڈائریکٹر جنرل کے حوالے کر دے گی۔

مراد ہکا بکا سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ”میں اس دشمن عورت پر بھروسا کرنے لگا تھا۔ اگر اس کی فرنچ لینگویج پکڑی نہ جاتی تو آگے جاکر بہت بڑا دھوکا کھانے والا تھا۔ یا میرے اللہ ...... اے میرے پاک پروردگار... میں گناہوں سے توبہ کر رہا ہوں اور تو مجھے سلامتی دے رہا ہے۔ تیرا شکر ہے۔ لاکھ لاکھ شکر ہے......“

چمپت راؤ نے کہا۔ ”مرینہ تمہارے معاملے میں جذباتی ہے۔ انتظار کر رہی ہے کہ تمہارا بچہ اس کی کوکھ میں آجائے لیکن ڈائریکٹر جنرل اس کے پاؤں بھاری ہونے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ دوسری خطرناک تنظیموں والے اور انڈر ورلڈ والے تم تک پہنچ کر پچاس لاکھ ڈالرز کے حقدار ہوجائیں گے۔ پچاس لاکھ ڈالرز معمولی رقم نہیں ہے۔ پتا نہیں کتنی خطرناک تنظیموں کے شوٹرز تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔

”ابھی ڈائریکٹر جنرل کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ تم مرینہ کے ساتھ جے پور میں ہو۔ اس کی سوچ یہ ہے کہ اگر ابھی تمہیں اپنی گرفت میں نہ لیا تو تم دوسروں کے ہتھے چڑھ جاؤ گے۔

”ڈائریکٹر جنرل مرینہ کو بھی دھوکا دے رہا ہے۔ اس کی

لاعلمی میں MET ڈیپارٹمنٹ کے جاسوس تمہیں یہاں تلاش کررہے ہیں۔ تمہاری قسمت اچھی ہے کہ ہم پہلے سے ہوشیار ہوگئے۔ آج رات وہ کسی وقت ڈرگا پرساد کی کوٹھی میں بھی پہنچ جائیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''یہ تمہاری دانش مندی ہے کہ تم نے فرنچ لینگویج کا ترجمہ کرایا اور محتاط ہوگئے۔ میں وہاں سے بچ کر آگیا ہوں۔ اگر میں غافل رہتا تو مرینہ سے دھوکا کھاتا رہتا۔ وہ پیار سے میرے ساتھ راتیں گزارتی رہتی پھر کسی دن ماں بننے کے آثار پیدا ہوتے تو مجھے قصائیوں کے حوالے کردیتی۔''

چمپت راؤ نے کہا۔ ''وہ ابھی جہاز میں ہوگی صبح لندن پہنچے گی۔ اگرچہ وہ خود تمہیں قاتلوں کے حوالے کرنا چاہتی ہے لیکن ماں بننے تک تمہاری سلامتی چاہتی رہے گی۔ یہ ہرگز نہیں چاہے گی کہ ڈائریکٹر جنرل اسے دھوکا دے کر تمہیں حاصل کرے۔''

مراد نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہوں۔ پھر تو مرینہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ دھوکا کھارہی ہے۔''

''جلدی نہ کرو۔ مرینہ کو اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ سے دھوکا کھانے دو۔ ابھی تمہیں سلامتی سے کسی پناہ گاہ میں پہنچنا ہے۔''

''کیا میں دہلی میں محفوظ رہ سکوں گا؟''

''نہیں۔ وہاں MET کا سیکرٹ ایجنٹ ہیلری ہڈسن ہے۔ اسی نے اپنے آدمیوں کو تمہاری تلاش میں یہاں بھیجا ہے۔

''ویسے میں تمہیں دہلی تک پہنچارہا ہوں۔ ہم صبح سے پہلے اندھیرے میں وہاں پہنچیں گے۔ کوئی دشمن تمہیں نہیں دیکھے گا۔ وہاں سے تم ٹرین میں گورکھ پور جاؤ گے۔

''میرا ایک آدمی تمہاری راہنمائی کے لیے ساتھ رہے گا۔ تم گورکھ پور سے بائی روڈ سناؤلی پہنچو گے وہاں سے تمہیں کھٹمنڈو جانا ہے۔ تمہارا گائیڈ راستوں کی پہچان کراتا جائے گا۔''

وہ پریشان ہوکر بولا۔ ''یعنی نیپال جارہا ہوں۔ میں تو اپنی ماروی سے ہزاروں میل دور ہوجاؤں گا۔''

''مجبوری ہے۔ مرینہ، ہیلری ہڈسن اور انٹیلی جنس والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم راجستھان میں کہیں چھپ کر رہو گے اور وہیں کی سرحد پار کرکے پاکستان جاؤ گے۔ یہ اچھا ہے، ہم انہیں اسی غلط فہمی میں رکھیں گے۔''

''میں اتنی دور سے پاکستان کیسے جاؤں گا؟''

''کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ تم دنیا کے آخری سرے سے بھی اپنی ماروی کے پاس جاسکو گے۔

''لیکن مراد...... ! جلدی نہ کرنا۔ حالات ناساز گار ہیں جلد بازی میں کہیں پھنسو گے تو ہم نکال نہیں سکیں گے۔ میں بھی تم سے ہزاروں میل دور رہوں گا۔ نیپال میں ماسٹر کو بوبو کا دوسرا دستِ راست ہوگا۔ وہ تمہارے کام آتا رہے گا۔ یہ دیکھو کہ تمہارے زخم نہیں بھرے ہیں تم لنگڑا کر چلتے ہو۔ اگر عشق کی نادانی میں کسی پناہ گاہ سے نکلو گے، دشمنوں کو اپنے پیچھے لگاؤ گے تو بری طرح پچھتاؤ گے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھاؤں گا۔''

''اب آرام سے لیٹ جاؤ۔ لمبا راستہ ہے۔ نیند پوری کرلو۔ پتا نہیں آگے کیسے حالات پیش آئیں گے۔ آگے تمہیں جاگتے ہوئے سفر کرنا ہے۔''

چمپت راؤ گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ وہ پچھلی سیٹ پر آکر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ اسے تھوڑی دیر میں ہی نیند آگئی۔

مرینہ نے بڑے پیار سے بڑی مکاریوں سے اسے جیت لیا تھا۔ اس کی خودسپردگی اور پیار کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ وہ اس پر اعتماد کرنے لگا تھا۔ عورتوں سے دور بھاگنے والے مرد کو تریا چلتر نے رفتہ رفتہ زیر کرلیا تھا۔

وہ اکیلا تھا اور ہر سمت سے موت کی للکار تھی۔ ایسے میں ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ اپنی ماروی کو خواب میں بھی نہ دیکھ سکا۔ نیند کی حالت میں بھی مضطرب رہا۔ چمپت راؤ نے اسے جھنجھوڑا تو آنکھ کھل گئی۔ اس نے کہا۔ ''اٹھو۔ ہم دہلی پہنچ گئے ہیں۔''

وہ اٹھ گیا۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ابھی دم توڑتی ہوئی رات کا اندھیرا تھا۔ ان کی لینڈ کروزر ریلوے اسٹیشن کے باہر ایک جگہ تاریکی میں کھڑی ہوئی تھی۔

ایک شخص نے آکر دروازے پر دستک دی۔ چمپت راؤ نے دروازہ کھول کر اسے اندر بلایا۔ اس سے مصافحہ کیا۔ پھر مراد سے تعارف کرایا۔ ''یہ مدھوکر ہے۔ تمہارے ساتھ کھٹمنڈو تک جائے گا۔''

مدھوکر نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی دو گھنٹے بعد یہاں سے ٹرین چلے گی۔ ہم سولہ گھنٹے میں گورکھ پور پہنچیں گے۔''

پھر اس نے کہا۔ ''میں تمہیں بتادوں۔ آج سے تمہارا نام سنجے ورما ہے۔ کھٹمنڈو میں اندر انگری ایک

علاقہ ہے۔ وہاں تمہارا ایک کاٹیج ہے۔ اس کاٹیج میں تمہاری ایک دھرم پتنی اپنے چار برس کے بچے سدھارت کے ساتھ رہتی ہے۔''

مراد نے پریشان ہو کر چھپت راؤ کو دیکھا۔ پھر کہا۔''میں کسی عورت کے ساتھ نہیں رہوں گا۔''

مدھوکر نے کہا۔''مرد ہو کر گھبراتے ہو۔ ویسے وہ تمہارے ساتھ نہیں سوئے گی۔ تم سے دور رہا کرے گی۔''

وہ بولا۔''مجھے منظور نہیں ہے۔ چار دیواری کے اندر تنہائی میں شیطان اسے بہکائے گا۔ ایسے میں اسے دھتکاروں گا تو وہ اپنی توہین محسوس کرے گی۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔''میں تم لوگوں کو سمجھا نہیں سکتا۔ چھپت راؤ...... اُدرگا پرساد کے گھر میں میرے ساتھ ایسا تماشا ہو چکا ہے۔ کسی دوسری جگہ میری رہائش کا انتظام کرو۔''

''فی الحال دوسری جگہ ممکن نہیں ہے۔ ہم نے اپنی سہولتیں دیکھی ہیں۔ ایک تو وہاں کے لوگ سنجے ورما کو چہرے سے نہیں پہچانتے ہیں۔ وہ دہلی میں رہتا تھا۔ اسی شہر میں اس کی موت ہوئی ہے۔ وہاں کوئی نہیں جانتا کہ اس کا دیہانت ہو چکا ہے۔ تم جاؤ گے تو گویا سنجے ورما پہلی بار وہاں جائے گا۔''

اس نے بیگ سے ایک شناختی کارڈ اور پاسپورٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔''لو اسے اچھی طرح دیکھو۔ یہاں سنجے ورما کی جگہ تمہاری تصویر ہے۔''

مراد نے پوچھا۔''میری تصویر کہاں سے مل گئی؟''

''تمہاری تصویر کہاں نہیں ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں تمہیں تلاش کرنے والے ہر قاتل کے ایک ہاتھ میں تصویر اور دوسرے ہاتھ میں گن ہے۔''

پھر اس نے مراد کو نئے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''سنجے! وہاں جو تمہاری دھرم پتنی ہے' وہ بہت ہی دھرم کرم والی ہے۔ پوجا پاٹ میں لگی رہتی ہے۔ وہ تمہیں ایک پتی کا مان مرتبہ دے گی لیکن تمہارے قریب نہیں آئے گی۔''

اسی وقت دور کہیں سے اذان کی آواز سنائی دی۔ مراد نے کہا۔''مجھے پانی چاہیے میں وضو کروں گا۔''

اسے منہ ہاتھ دھونے اور وضو کرنے کے لیے پانی دیا گیا۔ چھپت راؤ نے کہا۔''گاڑی کے اندر نماز پڑھو، باہر کوئی نہ دیکھے تو اچھا ہے تم ہمارے لیے اسی لمحے سے سنجے ورما ہو۔''

وہ وضو کرنے کے بعد لینڈ کروزر کے اندر جا کر نماز ادا کرنے لگا۔ وہ دونوں فکر مند تھے۔ نماز کے بعد مدھوکر نے کہا۔''وہاں تمہاری عبادت ہمارے لیے مسائل پیدا کرے گی۔''

چھپت راؤ نے کہا۔''کسی نے سنجے ورما کو نماز پڑھتے دیکھ لیا تو بھید کھل جائے گا۔ فوراً آنکھ بند کر کے کہا جائے گا کہ تم مسلمان ہو تو پھر پاکستانی جاسوس ہو۔''

مدھوکر نے اس کی طرف جھک کر کہا۔''ایسا کرو جب تک وہاں رہو عبادت نہ کرو۔''

مراد نے سخت لہجے میں کہا۔''یہ بات دوسری بار نہ کہنا۔ بھید کھل جائے' مسائل پیدا ہوں' موت میرے سامنے آ جائے تب بھی میں نماز پڑھوں گا۔''

نماز اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی۔ وہ اپنے رب سے وعدہ کر چکا تھا کہ ایک وقت کی بھی نماز نہیں چھوڑے گا۔

☆☆☆

بلّا کارونجھر کے پہاڑی علاقے میں پہنچا ہوا تھا۔ صحرائے تھر میں کارونجھر کا پہاڑی علاقہ بہت ہی سرسبز و شاداب ہے۔ ان پہاڑیوں کی بلندیوں سے چشمے اور آبشار گرتے ہیں۔ یہاں اٹھارہ میل کے فاصلے تک کئی چھوٹی بڑی جھیلیں ہیں جن کے سبب ہریالی رہتی ہے۔

بلّا وہاں تفریح کے لیے نہیں آیا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ عالی جناب اپنے غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ شکار کھیلنے وہاں گیا ہے۔ شکار کے سیزن میں بے انتہا امیر و کبیر شیخ وہاں شکار کھیلنے اور عیش و عشرت سے وقت گزارنے کے لیے کچھ روز کے لیے آیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس علاقے میں ایک محل نما شکارگاہ بنائی تھی۔ ان کے لیے یہ میزبان ملک بڑا اہتمام اور سیکیورٹی کے بڑے سخت انتظامات کرتا تھا۔

دنیا کے امیر ترین شیخ حضرات کے لیے ایک ہیلی پیڈ بنایا گیا تھا۔ وہ اپنے ملک سے ہیلی کوپٹر کے ذریعے وہاں آتے اور کچھ روز اس علاقے کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہو کر وہیں سے واپس چلے جاتے تھے۔ انہیں پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس قوم کو مسکین کہتے تھے۔

مراد کے حکم کے مطابق بلّا عالی جناب کو اوپر پہنچانے آیا تھا۔ وہ اب تک مراد سے تین لاکھ روپے لے چکا تھا اور بہت خوش تھا، آئندہ اس کے لیے جی جان سے کام کرنے والا تھا۔

اس نے عالی جناب کے ایک شوفر جمشید کو خرید لیا تھا۔ جو اس کا دوست بھی تھا۔ اس کے لیے مخبری کرتا

تھا۔ اسی نے بتایا تھا کہ عالی جناب ایک ہفتے کے لیے تھر کے علاقے کا دورہ کر رہا ہے۔ وہاں ایک رئیس اعظم شیخ کی میزبانی کرے گا۔

ان کا پروگرام یہ تھا کہ شیخ اپنے محل سے نکل کر ایک جھیل بھیم بھوڈا کے قریب خیموں میں رہے گا۔ جہاں وہ رہے گا، وہاں سے عام لوگوں کو گزرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

مسلح سپاہیوں نے دور تک اس علاقے کی ناکا بندی کی تھی۔ عالی جناب کے خاص خدمت گاروں کے پاس پلاسٹک کوٹڈ بیج تھے۔ وہ اس بیج کو گلے میں تعویز کی طرح پہن کر رہا کرتے تھے۔ اس طرح مسلح سپاہیوں کو دور سے معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ عالی جناب کے خدمت گار ہیں۔

بلّے نے جمشید کے ذریعے ایسا ہی ایک بیج حاصل کیا تھا اور اسے گلے میں ہار کی طرح پہن کر شیخ اور عالی جناب کے خیموں تک پہنچ گیا تھا لیکن وہاں سے دور چھپ کر رہتا تھا۔ کیونکہ عالی جناب کے شوٹرز اسے چہرے سے پہچانتے تھے۔

وہاں شکار کے سیزن میں مور، ہرن، بندر، سانبھر چیتل، تکور اور تیتر بٹیر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ عالی جناب اپنے مہمان اور اپنے شوٹرز کے ساتھ صبح خیموں سے نکل جاتا تھا۔ وہ شام تک شکار کھیلتے اور اندھیرا ہونے سے پہلے لوٹ آتے تھے۔

بلّے نے پہلے دن چھپ کر ان سب کو گولیاں چلاتے اور ہرن اور تیتر بٹیر کا شکار کرتے دیکھا۔ اس رات وہ ان کا گوشت بھون کر کھاتے اور مہنگی شراب پیتے رہے۔

بلّے نے سوچا تھا کہ دن کو شکار کھیلتے وقت جب گولیاں چلتی رہیں گی تب ہی آسانی رہے گی۔ وہ کہیں سے چھپ کر ایک گولی عالی جناب کے نام کر دے گا۔

اس نے پہلے دن دیکھ لیا۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ دن کی روشنی میں گولی چلا کر فرار ہوتا تو عالی جناب کے شوٹرز اور مسلح سپاہی اس کا پیچھا نہ چھوڑتے۔ اسے دوڑا دوڑا کر گولیوں سے چھلنی کر دیتے۔

بہت سوچ سمجھ کر وہ رات کی تاریکی میں پچھلے پہر عالی جناب کے خیمے کے پاس آیا۔ تمام شکاری دن بھر کے تھکے ہوئے تھے۔ شراب اور کباب سے شکم سیر ہو کر گہری نیند سو رہے تھے۔

بلّے نے دیکھا ہر خیمے کے باہر دو دو مسلح گارڈز جاگ رہے تھے۔ ایک خیمے کے آگے تھا۔ دوسرا پیچھے مستعدی سے ڈیوٹی پر تھا۔

وہ تاریکی میں رینگتا ہوا آیا تھا۔ اس نے عالی جناب کے خیمے کے قریب رک کر دور تک دیکھا۔ خیموں کے اندر زیرو پاور کے بلب روشن تھے بہت ہی دھیمی روشنی تھی۔ تمام خیمے ایک دوسرے سے پانچ یا چھ گز کی دوری پر تھے۔ وہاں مطلوبہ خیمے کے سامنے ایک گارڈ گن لیے کھڑا تھا۔

اس نے سائلنسر لگے ہوئے ریوالور سے نشانہ لیا اور اپنی مہارت کا ثبوت دیا۔ پچاک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ گارڈ کے حلق سے ایک کراہ نکلی اور وہ دھپ سے زمین پر گر پڑا۔

ایسی دھیمی آواز دوسرے خیموں کے گارڈز تک نہیں پہنچی۔ بلّے نے تھوڑی دیر تک انتظار کیا۔ کہیں سے کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی۔ وہ مطمئن ہو کر رینگتا ہوا گارڈ کی لاش کے پاس آ گیا۔ اس پر ایک نظر ڈال کر اسے یوں تھپکی دی جیسے شاباشی دے رہا ہو پھر اس کے قریب سے گزرتا ہوا خیمے کے اندر پہنچ گیا۔

وہ اپنے بیڈ پر خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ زندگی میں بھی انسان مردے کی طرح سوتا ہے۔ بیڈ کے نیچے قالین پر شراب کی بوتل پڑی تھی۔ کباب اور سلاد کی پلیٹیں سرہانے والی میز پر تھیں۔ وہ اس کی زندگی کا آخری دانہ پانی تھا۔

بلّے نے قریب آ کر ریوالور کی نال اس کے سینے پر رکھی۔ پھر اس کے اوپر تکیہ رکھا۔ ایک تو پہلے سے سائلنسر لگا ریوالور تھا۔ پھر تکیے کے باعث آواز ایک ذرا نہیں ابھری۔ اس نے دو بار ٹریگر کو دبایا۔ دو گولیاں اس کے سینے میں اتاریں۔ وہ اسی لمحے میں پھڑ پھڑا کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر وہ بیڈ کے نیچے چھپ کر خیمے کے پچھلے حصے کی طرف دیکھنے لگا۔

ادھر گارڈ زندہ تھا۔ ہلکی سی آہٹ بھی سن کر اندر آ سکتا تھا لیکن بھلا ہوا موت کی ہچکیاں وہاں تک نہیں پہنچیں۔ وہ مطمئن ہو کر بیڈ کے نیچے سے اٹھا۔ اس نے ایک تہ کیا ہوا کاغذ اس کی لاش پر رکھا اور رینگتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا۔

جس راستے سے جیسا محتاط ہو کر آیا تھا، اسی احتیاط سے واپس دو میل دور اپنی موٹر سائیکل کے پاس آ گیا۔ اسے اسٹارٹ کر کے جانے لگا۔ آگے پولیس چوکی پر اسے روکا گیا۔ اس نے عالی جناب کے شوٹر کا وہ بیج دکھایا۔ اس کے شوٹرز اور خدمت گار کسی نہ کسی کام سے آتے جاتے رہتے تھے۔ سپاہیوں نے کسی شک وشبے کے بغیر

اسے جانے کی اجازت دے دی۔

وہ بخیریت سلامتی سے نکل آیا لیکن آئندہ بخیریت رہنے والا نہیں تھا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے اسے شہر میں گرفتار کر سکتے تھے۔ آئندہ عالی جناب کے خدمت گار یہ گواہی دینے والے تھے کہ بلّے نے ان سے غداری کی تھی اور وہ مراد کا شوٹر بن گیا تھا۔ پاکستان میں مراد موجود نہیں ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں بلّے نے ہی عالی جناب کو ہلاک کیا ہے۔

وہ الزام سے بچ نہیں سکتا تھا۔ گرفتار ہو جاتا تو اس سے سچ اگلوانے کے لیے تھرڈ ڈگری کے حربے استعمال کیے جاتے۔ اسے اقرار کرنا پڑتا کہ اس نے عالی جناب کو قتل کیا ہے۔

بلّے نے واردات سے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ آئندہ کراچی میں نہیں رہ سکے گا۔ اس نے اپنی بلی کو اس کے رشتے داروں کے پاس شاہ کوٹ بھیج دیا تھا۔ خود بلوچستان کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں ایک ایسی جگہ تھی جہاں ایک بڑی رقم ادا کر کے پولیس اور انٹیلی جنس والوں سے محفوظ رہا جاتا تھا۔

وہ وہاں پہنچنے کے بعد مراد سے رابطہ کر کے کہنے والا تھا کہ اسے بھی اپنے پاس بلا لے۔ وہ بلی کے ساتھ چلا آئے گا۔ وہ بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ لیکن ہونا تو وہی تھا' جو مقدر میں لکھا تھا۔

دوسری صبح شکار گاہ میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ وہاں سے اسلام آباد تک اور بڑے بڑے سیاستدانوں تک فون چیخنے لگے۔ عالی جناب کی ہلاکت کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے فوراً ہی حرکت میں آ گئے۔ وہ مشکوک پیشہ ور مجرموں کو گرفتار کر رہے تھے اور بلّے کو بھی تلاش کر رہے تھے۔

عالی جناب کی لاش کے پاس ایک تہ کیا ہوا کاغذ پایا گیا تھا۔ اسے کھول کر پڑھا گیا جس پر لکھا تھا۔

''عالی جناب...... اتم یہ تحریر نہیں پڑھ سکو گے۔ دوسرے پڑھیں گے اور عبرت حاصل کریں گے۔ 'سنڈیکیٹ ریڈ البرٹ' کے سربراہ میکی البرٹ نے آخری سانسیں لیتے ہوئے تمہیں اپنے فون پر مخاطب کیا تھا۔ میں نے وہ فون لے کر تم سے کہا تھا کہ میکی کے بعد تمہاری باری ہے۔ اپنی سانسیں گنتے رہو۔

''لو آج گنتی ختم ہو گئی۔ اب تم عالی رہے نہ اعلیٰ۔ آپ رہے نہ جناب رہے۔ کیڑوں کی خوراک بننے جا رہے ہو۔''

عالی جناب نے میکی البرٹ کی ہلاکت کے بعد بیان دیا تھا کہ مراد ان کا جانی دشمن ہے۔ اس نے میکی کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ وہی مجھے مار ڈالنا چاہتا ہے۔ اس بیان کے پیش نظر یہ رائے قائم کی گئی کہ مراد نے ہی عالی جناب کو شکار گاہ میں آ کر قتل کیا ہے۔ اور اگر وہ پاکستان میں نہیں ہے' کہیں پڑوسی ملک میں ہے تو پھر قاتل اس کا دستِ راست بلّا ہے۔

☆☆☆

اچانک ہی مراد کا ارادہ بدل گیا۔ اس نے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے چمپت راؤ اور مدھو کر کو دیکھا پھر کہا۔ ''میں آج کھٹمنڈو نہیں جاؤں گا۔ ٹکٹ واپس کر دو۔''

دونوں نے حیرانی سے اسے دیکھا پھر چمپت راؤ نے کہا۔ ''اچانک ارادہ کیوں بدل رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''اگر MET کے جاسوس اور شوٹرز مجھے جے پور میں ڈھونڈ نکالتے اور گولی مار دیتے تو ابھی میں یہاں نہ ہوتا۔

''یہ تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لو کہ وہ مجھے گولی مار چکے ہیں۔ میں مر چکا ہوں۔ تمہارے دھرم کے مطابق آدمی مرنے کے بعد دوسرا جنم لیتا ہے۔'' اس نے دونوں سے پوچھا۔ ''لیتا ہے نا؟''

دونوں نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''تو پھر مرنے کے بعد میں نے ابھی نیا جنم لیا ہے۔''

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ اس نے کہا۔ ''یہ تمہارے لیے ہنسنے کی اور دشمنوں کے لیے رونے کی بات ہے۔ انہوں نے جے پور جا کر مجھے مار ڈالا اب میں نے انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے دوسرا جنم لیا ہے۔''

چمپت راؤ نے کہا۔ ''انتقام لینے کی بات نہ سوچو۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے دور چلے جاؤ۔ تمہارے بے شمار دشمن ہیں تم کتنوں سے انتقام لو گے۔''

''میں دشمنوں کے پیچھے نہیں جاؤں گا۔ جو آس پاس ہوں گے انہیں ٹھکانے لگاؤں گا۔''

وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔ ''یہاں میرا جانی دشمن MET کا سیکرٹ ایجنٹ ہیلری ہڈسن ہے۔ کل رات اسی نے اپنے شوٹرز کو میری ہلاکت کے لیے جے پور بھیجا تھا۔''

مدھو کر نے کہا۔ ''بے شک وہ تمہارا دشمن یہاں ہے۔ اس سے پھر کبھی نمٹ لینا۔ ابھی یہاں سے چلو۔''

''لندن کے MET ڈیپارٹمنٹ کو اور مرینہ کو مجھ سے

تو دشمنی کا جواب فوراً ملنا چاہیے۔ میں انہیں جواب دیے بغیر آگے نہیں جاؤں گا۔''

چیپت راؤ نے کہا۔''میں تمہیں رخصت کر کے واپس جانا چاہتا تھا۔ تمہاری وجہ سے دہلی میں رکنا پڑے گا۔''

''تم واپس جاؤ۔ میں یہاں پہاڑ گنج والی رہائش گاہ میں جا رہا ہوں۔ میری فکر نہ کرو۔''

مدھوکر ٹکٹ واپس کرنے چلا گیا۔ چیپت راؤ فکر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مراد نے پوچھا۔''کیا تم نے ماسٹر کو بوبو کو بتایا ہے کہ مرینہ اب بھی در پردہ میری دشمن ہے صرف میرے بچے کی ماں بننے تک دوستی نبھا رہی ہے؟''

وہ بولا۔''نہیں۔ میں تمہیں وہاں سے نکال کر لانے کے سلسلے میں الجھا ہوا تھا۔ ابھی بات کرتا ہوں۔''

اس نے ماسٹر کے نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر وائنڈ اسپیکر آن کر دیا۔ ماسٹر کو موجودہ حالات کی رپورٹ پیش کرنے لگا۔ یہ بتایا کہ مرینہ کیسی دہری چالیں چل رہی ہے اور میٹ کے شوٹرز مراد کو ہلاک کرنے جے پور گئے تھے۔

چیپت راؤ نے کہا۔''میں مراد کو یہاں لے آیا ہوں۔ نیپال میں اس کے چھپنے کے لیے مکمل انتظامات کر چکا ہوں لیکن۔''

اس نے مراد کو دیکھ کر کہا۔''یہ MET والوں کو اینٹ کا جواب پتھر سے دیے بغیر آگے نہیں جانا چاہتا۔ آپ کیا کہتے ہیں؟''

ماسٹر کو بوبو نے کہا۔''مراد میری باتیں سن رہے ہو؟''

اس نے کہا۔''یس ماسٹر!''

وہ بولا۔''بے شک اینٹ کا جواب پتھر سے دو لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہم ابھی مرینہ کو اندھیرے میں رکھیں۔ اسے معلوم نہ ہو کہ تم اس کی دوغلی چالبازیوں کو سمجھ گئے ہو۔ مراد ذرا سوچو۔ وہ MET آفیسر بن گئی ہے۔ ہم بہت سے اہم معاملات میں اس سے کام لیتے رہیں گے۔''

''آپ کہتے ہیں تو میں مرینہ کے سامنے اس کی اصلیت سے انجان بن کر رہوں گا۔''

''تم وہاں MET کے سیکرٹ ایجنٹ کو ہلاک کرو گے تو مرینہ آنکھ بند کر کے کہے گی کہ اسے تم نے ہلاک کیا ہے اور تم ان کے خفیہ ارادوں سے واقف ہو گئے ہو۔''

''میں اسے گولی نہ ماروں کوئی دوسرا اسے موت کے گھاٹ اتار دے گا تو کیا پھر بھی مجھ پر الزام آئے گا؟''

''وہاں کوئی اس کا دوسرا دشمن نہیں ہے۔''

''سیکرٹ ایجنٹ جس ملک میں جاتا ہے وہاں اس کے مخالفین پیدا ہو جاتے ہیں پھر یہ کہ میں ابھی مرینہ سے فون پر کہوں گا کہ جے پور میں میرے لیے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ چیپت راؤ نے مجھے اس پناہ گاہ سے نکال کر صبح کی فلائٹ سے کولکتہ پہنچا دیا ہے اور میں اب اسی شہر میں رہوں گا تب وہ اپنے MET ڈیپارٹمنٹ والوں کو یقین دلائے گی کہ مراد کولکتہ میں ہے اور ان کے سیکرٹ ایجنٹ ہیلری ہڈسن کا قتل دہلی میں ہوا ہے۔

''چونکہ MET کا ڈائریکٹر جان انتھونی جانتا ہے کہ مرینہ مجھے چھپا کر رکھتی ہے تو پھر اس کے بیان کے مطابق وہ یقین کرے گا کہ میں کولکتہ میں ہوں اور میں نے ہڈسن کو ہلاک نہیں کیا ہے۔''

ماسٹر نے کہا۔''ہاں اس طرح تم پر کوئی شبہ نہیں کرے گا۔ ایسا کرو کہ تم جلد سے جلد اس کا کام تمام کر کے وہاں سے نیپال جاؤ۔ تمہیں دہلی میں نہیں رہنا چاہیے۔''

''او کے سر! میں یہی کروں گا۔''

ماسٹر کو بوبو نے اجازت دے دی۔ مراد نے چیپت راؤ سے کہا۔''یہاں پہاڑ گنج میں میرے لیے جو بنگلا ہے میں وہاں رہوں گا۔ ایم این اے دھرم داس کے تعاون سے ہیلری ہڈسن کا پتا ٹھکانا معلوم کروں گا۔ آپ جے پور چلے جائیں۔ فکر نہ کریں۔ مدھوکر میرے ساتھ رہے گا۔''

چیپت راؤ نے کہا۔''تم یہاں مراد کے ساتھ رہو گے۔ یہ آج کل میں اپنے دشمن سے نمٹ کر تمہارے ساتھ نیپال جائے گا۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی گاڑی لے کر چلا گیا۔ مراد نے ایم این اے دھرم داس کو فون پر مخاطب کیا۔ وہ دیر تک سونے کا عادی تھا۔ رنگ ٹون سن کر آنکھ کھول دی۔ ناگواری سے جماہی لے کر فون پر پوچھا۔''کون ہے؟''

مراد نے کہا۔''میں بول رہا ہوں نوشاد علی۔''

وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔''ہاں مراد سوری نوشاد علی...... بولو کہاں ہو؟ اتنی صبح کیوں فون کیا ہے؟''

اس نے کہا۔''میں یہاں دہلی آیا ہوں۔ بنگلے کی صفائی کرائیں اور جب نیند پوری ہو جائے تو مجھے کال کریں۔ آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''نیند تو پوری ہو گئی سمجھو۔ اپنی ضروری بات بھی کر لو۔''

''فون پر نہیں بول سکتا۔''

''تو پھر ابھی آ جاؤ۔ ناشتا میرے ساتھ کرو۔''

''ٹھیک ہے۔ ابھی آ رہا ہوں۔''

وہ مدھوکر کے ساتھ ایک ٹیکسی کے ذریعے دھرم داس

کی شاندار کوٹھی میں پہنچ گیا۔ وہ ابھی بیدار ہو رہا تھا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انتظار کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بلایا۔ مراد نے مدعوکر سے کہا۔ "تم یہاں بیٹھو۔ یہ بڑے سیاستداں ہر ایک سے ملنے سے کتراتے ہیں۔ میں ابھی آجاؤں گا۔"

وہ اندر آیا تو دھرم داس ڈائننگ ٹیبل پر اس کا منتظر تھا۔ دھرم داس نے ملازم کو حکم دیا کہ ناشتے کی ٹرالی مدعوکر کے لیے لے جائے پھر مراد سے کہا۔ "آؤ بیٹھو۔ ناشتے کے ساتھ ساتھ ضروری باتیں بھی کرتے رہو۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہاں غیر ملکی سفارت خانے والوں سے آپ کے تعلقات ہوں گے۔"

"ہاں تعلقات رکھنا پڑتے ہیں۔ کتنے ہی ملک کے سفیر سفارت خانے کی آڑ میں غیر قانونی سرگرمیوں کو گرم رکھتے ہیں۔"

"انگلینڈ کے سفارت خانے میں ایک ہیلری ہڈسن نام کا آدمی ہے۔ اسے جانتے ہیں؟"

"ہاں وہ اپنے سفارت خانے کا منتظم ہے۔ کل رات اس پر کچھ لوگوں نے گولیاں چلائی تھیں۔ تقدیر اچھی تھی۔ ابھی زندہ سلامت ہے۔ غیر ملکیوں کے ساتھ ایسا ہو تو ہمارے دیس کی بدنامی ہوتی ہے۔"

مراد نے پوچھا۔ "ہیلری ہڈسن کیا کہتا ہے، اس پر کون لوگ حملہ کر رہے ہیں؟"

"اس کا بیان ہے کہ دی ڈینجرس ریکٹ کے خطرناک شوٹرز یہاں دہلی میں چھپے ہوئے ہیں۔ ایک معاملے میں MET ڈپارٹمنٹ والے دشمن ہوگئے ہیں۔ وہ ہیلری ہڈسن کو اس ڈپارٹمنٹ کا سیکرٹ ایجنٹ سمجھ کر اس پر ایک حملہ کر چکے ہیں۔ ہماری حکومت اسے پوری طرح سیکیورٹی دے رہی ہے۔"

مراد نے کہا۔ "یعنی وہ اپنے ملک کے سفارت خانے کا منتظم بھی ہے اور سیکرٹ ایجنٹ بھی؟"

دھرم داس نے کہا۔ "وہ انکار کرتا ہے، کہتا ہے کہ نہ جاسوس ہے نہ سیکرٹ ایجنٹ ہے۔ یہ بتاؤ تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے؟"

"دلچسپی یہ ہے کہ وہ واقعی سیکرٹ ایجنٹ ہے۔ وہ مجھے قتل کرانا چاہتا تھا۔ پچھلی رات اس کے شوٹرز مجھے جے پور میں تلاش کر رہے تھے۔ اسی لیے میں وہاں سے یہاں آیا ہوں۔"

"ہوں۔ میں نے پہلے ہی کہا ہے غیر ملکی سفارت خانے والے یہاں غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث رہتے ہیں۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ کیا تم اس سے نمٹنے کے لیے دہلی واپس آئے ہو؟"

"جی ہاں۔ آپ مجھے اس کا فون نمبر اور رہائش گاہ کا پتا بتائیں اور اس کے متعلق جو انفارمیشن دے سکتے ہیں دیں۔"

وہ بولا۔ "ابھی تو تمام عیسائی کرسمس ڈے منا رہے ہیں۔ کل پچیس دسمبر ہے۔ مسیح کی پیدائش کا دن ہے۔ وہ کل صبح چرچ جائے گا۔ دن کو عیسائی دوستوں سے ملاقاتیں کرتا رہے گا۔ رات کو ہال میں ناچنے گانے اور خوشیاں منانے کی تقریب ہے۔ ہماری طرف سے اسے سیکیورٹی دینے والے پریشان ہیں۔ کیونکہ کل رات فینسی ڈریس شو بھی ہے۔ عورتیں اور مرد طرح طرح کے بھیس بدل کر اپنے چہرے چھپا کر سرپرائز دیں گے کہ بوجھو تو جانیں ہم کون ہیں؟ ایسے موقع پر ہیلری ہڈسن کے دشمن بھی کسی بہروپ میں چھپ کر اسے قتل کرنے آسکتے ہیں۔"

مراد نے کہا۔ "پھر تو میرے لیے آسانی ہے۔ میں بھی کسی بھیس میں وہاں جاؤں گا تو ہڈسن مجھے پہچان نہیں سکے گا۔"

پھر اس نے فون پر جاسوس بھنڈاری سے رابطہ کر کے کہا۔ "میں دھرم داس جی کے بنگلے میں ہوں۔ ابھی آسکتے ہو؟"

"یس سر! ابھی آرہا ہوں۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ دھرم داس نے کہا۔ "میرا ملازم تمہارے بنگلے کی صفائی کر رہا ہے۔ جو کار تم استعمال کر رہے تھے وہ میرے گیراج سے آگئی ہے اور تمہیں کیسے ہتھیاروں کی اور کتنے ہتھیاروں کی ضرورت ہے بولو؟"

"میں شام تک بتاؤں گا۔ ابھی میرے پاس گن اور بلٹس ہیں۔ آپ ابھی ہیلری ہڈسن سے فون پر بات کریں۔ میں اس کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔"

دھرم داس نے ناشتے کے بعد چائے پیتے ہوئے فون پر اسے مخاطب کیا۔ اس نے کہا۔ "ہیلو مسٹر داس! آپ نے بڑی سخت سیکیورٹی کا انتظام کیا ہے۔ تھینکس تھینکس۔"

دھرم داس نے کہا۔ "کل کرسمس ڈے ہے۔ ہماری پریشانی بڑھ جائے گی۔ آپ مجھے آج ہی سے بتاتے رہیں کہ آپ کی مصروفیات کیا ہیں۔ آپ کن دوستوں اور رشتے داروں سے ملنے کہاں کہاں جاتے رہیں گے؟"

"میں آج باہر نہیں نکلوں گا۔ میرے دوست احباب

مجھ سے ملنے آتے رہیں گے۔ میں انہیں اچھی طرح پہچاننے کے بعد ہی بنگلے کے اندر آنے کی اجازت دوں گا۔

"میری بہن لیزا میرے ساتھ کرسمس ڈے منانے آئی ہے۔ وہ لی شہر گھومنا چاہتی ہے۔ آپ اس کے ساتھ دو مسلح باڈی گارڈز لگادیں۔ وہ دس بجے یہاں سے نکلنا چاہتی ہے۔"

دھرم داس نے کہا۔ "آپ وہاں ہمارے سیکیورٹی آفیسر کو حکم دیں۔ مس لیزا کے ساتھ دو باڈی گارڈز رہا کریں گے۔"

ہڈسن نے شکریہ کہہ کر رابطہ ختم کردیا۔ مراد نے چائے کا آخری گھونٹ پی کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "اس کی بہن ایک گھنٹے بعد گھر سے نکلنے والی ہے۔ آپ اس کی رہائش گاہ کا پتا بتائیں۔ ابھی میں کار نہیں لے جاؤں گا۔ مجھے ایک موٹر سائیکل کی ضرورت ہے۔"

اس نے ایک ملازم کو بلا کر حکم دیا۔ "گیراج سے ایک موٹر سائیکل لے آؤ۔ اسے اچھی طرح چیک کرو۔ اس میں کسی طرح کی خرابی نہ رہے اور اس کی ٹنکی فل کردو۔"

پھر وہ ڈرائنگ روم میں آئے۔ وہاں جاسوس بھنڈاری آگیا تھا۔ مراد نے کہا۔ "دھرم داس جی آپ ہڈسن کو سیکیورٹی دینے والی ٹیم سے بولیں کہ بھنڈاری بھی اسی ٹیم کا ایک جاسوس ہے۔ اسے ہڈسن کے قریب آنے جانے سے نہ روکا جائے۔

"اور تم بھنڈاری... ہڈسن اور اس کی بہن لیزا پر نظر رکھو گے۔ مجھے بتاتے رہو گے کہ وہ کہاں کہاں جارہے ہیں۔ کیا تمہارے پاس موٹر سائیکل ہے؟"

"یس سر! ابھی اپنی بائیک پر آیا ہوں۔"

"میں اپنی موٹر سائیکل پر رہوں گا تم ہڈسن کے بنگلے تک میرے ساتھ چلو۔ وہاں پہنچ کر مجھ سے دور ہو جاؤ گے۔"

پھر اس نے مدھوکر سے کہا۔ "تم گھر جا کر آرام کرو۔ میں ضرورت کے وقت تمہیں کال کروں گا۔"

وہ اپنے سیٹ اپ سے مطمئن ہو کر بھنڈاری کے ساتھ بنگلے سے باہر آیا۔ اپنی نئی موٹر سائیکل کا جائزہ لیا۔ پھر وہ دونوں اپنی اپنی بائیکس میں وہاں سے روانہ ہوگئے۔

مراد نے راستے سے ماسک خریدے تاکہ چہرہ چھپا سکے۔ پھر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ وہ ہیلری ہڈسن کے بنگلے سے کچھ دور پہنچ کر رک گئے۔ بنگلے کے احاطے کے باہر اور اندر مسلح سپاہی نظر آرہے تھے۔ وہ وہیں رک گیا، بھنڈاری اسے چھوڑ کر اس بنگلے کی طرف چلا گیا۔ دس بج رہے تھے۔ لیزا اس بنگلے سے نکلنے والی تھی۔ وہ موٹر سائیکل سے اتر کر اسے یوں چیک کرنے لگا جیسے اس میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی ہو۔ اس طرح کوئی اس پر شبہ نہیں کرسکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ ہڈسن کے ساتھ بنگلے سے باہر آئی۔ مراد نے اندازہ لگایا کہ وہی سیکرٹ ایجنٹ ہیلری ہڈسن ہے۔ وہ بہن کو چوم کر اسے پچھلی سیٹ پر بٹھا کر ادھر کا دروازہ بند کررہا تھا۔ دو گن مین اگلی سیٹ پر آگئے تھے۔ ان میں سے ایک ڈرائیو کرتا ہوا کار کو بنگلے کے احاطے سے باہر لے آیا۔ پھر ایک سمت تیز رفتاری سے جانے لگا۔

مراد نے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی پھر کچھ فاصلہ رکھ کر اس کار کے پیچھے جانے لگا۔ وہ ڈلہوزی روڈ پر تھے۔ اس نے دیکھا آگے جا کر ایک گاڑی ان کے پیچھے لگ گئی تھی۔ لیزا کو تاریخی عمارتیں دیکھنے کا شوق تھا۔ اس لیے پہلے اسی طرف جارہی تھی۔ دوسری گاڑی مسلسل ان کے پیچھے چلی جارہی تھی۔ اس پر شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ اور بہت سی گاڑیاں بھی آگے پیچھے چل رہی تھیں۔ یہ اندازہ ہوگیا کہ ہیلری ہڈسن کے دشمن اس کی بہن کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ یا اسے اغوا کرکے ہڈسن کو نشانے پر آنے کے لیے مجبور کرنا چاہتے ہیں۔

وہ کار پرانا قلعہ کے احاطے میں پہنچ کر رک گئی۔ وہاں لوگ اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ انہوں نے تعاقب کرنے والی گاڑی پر شبہ نہیں کیا۔ دونوں گارڈ کار کو روک کر اپنی طرف کے دروازے کھول کر باہر آئے۔ وہ لیزا کے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولنا چاہتے تھے۔

اسی وقت کار کے پیچھے رکنے والی گاڑی سے دو گن مین نے پھرتی سے نکل کر فائرنگ شروع کردی۔ لیزا کے گارڈز کو توقع نہیں تھی کہ عورتوں اور مردوں کی بھیڑ میں اچانک ان پر حملہ ہوسکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی گنیں سیدھی کرتے، موت نے انہیں سیدھا کردیا۔ وہ زمین پر گر کر سیدھے لیٹ گئے۔

وہاں دہشت پھیل گئی۔ مرد عورتیں بوڑھے اور بچے فائرنگ سے ہراساں ہو کر دور بھاگنے لگے۔ دو رائفل برداروں نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر لیزا کو پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ وہ رو رہی تھی اور مدد کے لیے چیخ رہی تھی۔ لیکن بندوق کے سامنے کوئی قریب آنے کی جرأت نہیں کررہا تھا۔

مراد نے اپنے چہرے پر ہاتھی کا ماسک پہن لیا تھا۔ جہاں تک گن فائٹنگ کا تعلق ہے، وہ تو اب ایسا ماہر شوٹر

ہو گیا تھا کہ دور سے بھی اپنے ٹارگٹ کا صحیح نشانہ لیتا تھا۔

وہ دونوں لیزا کو بڑی بے دردی سے کھینچتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف آرہے تھے۔ انہیں بھی توقع نہیں تھی کہ وہاں کوئی تیسرا بارود کا کھلاڑی ان سے ٹکرائے گا۔ اچانک ہی تڑاتڑ گولیاں چلیں۔ ایک گن مین اچھل کر گرا۔ لیزا اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ دوسرے گن مین نے پھرتی دکھانی چاہی لیکن مراد کے ریوالور سے گولیاں نکلتی جارہی تھیں۔ وہ بھی ایک گولی کھا کر گر پڑا۔

لیزا دیدے پھیلائے احسان مندی سے مراد کو دیکھ رہی تھی۔ تمام عورتوں اور مردوں نے صورتِ حال بدلتی دیکھی تو قریب آنے لگے۔ پھر مراد نے حیرانی سے دیکھا' وہ سب اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہے تھے اور سر کو جھکا رہے تھے۔ درحقیقت ان کے سامنے گنیش دیوتا کھڑے ہوئے تھے۔

ہندوؤں کے ایک دیوتا گنیش مہاراج کا سر ہاتھی کا ہے اور باقی جسم انسان کا ہے۔ وہ بڑی عقیدت سے گنیش دیوتا کو گنپتی بپا موریا کہتے ہیں۔ اس وقت مراد کا بھی جسم انسان کا اور سر ہاتھی کا تھا۔ وہ لوگ اسے گنیش دیوتا کا اوتار مان کر اس کے آگے ہاتھ جوڑ رہے تھے اور سر جھکا رہے تھے۔ ان کے عقیدے کے مطابق گنیش دیوتا لیزا کی رکھشا کرنے آگئے تھے۔

مراد نے دیکھا فائرنگ کے نتیجے میں لیزا کی کار کا ایک پہیا بے کار ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''یہاں اور بھی دشمن آسکتے ہیں۔ فوراً یہاں سے نکلو۔''

وہ بولی۔ ''میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں؟''

وہ بولا۔ ''شکریہ بعد میں ادا کر لینا۔ اپنی سلامتی دیکھو اور فوراً چلو۔''

وہ اپنی گاڑی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میری کار... بے کار ہو گئی ہے۔ میں ابھی فون کرتی ہوں۔''

''تمہارے مددگاروں کے آنے تک دشمن آجائیں گے۔ کیا میری موٹر سائیکل چلا سکو گی؟''

اس نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں تمہارے ساتھ یہاں سے دور نکل جاؤں گی لیکن تم کیوں نہیں چلاؤ گے؟''

''میں تعاقب کرنے والے دشمنوں پر نظر رکھوں گا اور پیچھے بیٹھ کر فائر کرتا رہوں گا تو کوئی تمہارے قریب نہیں آسکے گا۔''

وہ متاثر ہو کر بولی۔ ''تھینکس اے لاٹ۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔''

یہ کہتی ہوئی وہ موٹر سائیکل پر آکر بیٹھ گئی۔ اسے کک مار کر اسٹارٹ کیا۔ مراد اس کے پیچھے آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''سیدھی اپنے بنگلے کی طرف چلو۔''

''میں یہاں کے راستے نہیں جانتی ہوں۔''

''میں گائڈ کرتا رہوں گا۔''

وہ موٹر سائیکل کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''تم کون ہو' تم نے اپنا چہرہ چھپا کر دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ کیا یہاں کے لوگ تمہیں جانتے ہیں؟ وہ سب ہی تمہارے سامنے سر جھکا کر ہاتھ جوڑ رہے تھے۔''

وہ بولا۔ ''وہ سیدھے سادے لوگ ہیں۔ اس ہاتھی کے ماسک کو پوج رہے تھے۔ ان کی بات چھوڑ دو۔ اپنے گھر والوں کو مدد کے لیے کہیں بلاؤ۔''

''ہاں۔ میں بھائی کو کال کروں گی۔''

وہ بولا۔ ''آگے مولانا آزاد روڈ پر ایک وومن کلب ہے وہاں عورتوں کے درمیان محفوظ رہو گی۔ میں تمہیں اس کلب کے دروازے پر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ تم ابھی کال کرو۔''

''میں گاڑی چلاتے ہوئے فون نہیں کر سکوں گی۔''

''اپنا فون مجھے دو۔''

''میرے ہینڈ بیگ میں ہے۔''

ہینڈ بیگ اس کے شانے سے لٹکا ہوا تھا۔ وہ بڑی دیر سے اس کے بدن کی آنچ محسوس کر رہا تھا لیکن پھسلنا بھول گیا تھا۔ بڑے اعتماد سے ہوس کو نظر انداز کر رہا تھا۔ اس نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر اس کا فون نکالا۔ پھر کالنگ لسٹ پر اس کے بھائی ہڈسن کا نام پڑھ کر ایک بٹن کو دبایا۔ دوسری طرف کالنگ ٹون جانے لگی۔

اس نے فون کو لیزا کے کان سے لگا کر کہا۔ ''اپنے بھائی سے بات کرو۔''

اس نے ہڈسن کی آواز سن کر کہا۔ ''برادر! دشمنوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ دونوں گارڈز مارے گئے ہیں۔ وہ لوگ مجھے اغوا کرنا چاہتے تھے ایک فرشتے نے مجھے بچا لیا ہے۔''

ہڈسن یہ سن کر پریشان ہو رہا تھا۔ پہلے سے یہ اندیشہ تھا کہ دشمن اس کی بہن کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن بہن نے دہلی شہر دیکھنے کی ضد کی تھی اور اب اندیشہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''میں مولانا آزاد روڈ کے چوراہے کے پاس وومن کلب میں ملوں گی۔ تم فوراً آؤ۔''

''ابھی آرہا ہوں۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ لیزا نے مراد سے کہا۔ ”بات ہو گئی ہے۔ میرا بھائی آرہا ہے۔“

وہ یہی چاہتا تھا کہ ہڈسن اس کے نشانے پر آجائے۔ ویسے وہ تنہا آنے والا نہیں تھا۔ اگر پوری سیکیورٹی کے ساتھ آتا تو مراد اسے گولی مار کر فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے مسلح گارڈز پیچھے پڑ جاتے۔

وہ سہولت سے اور اس اعتماد سے گولی مارنا چاہتا تھا کہ اسے ناکامی نہ ہو اور وہ گرفت میں بھی نہ آئے۔

لیزا نے ڈومن کلب کے سامنے پہنچ کر گاڑی روک دی۔ دونوں اتر گئے۔ وہ بڑی عقیدت سے اور بڑے جذبے سے قریب آکر اس سے لگ گئی۔ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ ان ظالموں سے مجھے کوئی بچانے والا نہیں تھا۔ تم فرشتہ بن کر آئے ہو۔ آئی ایڈ مائر یو...... میں چاہتی ہوں تم مجھے کس کرو۔“

وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ ”سوری۔ مائنڈ نہ کرنا۔ میں عورتوں سے دور رہتا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں تمہاری عزت کروں گی۔ بائی دا وے اپنی صورت تو دکھاؤ۔“

”پھر ایک بار سوری۔ تم بہت اچھی ہو۔ وعدہ کرتا ہوں پھر کسی دن ملاقات ہوگی تو یہ صورت ضرور دکھاؤں گا......“

اس نے ایک کک مار کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ وہ بولی۔ ”کہاں جا رہے ہو؟ تمہیں میرے بھائی سے ملنا چاہیے۔ پلیز ہم سے دوستی کرو۔“

”زیادہ باتیں نہ کرو۔ فوراً اندر جاؤ۔ کہیں سے کوئی گولی آسکتی ہے۔ میں یہیں رہوں گا۔ تمہارے بھائی سے ملوں گا۔“

اسے اپنی زندگی عزیز تھی۔ فوراً ہی کلب کے احاطے کے اندر چلی گئی۔ مراد نے وہاں سے دور جاتے ہوئے ماسک کو اتار دیا۔ ایک ایسی جگہ رک گیا جہاں سے وہ ہڈسن اور لیزا کو دیکھ سکتا تھا۔

اس کا دشمن ہڈسن تھا۔ لیزا نہیں تھی۔ اس لیے اس نے ایک لڑکی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دو گاڑیاں آکر ڈومن کلب کے سامنے رکیں۔ ہیلری ہڈسن دس مسلح سپاہیوں کے ساتھ آیا تھا۔ گویا فوج لے کر آیا تھا۔

مراد نے سمجھ لیا کہ وہاں خطرات سے دوچار ہو کر دشمنی نکالنی ہوگی اور یہ مناسب نہیں ہے۔ آئندہ اور مواقع ملیں گے۔ وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے وہاں سے چلا گیا۔ لیزا کلب کے اندر تھی۔ بھائی کو مسلح فوج کے ساتھ دیکھتے ہی باہر آگئی۔ بھائی کے گلے لگ کر بولی۔ ”وہ فرشتہ کہاں ہے؟“

ان سب نے دور دور تک دیکھا۔ کوئی موٹر سائیکل اور ہاتھی کے ماسک والا نظر نہیں آرہا تھا۔ ہڈسن نے کہا۔ ”تعجب ہے۔ وہ کہاں چلا گیا ہے؟ اس نے تمہاری جان بچائی ہے۔ اسے مجھ سے ملنا چاہیے تھا۔ میں بھی اس کا شکریہ ادا کرتا۔“

وہ بولی۔ ”کچھ عجیب سا آدمی تھا۔ میں نے اسے کس کرنے کو کہا تو اس نے معذرت چاہی۔ وہ عورتوں سے دور بھاگتا ہے۔ میں نے تو اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟“

”ہاں برادر! اس نے ہاتھی کا ماسک پہنا ہوا تھا۔ میں نے صورت دکھانے کو کہا تو اس نے ٹال دیا۔“

ہڈسن نے متفکر ہو کر کہا۔ ”وہ ہمارے دوستوں اور دشمنوں میں سے کوئی پراسرار شخص ہے۔ وہ منہ چھپاتا رہا ہے۔ مجھے سمجھنا چاہیے اس کی ضرور کوئی وجہ ہوگی۔“

وہ خاص وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر اپنے بنگلے کی طرف جانے لگے۔ ایسے وقت MET کے ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ ”ہیلو ہڈسن! ڈینجرس ریکٹ کے شوٹرز کو گرفتار کیا گیا ہے یا نہیں؟“

وہ بولا...... ”انڈین پولیس نے ہمارے ایک بھی دشمن کو گرفتار نہیں کیا ہے۔ ان کے حوصلے بڑھ گئے ہیں۔ انہوں نے ابھی میری بہن لیزا کے دو باڈی گارڈز کو ہلاک کیا ہے۔“

جان انتھونی نے کہا۔ ”او گاڈ! لیزا خیریت سے ہے؟“

”وہ اسے اغوا کرنا چاہتے تھے۔ اچانک ایک شخص نے آکر اسے بچایا ہے۔ اس اکیلے نے ان دشمنوں کو جہنم میں پہنچایا ہے۔“

”پھر تو وہ انعام کا مستحق ہے۔ کون ہے وہ؟“

”کوئی پراسرار شخص ہے۔ اس کے چہرے پر ماسک تھا۔ اس نے اپنا نام بھی نہیں بتایا۔ مجھ سے ملاقات بھی نہیں کی۔“

”تعجب ہے‘ وہ کون ہو سکتا ہے۔ کہیں یہ ڈینجرس ریکٹ والے دہری چالیں تو نہیں چل رہے ہیں۔ ذرا سوچو‘ انہوں نے ایک طرف لیزا کو اغوا کرایا۔ دوسری طرف اسے بچا کر شاید تمہارا اعتماد حاصل کر رہے ہوں۔“

"لیزا کو اغوا کرنے والے ان کے دو شوٹرز مارے گئے ہیں۔ وہ اپنے آدمیوں کی قربانی نہیں دیں گے۔"

"ہوسکتا ہے وہ ہلاک ہونے والے ڈینجرس ریکٹ کے خاص کارندے نہ ہوں اور... کرائے کے انڈین شوٹرز قربانی کے بکرے بن گئے ہوں۔ سنبھل کر رہو۔ تمہیں اس فرشتہ بن کر آنے والے سے ہوشیار رہنا ہوگا۔"

"میں ہمیشہ محتاط اور چوکنا رہتا ہوں۔ آپ یہ بتائیں کہ ڈینجرس ریکٹ والے اچانک ہمارے دشمن کیوں بن گئے ہیں؟"

ڈائریکٹر جنرل نے کہا۔ "ڈینجرس ریکٹ کے... سربراہ نے مجھے فون پر کہا تھا کہ میں اسے مراد علی منگی کا پتا بتاؤں۔ اسے یہ معلوم ہوگیا ہے کہ مرینہ نے مراد کو کہیں چھپا کر رکھا ہے اور وہ اسے MET کے حوالے کرنے والی ہے۔"

"تعجب ہے انہیں اندر کی یہ بات کیسے معلوم ہوگئی؟"

"سب ہی کے اپنے خفیہ ذرائع ہوتے ہیں۔ انہوں نے کسی طرح معلوم کرلیا ہوگا۔ تب ہی ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ڈینجرس ریکٹ کے سربراہ ڈی بلیک نے کہا ہے کہ تم دہلی میں مراد کے آس پاس کہیں بھٹک رہے ہو۔ یا اپنی میٹ آفیسر مرینہ کی غیر موجودگی میں مراد کی نگرانی کر رہے ہو۔

"اس نے کہا تھا' اگر پچاس لاکھ ڈالرز میں انہیں حصہ نہ دیا گیا تو وہ تمہیں گولی ماردیں گے۔ اور تم دیکھ رہے ہو۔ میں نے حصہ دینے سے انکار کیا ہے تو وہ تمہاری جان کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔"

"سر! یہ مراد علی منگی کیا ہے؟ دیکھتے دیکھتے ذرّے سے پہاڑ بن گیا ہے۔ جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے تمام خطرناک مجرم اور قاتل پچاس لاکھ ڈالرز کے لیے اس کی تصویر ہاتھ میں لیے گھوم رہے ہیں اور وہ کسی کو نظر نہیں آرہا ہے۔"

جان انتھونی نے کہا۔ "ہمیں بھی... نظر تو نہیں آیا تھا اس کی بو سونگھنے کو ملی تھی کہ مرینہ اسے جے پور میں چھوڑ کر گئی ہے۔"

"سر! وہ یقیناً وہاں تھا لیکن بہت پھرتیلا ہے ہمارے آدمیوں کے پہنچنے سے پہلے فرار ہوگیا ہے۔ اب ہمیں بھی اس کا سراغ نہیں ملے گا۔"

"یہ ہوسکتا ہے کہ وہ دہلی آگیا ہو۔ اس سے ہوشیار رہو۔ مرینہ یہاں لندن پہنچ گئی ہے۔ اس نے فون پر کہا ہے کہ ایک تھیلے کے اندر مجھ سے ملنے آرہی ہے۔"

"سر! مراد نے اسے ضرور بتایا ہوگا کہ وہ جے پور سے نکل کر کہاں چھپنے گیا ہے؟"

"ہاں لیکن یہ حرافہ ہمیں نہیں بتائے گی کہ وہ کہاں ہے؟ ہمیں اپنے طور پر تلاش کرنا ہوگا یا پھر انتظار کرنا ہوگا کہ مراد کا بچہ اس کے پیٹ میں آجائے۔"

"سر! وہ پاگل ہے۔ مراد کے بدن سے لگے رہنے کے لیے جنونی ہوگئی ہے۔ اگر وہ ایک بیٹی کو جنم دے گی تو آپ سے کہے گی کہ مراد کا ایک بیٹا پیدا کرنے دو۔ اس طرح ہم دو چار یا چھ برس تک پچاس لاکھ ڈالرز کا انتظار کرتے رہ جائیں گے۔"

"ہوں۔ وہ کمبخت یہی کرے گی۔ مراد کے بچے پیدا کرتی رہے گی اور ہمیں انتظار کراتی رہے گی۔ پچاس لاکھ ڈالرز خواب میں نظر آنے والی رقم ہے لیکن ہم اسے خواب نہیں رہنے دیں گے۔

"مرینہ ہمارے قریب رہا کرے گی تو ہم جلد ہی اپنی حکمت عملی سے مراد تک پہنچ جائیں گے۔ بہرحال تم محتاط رہو۔ میں پھر کسی وقت کال کروں گا۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ لیزا نے گھر پہنچ کر کہا۔ "برادر! وہ فرشتہ غیر معمولی شخص تھا۔ وہ عوام میں بہت مقبول ہے۔ تم یقین نہیں کرو گے' وہ اتنا مقبول ہے کہ پرانا قلعہ میں جتنے لوگ تھے وہ سب اس کے سامنے سر جھکا کر ہاتھ جوڑ رہے تھے۔"

وہ بولا۔ "میں حیران ہوں۔ اس نے دشمنوں سے تمہیں بچایا ہے لیکن مجھ سے ملاقات نہیں کی۔ اسے محض فرشتہ نہ سمجھو۔ اگر وہ ہم سے ملے گا اور دشمن نہیں ہوگا تو ہم اسے ضرور گلے لگائیں گے۔"

"میں نے اسے کس کرنے کو کہا تھا' اس نے انکار کردیا۔ میں بہت توہین محسوس کررہی ہوں لیکن غصہ نہیں دکھا سکتی۔ اس نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔"

"لیزا......! تمہیں جذباتی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس سے فری نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"اس نے میری جان بچائی ہے۔ مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ کیا میں اسے انعام بھی نہ دیتی؟ ہماری تہذیب میں ایک دوسرے کو کس کرنا معیوب اور ممنوع تو نہیں ہے۔"

"اچھا جاؤ۔ بحث نہ کرو۔ کل ہمارا مقدس اور مبارک دن ہے۔ ہمیں خطرات کے باوجود خوشیاں منانی ہیں۔ ٹھوس پلاننگ کرنے دو۔"

وہ اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ ہڈسن سوچنے لگا۔ یہ عورتیں کیا ہوتی ہیں؟ کسی کی جواں مردی سے متاثر ہوجاتی ہیں۔ وہ ناگواری سے سر ہلا کر دوسرے دن کرسمس ڈے منانے کے متعلق سوچنے لگا۔

☆☆☆

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عورت جسے اپنا تن من دے دیتی ہے اس کے بچے کو اپنی کوکھ میں رکھ کر جنم دینے کی شدید خواہش رکھتی ہے اور ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو شادی سے پہلے ہی اپنے دلدار کے بچے کو کلیجے سے لگالیتی ہیں۔ ایسی ایک پاگل عورت ماروی بھی تھی۔

اسے عورت نہیں کہنا چاہیے۔ ابھی کنواری تھی۔ مراد کے بچے کو دھڑکنوں سے لگائے رکھتی تھی۔ وہ رات کو اسے اپنے پہلو میں سلاتی تھی۔ منی چاچی اسے سکھا رہی تھی کہ کس طرح بچوں کو پالنا چاہیے۔ بچے منہ سے بول نہیں پاتے لہٰذا ان کی گونگی حرکتوں سے اور ان کے رونے سے کس طرح ان کی ضرورت کو سمجھنا چاہیے۔

مراد نامعلوم مدت کے لیے جدا ہوگیا تھا۔ اس کے بیٹے نے سینے سے لگ کر اس کی جدائی کا غم ہلکا کر دیا تھا۔ اس لیے وہ ننھے شہزاد علی منگی کو اپنے بدن سے لگائے پھر رہی تھی۔ دوسری طرف محبوب ابھی تک نامراد تھا۔ وہ ہر روز اپنے دفتر سے دوپہر کو لنچ کے لیے ماروی کے پاس آتا اور ہر روز اپنے رقیب کے بیٹے کو اس کے سینے سے لگا ہوا دیکھتا تھا۔

وہ بہ ظاہر اس کی خوشی میں خوش تھا لیکن اندر سے یہ سمجھتا تھا کہ وہ مراد کو سینے سے لگائے رہتی ہے۔ بے چارہ کس دل سے برداشت کرتا تھا یہ وہی جانتا تھا۔

ماروی نے کھانے کی میز پر پوچھا۔ ''آج آپ دیر سے کیوں آئے ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''مراد نے اور زیادہ الجھا دیا ہے۔ حماد کہہ رہا تھا کہ اب وہ پاکستان نہیں آسکے گا۔''

ماروی نے اس کی طرف پلیٹ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ کیوں نہیں آسکے گا؟''

''اس نے برسرِ اقتدار پارٹی کے ایک بہت بڑے سیاسی لیڈر عالی جناب کو قتل کیا ہے؟''

وہ بے یقینی سے بولی۔ ''وہ خوامخواہ کسی سیاستداں کو کیوں ہلاک کرے گا؟''

''وہ مراد کا دشمن تھا۔ اسی نے مراد کو یہاں سے جان بچا کر ہندوستان تک بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔''

''پھر تو اس نے اپنے جانی دشمن کو ہلاک کیا ہے۔ اگر نہ کرتا تو وہ دشمن اس کی جان لے سکتا تھا۔''

محبوب نے کہا۔ ''لیکن اس کا نتیجہ دیکھو کہ ایک بڑے سیاستداں کا قاتل کہلا رہا ہے۔ حالات کیسے بدل جاتے ہیں؟ اس نے ہمارے ملک کے دشمن برنارڈ کو قتل کر کے نیک نامی حاصل کی تھی۔ محبِ وطن کہلا رہا تھا اب اس کے برعکس ایک قتل کا مرتکب ہونے والا مجرم بن گیا ہے۔''

ماروی پریشان ہوکر سن رہی تھی۔ محبوب کہہ رہا تھا۔ ''وہ جب بھی پاکستان کی زمین پر قدم رکھے گا' اسے گرفتار کرلیا جائے گا۔ اسے سزائے موت ہوگی یا عمر قید کی سزا ملے گی۔ اس کی رہائی ناممکن ہوجائے گی۔''

وہ کرسی کے ساتھ پیچھے سرکتی ہوئے بولی۔ ''آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔''

''اپنے دل کو سمجھاؤ۔ اس نے خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ جب وہ بارڈر پار جاچکا تھا اسے عالی جناب سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا تو پھر یہاں اسے قتل کرنا کیا ضروری تھا؟''

ماروی نے چونک کر کہا۔ ''ارے ہاں۔ وہ تو انڈیا میں ہے' یہاں قتل کرنے کیسے آئے گا؟ اگر وہ آتا تو میرے پاس ضرور آتا۔''

''وہ وہاں سے یہاں اسے قتل کرنے خود نہیں آیا تھا۔ اس کے تابعدار بلے نے اسے ہلاک کیا ہے۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے اسے بھی تلاش کررہے ہیں۔

''ماروی! یہ سمجھ لو کہ مراد اور بلا دونوں ہی ایک قتل کے جرم میں پکڑے جائیں گے چونکہ مراد سے عالی جناب کی دشمنی تھی اس لیے مراد کو ہی اس کا قاتل کہا جارہا ہے۔ سزائے موت یا سزائے عمر قید مراد کو ہی ہوگی۔''

ماروی نے ایک ہی لقمہ کھایا تھا۔ پھر کھانا حرام ہوگیا۔ اب اس کے حلق سے پانی بھی نہیں اتر سکتا تھا۔ اس نے کھانے کی پلیٹ سامنے سے ہٹادی۔

محبوب نے کہا۔ ''مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں نے پہلے خبر سنادی۔ یہ باتیں بعد میں کرتا تو تم پیٹ بھر چکی ہوتیں۔''

وہ بولی۔ ''آپ کھائیں۔ میری فکر نہ کریں۔ میں آپ کے سامنے بیٹھی رہوں گی۔''

وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''تم بھوکی رہوگی اور میں کھاتا رہوں گا؟ یہ تو کبھی ہو نہیں سکتا۔''

اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے بڑے دکھ سے پوچھا۔ ''کیا وہ کبھی یہاں نہیں آسکے گا؟''

میری باتوں سے تمہارا دل ٹوٹ رہا ہے مگر مجبوراً بولنا پڑتا ہے۔ کبھی نہیں آسکے گا۔ آئے گا تو تمہیں اپنی صورت دکھانے سے پہلے ہی گرفتار ہو جائے گا۔"

"میں ابھی اسے فون کرتی ہوں۔ وہ یہاں نہ آئے۔ میں اس کے پاس جاؤں گی۔"

وہ اپنا فون اٹھا کر اس کے نمبر پنچ کرنا چاہتی تھی۔ محبوب نے کہا۔ "تم وہاں کیسے جاؤ گی؟ اگلے ماہ کی دو تاریخ کو ہماری شادی ہے۔ اپنا وعدہ یاد رکھو۔"

ماروی نے ایسے چونک کر دیکھا جیسے وعدہ بھول گئی تھی۔ مراد ایسا سر میں سمایا تھا کہ وہ سب کو بھول جاتی تھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "وہ مشکل میں ہے۔ یہاں آنے کا راستہ رک گیا ہے۔ ابھی آپ شادی کی بات نہ کریں۔"

"میں شادی کی بات نہ کروں۔ بھول جاؤں؟ تمہارے وعدے کا ایک مہینا گزر جائے گا۔ وہ نہیں آئے گا تب بھی تم یہی کہو گی کہ میں شادی کی تاریخ بھول جاؤں۔"

"آپ ناراض نہ ہوں۔ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں نہیں بھولوں گی۔ مجھے اس سے بات کرنے دیں۔"

اس نے مراد کے نمبر پنچ کیے پھر اس کی آواز سننے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ لیزا کو دو من کلب میں پہنچا کر اپنے بنگلے میں آیا تھا اور لمبی تان کر سو رہا تھا۔ فون قریب ہی بیڈ پر پڑا تھا۔ اس نے رنگ ٹون کو سنتے ہی آنکھیں کھول دیں۔

نیند کا مزہ آ رہا تھا لیکن اسکرین پر ماروی کا نام پڑھ کر اور مزہ آگیا۔ اس نے فوراً ہی بٹن دبا کر کہا۔ "بولو میری جان! تم حالات کے جہنم میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہو۔"

وہ ناراضی سے بولی۔ "لگاوٹ کی باتیں نہ کرو۔ یہ بتاؤ تم نے عالی جناب کو قتل کیوں کرایا؟"

وہ ذرا چپ رہا۔ پلے نے اسے فون پر کہا تھا کہ عالی جناب کو جہنم میں پہنچا چکا ہے۔ اب بلوچستان کی طرف جا رہا ہے۔ کہیں پناہ ملتے ہی اس سے فون پر بولے گا۔

ماروی نے پوچھا۔ "چپ کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟ کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہاں آؤ گے تو تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ تمہیں سزائے موت سنائی جائے گی۔"

اس نے کہا۔ "تم ان معاملات کو نہیں سمجھو گی۔ میں اسے قتل نہ کراتا تو وہ مجھے پاکستان آتے ہی قتل کرا دیتا۔"

"اب کیسے آؤ گے؟ تم نے دشمن کو تو مار دیا ہے لیکن اپنے واپس آنے کا راستہ بھی بند کر چکے ہو۔"

اس نے ایک ہاتھ سے سر پکڑ کر کہا۔ "میں کیا کرتا؟ مجرموں کی دنیا میں مقابل کو نہ مارو تو وہ ہمیں مار ڈالتا ہے۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے قتل کرایا ہے۔"

"میں کچھ نہیں سنوں گی۔ میری ایک بات کا جواب دو۔ تم پچیس دنوں کے اندر دو تاریخ سے پہلے یہاں نہ آسکے، یہ ثابت نہ کر سکے کہ جرائم سے پاک ہو گئے ہو اور گناہوں سے توبہ کر چکے ہو تو بولو کیا ہوگا؟"

وہ بولا۔ "خدا گواہ ہے میں عورتوں کے سائے سے بھی دور رہتا ہوں۔ میرا اللہ سے وعدہ ہے کہ ایک وقت کی بھی نماز قضا نہیں کروں گا اور میں پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتا ہوں۔ اب میں اتنی دور سے اپنی پارسائی کا یقین کیسے دلاؤں؟"

"میں تو یقین کر لوں گی۔ دوسرے نہیں کریں گے۔ تمہیں یہاں آکر یقین دلانا ہوگا اور تم کبھی نہیں آسکو گے۔"

"ماروی! میں ایک بات جانتا ہوں۔ جب سے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے لگا ہوں، تب سے اپنے اندر نئی قوت اور نیا حوصلہ پا رہا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ خدا مجھ کو اور میری مجبوریوں کو دیکھ رہا ہے۔ ابھی ایک مہینا نہیں گزرا ہے۔ پچیس دن باقی ہیں۔ مگر میرا ایمان کہتا ہے۔ پورے یقین سے کہتا ہے کہ میں تمہیں کسی کی دلہن نہیں بننے دوں گا۔ دو تاریخ سے پہلے سر سے کفن باندھ کر آؤں گا۔

"بس...... میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ میرا انتظار کرو۔ فکر اور پریشانی دور کرو۔ اور خوش رہا کرو۔ میری ماروی...... میں آؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ زیادہ باتیں کرتا تو وہ پوچھتی "کیا گرفتار ہونے آؤ گے؟"

اس سوال کے بعد بحث طول پکڑتی رہتی۔ اس لیے اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے صرف خدا کے بھروسے پر کہا تھا کہ پچیس دنوں کے اندر آئے گا۔ دل میں یہ بات تھی کہ نہ جا سکا تب بھی اس کے حق میں کوئی قدرتی فیصلہ ہوگا۔ کچھ بھی ہو، ماروی پرائی نہیں ہو سکے گی۔

ادھر محبوب کہہ رہا تھا۔ "ماروی! اس نے تمہیں ٹال دیا ہے۔ یہاں کبھی نہیں آسکے گا۔ میں مانتا ہوں کہ وہ بڑی جواں مردی سے بدترین حالات کا مقابلہ کر رہا ہے۔ لیکن وہ کتنا بڑا سورما ہے کہ یہاں کی تمام پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو گولی مار کر تمہارے پاس پہنچ جائے گا؟"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی۔ "میں کیا بولوں۔ میرا سر دکھ رہا ہے۔ جب اس نے کہا ہے کہ پچیس دنوں کے اندر آئے گا تو پھر دیکھیں کہ کیسے آئے گا؟

"آپ مائنڈ نہ کریں۔ واقعی میرا سر دکھ رہا ہے۔ میں کمرے میں جا کر آنکھیں بند کر کے لیٹنا چاہتی ہوں۔"

"میں تمہاری پریشانیوں کو سمجھ رہا ہوں۔ جاؤ آرام کرو۔ میں آفس جا رہا ہوں۔"

وہ دونوں کچھ کھائے پیے بغیر کھانے کی میز سے اٹھ گئے۔ ایک اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دوسرا باہر چلا گیا۔

☆☆☆

مرینہ لندن پہنچ گئی تھی۔ اس نے ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی کو فون پر کہا تھا کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر اس سے ملنے آئے گی۔ پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ ائرپورٹ سے سیدھی لیڈی ڈاکٹر مارتھا کے پاس آئی۔ اس کے اندر کھلبلی سی مچی تھی کہ وہ مراد کے بچے کی ماں بننے والی ہے اور ابھی یہ وقت آ گیا ہے۔

ڈاکٹر مارتھا نے اسے اچھی طرح چیک کرنے کے بعد کہا۔ "تم ماں بننے کے لیے پاگل ہو رہی ہو۔ تم ابھی نہیں اگلے ماہ میرے پاس آنا۔ پھر شاید تمہارے حاملہ ہونے کے آثار پیدا ہوں گے۔"

مرینہ ذرا مایوس ہوئی۔ مایوسی کے وقت امیدیں سہارا دیتی ہیں۔ وہ ایسے وقت تصور میں مراد کو دیکھتی تھی اور خیالوں میں اس سے کہتی تھی۔ "میں کیوں تمہیں چھوڑ کر یہاں آ گئی؟ مجھے ہر رات تمہارے ساتھ رہنا چاہیے تھا۔ میں یہاں ڈیوٹی جوائن کرتے ہی تمہارے پاس دوڑی چلی آؤں گی۔"

وہ ڈاکٹر کے کلینک سے باہر آ کر رینٹڈ کار میں بیٹھ گئی۔ آگے جانے سے پہلے مراد کی خیریت معلوم کرنا چاہتی تھی لیکن کار میں بیٹھتے ہی اسے ڈیش بورڈ پر ایک موبائل فون نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ اس کا فون نہیں تھا۔

یہ سمجھ میں آیا کہ جب وہ کلینک کے اندر گئی تھی تب ہی کوئی آیا تھا اور ڈیش بورڈ پر وہ فون رکھ کر چلا گیا تھا۔

اس نے ونڈ اسکرین کے پار اور دائیں بائیں سر گھما کر دور تک دیکھا۔ کلینک کے احاطے کے باہر ٹریفک رواں دواں تھا۔ کوئی پُراسرار مشکوک آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ فون بجنے لگا۔ رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اٹھایا۔ اس کے بٹن کو دبا کر کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہیلو۔ کون ہو تم؟"

ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "اس فون سے تمہاری موت بول رہی ہے۔ یہ فون تمہارے پاس جتنی آسانی سے پہنچ گیا ہے، اتنی ہی آسانی سے موت بھی آ جائے گی۔"

وہ حقارت سے بولی۔ "موت سے کھیلنے والی کو دھمکی نہ دو۔ کام کی بات کرو۔"

"کام کی بات یہ ہے کہ پچیس لاکھ ڈالرز تمہارے پچیس لاکھ ہمارے...... مراد علی منگی تمہارے پاس ہے۔ تم اپنے ادارے کو فائدہ پہنچانا چاہتی ہو تو اپنے پچیس لاکھ MET کو دے دو لیکن آدھی رقم ہم لے کر رہیں گے۔"

وہ بولی۔ "اچھا تو تم بھیک مانگ کر گزارہ کرتے ہو؟ مسٹر بھکاری! اپنا تعارف تو کراؤ؟"

"میں ڈینجرس ریکٹ کا سربراہ ڈی بلیک بول رہا ہوں۔

"انڈیا میں MET کے سیکرٹ ایجنٹ ہیلری ہڈسن کی شامت آ گئی ہے۔ ہمارا ایک حملہ اس پر محض دھمکی کے طور پر ہو چکا ہے۔ کسی وقت دوسرا حملہ ہوگا تو نہیں بچے گا۔ تم نے ہمارا مطالبہ تسلیم نہیں کیا تو ابھی تم خیریت سے گھر نہیں پہنچو گی۔ یہ حملہ بھی دھمکی کے طور پر ہوگا۔ تمہیں صرف زخمی کیا جائے گا۔ دوسرے حملے میں جان سے جاؤ گی۔"

مرینہ نے پوچھا۔ "تم ہڈسن کو کیوں ہلاک کرنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا۔ "کیا تم نہیں جانتیں یا انجان بن کر پوچھ رہی ہو؟ ہڈسن کو معلوم ہے کہ تم نے مراد کو کہاں چھپا رکھا ہے۔"

یہ مرینہ کے لیے چونکا دینے والی بات تھی۔ وہ بول رہا تھا۔ "شاید تم نے ہڈسن کو مراد علی منگی کی خفیہ پناہ گاہ نہیں بتائی ہے۔ کل رات اس کے شوٹرز اسے ڈھونڈنے کے لیے جے پور گئے تھے اور تمام رات بھٹکتے رہے۔ ہمارے آدمی بھی سائے کی طرح ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔"

اس بات پر مرینہ کا سر گھوم گیا کہ پچھلی رات وہ لندن کے لیے روانہ ہوئی تو ہیلری ہڈسن نے دغا بازی کی اور اس نے یقیناً ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی کے حکم کی تعمیل کی ہوگی۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ جان انتھونی اس کی لاعلمی میں مراد کو ڈھونڈ کر اپنی کسٹڈی میں لے کر اسے فوراً کیش کرنا چاہتا ہے۔ وہ پچاس لاکھ ڈالرز حاصل کرنے کے لیے اس کے حاملہ ہونے کا انتظار بھی نہیں کرے گا۔

ڈینجرس ریکٹ کا سربراہ ڈی بلیک کہہ رہا تھا۔ "پچھلی رات ہڈسن کے آدمیوں نے پورا جے پور کھنگال ڈالا لیکن مراد علی منگی ہاتھ نہیں آیا۔ یہ تو تم ہی بتا سکتی ہو کہ اسے کہاں چھپایا ہے؟"

اسے غصہ آرہا تھا۔ یہ سوچ کر جھنجلا رہی تھی کہ جس ادارے میں دوبارہ MET آفیسر بن گئی ہے' اس ادارے کا ڈائریکٹر جنرل اسے دھوکا دے رہا ہے۔

وہ جھنجلا کر بولی۔ ''یو مسٹر بلیک! وہ میرا دلدار ہے کوئی بچوں کا کھلونا نہیں ہے کہ میں اسے ڈالروں میں بیچ دوں۔ یو گو ٹو ہیل ود ... یور ڈالرز۔ کم آن ..... آؤ۔ مجھ پر گولیاں چلاؤ۔ تمہیں چھٹی کا دودھ یاد نہ دلایا تو میرا نام مرینہ نہیں۔''

اس نے فون بند کر کے ڈیش بورڈ پر رکھا پھر سیٹ پر آگے کی طرف کھسک کر کھڑکی سے نیچے ہوگئی تاکہ کوئی گولی آکر نہ لگے۔

وہ کبھی آگے اور کبھی دائیں بائیں سر گھما کر دیکھ رہی تھی۔ گولیاں چلانے والے شوٹنگ رینج کی دوری پر نظر آسکتے تھے۔ وہاں دائیں بائیں بنگلوز تھے۔

اس نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا۔ پھر اسٹیئرنگ پر جھک کر اسے آگے بڑھایا۔ کلینک کے احاطے سے باہر آتے ہی ایک گولی نے آکر پچھلی کھڑکی کے شیشے کو توڑ دیا۔ حملے کی پہل ہوگئی تھی۔

یہ گیدڑ بھبکی تھی۔ شوٹرز ایسے اناڑی نہیں ہوتے۔ وہ سامنے والی کھڑکی کے شیشے کو گولی مار کر توڑتے تو وہ ضرور زخمی ہوتی لیکن ڈی بلیک پچیس لاکھ کے لیے اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ مین روڈ پر ٹریفک کی بھیڑ میں آتے ہی سیٹ پر سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔ کار کو تیزی سے ڈرائیو کرتی ہوئی قریبی پولیس اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہوگئی۔ وہاں اس نے پولیس افسر کو بتایا کہ وہ MET آفیسر ہے اور دشمن اس پر حملہ کر رہے ہیں۔

انہوں نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کو دیکھا پھر گئی سپاہی اِدھر اُدھر جاتے ہوئے حملہ آوروں کو ڈھونڈنے لگے۔ مرینہ نے آفس میں بیٹھ کر ڈائریکٹر جنرل کو فون پر کہا۔ ''ڈی ڈینجرس ریکٹ کا سربراہ ڈی بلیک مجھ پر گولیاں چلا رہا ہے۔ میں اس وقت چیلسی پولیس اسٹیشن میں ہوں اور میرے پاس ایک بھی ہتھیار نہیں ہے۔''

اس نے کہا۔ ''وہاں سے باہر نہ نکلو۔ ابھی ہمارے گن مین تمہارے پاس آجائیں گے۔''

''نو سر..... مجھے کسی گن مین کی' کسی محافظ کی ضرورت نہیں ہے۔ پستول اور شاٹ گن فوراً یہاں پہنچائیں۔ میں ڈی بلیک سے خود نمٹ لوں گی۔''

''تم ایسے وقت تنہا فائٹ کرنے کی ضد نہ کیا کرو۔''

''میں اکیلی دشمنوں پر بھاری پڑتی ہوں اور یہ ہمیشہ سے ثابت کرتی آئی ہوں۔ ڈی بلیک کو بھی یہی سمجھانا چاہتی ہوں۔ آپ میری جنگ مجھے لڑنے دیں۔''

وہ فون پر سننے لگی۔ جان انتھونی کسی کو حکم دے رہا تھا کہ چیلسی کے تھانے میں ہتھیار اور بلٹ پروف گاڑی فوراً پہنچائی جائے۔ مرینہ ابھی ڈائریکٹر جنرل انتھونی پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس کی دوغلی چالوں سے واقف ہو چکی ہے۔

انتھونی نے پوچھا۔ ''اس کمبخت ڈی بلیک کو کیسے معلوم ہوا کہ تم ابھی انڈیا سے آرہی ہو؟''

مرینہ نے کہا۔ ''وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں' اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں نے مراد کو اپنے پاس چھپا کر رکھا ہے؟''

وہ بولا۔ ''میں خود حیران ہوں۔ اس نے انڈیا میں ہیلری ہڈسن پر بھی حملہ کرایا ہے۔ اس سے پوچھ رہا تھا کہ مراد علی منگی کہاں ہے؟ مرینہ اسے کہاں چھپانے کے بعد لندن گئی ہے؟''

''سر! مجھے غصہ آرہا ہے۔ اندر کی بات اسے کیسے معلوم ہوگئی۔ یہ صرف آپ جانتے ہیں اور ہڈسن جانتا ہے کہ میں نے مراد کو چھپا کر رکھا ہے۔''

''صرف ہم ہی نہیں' انڈین بارڈر سیکیورٹی فورس اور وہاں کی انٹیلی جنس والے بھی جانتے ہیں کہ ان کا مطلوبہ جاسوس ایک عورت کے ساتھ کہیں چھپا ہوا ہے۔ حقائق کو سمجھو مرینہ......! انڈر ورلڈ والے بھی وہاں تم دونوں کی کھوج میں بھٹک رہے ہیں۔''

وہ بولی۔ ''میں اسے چھوڑ کر لندن آئی ہوں۔ تعجب ہے' میرے وہاں سے روانہ ہوتے ہی نہ جانے کتنے دشمن اسے ڈھونڈنے اس شہر میں پہنچ گئے۔''

وہ انجان بن کر بولا۔ ''میں حیران ہوں۔ کیا کہہ سکتا ہوں کہ کون لوگ اسے تلاش کرنے جے پور گئے تھے۔ ڈی بلیک خوامخواہ ہڈسن کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ بائی دا وے مراد محفوظ ہے نا؟''

''تھینکس گاڈ۔ وہ محفوظ ہے۔ میں اناڑی نہیں ہوں۔ میں نے اس کی حفاظت کے لیے ٹھوس انتظامات کیے ہیں۔''

''مرینہ! میں پھر سمجھاتا ہوں۔ نہ جانے کتنے سنڈیکیٹس اور ریکٹس والے اور انڈر ورلڈ کے ماہر شوٹرز اسے تلاش کر رہے ہیں۔ تم اکیلی ہو۔ تمہاری ذہانت اور پلاننگ ہمیشہ کامیاب نہیں رہے گی۔ آج یا کل کوئی نہ کوئی دشمن مراد

تک پہنچ کر اسے دبوچ لے گا۔ پھر ہم خالی ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔''

''میں مانتی ہوں۔ میری توقع کے خلاف کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ویسے مراد بھی بہت ذہین اور پھرتیلا ہے۔ وہ جے پور سے نکل کر کسی دوسری جگہ چلا گیا ہوگا۔''

''کہیں بھی جائے گا' مارا جائے گا۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟ یہاں لندن میں اسے بلاؤ اور اپنے پاس چھپا کر رکھو۔ میں وعدہ کرتا ہوں' ہم سب اس وقت تک اس کی حفاظت کریں گے' جب تک تم حاملہ نہیں ہو جاؤ گی۔''

''وہ صرف پاکستان میں اپنی محبوبہ ماروی کے پاس رہے گا۔ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ میں اسے زبردستی نہیں لا سکوں گی۔ آپ دوسری بات کریں۔''

''دوسری باتیں ہوتی رہیں گی۔ یہ ابھی اہم ہے۔ میں تمہارا سینئر ہوں۔ میرا فرض ہے کہ تمہیں غلطیاں کرنے سے روکوں۔''

''آپ میرا سروس ریکارڈ دیکھیں' میں نے کبھی ادارے کو نقصان پہنچانے والی غلطی نہیں کی ہے۔''

''ان دنوں تم کسی مرد کی دیوانی نہیں تھیں۔ پتا نہیں اس مراد علی منگی میں کیا بات ہے تم تو اس کے پیچھے پاگل ہوگئی ہو۔''

''یہ آپ نہیں سمجھیں گے۔ اس سے ٹکرانے والی کسی عورت سے پوچھیں وہ کیسا مرد ہے؟''

''پھر تو تم بھی اس کی موت نہیں چاہو گی۔ اپنی سانسیں گرم کرتی رہو گی۔ ہمارے ادارے کو پچاس لاکھ ڈالرز دور سے دکھاتی رہو گی اور ہمیں ترساتی رہو گی۔''

''میں زبان کی پکی ہوں۔ ایک بار کہہ چکی ہوں۔ اسے ضرور آپ کے حوالے کروں گی۔ آپ نہیں جانتے اس نے سکھر میں مجھے مار ہی ڈالا تھا۔ میں مرتے مرتے بچ گئی۔ سچ کہتی ہوں اس تکلیف کو اور موت کی اذیت کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ پھر وہ کمینہ مجھے بیچ بازار میں برہنہ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس توہین کا احساس مجھے مارتا رہتا ہے۔ میں ایک دن اسے مرتے دیکھ کر ہی سکون حاصل کروں گی۔''

اس نے رابطہ ختم کردیا۔ یہ سچ تھا کہ وہ مراد سے اپنی توہین کا بدلہ لینے والی تھی۔ فی الحال نفسانی خواہشات کے زیر اثر تھی۔ جب اس کے بچے کی ماں بن جاتی' جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے تب وہ انتقام ضرور لیتی۔

اس کے ڈیپارٹمنٹ سے ہتھیار اور ایک بلٹ پروف کار آگئی تھی۔ اس نے فون پر ڈی بلیک سے کہا۔ ''یہ نہ سمجھنا کہ میں پولیس اسٹیشن میں آکر چھپ گئی ہوں۔ ابھی اتنی دیر تک تمہارے کتوں کی موت کا سامان کر رہی تھی۔

یہ جانتی ہوں کہ تم میرے مقابلے پر نہیں آؤ گے۔ چلو تمہارے کرائے کے ٹٹو ہی سہی۔ میں باہر آرہی ہوں۔ تم دیکھو گے کہ میں بالکل تنہا رہوں گی۔ ایک بھی مسلح گارڈ میرے ساتھ نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی دور رہ کر میری نگرانی اور حفاظت کرے گا۔ میں تمہاری سہولت کے لیے اسکاٹ لینڈ جانے والے ہائی وے پر رہوں گی، وہاں زیادہ ٹریفک نہیں ہوگا۔ اچھی طرح اطمینان کرلینا کہ میں تنہا ہوں پھر اپنے آدمیوں سے کہنا کہ وہ سامنے آئیں اور مجھ پر حملہ کرنے کی حسرت پوری کریں۔''

ڈی بلیک نے کہا۔ ''مرینہ! جرائم کی دنیا میں سب ہی جانتے ہیں کہ تم خطرناک بلا ہو لیکن بہت زیادہ خود اعتمادی لے ڈوبتی ہے اور آج تم ڈوبنے کے بعد زندگی کے ساحل پر نہیں ابھر سکو گی۔

''اس سے پہلے سمجھاتا ہوں۔ تمہاری بہتری چاہتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔ ففٹی ففٹی پر راضی ہو جاؤ۔ پچیس میرے پچیس تمہارے۔''

''تم مجھے گولی مارنے کی حسرت پوری کرو۔ میں مرگئی تو ایک ڈالر بھی نہیں ملے گا۔''

اس نے فون بند کردیا۔ ڈی بلیک اس پولیس اسٹیشن سے دور ایک پارکنگ کی جگہ کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ قانون کے محافظ اسے صورت سے نہیں پہچانتے تھے۔ وہ ایک بزنس مین کی حیثیت سے اچھا خاصا جانا پہچانا شریف آدمی تھا۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ مرینہ شانے سے شاٹ گن لٹکائے ہاتھ میں ریوالور لیے تھانے سے باہر آئی تھی اور ایک کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ ڈی بلیک نے فون پر اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''وہ باہر آگئی ہے۔ جس کار میں بیٹھ کر جارہی ہے' اس کے بارے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بلٹ پروف ہے۔ اس کے پاس ریوالور اور شاٹ گن ہے۔

''دور تک پیچھا کرو اور ابھی اسے نہ چھیڑو۔ یہ دیکھتے رہو کہ اس کی سیکیورٹی کے لیے آگے پیچھے کتنے مسلح افراد ہیں؟ میں اس کا تعاقب کرتا رہوں گا اور تم لوگوں سے رابطہ رکھوں گا۔ یاد رکھو وہ عورت ہماری سوچ سے بھی زیادہ مکار ہے۔ وہ کئی راستوں سے گزرتے ہوئے اسکاٹ لینڈ کی سمت ہائی وے پر جائے گی۔ وہاں موقع دیکھ کر اس پر اٹیک کیا جائے گا۔''

دونوں بند کر کے اپنی کار آگے بڑھا کر اس کے پیچھے جانے لگا۔ اس کے چار گن مین موٹر سائیکل پر تھے۔ وہ بھی بہت فاصلہ رکھ کر تعاقب کر رہے تھے۔

مرینہ جدھر سے گزر رہی تھی ادھر ٹریفک اتنا تھا کہ دشمن گولیاں چلا کر آسانی سے فرار نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ بڑے صبر سے تعاقب کرتے رہے۔ انہیں ہائی وے پر پہنچنے تک یقین ہو گیا کہ وہ بالکل اکیلی ہے۔ آگے پیچھے کوئی اس کا مددگار نہیں ہے۔

ہائی وے پر پٹرولنگ پولیس کی گاڑیاں گشت کرتی رہتی تھیں۔ جب کسی پولیس کی ایک گاڑی سائرن بجاتی ہوئی گزر گئی تو ڈی بلیک نے اپنے آدمیوں کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔

وہ محتاط تھی۔ کھڑکیوں کے بلٹ پروف شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ اسے عقب نما آئینے میں صاف نظر آرہا تھا۔ موٹر سائیکل والوں نے رفتار بڑھا دی تھی اور بڑی تیزی سے قریب آرہے تھے۔ اس کے اعصاب تن گئے۔ اب تو مرنے یا کچھ کر گزرنے والی بات تھی۔ وہ ہونے والا تھا جس کے متعلق مد مقابل آنے والے سوچ بھی نہیں سکتے کہ کون اوپر جائے گا اور کون زمین پر رہ جائے گا۔

دو بائیک سوار تیزی سے دائیں بائیں آرہے تھے اور دو سوار کار کے پیچھے تھے۔ سب کی تیز رفتاری یکساں تھی۔ ایسے وقت مرینہ نے اپنی رفتار اور بڑھائی تو انہوں نے بھی بڑھائی پھر وہ اپنی اندھی رفتار سے اچانک ہی مارے گئے۔

اسی کو مکاری کہتے ہیں۔ اچانک ہی مرینہ نے بریک لگائے۔ کار رکتے رکتے گھوم گئی۔ جو پیچھے آرہے تھے وہ کار سے ٹکرا کر اپنی اپنی بائیک سے اچھلے۔ بلّے سے لگنے والی گیند کی طرح آسمان کی طرف گئے۔ ان میں سے ایک سر کے بل زمین کی طرف واپس آیا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ سڑکوں کے درمیان آئی لینڈ کی مرمت کے لیے بڑے بڑے پتھر رکھے ہوئے تھے۔ دوسرا ان پر آکر گرا تو اس کی کمر کی ہڈی گئی۔ وہ وہیں تڑپتا رہ گیا۔

اچانک بریک لگانے کے باعث کار گھوم گئی تھی۔ دائیں بائیں آنے والے اس سے ٹکرا کر گرے تھے اور سڑک پر لڑھکتے ہوئے دور تک گئے تھے۔ مرینہ پھرتی سے باہر آئی۔ پھر اس نے تڑاتڑ فائرنگ شروع کر دی۔ وہ گرنے اور لڑھکنے والے اٹھتے ہی پھر گر پڑے۔ قصہ تمام ہو گیا۔

اس نے آگے پیچھے دور تک چار لاشیں دیکھیں۔ پھر کار میں بیٹھ کر واپس جانے والی سڑک پر آگئی۔ ڈی بلیک سست رفتاری سے بہت پیچھے آرہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ مرینہ موت کے ہرکاروں سے کیسے کھیلتی ہے اور کس طرح اپنی ہیبت طاری کرتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں بولا۔ ''غضب کی تربیت یافتہ ہے۔ ایک ہی حملے میں ان لوگوں کو چاروں شانے چت کر دیا ہے۔''

وہ واردات والی جگہ کی سمت جا رہا تھا۔ مرینہ ادھر سے واپس آرہی تھی۔ اس نے بلٹ پروف کار کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھا۔ وہ اسے نہیں پہچانتی تھی۔ ڈرائیو کرتی ہوئی اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔

اس نے آگے جا کر فون کو ڈیش بورڈ سے اٹھایا پھر ڈی بلیک سے رابطہ کر کے پوچھا۔ ''اور کتنے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''آج اتنے ہی رہنے دو۔''

''کیوں پچیس لاکھ نہیں لو گے؟''

''وہ تو ہر حال میں لیتا ہے۔ لیکن ذرا سوچنا ہوگا۔ تم سے کسی اور طرح سے نمٹنا ہوگا۔''

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''تو مرد نہیں ہے۔ جس کے سر کا سودا چاہتا ہے وہ ہے اصلی مرد۔ مرد نما زنخے...... آخ تھو۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ اسے ونڈ اسکرین پر مراد دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پچھلی رات اس سے جدا ہوئی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ بچھڑے ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں۔ اس کے لیے جنگ لڑنے کے بعد دل اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

وہ لندن پہنچتے ہی مصروف ہو گئی تھی۔ اس کی خیریت معلوم کرنا ضروری تھا۔ اس نے فون نکال کر اس سے رابطہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔ وہ بولی۔ ''ہائے مراد......! سب سے پہلے یہ بتاؤ خیریت سے ہو؟''

وہ بولا۔ ''خیریت نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے میں اندگا پرساد کے گھر سے نکل آیا ہوں۔''

''ہاں مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ کل رات دشمن تمہیں ڈھونڈنے کے لیے جے پور گئے تھے اور یہ غصہ دلانے والی بات معلوم ہوئی ہے کہ میرے ہی ادارے کا ڈائریکٹر جنرل اور سیکرٹ ایجنٹ ہیکری ہڈسن میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچا رہے ہیں۔ مجھے دھوکا دے رہے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ دوہری چالیں چلیں گے۔ لعنت ہے ان پر میرے انڈیا سے نکلتے ہی ہڈسن کے تابعدار تمہیں اپنی گرفت میں لینے کے لیے جے پور پہنچ گئے تھے۔''

مراد نے پوچھا۔ ''وہ کیسے پہنچ گئے؟ تم نے انہیں بتایا

ہوگا کہ میں کہاں چھپا ہوا ہوں۔"

"مجھ سے غلطی بھی ہوئی قسم لے لو۔ میں نے تمہاری خفیہ پناہ گاہ کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا ہے۔ البتہ مجھ سے ایک بھول ہوگئی۔ میں نے تمہاری محبت کے جنون میں بڑے فخر سے کہہ دیا کہ جسے ساری دنیا تلاش کر رہی ہے وہ میری بانہوں میں رہتا ہے۔ اس طرح انہوں نے اندازہ لگایا کہ میں جے پور میں ہی تو تم بھی وہیں کہیں چھپے ہوئے پائے جاؤ گے۔"

مراد نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ میرے پیروں میں گردش ہے۔ میں کسی ایک جگہ رہ نہیں پاتا۔ اسی گردش نے میری ماروی سے مجھے جدا کر دیا ہے۔"

"تم ابھی کہاں ہو؟"

"کولکتہ پہنچ گیا ہوں۔ چمپت راؤ نے مجھے راتوں رات وہاں سے نکالا ہے۔ اگر وہ ہوشیار نہ رہتا تو میری شامت آجاتی۔ میں جلد سے جلد ماروی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا لیکن اس سے اور زیادہ دور چلا آیا ہوں۔"

مرینہ کو یہ اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس سے باتیں کر رہا تھا اور ماروی کو یاد کر رہا تھا۔ وہ بولی۔ "فکر نہ کرو۔ میں یہاں سے جلد ہی پاکستان جاؤں گی۔ تمہاری ماروی کو تمہارے رقیب کی جھولی میں جانے نہیں دوں گی۔"

"نہیں مرینہ! میں تم سے کہہ چکا ہوں۔ پاکستان جا کر ماروی کو اپنی شکل نہ دکھانا۔ وہ تمہیں اپنی سوکن سمجھ رہی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ میں تمہیں کراچی جانے سے روک دوں۔ اگر تم وہاں جاؤ گی تو وہ مجھ سے ناراض ہوجائے گی۔"

وہ بولی۔ "یہ میری جیت ہے اور خوشی کی بات ہے کہ وہ مجھے اپنی سوکن سمجھتی ہے۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں حاصل کیا ہے۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ پاکستان نہیں جاؤں گی۔ کیا تم کولکتہ پہنچ کر مطمئن ہو؟ وہاں تمہارے لیے خطرہ تو نہیں ہے نا؟"

"خطرہ کہاں نہیں ہے۔ موت میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ دنیا کے تمام مجرم پچاس لاکھ ڈالرز حاصل کرنے کے لیے اپنا گھر اپنا ملک چھوڑ کر انڈیا چلے آرہے ہیں۔"

"میری ایک بات مانو۔ آج ہی کسی پلاسٹک سرجری کے ماہر سے بات کرو اور اپنا چہرہ بدل دو۔"

"ابھی دشمن تمہیں دور سے پہچان لیتے ہیں۔ سرجری کے بعد قریب آکر بھی پہچان نہیں سکیں گے۔"

"میں نے کئی بار سوچا کہ چہرہ بدلنا ہی ہوگا لیکن دل نہیں مانتا۔ یہ کہتا ہے کہ ماروی مجھے نہیں پہچانے گی۔ مجھے اجنبی سمجھے گی۔ اپنے بچپن کے مراد کو ڈھونڈتی رہے گی۔"

"یہ جذباتی باتیں ہیں۔ ابھی ہر قدم پر جان جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ موجودہ چہرہ ماروی کا دوست ہے تو تمہارا جانی دشمن ہے۔"

"پھر یہ کہ آج کی پلاسٹ سرجری بہت ایڈوانس اسٹیج پر ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں چہرہ بدل جاتا ہے۔ تم واپس اپنی اصل صورت لانا چاہو گے تو فوراً سرجری کے ذریعے پیدائشی چہرے کی طرف لوٹ آؤ گے۔"

"ایسی بات ہے تو میں ضرور چہرہ تبدیل کروں گا۔ پھر جب چاہوں گا اپنی ماروی کا مراد علی منگی بن جاؤں گا۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ مرینہ نے اپنے فون کو دیکھا۔ یہ سوچ کر غصہ آرہا تھا کہ وہ ماروی کا نام بھولتا ہی نہیں تھا۔ وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے زیرلب بڑبڑانے لگی۔ "میں اپنا تن من دے چکی ہوں۔ اسے مار ڈالنا چاہتی تھی مگر زندہ چھوڑ رہی ہوں۔ اس کے لیے فائٹ کر رہی ہوں۔ اسے خطرناک دشمنوں سے چھپا رہی ہوں۔ اس نے کبھی میرا احسان نہیں مانا کبھی میری تعریف نہیں کی۔ جب دیکھو ماروی کے نام کی مالا جپتا رہتا ہے۔

"وہ گدھا گاڑی والا عشق میں گدھا بن گیا ہے۔ پتا نہیں کمبخت میں کیا بات ہے؟ نہ چاہتے ہوئے بھی اس پر مری جارہی ہوں۔ اونہہ آخر کب تک؟ جب اس کے ایک بیٹے کو ایک جونیئر مراد علی منگی کو جنم دوں گی تو اس کی کمی پوری ہو جائے گی۔ وہ غیر ضروری ہوجائے گا۔ پھر میں پچاس لاکھ ڈالرز کیش کراؤں گی۔"

اس کی بڑبڑاہٹ ختم ہوگئی۔ وہ تھوڑی دیر تک چپ رہی۔ پھر ایک سوچ پیدا ہوئی۔ "اگر ایک بچے کے بعد بھی وہ میرے دل سے نہیں جائے گا، مجھے پاگل بناتا رہے گا تو کس دل سے اس کے سر کا سودا کروں گی؟

"نہیں پھر تو اسے زندہ رکھنا ہوگا۔

"معلوم ہوتا ہے اس کی طلب میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ میں چاہوں تو اسے ہمیشہ کے لیے اپنے نام کر سکتی ہوں۔ صرف ایک رکاوٹ دور کر کے....

"اور وہ رکاوٹ ہے ماروی... اور اس کا نام و نشان مٹانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اسے تو ایک چٹکی میں مسل دوں گی۔"

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

ملاپ

ثمر عباس

سیانے کہتے ہیں جو آنکھوں کو اچھا نہیں لگتا اسے آنتیں بھی قبول نہیں کرتیں... آنکھیں ہی سب سے پہلے انسان کی ظاہری شخصیت کو پسند یا ناپسند کرتی ہیں... وہ بھی اگرچہ من کا بہت اچھا تھا لیکن اس کا تن کسی عجوبے سے کم نہیں تھا۔ جس کے چلنے سے زمین دہل جاتی تھی پھر وہ کیسے کسی کے دل میں جگہ پاتا لیکن... تقدیر مہربان ہو تو ناممکن کو ممکن میں بدلتے دیر نہیں لگتی... اور اس بار مقدر اس پر فدا تھا۔



بے وزن تدبیروں سے وزن گھٹانے والے ایک دیوانے کی حماقتیں

ایک دو دن کی برف باری تو قابل برداشت ہے لیکن یہ سلسلہ دراز ہو جائے تو الجھن ہونے لگتی ہے کیونکہ گھر سے نکل کر گاڑی تک پہنچنے میں ہی پاؤں برف کی دو انچ موٹی تہ میں دھنسنے لگتے ہیں اور ایسی صورت میں آدمی کے پاس گھر میں مقید رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ مجھے کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی کیونکہ میرا فریج عموماً انواع و اقسام کی اشیا سے بھرا رہتا ہے۔ ویسے بھی گھر کے نیچے میری ماں کا چھوٹا سا ریستوران تھا جہاں عمدہ قسم کے کھانے ہر وقت دستیاب تھے۔ ماں بڑھاپے کی وجہ سے بہت کم گھر سے باہر نکلتی ہیں۔ انہوں نے تہ خانے میں جم بنا

رکھا ہے اور جب برف باری ہو رہی ہو تو وہ روزانہ باقاعدگی سے مشینوں پر ورزش کرتی رہتی ہیں لیکن میرے لیے گھر میں بند ہو کر رہنا ممکن نہیں۔ میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں اور میرا واسطہ دن میں مختلف لوگوں سے رہتا ہے۔ میں نے اپنا ایک دفتر گھر میں بھی بنا رکھا ہے اور لوگ مجھ سے ملنے کے لیے اکثر یہیں آجاتے ہیں۔ چنانچہ جب دروازے کی گھنٹی بجی تو میں چونک اٹھا اور میری آنکھوں میں امید کی چمک لہرانے لگی۔ دروازے پر دو افراد کھڑے تھے۔ میں نے انہیں اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اندر آجاؤ۔ ورنہ برف میں جم کر رہ جاؤ گے۔''

''شکریہ البرٹ!'' ان میں سے ایک نے کہا۔ میں اسے جانتا تھا۔ دوسرے نے بھی اس کی تقلید میں میرا شکریہ ادا کیا۔

''معاف کرنا، ہم ملاقات کا وقت طے کیے بغیر ہی چلے آئے۔'' پہلے شخص نے کہا۔ ''لیکن لیری کو ایک فوری مسئلہ درپیش تھا۔ اس لیے ہمارے پاس انتظار کی بالکل گنجائش نہیں تھی۔''

لیری چھوٹے قد کا فربہ اندام شخص تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ البتہ اس کے گلابی رخسار دیکھ کر مجھے خاصی حیرانی ہوئی۔ میں نے ایسے صحت مند لوگ بہت کم دیکھے تھے۔ میں نے ان دونوں کو کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لیری کے ساتھ آنے والا کرس نیلسن تھا لیکن دوستوں اور رشتے داروں میں شربے کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

میں نے انہیں کافی کی پیشکش کی تو لیری بے تکلفی سے بولا۔ ''میں دودھ کے ساتھ تین چمچے چینی بھی لیتا ہوں۔''

شربے نے بھی پیچھے رہنا مناسب نہ سمجھا اور بولا۔ ''تمہارے پاس سبز چائے ہوگی؟''

میں مسکراتے ہوئے اٹھا اور سبز چائے کی تلاش میں نیچے ریستوران میں آگیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس وقت میری ماں وہاں موجود ہوں گی، البتہ ریستوران کے منیجر یا ایک دو گاہکوں کے ہونے کا امکان ہو سکتا تھا لیکن وہاں صرف ویٹریس کترینا نظر آئی۔ وہ یوکرائن کی رہنے والی خوب صورت لڑکی اکیلی بیٹھی تاش سے دل بہلا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ''کھانا چاہیے؟ میں نارمن کو بلاتی ہوں۔ وہ تمہارے لیے کچھ بنا دے گا۔''

''رہنے دو۔ میں خود ہی دیکھ لیتا ہوں۔''

''یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ ویسے بھی تمہارا انشورنس نہیں ہوا ہے۔''

میں نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی اور مطلوبہ سامان لے کر اوپر آگیا۔ کافی پینے کے دوران میں نے پوچھا۔ ''اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟''

لیری نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔''

''بالکل ابتدا سے!'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

اس نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ قصہ اس وقت شروع ہوا جب چند سال پہلے میری بیوی نے سگریٹ نوشی چھوڑی۔ اس سے پہلے ہم کسی دوسری جگہ منتقل ہونے کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اچانک اس کا ذہن بدل گیا اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنی ماں سے قریب رہنے کو ترجیح دے گی۔ ہمارا ایک ہی بیٹا ہے اور ایما اب اٹھائیس برس کی ہو چکی ہے لیکن اس وقت وہ چھتیس سال کی تھی۔ مجھے تاریخ سے دلچسپی ہے اور میں چیزوں کو ان کے تاریخی تناظر میں دیکھتا ہوں۔''

اس نے کچھ زیادہ ہی لمبی تمہید باندھ لی تھی۔ میں نے.... بے چینی سے پہلو بدلا اور گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آگے بولو۔''

''اسے دوسرے بچے کی خواہش تھی چنانچہ اس نے تمباکو نوشی چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تاکہ دوران حمل کوئی مسئلہ نہ ہو۔''

''کیا پہلی بار کوئی پیچیدگی ہوگئی تھی؟''

''نہیں لیکن ان دنوں ایما بہت زیادہ شراب اور سگریٹ پیا کرتی تھی۔ شاید اسی لیے ہمارا پہلا بیٹا کوری، عام بچوں کے مقابلے میں چھوٹا اور کمزور نظر آتا ہے چنانچہ ایما نے سگریٹ نوشی چھوڑ دی۔ اس کے باوجود وہ حاملہ نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ موٹاپے کی وجہ سے بھی اس عمل میں رکاوٹ ہو سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے ڈائٹنگ شروع کر دی اور اپنے ساتھ مجھے بھی شریک کرلیا۔''

''کیا تمہیں اپنا وزن کم کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں؟'' میں نے اس کے فربہ جسم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا وزن بڑھنے کی وجہ گھٹنے کی تکلیف ہے۔ پہلے میں باقاعدگی سے دوڑ لگایا کرتا تھا لیکن اب......''

''تمہارا کہنا ہے کہ گھٹنے کی تکلیف کی وجہ سے وزن بڑھ گیا۔ لہٰذا تم نے بھی اس کے ساتھ ڈائٹنگ شروع کر دی؟''

''مجھے اپنی مرضی کے خلاف ایسا کرنا پڑا کیونکہ ایما کو انکار کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔''

''اب کیا مسئلہ ہے...... تم کس وجہ سے پریشان ہو؟'' میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

''یہ خوراک مجھے مار ڈالے گی۔'' اس نے بھرائی

ہوئی آواز میں کہا۔

مجھے اس کی بات سن کر ہنسی آگئی۔ میں نے کبھی یہ نہیں سنا کہ کھانے سے بھی کبھی کوئی شخص مر گیا ہو۔ وہ بھی شاید میرے چہرے کے تاثرات بھانپ گیا تھا چنانچہ اس نے پہلے سے بھی زیادہ سخت لہجے میں کہا۔ ''میں بتا رہا ہوں کہ وہ جو کچھ مجھے کھانے کے لیے دے رہی ہے، اس سے میری موت واقع ہو جائے گی۔ پھر ایک دن اس نے مجھے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا۔''

''چوری۔'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''کھانے کے بیچ میں چوری کا ذکر کہاں سے آگیا؟''

''میری پوری بات سن لو۔ اس نے میری غذا میں تبدیلی کر دی اور مجھے کھانے میں سلاد، ابلی ہوئی مرغی اور بند گوبھی دینے لگی۔ اس کے باوجود میرا وزن کم نہیں ہوا جبکہ اس کا وزن تیزی سے گھٹ رہا تھا پھر اس نے مرغی بھی بند کر دی اور میرے نصیب میں سلاد اور گوبھی کے پتے رہ گئے۔ وہ دن میں دو مرتبہ میرا وزن کرنے لگی لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا پھر اس نے ایک دن میرا تعاقب کیا۔ تم سوچ سکتے ہو کہ کوئی عورت اپنے شوہر کا اس طرح پیچھا کرے گی جس کی شادی کو سولہ سال ہو گئے ہوں۔''

''واقعی یہ حیرت انگیز بات ہے۔'' میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''اسے ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور تم کہاں جا رہے تھے؟''

''پپی!'' اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ یہ ریستوران ہمارے ہوٹل سے کچھ فاصلے پر تھا اور چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ ''اسے شک ہو گیا تھا کہ میں گھر سے باہر کچھ کھا لیتا ہوں۔ جب وہ وہاں پہنچی تو میں اپنے لیے چیز برگر، فرائی انڈے اور پیاز کے لچھے خرید رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی وہ بھٹ پڑی...... یہ کیا حرکت ہے۔ میں تمہارے لیے اتنا کچھ کر رہی ہوں اور تم اس طرح میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر رہے ہو۔ میں نے اسے اس سے پہلے کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ گھر آنے کے بعد بھی اس کی بکواس جاری رہی۔ عین اسی وقت ہمارا بیٹا کوری اسکول سے آگیا۔ وہ بہت حساس ہے اور ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی غصے میں دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے۔ اس نے جو یہ صورت حال دیکھی تو رونے لگا۔ مجبوراً ایما کو خاموش ہونا پڑا۔''

''کیا وہ اپنی ماں سے بہت قریب ہے؟''

''پہلے بھی تھا لیکن جیسے جیسے بڑا ہو رہا ہے، اس کی خاموشی اور سنجیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ ماں کو اس طرح چیختے چلاتے دیکھ کر اسے صدمہ ہوا اور وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔''

میں نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تک تمہاری کہانی سے جو کچھ واضح ہو سکا ہے، وہ یہ کہ بیوی نے تمہارا وزن کم کرنے کے لیے غذا میں تبدیلی کی جو تمہیں پسند نہیں آئی پھر ایک ریستوران میں چیز برگر کھاتے ہوئے پکڑے گئے جس پر تمہاری بیوی نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ تمہارا بیٹا اسے برداشت نہ کر سکا اور اس نے رونا شروع کر دیا۔''

''اس کہانی میں ابھی بہت کچھ باقی ہے۔'' شر سے نے کہا۔

لیری سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھ سے اپنے بیٹے کا رونا نہیں دیکھا گیا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ سختی سے ڈائٹ پلان پر عمل کروں گا لیکن اس پر قائم نہ رہ سکا اور چوری چھپے پپی جاتا رہا۔ ایما جب کھانے کے وقفے کے دوران فون کرتی تو میں جھوٹ بول کر اسے مطمئن کر دیتا کہ اس کا دیا ہوا کھانا کھا رہا ہوں، حالانکہ میں اس کے لنچ باکس میں سے صرف سیب لیا کرتا تھا جو مجھے ہمیشہ سے پسند ہیں۔''

''اس کے بجائے تم پپی جا کر اپنی پسند کی چیزیں کھا لیتے تھے؟''

''ہاں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہوتا تھا لیکن روینڈا جانتی تھی کہ مجھے کیا چاہیے۔ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔''

''روینڈا کون ہے؟''

''سہ پہر میں ڈیوٹی انجام دینے والی ویٹریس۔ وہ جانتی ہے کہ میں چیز برگر کے ساتھ ڈبل فرائیز لیا کرتا ہوں۔ پہلے میں ہفتے میں تین بار وہاں جاتا تھا لیکن اس بے احتیاطی کے باوجود میرا وزن کم نہیں ہوا۔ اب پانچ دفعہ اپنی پسندیدہ ڈش لے رہا ہوں اور میرا وزن گزشتہ چار ہفتوں سے کم ہونا شروع ہو گیا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہر ہفتے تین چار پونڈ کی کمی واقع ہو رہی ہے۔''

''اور تمہیں اس پر تشویش ہے؟''

''ہاں کیونکہ میری بیوی مجھے زہر دے رہی ہے۔ مسٹر ہکسن، مجھے اس کا پورا یقین ہے۔''

''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟'' میں نے اسے سمجھانے کی غرض سے کہا۔ ''وزن کم ہونے کی اور بھی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔''

''جانتا ہوں اور اسی لیے مکمل معائنے کی غرض سے ڈاکٹر کے پاس گیا تھا لیکن اسے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ اس نے مجھے اپنا طرز زندگی بدلنے کا مشورہ دیا۔''

''ورزش کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ میرے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ پورا دن کرسی پر بیٹھے بیٹھے گزر جاتا ہے۔''

''کوئی کھیل بھی نہیں کھیلتے؟''

''کبھی کبھی گاڑی سے اتر کر ایک بلاک پیدل چل لیتا ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے مسٹر سیمسن کہ مجھے خود بھی وزن کم ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی لیکن میں بہت خوفزدہ ہوں۔''

''تمہاری بیوی کا رویہ اب کیسا ہے؟''

''اس کے طرزِ عمل میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا۔ اسے صرف میرا وزن کم ہونے سے دلچسپی ہے۔ میری خوشیوں اور پریشانیوں سے کوئی غرض نہیں۔ اب اگر اسے بچہ چاہیے ہوگا تو وہ کسی کو گود لے سکتی ہے۔''

''تم یہ بے احتیاطی صرف کام کے اوقات میں کرتے ہو؟''

''ہاں، بقیہ وقت وہ سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ والدین سے ملنے جاؤں تو وہاں بھی وہ میرے ہمراہ جاتی ہے لیکن ہم وہاں کھانے کے لیے بھی نہیں رک سکتے۔ وہ نہیں چاہتی کہ میں اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے نام نہاد کھانے کے علاوہ کوئی اور چیز کھاؤں۔ مما چپکے سے مجھے چاکلیٹ پکڑا دیتی ہیں لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ ان کی خوشبو نہ سونگھ لے۔''

''گویا تمہیں صرف لنچ ٹائم میں ہی بچنے جانے کا موقع ملتا ہے؟''

''ہاں۔''

''رونڈا کے ساتھ تمہارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟'' میں نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

''میں اس سے کبھی ریستوران کے باہر نہیں ملا۔ میرا خیال ہے کہ شاید وہ میرا نام بھی نہیں جانتی ہوگی لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسے دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔''

''لیری! اگر تم ایما کے ساتھ خوش نہیں ہو تو اس سے طلاق کیوں نہیں لے لیتے؟''

''اس طرح میں اپنے بیٹے کو کھو دوں گا۔ میں نے ایک وکیل سے بات کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ طلاق کی صورت میں بیٹا ماں کے پاس رہے گا۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ میں اپنے والدین کے پاس چلا جاؤں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنی ملازمت پسند نہیں اور والدین چاہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ مل کر کام کروں۔ ان کا بہت اچھا کاروبار ہے۔''

''کیا میں اس کاروبار کی نوعیت جان سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ وہ بیل نالبٹن میں استعمال ہونے والی جڑی بوٹیوں کی کاشت کرتے ہیں اور مارکیٹ میں تھوک کے داموں پر فروخت کرتے ہیں۔ ان کا فارم کینڈن کے قریب ہے لیکن ایما کا کہنا ہے کہ وہ وہاں رہنے کے مقابلے میں مرجانا پسند کرے گی۔''

''لگتا ہے کہ اس کے مزاج میں انتہا پسندی بہت زیادہ ہے۔''

''ہاں وہ سمجھوتا نہیں کرسکتی۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں اور کوری ان کا اکلوتا پوتا۔ اسی لیے وہ ہمیں اپنے سے قریب رکھنا چاہتے ہیں لیکن ایما اس بارے میں ایک لفظ سننا پسند نہیں کرتی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا کہ تم اسے کیوں نہیں چھوڑ سکتے۔ اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''اگر میں تمہیں اس خوراک کے نمونے لا کر دے دوں جو وہ مجھے کھانے کے لیے دیتی ہے تو کیا تم کسی لیبارٹری سے اس کا تجزیہ کروا کر معلوم کرسکتے ہو کہ وہ مجھے کون سا زہر دے رہی ہے؟''

''یہ کام تو تم خود بھی کرسکتے ہو۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

لیری نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیبارٹری والے مجھ سے عجیب طرح کے سوالات کریں گے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ پولیس کو بھی اس کی اطلاع دے دیں لیکن تم سے وہ کچھ نہیں پوچھیں گے کیونکہ تم سراغ رساں ہو اور اس طرح کے معاملات میں تمہارا ان سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔''

''فرض کرو لیبارٹری تجزیے سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ایما تمہیں کھانے میں زہر دے رہی ہے پھر تم کیا کرو گے؟ اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کراؤ گے یا......'' میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ابھی اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیبارٹری رپورٹ آنے کے بعد ہی سوچوں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

شرے نے مجھے اشارہ کیا کہ گفتگو کو مزید طول نہ دوں۔ چنانچہ میں نے اس کا کام کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے نوٹوں کو چوما اور سوچنے لگا کہ جب تک دنیا میں لیری جیسے ضرورت مند موجود ہیں، میرا فریج کبھی خالی نہیں رہ سکتا۔ مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ شرے ابھی تک میرے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ''مجھے تو اس کے عزائم کچھ اور ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر معاملہ صرف خوراک کے تجزیے کا

ہوتا تو اس کے لیے وہ کسی لیبارٹری سے فون پر بھی رابطہ کرسکتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اسے یہ خیال کیسے آیا کہ ایما اسے زہر دے رہی ہے؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ کھانے میں کوئی وزن کم کرنے والی دوا استعمال کی گئی ہو۔"

"تمہیں اس کام کے معقول پیسے مل رہے ہیں لہٰذا خیالی گھوڑے دوڑانے کی ضرورت نہیں۔ لیبارٹری رپورٹ آنے کے بعد ہی اس بارے میں مزید گفتگو ہوسکتی ہے۔" شریے نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ نیچے ریستوران میں کچھ کھانے کو مل جائے گا؟"

"چل کر دیکھ لیتے ہیں۔"

میں اسے ساتھ لے کر نیچے آیا تو کترینا تاش کے پتوں سے فارغ ہونے کے بعد اب بوتلوں میں کیچپ ڈال رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "کھانے میں کچھ ہے؟ ہم اس کی ادائیگی کریں گے۔"

اس نے مجھے گھورا اور منہ بناتے ہوئے بولی۔ "تم بیٹھو۔ میں مینیو لے کر آتی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں کہ مینیو کیا ہوگا۔ اس سے پہلے ہمیں ایک چائے اور ایک کافی چاہیے ہوگی۔"

اس نے ایک بار پھر مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔ "تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ سب کچھ مل جائے گا۔"

ہم نے کھڑکی کے پاس ایک میز منتخب کی۔ تھوڑی دیر بعد ہی کترینا آگئی۔ اس کے ہاتھ میں دو مینیو کارڈ تھے۔ وہ انہیں میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ "اگر کھانا چاہیے تو میں نارمن کو بلاتی ہوں۔ وہ منٹوں میں تیار کردے گا۔ ورنہ بیکری کی چیزیں بھی مل سکتی ہیں۔"

شریے غور سے اسے دیکھ رہا تھا پھر اس سے رہا نہ گیا اور وہ بول پڑا۔ "تم کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"جہاں احمقوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے۔"

شریے لاجواب ہوگیا پھر اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ "پیسٹری کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"تمام پیسٹریاں دو دن پرانی ہیں۔ البتہ آج صبح نارمن نے بہت اچھا چاکلیٹ کیک بنایا ہے۔"

"پھر وہی لے آؤ اور ساتھ میں چائے بھی۔"

کترینا نے تیزی سے گردن ہلائی اور میری طرف دیکھنے لگی۔

"میرے لیے بلیک کافی۔"

وہ کچھ کہے بغیر چلی گئی۔ شریے کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "کیا بہت پسند آگئی ہے؟"

"شاید۔" وہ جھینپتے ہوئے بولا۔

میں اس سے لیری کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا لیکن شریے کا ذہن کہیں اور تھا۔ اس نے اپنے خیالوں سے باہر آتے ہوئے کہا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ کترینا ابھی اکیلی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ اس کی شادی تو نہیں ہوئی یا اس کا کوئی بوائے فرینڈ......"

"یہ معلوم کرنے کی فیس پانچ سو ڈالرز ہے۔" میں نے مذاق میں کہا۔

"رہنے دو۔ میں خود اس سے پوچھ لوں گا۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، کترینا کھانے پینے کی چیزیں لے کر آگئی اور ہمیں گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں اسے وہیں بیٹھا ہوا چھوڑ کر اوپر چلا آیا کیونکہ اس کے سر پر کترینا سوار ہوچکی تھی اور اب اس سے لیری کے بارے میں کچھ پوچھنا بیکار تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں آکر کمپیوٹر آن کیا اور مختلف لیبارٹریوں کے پتے اور ٹیلی فون نمبرز تلاش کرنے لگا۔ اسکرین پر ایسے کئی اشتہارات نظر آئے جن میں کئی اشیا کے تجزیے کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ ان میں کیمیکلز، دھاتیں، کیڑے مار دوائیں، بیکٹیریا، پانی اور نہ جانے کیا کچھ شامل تھا لیکن ان میں ایک بھی لیبارٹری ایسی نظر نہ آئی جہاں زہریلی خوراک کا تجزیہ کیا جاتا ہو۔ مجبوراً میں نے براہِ راست فون پر معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

پہلا فون اٹھانے والا کوئی مرد تھا۔ وہ میرا سوال سنتے ہی بھڑک گیا اور جھلاتے ہوئے بولا۔ "مسٹر! ہمارے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ ہم اس طرح کا مذاق برداشت نہیں کرسکتے۔"

مجھے اس جواب پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ جانتا تھا کہ اس طرح کے کئی جملے سننے کو ملیں گے لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ دوسرا... فون ایک عورت نے اٹھایا۔ اس نے اپنا تعارف لوسی کے نام سے کرایا۔ میری بات سننے کے بعد وہ بولی۔ "ضروری نہیں کہ اس کے کھانے میں زہر ملایا گیا ہو۔ ممکن ہے کہ کوئی وزن کم کرنے والی دوا دی جارہی ہو جس سے بھوک ختم ہوجاتی ہے۔"

"فرض کرلو کہ کھانے میں زہر دیا جارہا ہے تو یہ کون سا ہوسکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے نام اتنے پیچیدہ ہیں کہ تمہارے سر پر سے

گزر جائیں گے۔ ویسے عام طور پر سنکمیا کا استعمال زیادہ ہے۔ اگر اسے مناسب مقدار میں دیا جائے تو وزن کم ہونے لگتا ہے لیکن موت کا کوئی اندیشہ نہیں۔ کیا اس کی بیوی کا کوئی سائنسی یا طبی پس منظر ہے؟ میرا مطلب ہے کہ وہ دواؤں اور کیمیائی اشیا کے بارے میں کیا جانتی ہے؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

مجھے لوسی سے باتیں کرنے میں مزہ آرہا تھا اور میری خواہش تھی کہ وہ دیر تک اسی خوشگوار لہجے میں مجھ سے گفتگو کرتی رہے لیکن وہ ڈیوٹی پر تھی اور اس کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا چنانچہ اس نے معذرت کرتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میرا دوبارہ کافی پینے کا موڈ ہو رہا تھا۔ اس لیے ایک بار پھر نیچے آگیا اور یہ دیکھ کر مجھے خاصی حیرت ہوئی کہ شرے ابھی تک وہیں تھا۔ کترینا کچن کاؤنٹر پر کھڑی پلیٹیں صاف کر رہی تھی اور وہ اس سے مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ میرے لیے یہ حیرت کا ایک اور جھٹکا تھا۔ کترینا خاصی بدمزاج اور تنک مزاج عورت تھی اور کسی اجنبی کو تو وہ بالکل بھی منہ نہیں لگاتی تھی۔ نہ جانے اسے شرے میں ایسی کیا بات نظر آئی کہ وہ اس سے اتنی جلدی گھل مل گئی۔ خیر مجھے اس سے کیا۔ میں نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور ریستوران سے باہر آگیا۔ اب میرا رخ پی پی کی جانب تھا۔

سڑک پر جمی ہوئی برف کی تہ کی وجہ سے میں نے پانچ منٹ کا فاصلہ آدھے گھنٹے میں طے کیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو لیری جاچکا تھا اور ریستوران میں صرف دو افراد نظر آئے۔ ان میں سے ایک بھاری بھرکم گاہک بوتھ میں بیٹھا ہوا تھا جبکہ کاؤنٹر کے پیچھے ایک عورت براجمان تھی۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ دراز قد اور دبلی پتلی تھی۔ اس نے اپنے سیاہ بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔ اس نے ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا اور بولی۔ ''اندر آجاؤ اجنبی! باہر بہت سردی ہے۔''

میں ایک اسٹول گھسیٹ کر کاؤنٹر کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ میری حالت دیکھ کر وہ بولی۔ ''کیا بہت دور سے آرہے ہو؟''

''لگتا تو ایسا ہی ہے۔'' میں نے اپنے لباس پر لگی ہوئی برف جھاڑتے ہوئے کہا۔

''یہ مت بھولو کہ سردی کے موسم میں تمہیں اضافی کیلوریز کی ضرورت ہے۔''

''گویا تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ روزمرہ کی خوراک لیتا رہا تو میرا وزن کم ہو سکتا ہے؟''

تمہیں وزن کم کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور کوئی تمہیں اس کے لیے مجبور نہیں کر سکتا۔''

''لگتا ہے کہ تمہیں اس بارے میں خاصا تجربہ ہے۔'' میں چاہ رہا تھا کہ کسی طرح اسے گھما پھرا کر لیری کے موضوع پر لے آؤں۔ وہ اداس لہجے میں بولی۔

''ہاں جب وزن بڑھنا شروع ہوا تو میرے سابق شوہر سے یہ برداشت نہ ہو سکا چنانچہ اس نے مجھے وزن کم کرنے کی دوا دینا شروع کر دی۔''

''اس نے تمہیں کون سی دوا دی تھی؟''

''وہ ایک دواساز کمپنی میں کام کیا کرتا تھا اور اس نے وہ دوا تجرباتی طور پر آزمائی تھی۔ میں ڈاکٹر کے نسخے کے بغیر اس دوا کو استعمال کرنے سے ہچکچا رہی تھی لیکن اس نے مجھے یقین دلایا کہ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ مجبوراً مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔''

میں نے اسے مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں اسے شک نہ ہو جائے البتہ اپنے گاہک ہونے کا ثبوت دینے کے لیے کافی اور پیسٹری کا آرڈر دے دیا۔ وہ دونوں چیزیں لے کر آئی تو بے اختیار میری زبان سے نکل گیا۔

''شکریہ رونڈا۔''

وہ چونکتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟ کیا بریڈ نے تمہیں بھیجا ہے؟''

''بریڈ کون ہے...... تمہارا سابق شوہر؟''

''تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بتاؤ تم کون ہو اور یہاں کس مقصد سے آئے ہو؟''

''میرا نام البرٹ ہے اور میں ایک ایسے شخص کے لیے کام کر رہا ہوں جو یہاں آتا رہتا ہے۔ اس نے تمہاری بہت تعریف کی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہاری خاطر اپنی بیوی کو چھوڑنے پر بھی تیار ہو جائے گا۔''

''میں شادی شدہ لوگوں سے میل جول نہیں رکھتی۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔ ''تم کیا کام کرتے ہو؟''

''میں پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔''

''تمہیں بریڈ نے بھیجا ہے؟'' وہ خوفزدہ ہوتے ہوئے بولی۔

''نہیں۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ بریڈ نے مجھے نہیں بھیجا بلکہ میں ایک اور شخص کے لیے کام کر رہا ہوں جو تمہارا گاہک ہے۔''

''کیا میں کام کی نوعیت جان سکتی ہوں؟''

''یہ میں فی الحال نہیں بتا سکتا۔''

وہ مشتعل ہوتے ہوئے بولی۔ ''یہ اچھا طریقہ ہے۔ مجھ سے تو پوچھے جا رہے ہو لیکن میری کسی بات کا جواب نہیں دے رہے۔''

''ہر سراغ رساں اسی اصول پر عمل کرتا ہے۔ میں صرف وہی بات بتا سکتا ہوں جس سے تمہیں کچھ فائدہ پہنچے۔''

مجھے اندازہ تھا کہ اس گفتگو کے بعد وہ مجھے لیری کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گی۔ ویسے بھی میں فی الوقت اسے ایک نظر دیکھنے اور ملنے کے لیے آیا تھا کہ اس میں ایسی کیا خوبی ہے جو لیری اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔

واپس آیا تو کترینا تنہا بیٹھی تاش کے پتوں سے دل بہلا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ''ریستوران بند ہو چکا ہے۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔''

''تم پریشان مت ہو۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شریے کب گیا تھا؟''

''وہ کافی دیر تک یہاں بیٹھا رہا لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ مجھے ڈیٹ پر چلنے کے لیے کہتا۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی پھر اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کہنے لگی۔ ''شریے نے بتایا ہے کہ تمہیں کوئی کام مل گیا ہے۔ تمہاری ماں یقیناً یہ سن کر خوش ہو گی۔''

''ہاں۔'' میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا اور اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ لپک کر میرے پیچھے آئی اور بولی۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ لیری نے جو کچھ بتایا وہ سب سچ ہے؟''

''ممکن ہے کہ اس میں تھوڑا بہت جھوٹ شامل ہو، لیکن ہمیں ان کی فراہم کردہ معلومات پر بھروسا کرنا پڑتا ہے۔ جھوٹ سچ کا پتا تو بعد میں چل ہی جائے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ اس نے تمہیں پوری بات نہیں بتائی۔ تمہیں اس سے مزید سوالات کرنے چاہئیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بدپرہیزی کرنے کے باوجود اس کا وزن کم ہو رہا ہے؟''

''کمال ہے۔ تم اتنی چھوٹی عمر میں ایسی عقل مندی کی باتیں کر لیتی ہو۔'' میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

اب مجھے لیری کا انتظار تھا۔ اس نے مجھے کھانے کے نمونے پہنچانے کے لیے کہا تھا جن کے بارے میں اسے شک تھا کہ ایما نے ان میں کچھ ملا دیا ہے۔ اس کی آمد رات آٹھ بجے کے قریب ہوئی۔ برف باری اور سردی کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے کپڑوں اور جوتوں سے برف جھاڑنے کے بعد جیب سے پانچ عدد پیکٹ نکالے اور مجھے ان کے بارے میں تفصیل بتانے لگا۔ پہلے میں سلاد، دوسرے میں چکن تکا، تیسرے میں پھول گوبھی، چوتھے میں فروٹ سلاد اور پانچویں پیکٹ میں لیموں پانی تھا۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جس سے لیری کو نقصان پہنچ سکتا۔ میں نے حیرت سے ان چیزوں کو دیکھا اور بولا۔ ''کیا ایما کو تم سے کوئی خطرہ ہے؟''

''نہیں۔''

''کیا تمہارے گھر میں کوئی ہتھیار ہے؟''

''پہلے میرے پاس ایک ریوالور تھا لیکن میں نے اسے ڈیڈی کے پاس رکھوا دیا ہے کیونکہ کوری اب بڑا ہو گیا ہے اور وہ اپنی ناسمجھی میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''کیا تمہیں کوری سے کوئی خطرہ تھا؟''

لیری کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے لمحہ بھر کو سوچا پھر گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں...... لیکن ایما کا بھی یہی خیال تھا کہ گھر میں کوئی ہتھیار نہیں ہونا چاہیے۔''

میں نے وہ پیکٹ فریج میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''کل صبح لیبارٹری والوں کو فون کر دوں گا۔ وہ کوریئر کے ذریعے یہ نمونے منگوا لیں گے۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو چند سوال کر سکتا ہوں؟''

''ہاں ہاں ضرور۔ تمہیں مطمئن کرنا میرا فرض ہے۔''

''ایما سے تمہاری ملاقات کام کے دوران ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ کیا کرتی تھی، کیا اس نے سائنس پڑھی ہے؟''

''ہاں۔ اس نے بیالوجی میں ڈگری لے رکھی ہے۔''

''لیبارٹری والوں نے مجھے بتایا ہے کہ کچھ زہر ایسے بھی ہیں جن سے وزن تو کم ہو جاتا ہے لیکن زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔''

''یقیناً۔ ایما نے ایسا ہی کوئی بندوبست کیا ہو گا۔'' لیری نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''میں آج پیپی گرل گیا تھا۔''

''اچھا۔'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''میں دوبارہ وہاں جا کر رونڈا سے مزید گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ خصوصاً اس واقعے کے بارے میں جب ایما تمہارا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچی تھی۔ کیا تمہارے خیال میں یہ مناسب ہو گا؟''

''تم جو چاہو کرو، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔''

''ایک بات اور۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''جب سے تمہارا وزن کم ہونا شروع ہوا ہے، کیا تم نے اپنے نظام ہاضمہ میں کوئی تبدیلی محسوس کی؟''

''ہاں۔ میرے پیٹ میں اکثر درد رہنے لگا ہے اور پہلے کے مقابلے میں باتھ روم بھی زیادہ جانے لگا ہوں۔''

مجھے لگا جیسے اب بھی اس نے پوری بات نہیں بتائی۔ میں نے قدرے برہم ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم نے میری خدمات اس لیے حاصل کی ہیں کہ تمہیں مرنے سے بچا سکوں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اس دوران میں تمہارے اندر جتنی بھی تبدیلیاں آئی ہیں ان کے بارے میں مجھے بتادو۔''

''میرے سر میں درد رہنے لگا ہے۔ صبح بستر سے اٹھنے کے دس منٹ بعد شروع ہوتا ہے اور دن بھر وقفے وقفے سے ہوتا رہتا ہے۔'' اس نے اپنی دائیں آنکھ کے اوپر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن بھی وقفے وقفے سے برفباری ہوتی رہی۔ میں نے کوریئر کمپنی کو فون کر کے گاڑی منگوائی اور اس کے ذریعے وہ پیکٹ لیبارٹری بھجوا دیے۔ اس کے بعد میں نے فون کر کے لوسی کو بتادیا کہ وہ پیکٹ اسے گیارہ بجے تک مل جائیں گے۔ میں جاننا چاہ رہا تھا کہ وہ کب ان پر کام شروع کرے گی۔ اس نے مجھ سے معذرت کی کہ برفباری کی وجہ سے کوریئر وین کا ڈرائیور ابھی تک نہیں آیا تھا جس کی وجہ سے وہ یہ پیکٹ نہ منگوا سکی۔ اس نے کہا کہ پیکٹ ملتے ہی ان پر کام شروع ہوجائے گا لیکن رپورٹ میں شاید دیر لگ جائے کیونکہ فی الحال وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ اس کے لیے کون کون سے ٹیسٹ کرنا ہوں گے۔

لوسی سے باتیں کرنے کے بعد میں ناشتا کرنے بیٹھا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے کوئی عورت پوچھ رہی تھی۔ ''کون بول رہا ہے؟''

میں اس آواز کو نہ پہچان سکا لہٰذا ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔ ''اگر تم کوئی چیز بیچنا چاہ رہی ہو تو سن لو کہ میرا فی الحال کچھ خریدنے کا ارادہ نہیں ہے۔''

''میں کوئی سیلز گرل نہیں ہوں۔'' وہ برہم ہوتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے گھر میں کوئی عورت ہے۔ میرا مطلب ہے بیوی یا گرل فرینڈ؟''

''نہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''اس لیے کہ یہ نمبر میرے شوہر کے کوٹ کی جیب سے نکلا ہے۔ کسی مرد کے پاس اجنبی فون نمبر کیا معنی رکھتا ہے لہٰذا مجھے اپنا شک دور کرنے کے لیے فون کرنا پڑ گیا۔ ویسے بائی دا وے تم کون ہو؟''

''پہلے تم اپنا تعارف کرادو۔ پھر بتاؤں گا کہ میں کون ہوں۔''

اس نے کوئی جواب دیے بغیر فون بند کردیا اور میں سوچنے لگا کہ وہ کون شخص ہوسکتا ہے جس نے حال ہی میں میرا فون نمبر لیا ہو اور مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ فون کرنے والی لیری کی بیوی ایما تھی۔ میں نے اپنا کوٹ اٹھایا اور پیچی جانے کے لیے روانہ ہوگیا۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ اگر ایما کو پہچان لیا ہوتا تو اس سے یہ ضرور پوچھتا کہ کیا واقعی وہ اپنے شوہر کو کھانے میں زہر دے رہی ہے؟ لیکن وہ لمحہ میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور ایما کے فون سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ وہ لیری کے کھانے پینے پر ہی نہیں بلکہ اس کی نقل وحرکت پر بھی پوری طرح نظر رکھتی ہے۔ میرے علم کے مطابق لیری کی زندگی میں آنے والی واحد عورت رونڈا تھی جس نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ کسی شادی شدہ مرد کے ساتھ تعلق قائم کرنے پر یقین نہیں رکھتی تاہم اس کے باوجود لیری کی جانب سے کسی کوشش کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔

رونڈا مجھے دیکھ کر تھوڑی سی حیران ہوئی اور بولی۔ ''تم پھر آگئے؟''

میں کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھا اور کاؤنٹر کے ساتھ رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے قریب آکر بولی۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم یہاں کچھ کھانے نہیں بلکہ معلومات حاصل کرنے کے لیے آئے ہو۔''

''کیا دونوں کام ساتھ ساتھ نہیں ہوسکتے؟''

وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیا کھاؤ گے؟''

''کافی اور چاکلیٹ کیک۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے سر ہلایا اور چند منٹ بعد دونوں چیزیں میرے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''میں اس شخص کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں جو دوپہر کے وقت تمہارے ہاں چیز برگر کھانے آتا تھا۔''

''تم لیری کی بات کررہے ہو؟''

مجھے یہ سن کر تھوڑی سی حیرانی ہوئی کیونکہ لیری یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کا نام جانتی ہے یا نہیں۔ میں نے رونڈا سے پوچھا۔ ''اس کی بیوی بھی ایک مرتبہ یہاں آئی تھی؟''

''ہاں اور اس نے کافی شور مچایا تھا کیونکہ وہ بدپرہیزی کا مرتکب ہورہا تھا۔''

''تم خود بھی اس تجربے سے گزر چکی ہو لہٰذا تمہیں افسوس تو ہوا ہوگا؟''

''اس کے باوجود میں اب بھی اسے چیز برگر دیتی ہوں کیونکہ اسے اپنی مرضی سے کھانے کا حق ہے اور کوئی بھی اسے نہیں روک سکتا۔''

''تم لیری کو پسند کرتی ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے بلا جھجک کہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے اسے مزید بے عزتی سے بچانے کے لیے چیز برگر میں وہ بچی ہوئی دوا ملا دی ہو جو تمہارا سابق شوہر وزن کم کرنے کے لیے تمہیں دیا کرتا تھا؟''

اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ بولی۔''اس سے پہلے کہ میں تمہارا سر پھاڑ دوں، تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

مجھے اپنی کھوپڑی بہت عزیز تھی۔ اس لیے خاموشی سے کھسک لیا۔

☆☆☆

ڈیڑھ بجے کے قریب لوسی نے فون پر بتایا کہ وہ کھانے کے نمونوں کا تجزیہ کر رہی ہے اور ابھی تک ایک رزلٹ مثبت آیا ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق صرف چکن تکا میں سنکھیا کی مقدار پائی گئی ہے لیکن اس سے نہ تو وزن کم ہوتا ہے اور نہ ہی سر میں درد یا چکر آتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ مجھے گزشتہ دو ہفتوں کے کھانے کے نمونے فراہم کر دو اور اگر یہ ممکن نہیں تو ہیری کے کچھ بال منگوالو۔ اس سے بھی اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے جسم میں سنکھیا کی کتنی مقدار جمع ہو گئی ہے۔

ان ابتدائی رپورٹ سے ایک بات تو سامنے آ گئی کہ ایما نے لیری کے لیے جو چکن تیار کیا، اس میں سنکھیا ملا ہوا تھا اور ایسا حادثاتی طور پر نہیں ہوا تھا بلکہ ایما چاہتی تھی کہ سنکھیا کی تھوڑی سی مقدار بھی وزن کم کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ مجھے یہ اطلاع لیری کو فوراً پہنچانی تھی تاکہ وہ پولیس کی مدد حاصل کرے۔ لہٰذا میں نے اس کے سیل فون پر رابطہ کر کے پوچھا۔''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''یہ کھانے کا وقفہ ہے اور میں وہیں جا رہا ہوں جہاں مجھے اس وقت ہونا چاہیے۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ چپی جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''مجھے لیبارٹری سے ابتدائی رپورٹ ملی ہے۔ کیا میں وہیں آ جاؤں؟''

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔''ٹھیک ہے آ جاؤ۔''

''میرے لیے ایک کافی کا آرڈر دے دینا۔ میں پہنچ رہا ہوں۔''

وہ اس وقت ایک بوتھ میں بیٹھا ہوا تھا اور میز پر اس کی پسندیدہ اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے میرے لیے کافی منگوائی اور بولا۔''تمہارے پاس کیا معلومات ہیں؟''

''تمہیں زہر دیا جا رہا ہے۔'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔''تم نے جو کھانے کے نمونے دیے تھے ان میں سے چکن میں سنکھیا کی معمولی مقدار ملی ہے لیکن لیبارٹری والوں کا کہنا ہے کہ یہ اتنی مہلک نہیں کہ اس سے تمہاری موت واقع ہو یا وزن کم ہو جائے۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' وہ غراتے ہوئے بولا۔''میرا وزن تو کم ہو رہا ہے۔''

''انہیں مزید نمونے چاہئیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اپنے تھوڑے سے بال دے دو تاکہ ان سے تمہارے جسم

میں پہنچنے والی سنکھیا کی مقدار کا اندازہ لگایا جا سکے۔“

لیری نے کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی رونڈا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میں تمہیں بعد میں فون کروں گا۔“

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ مجھے جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔

مجھے اس کے رویّے پر حیرت ہوئی تھی۔ میری دی ہوئی اطلاع کے مقابلے میں اس کے لیے چیز برگر اہم تھا یا وہ رونڈا کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا خواہش مند تھا....؟

بہرحال میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ میں اپنا کام کر چکا تھا اور اب اسے فیصلہ کرنا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ ساڑھے چار بجے اس نے فون کر کے کہا۔ ”میں نے آج شام ایما سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس موقع پر موجود رہو۔ کیا آج شام تم میرے گھر آ سکتے ہو؟“

”میں وہاں آ کر کیا کروں گا؟“ میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہا۔

”میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ لیبارٹری رپورٹ کے مطابق چکن میں سنکھیا کی موجودگی پائی گئی ہے۔“

”کیا وہ تمہاری بات پر یقین کر لے گی؟“

”میں چاہتا ہوں کہ تم بھی ایک غیر جانبدار شخصیت کے طور پر اس کی تصدیق کر سکو۔“

”ٹھیک ہے آ جاؤں گا اور کچھ.....“

”ہاں، کل صبح میں نے اپنے وکیل سے گیارہ بجے کا وقت لیا ہے۔ تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”وہ کس لیے؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ایما مجھے سنکھیا دے رہی ہے۔ میں اسے مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ خواہ اس کے کچھ بھی نتائج نکلیں۔ اور تم وکیل کو اس لیبارٹری کے بارے میں بتاؤ گے جہاں سے ٹیسٹ کروایا ہے۔ میں تمہیں مزید ٹیسٹ کے لیے اپنے بال بھی دوں گا۔ تم ساڑھے چھ بجے تک میرے گھر آ جاؤ۔“

سلسلہ منقطع ہونے کے بعد میں سوچنے لگا کہ لیری پولیس سے مدد لینے کے بجائے وکیل سے کیوں رجوع کر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد شرے کا فون آیا۔ وہ خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”لیری نے مجھے بتایا ہے کہ اس کو کھانے میں سنکھیا دیا جا رہا ہے۔“

لیری خود ہی ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا تو مجھے کچھ چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، لیبارٹری رپورٹ تو یہی کہتی ہے۔“

”وہ آج اپنی بیوی سے بات کرنے والا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ میں بھی وہاں موجود رہوں۔“

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ لیری سب لوگوں کو جمع کر رہا تھا لیکن پولیس کی مدد نہیں لے رہا۔ تھوڑی دیر بعد لوسی کا فون آیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں نے تمام ٹیسٹ مکمل کر لیے ہیں اور ان کی رپورٹ ای میل کر رہی ہوں۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے لیری کا نمبر ملایا لیکن اس کا فون بند تھا۔

☆☆☆

میں ساڑھے چھ بجے کے قریب لیری کے گھر پہنچ گیا۔ دروازہ ایما نے ہی کھولا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے برا سا منہ بنایا اور بولی۔ ”ایک اور آ گیا۔“

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ خاصی دلکش عورت تھی لیکن چہرے پر چھائی ہوئی کرختگی نے اس کے حسن کو ماند کر دیا تھا۔ میں نے اس کی ناراضی کی پروا کیے بغیر کہا۔ ”میرا نام البرٹ سیمسن ہے اور لیری نے مجھے بلایا ہے۔“

وہ مجھے اندر ہال میں لے گئی جہاں شرے پہلے سے موجود تھا اور خاصا مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ لیری اس کے برابر میں ہی کھڑا ہوا تھا۔ میں نے ہال کا بغور جائزہ لیا اور میری نظریں ایک سیاہ بالوں والے لڑکے پر جم گئیں جو راہداری میں کھڑا جھانک رہا تھا۔

میں نے لیری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ سب لوگ آ چکے ہیں۔ اب بتاؤ کہ ایجنڈا کیا ہے؟“

”ایجنڈا۔“ ایما چونکتے ہوئے بولی۔ ”کیا یہاں کوئی میٹنگ ہو رہی ہے؟“

لیری نے اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ ”ایما! یہ لوگ جانتے ہیں کہ دو ماہ پہلے تم نے میری خوراک میں تبدیلی کی تھی تاکہ میرا وزن کم ہو جائے۔“

”پھر تو انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ تم نے بے ایمانی کی اور رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔“

”ہاں کیونکہ مجھے وہ خوراک پسند نہیں تھی۔“ لیری نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں تو یہ سب تمہاری بہتری کے لیے کر رہی ہوں۔“ ایما بولی۔ ”موٹا آدمی کسی کام کا نہیں رہتا۔“

لیری کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ بولا۔ ”شاید اس میں بھی میری کوئی بہتری تھی کہ تم نے مجھے کھانے میں زہر دینا شروع کر دیا۔“

ایما یہ سن کر حیران رہ گئی اور بولی۔ ”زہر میرے

دیے ہوئے کھانے میں نہیں بلکہ ان چیز برگر میں ہوگا جو تم چوری چھپے کھاتے رہے ہو۔“

”میں بلاوجہ ہی تم پر الزام نہیں لگا رہا۔ مسٹر سیمسن پرائیویٹ سراغ رساں ہیں اور انہوں نے اس کھانے کا لیبارٹری میں تجزیہ کروایا ہے جو تم نے گزشتہ شب مجھے دیا تھا۔“

ایما نے کوئی جواب نہیں دیا اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

”مسٹر سیمسن! تم وہ رپورٹ لائے ہو؟“ لیری نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ذرا میں بھی تو سنوں مسٹر سراغ رساں کہ تم نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔“ ایما طنزیہ لہجے میں بولی۔

میں نے اسے غصے سے گھورا اور کہا۔ ”بیٹھ جاؤ اور خاموشی سے میری بات سنو۔“

اسے شاید میری جانب سے اس ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ ”گزشتہ شب تم نے لیری کو جو کھانا دیا تھا، اس کے نمونے میں نے لیبارٹری بھیجے تھے اور آج سہ پہر میں انہوں نے بتایا ہے کہ تمہارے دیے ہوئے چکن میں سنکھیا کی مقدار پائی گئی ہے۔“

لیری چلاتے ہوئے بولا۔ ”اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم مجھے زہر دے رہی تھیں تاکہ میرا وزن کم ہو جائے جبکہ میں ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن تم ہمیشہ وہی کرتی ہو جو تمہارا دل چاہتا ہے اور تم نے کبھی کسی دوسرے شخص کے جذبات و احساسات کی پروا نہیں کی۔ اس لیے میں کوری کو لے کر اپنے والدین کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ میرے فون کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اب میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں رک سکتا کیونکہ تم مجھے کھانے میں زہر دے رہی ہو۔“

وہ اپنی ایڑیوں کے بل گھوما اور راہداری میں کھڑے ہوئے لڑکے کو آواز دیتے ہوئے بولا۔ ”کوری! آ جاؤ...... تمہاری دادی اور دادا انتظار کر رہے ہیں۔ اپنی کتابیں، گیم اور تھوڑے سے کپڑے ساتھ لے لو۔ باقی سامان ہم بعد میں لے جائیں گے۔“

کسی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ تب میں نے اپنی جیب سے اس رپورٹ کی ای میل کاپی نکالی اور بولا۔ ”آج سہ پہر میں لیبارٹری انچارج نے مجھے دوبارہ فون کیا تھا......“

میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے لیری چلاتے ہوئے بولا۔ ”اس نے یہی کہا ہوگا کہ چکن کے نمونے میں سنکھیا کی مقدار پائی گئی ہے۔“

کلاسیکل بے عزتی

ایک لڑکا سائیکل پر جا رہا تھا۔ سائیکل کا ٹائر بھینس کے گوبر کے بیچ سے گزر گیا، قریب کچھ لڑکیاں کھڑی تھیں۔ انہوں نے تالیاں بجا کے کہا۔

”ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔“

لڑکا رکا اور بولا۔ ”وش“ کرنے سے کام نہیں چلے گا، کیک تو کھانا ہی پڑے گا۔“

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

”خاموشی سے بیٹھ جاؤ اور میری پوری بات سن لو۔“ میں نے قدرے برہم ہوتے ہوئے کہا۔ ”یہ معلوم ہو جانے کے باوجود لیبارٹری انچارج نے ان نمونوں کے مزید ٹیسٹ کیے تاکہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچا جائے۔“

”میں نے کھانے میں سنکھیا نہیں ملایا۔“ ایما غصے سے بولی۔ ”اگر مجھے اسے مارنا ہوتا تو یہ کام بہت پہلے کر چکی ہوتی۔“

”تم کچھ دیر خاموش نہیں رہ سکتیں۔“ میں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا تو وہ سہم گئی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”دوسرے تجزیوں میں مزید کسی زہر کی موجودگی کا انکشاف نہیں ہوا۔ البتہ لیمن میں ایک ایسے کیمیکل کی موجودگی کا پتا چلا ہے جو وزن کم کرنے والی دوا میں استعمال کیا جاتا ہے۔“

میری بات سن کر سب لوگ حیران رہ گئے لیکن کوئی کچھ نہیں بولا۔ میں نے ایما کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ ڈائٹنگ شروع کرتے ہی تمہارا وزن تیزی سے کم ہونا شروع ہو گیا تھا؟“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کیا تم نے کوئی وزن کم کرنے والی دوا استعمال کی تھی؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے کہا۔ ”کیا تم نے لیری کو اس بارے میں بتایا تھا یا اس پر یہی ظاہر کرتی رہیں کہ محض سلاد کھانے اور قوتِ ارادی کے بل بوتے پر تمہارا وزن کم ہو رہا ہے؟“

”اس نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا لہٰذا یہ جھوٹ میں شمار نہیں ہوگا۔“

لیری کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ چلاتے ہوئے بولا۔ ”تم نے مجھے دھوکا دیا۔“

ایما اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر بولی۔ ”میں موٹی ہو رہی تھی لہٰذا میں نے وہی کیا جو کرنا چاہیے تھا جبکہ لیری کو

وزن کم کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں اسے پرہیزی کھانا بنا کر دیتی تھی اور وہ باہر جاکر چیز برگر کھا لیتا تھا۔''

''لہٰذا تم نے بھی اس کے لیمن میں وہ دوا ڈالنا شروع کردی۔''

''نہیں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' ایما مضبوط لہجے میں بولی۔

''لیری! کیا تم نے ایسا نہیں کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ مجھے وزن کم کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔''

اچانک ہی کوری کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ ''وہ دوا میں نے ڈالی تھی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

☆☆☆

''حیرت ہے کہ وہ شخص خود ہی اپنے کھانے میں سنکھیا ملاتا رہا۔'' کترینا بھناتے ہوئے بولی۔

''یہ اس کے پلان کا حصہ تھا۔'' شرے نے کہا۔ ''تاکہ وہ اپنی بیوی کو موردِ الزام ٹھہرا کر بیٹے کو ساتھ لے جاسکے۔''

''یہ بالکل احمقانہ حرکت تھی۔'' کترینا نے کہا۔ ''اگر ایما نے کھانے میں زہر ملایا ہے تو بوتل پر اس کی انگلیوں کے نشانات بھی ہوں گے۔''

''تم جانتی ہو کہ موٹے آدمی میں عقل کی کمی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ زیادہ دور کی نہیں سوچتا۔''

شرے نے کہا۔ ''وہ ایما سے علیحدگی اختیار کرکے کوری کو اپنے پاس رکھنا چاہ رہا تھا جس پر اس کے وکیل نے مشورہ دیا کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ لڑکے کی ماں کو خطرناک اور ان فٹ ثابت کرسکے۔''

مجھے یقین نہیں تھا کہ اب لیری اپنے وکیل سے ملنے جائے گا کیونکہ جب گزشتہ شب میں وہاں سے رخصت ہوا تو ایما اور لیری کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ کوری کو بہلانے کی کوشش کررہے تھے۔

شرے نے کہا۔ ''یہ حرکت کوری کی تھی۔ اسی نے لیری کے لیمن جوس میں دوا ملائی تھی کیونکہ وہ لیری اور ایما کے روز روز کے جھگڑوں سے پریشان تھا لہٰذا جب اس نے اپنی ماں کے میڈیکل بکس میں وہ دوا دیکھی تو چپکے سے اس کے چند قطرے اپنے باپ کی ڈرنک میں ڈالنا شروع کردیے جس سے اس کا وزن کم ہونا شروع ہوگیا۔ ایما بھی مطمئن ہوگئی اور کوری نے سوچا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا لیکن رونڈا کی وجہ سے سارا معاملہ خراب ہوگیا۔''

''وہ کس طرح؟'' کترینا نے پوچھا۔

شرے کے بجائے میں نے جواب دیا۔ ''لیری اسے پسند کرنے لگا تھا۔ جبکہ رونڈا کا کہنا ہے کہ وہ کسی شادی شدہ مرد سے محبت کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''اب کیا صورتِ حال ہے؟'' کترینا نے پوچھا۔

''کوری نہیں چاہتا کہ وہ اپنی ماں کو چھوڑ کر جائے یا اسے باپ کی شفقت سے محروم ہونا پڑے چنانچہ بیٹے کی خاطر وہ اپنے اختلافات دور کرنے پر رضامند ہوگئے ہیں اور ماحول کی تبدیلی کی خاطر کہیں باہر جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔''

''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ لیری نے سنکھیا کا انتخاب کیوں کیا؟''

''اس لیے کہ اس نے کہیں پڑھ لیا تھا کہ سنکھیا کی تھوڑی سی مقدار کھانے میں ملانے سے وزن کم ہونے لگتا ہے۔ جب ایما نے اسے چیز برگر کھاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا تو اس نے اپنے ذہن میں یہ منصوبہ ترتیب دیا۔ اس طرح اس کا وزن کم ہونے لگا اور ایما مطمئن ہوگئی پھر وہ بلا روک ٹوک چیز برگر کھانے کے بہانے رونڈا سے ملنے لگا۔ پلان کے آخری حصے پر عمل کرتے ہوئے اس نے الزام لگایا کہ ایما اس کے کھانے میں زہر ملا رہی ہے۔ پہلی رپورٹ میں زہر کی موجودگی کی تصدیق تو ہوگئی لیکن یہ مقدار اتنی نہیں تھی کہ اس سے وزن کم ہوسکے البتہ جب تمام نمونوں کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا تو صورتِ حال واضح ہوگئی۔ لیری کا خیال تھا کہ وہ ایما پر الزام لگا کر کوری کو ساتھ لے جائے گا لیکن دوسری رپورٹ نے بھانڈا پھوڑ دیا اور کوری کے اعتراف کے بعد تو بازی ہی پلٹ گئی۔''

''میں تم لوگوں کے لیے کافی لے کر آتی ہوں۔'' کترینا اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے شرے سے کہا۔ ''جب سے تم نے کترینا کو دیکھا ہے، مسلسل اس کے گرد منڈلا رہے ہو۔ لگتا ہے کہ تم نے لیری کے واقعے سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ اگر تمہارے دل میں کوئی بات ہے تو کہہ ڈالو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ساری عورتیں ایما جیسی نہیں ہوتیں۔''

شرے نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا۔ کترینا کافی کے کپ لیے ہماری طرف ہی آرہی تھی۔ شرے نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''سوچ رہا ہوں کہہ ڈالوں۔''

''میں منتظر ہوں۔'' کترینا کافی کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

ابھی منصور حلاج نے الوہیت کا دعویٰ نہیں کیا تھا، بغداد میں جنید بغدادی، سری سقطی، معروف کرخی بڑا نام بن چکے تھے۔ ان کی محبت میں ایک ایسے صوفی کا ذکر رہنے لگا جس کا بیشتر وقت بشر حافی اور ذوالنون مصری کی صحبت میں گزرتا تھا۔ ان کا نام تھا ابوسعید خراز، ابوسعیدؒ صوفی بھی تھے اور عالم بھی، زہد و ریاضت کے ساتھ ہی کتابیں لکھنے کا شوق بھی پورا کرتے رہتے اور یہ شوق، شوق ہی نہیں تھا، عشق تھا، ویسا عشق جو خدا سے لوگ کے صوفیائے کرام ظاہر کیا کرتے تھے۔ آپ نے السیر نامی ایک کتاب لکھی تو بغداد کے علمی اور روحانی حلقوں میں زلزلہ آ گیا۔ السیر میں بندے اور خدا کے تعلق پر جس لب و لہجے میں بات کی گئی تھی، علما کے ساتھ ہی بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس کا برا مانا اور کفر کا فتویٰ دے دیا لیکن ابوسعیدؒ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔
بغداد میں ایک آواز گونجنے لگی۔ ''جب بندہ رجوع الی اللہ ہو کر اس سے رشتہ جوڑتے ہوئے قرب حاصل کر لیتا ہے تو اپنے نفس اور خدا کے علاوہ ہر شے کو فراموش کر دیتا ہے اور جب اس سے سوال کیا جاتا ہے کہ تو کہاں ہے اور کیا چاہتا ہے؟ تو وہ جواب میں صرف اللہ

دنیا کی تاریکیوں میں علم کی شمع جلانے والے نیک صفت انسان کا احوال

جیسے نیکی کے ساتھ بدی اور دن کے ساتھ رات پیدا کر کے اللہ نے بہت واضح پیغام دیا ہے کہ انسان اپنی صوابدید پر جو چاہے راستہ اختیار کرے۔ صحیح اور غلط کا فیصلہ تو روز حشر ہی ہو گا لیکن یہ پہلے ملنے والی مہلت انسان کے لیے آزمائش بھی ہے اور آخرت سنوارنے کا موقع بھی... جو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اللہ کی آزمائشوں پر پورا اترتے ہیں وہی اللہ کے برگزیدہ بندوں کی صف میں شامل ہوتے ہیں... آپ کا تعلق بھی اولیا کے قافلے سے تھا جنھوں نے تصوف کی زبان میں حق بات کہی اور اس پر ڈٹے رہے... اور اسی استقلال نے آپ کو اعلیٰ مقام عطا کیا۔

تصوف کی زبان

ضیا تسنیم بلگرامی



اللہ ہی کہتا ہے۔ اگر اس کے تمام اعضا کو گویائی عطا کردی جائے تو اس کے ہر عضو سے اللہ ہی اللہ نکلتا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اس کا ہر عضو نور سے پُر اور جذب سے لبریز ہوجاتا ہے اور اس کو وہ قرب حاصل ہوجاتا ہے کہ اس کا اللہ کہنا گویا خدا کی زبان سے اللہ کہنا ہوتا ہے۔

اس آواز نے ایک تہلکہ مچادیا۔ ایک ہنگامہ برپا کردیا۔ جذب و سوز سے خالی علما ابوسعیدؒ سے الجھنے لگے۔ وہ انہیں خوفزدہ کرنے لگے کہ ''ابوسعیدؒ! تو بہک گیا ہے اور تو اپنے ہوش میں نہیں ہے۔''

لیکن ابوسعیدؒ کو ان میں سے کسی ایک کی بھی پروا نہیں تھی۔ آپ کے ہم عصر صوفی آپ کو منع کرتے کہ اس قسم کی باتیں مت لکھا کرو لیکن ابوسعیدؒ پر ان کی نصیحتوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک سرکاری عالم نے بشر حافیؒ سے پوچھا۔ ''کیا ابوسعید خرازؒ آپ کی صحبت میں بھی اٹھتا بیٹھتا ہے؟''

بشر حافیؒ نے جواب دیا۔ ''ہاں، ابوسعیدؒ ہمارے خاص ہم نشینوں میں ہے لیکن تم یہ سوال کیوں کررہے ہو؟''

عالم نے کہا۔ ''کیا آپ نے ابوسعیدؒ کی السیر بھی پڑھی ہے۔ آپ اس کی عبارت اور مضامین سے متفق ہیں؟''

''متفق نہ ہونا کیا معنی۔ اس میں کوئی شک و شبہے کی بات تو ہے نہیں جس سے مجھے اختلاف ہو۔''

عالم نے کہا۔ ''واہ جناب! آپ بھی انہی جیسی باتیں کرنے لگے۔''

بشر حافیؒ نے عاجز آکر دریافت کیا۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو، یہ تو معلوم ہو۔''

عالم نے جواب دیا۔ ''ابوسعیدؒ اپنی تحریروں میں کفر بکتا ہے، وہ انسان کی زبان کو اللہ کی زبان قرار دیتا ہے۔ انسان مخلوق اور فانی ہے مخلوق اور فانی کی زبان اللہ کی زبان کس طرح ہوسکتی ہے۔''

بشر حافیؒ مسکرائے، فرمایا۔ ''تمہاری باتوں کا میرے پاس جواب تو ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ تم ان باتوں کا جواب ابوسعیدؒ ہی سے مانگو کیونکہ اگر میں تمہیں سمجھاؤں گا تو اس سے تمہاری گمراہی کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے مگر ابوسعیدؒ کے سمجھانے سے یہ خطرہ ٹل جاتا ہے۔''

عالم جز بز ہوکر ابوسعیدؒ کے پاس پہنچ گیا اور یہی سوال ان سے کردیا۔ بولا۔ ''ابوسعیدؒ! تو اپنی تحریروں میں کفر کیوں بک رہا ہے؟ کیا فانی مخلوق کی زبان، لافانی باری تعالیٰ کی زبان ہوسکتی ہے؟''

ابوسعید نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''اے عالم! میں خوب جانتا ہوں کہ یہ باریک نکتہ تیری سمجھ میں نہیں آئے گا۔''

عالم نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ''ابوسعیدؒ! تم علما کی بے عزتی کیوں کرتے ہو، علما نے تم صوفیوں کا کیا بگاڑا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک علما کا تعلق ہے تم صوفی ہمارے علما کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔''

ابوسعیدؒ نے جواب دیا۔ ''میں ان کے مقابلے کی بات کرہی کب رہا ہوں۔''

عالم نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میں یہ جاننے آیا ہوں کہ انسان کی زبان خدا کی زبان کس طرح ہوسکتی ہے؟''

ابوسعیدؒ نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''جب انسان ذکر و فکر میں خدا کا ہوجائے گا تو خدا اس کو تنہا کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟''

عالم نے طنز کیا۔ ''جناب! کچھ بھی ہو، میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ تم نے کفر بکا ہے اور تمہیں اس کی معافی مانگنا ہوگی، ورنہ میں تمہاری اس تحریر کے حوالے سے بغداد میں آگ لگوادوں گا۔''

ابوسعیدؒ نے صبر و تحمل کی روش اختیار کی، جواب دیا۔ ''میرے خدا نے مجھے صبر و تحمل کا حکم دیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ میں بحث و مباحثے میں الجھ کر اپنا وقت نہ ضائع کروں۔''

عالم نے فاتحانہ انداز میں پوچھا۔ ''تب پھر کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تم بحث مباحثے سے صرف اس لیے بچنا چاہتے ہو کہ تمہارے پاس اپنے دفاع میں مضبوط دلیلیں نہیں ہیں۔''

ابوسعیدؒ کو غصہ آگیا، بولے۔ ''اے دشمنِ خدا! تو یہ کیسی باتیں کررہا ہے آج؟''

عالم نے بھی جوش میں کہا۔ ''ابوسعیدؒ! دشمنِ خدا میں نہیں تم ہو، تم نے خدا کو انسانوں کی سطح پر لاکر کفر کیا ہے۔ تم باقاعدہ معافی مانگو... ورنہ میں تمہارے خلاف تحریک چلاؤں گا اور تمہیں رسوا کردوں گا۔''

ابوسعیدؒ نے کہا۔ ''اچھا تو ادھر میرے پاس آ، میں اپنی تحریروں کی صداقت ثابت کرتا ہوں۔''

عالم آپ کے روبرو بیٹھ گیا، بولا۔ ''ثابت کرو، میں دیکھتا ہوں۔''

ابوسعیدؒ نے پوچھا۔ ''تو عالم ہے یا نہیں؟''

عالم نے جواب دیا۔ ''میں عالم ہوں اور عالم بزعم خود نہیں ہوں، مجھے پورا بغداد عالم سمجھتا ہے۔''

ابوسعیدؒ نے کہا۔ ''اگر تو عالم ہے تو تو یہ بات بھی جانتا ہوگا کہ خدا خود کہتا ہے کہ سنت الٰہی کبھی نہیں بدلتی اور یہ سنتِ الٰہی کیا ہے؟ اس کائنات کی جملہ اشیا کے خواص اور فطرت۔ خود رسول مقبول ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ پہاڑ نے اپنی جگہ سے حرکت کی ہے

تو اس پر یقین کرلو لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ کسی شخص نے اپنی فطرت بدل دی ہے تو اس پر ہرگز یقین نہ کرنا۔"
عالم نے اکتا کر کہا۔ "یہ ساری باتیں میری بات کا جواب تو نہیں ہیں۔"
ابوسعیدؒ نے جواب دیا۔ "میری بات صبر و تحمل سے سنو، میری سیدھی سادی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔"
عالم نے کہا۔ "اچھا کہو، میں سنتا ہوں تمہاری بات۔"
ابوسعیدؒ نے کہا۔ "جب یہ حقیقت ہے کہ سنت الٰہی نہیں بدلتی اور فطرت ناقابل تردید ہے تو میں، تم اور جو کچھ اس جہاں میں ہے، اس کل کا ایک جزو ہے جیسے "خالق، خدا، اللہ" کہتے ہیں تو اگر میں یہ کہوں کہ جس انسان کو اس کا قرب حاصل ہو جاتا ہے، اس کا اللہ کہنا، خدا کی زبان میں اللہ کہنا ہے، اور جب کوئی صاحب قرب، اللہ کہتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ فطرت خود اپنی حقیقت بتا رہی ہے۔ فطرت سچ بول رہی ہے لیکن میری ان باتوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان آلائشوں سے پاک ہو تو ان کی سمجھ میں ان باتوں کے مجرد مفہوم آسکتے ہیں۔"
عالم نے چڑ کر کہا۔ "ابوسعیدؒ! میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔ تم نے کفر کیا ہے، تم کو اس کا اقرار کرنا پڑے گا۔"
ابوسعیدؒ نے بڑی سنجیدگی اور افسوس سے کہا۔ "افسوس کہ تم اپنی بات کو دلائل سے نہیں سمجھا سکتے اور جب میں دلائل سے سمجھانا چاہتا ہوں تو تم اسے سمجھنا نہیں چاہتے۔ خیر، تمہاری مرضی۔"
عالم نے واپس جاتے ہوئے کہا۔ "ابوسعیدؒ! میں تمہیں نہیں سمجھا سکتا کیونکہ تم لوگ کسی اور ہی دنیا کے باشندے معلوم ہوتے ہو۔"
عالم چلا گیا اور بعد میں آپ کے خلاف لوگوں میں نفرتیں پھیلاتا رہا مگر آپ کے طرز عمل اور فکری زاویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔
آپؒ پر ذکر و فکر کا کچھ ایسا غلبہ طاری ہوا کہ دنیا و مافیہا کی فکر ہی نہ رہی۔ آپؒ کو دنیا کی کسی بات کا کچھ ہوش ہی نہ تھا۔ اللہ کی یاد میں اس کی لو لگائے خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا رہتے۔ اس عالم میں آپؒ نے خواب میں دیکھا کوئی نورانی مجسمہ ان سے مخاطب ہے، اس نے آپؒ سے پوچھا۔ "ابوسعیدؒ! یہ تو ذکر و فکر میں کیوں مستغرق رہتا ہے؟"
آپؒ نے جواب دیا۔ "یہ تو تو میرے رب سے پوچھ کہ اس نے مجھے از خود رفتہ کیوں کر دیا ہے۔"
نورانی مجسمے نے کہا۔ "عجیب بات ہے کہ جس بات کا جواب تو خود دے سکتا ہے اس میں خدا کو کیوں کھینچ رہا ہے۔"
آپؒ نے پوچھا۔ "تو کون ہے اور مجھ سے اس قسم کا سوال کیوں کر رہا ہے؟"
نورانی مجسمے نے جواب دیا۔ "میں فرشتہ ہوں۔"
آپؒ نے دریافت کیا۔ "تو میرے پاس کیا لینے آیا ہے؟"
فرشتے نے جواب دیا۔ "میں صدق کا مفہوم معلوم کرنے آیا ہوں۔"
آپؒ نے فرمایا۔ "ایفائے عہد کا نام صدق ہے۔"
فرشتے نے مزید سوال کیا۔ "یہ ایفائے عہد کیا چیز ہے؟"
آپؒ نے جواب دیا۔ "انسان نے خدا سے روز ازل جو عہد کیا تھا اس کو پورا کرنا، اس پر قائم رہنا ہی ایفائے عہد ہے۔"
فرشتے نے کہا۔ "ابوسعیدؒ! واللہ تم نے صدق کا بہترین مفہوم بیان کیا ہے، اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انسانوں میں چند ہی ایسے ہیں، جو صدق کے اصل مفہوم سے واقف ہوں گے۔"
آپؒ کی آنکھ کھلی تو بے اختیار سجدے میں گر گئے اور فرمایا۔ "بارالٰہا! یہ میری خوش قسمتی اور میرے حال پر تیری مہربانی ہی کا ثمرہ تو ہے کہ میں خواب میں بھی صدق کے مفہوم سے غافل نہیں رہتا اور سوتے میں بھی ایفائے عہد کا خیال رکھتا ہوں۔" فرط جوش سے آپؒ پر رقت طاری ہوگئی، آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور اس قدر روئے کہ چادر تر ہوگئی اور دیر تک ہچکیاں اور سسکیاں لیتے رہے۔
چند دنوں بعد آپؒ کی یہ حالت ہوگئی کہ آپؒ پر پہلے سے زیادہ محویت طاری ہوگئی اور آپؒ کی زبان پر اللہ اللہ رہنے لگا۔ اسی عالم میں آپؒ نے ایک رات خواب میں رسول مقبول ﷺ کو دیکھا۔ رسول مقبول ﷺ نے آپ سے پوچھا۔ "ابوسعیدؒ! کیا تو مجھے دوست رکھتا ہے؟"
ابوسعیدؒ نے شرما کر جواب دیا۔ "یارسول اللہ ﷺ! اللہ کی دوستی اور اس کی یاد نے میرے دل میں اس طرح سرایت کیا ہے کہ وہاں کسی اور کا گزر ہی نہیں ہوتا۔ افسوس کہ میں دروغ گوئی نہیں کرسکتا۔"
رسول اللہ ﷺ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ "اے ابوسعیدؒ! میں تیرے سچ سے خوش ہوا اور یہ نکتہ یاد رکھ کہ جس نے اللہ کو دوست رکھا، اس نے مجھے دوست رکھا۔"
آپؒ کا مارے خوشی کے حال ہی غیر ہوگیا اور ایک بار پھر دل پر شدید رقت طاری ہوگئی اور دیر تک آنسو بہاتے رہے۔
آپؒ کی صحبت میں ہر عمر کے لوگ بیٹھنے کی کوشش کرتے لیکن آپؒ ان سے حذر کرتے، جوانوں کو بھی آپ کی پُرسوز اور پُرکیف باتوں

میں بڑا مزہ آتا اور ان کا کہنا یہ تھا کہ ابوسعیدؒ کی پُرکیف باتوں کا حقیقی اثر نوجوان دل ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ آپ نوجوانوں کی بڑی عزت کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ نوجوانوں کی اصلاح یوں زیادہ ضروری ہے کہ بوڑھوں کی نسبت ان کا نامۂ اعمال ستھرا ہوتا ہے۔

آپ نے عالمِ رویا میں دیکھا کہ ابلیس، آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ آپ غصے میں ڈنڈا لے کر اس کی طرف بڑھے اور للکار کر کہا۔

''ذرا ٹھہر تو، میں تیرا کام تمام کردوں گا۔''

ابلیس پر آپؒ کی للکار کا کوئی اثر نہ ہوا، جواب میں آپ نے ایک آواز سنی، کوئی کہہ رہا تھا۔ ''ابوسعیدؒ! تم ڈنڈے سے ابلیس کو خوفزدہ کرنا چاہتے ہو؟ یہ تمہارا خیالِ خام ہے۔''

آپ نے عاجزی سے پوچھا۔ ''بارالٰہا! پھر یہ کس طرح خوفزدہ ہوگا؟''

جواب ملا۔ ''ابلیس تو قلبِ مومن کے نور سے ڈرتا ہے۔''

آپ کو بیداری کے بعد یہ احساس ہوا کہ کیا میرا قلب مومن کا قلب نہیں ہے؟ کیا ابلیس میرے قلب سے ڈرتا ہے؟ لیکن ان وسوسوں اور خدشوں کا آپ کے پاس کوئی واضح جواب نہیں تھا۔ آپ ایک عرصے تک اسی گومگو میں رہے۔ آخر ایک بار آپ نے مراقبے میں ابلیس کو آواز دی۔ ''ابلیس! کیا تو میرے آس پاس کہیں موجود ہے؟''

آپ کو کوئی جواب نہیں ملا۔

آپ نے ایک بار پھر آواز دی۔ ''ابلیس! میں تجھے آواز... دے رہا ہوں، کیا تو میری آواز سن رہا ہے؟ تو کہاں ہے؟ مجھے آواز... دے، میں تیری آواز سننا چاہتا ہوں۔''

کہیں دور سے آواز آئی۔ ''ابوسعیدؒ! میں تم سے بہت دور ہوں۔''

ابوسعیدؒ نے کہا۔ ''تو میرے قریب آجا، میں تجھ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

دور سے جواب ملا۔ ''ابوسعیدؒ! افسوس کہ میں تمہارے پاس نہیں آسکتا۔''

ابوسعیدؒ نے کہا۔ ''تجھے میں بلا رہا ہوں، پھر میرے پاس آنے میں تامل کیوں ہے؟''

ابلیس نے جواب دیا۔ ''تامل یوں ہے کہ تم تارک الدنیا ہو، اور تمہارے قلب میں مومن کا نور پایا جاتا ہے اور میں تارک الدنیا لوگوں سے دور رہتا ہوں، پھر تمہارے قلب میں مومن کا نور بھی ہے اس لیے پاس آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

ابوسعیدؒ نے کہا۔ ''اگر میں تجھے اپنے پاس بلانا چاہوں تو اس کا بھی کوئی طریقہ ہے؟''

ابلیس نے جواب دیا۔ ''ہاں، میرے لیے تمہارے حالات میں ذرا سی گنجائش موجود ضرور ہے، اگر کبھی تم پھسلے تو میں تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔''

ابوسعیدؒ نے پوچھا۔ ''میں کس طرح یہ یقین کروں کہ تم کبھی میرے پاس بھی آسکتے ہو؟''

ابلیس نے جواب دیا۔ ''ابوسعیدؒ! میں سیدھی سی بات جانتا ہوں تم نوجوانوں کی اصلاح پر توجہ دیتے ہو، اور میں اس میں اپنی کامیابی دیکھ سکتا ہوں۔ نوجوانوں کی موجودگی میں، میں ہر وقت پُرامید رہتا ہوں کہ کبھی تو میں کامیابی حاصل کرلوں گا۔ میں مایوس نہیں ہوں۔''

ابوسعیدؒ نے پوچھا۔ ''یہ نوجوان لوگ تجھے کس طرح پُرامید رکھتے ہیں؟''

ابلیس نے جواب دیا۔ ''ابوسعیدؒ! میں خوب جانتا ہوں کہ جب تک نوجوان تیری صحبت میں موجود ہیں، میری کامیابی کا امکان موجود رہتا ہے۔ میں تمہارے اس محاذ کی کمزوری کا احساس رکھتا ہوں اور اس کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ کبھی نہ کبھی کامیاب بھی ہوجاؤں گا۔''

ابوسعیدؒ نے کہا۔ ''تو انتظار کرتا رہ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ میرا خدا مجھے مایوس اور شرمندہ نہیں کرے گا۔''

اس کے بعد ابلیس نے بھی سکوت اختیار کیا۔ آپ بھی چپ ہورہے۔

آپ کے دو بچے تھے جن سے آپ بڑی محبت کرتے تھے۔ ان میں سے ایک سخت بیمار پڑا۔ آپ کو اس کی بیماری کا صدمہ تو بہت ہوا لیکن آپ نے صبر و ضبط سے کام لیا۔ آپ ڈر رہے تھے کہ کہیں بیٹے کی محبت آپ کے حق میں بلائے جاں اور بلائے ایمان نہ ثابت ہو۔ بیمار بیٹا لیٹا لیٹا آپ کی صورت دیکھتا رہتا اور اس صدمے کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا، جو آپ کے دل اور دماغ کو ہلائے دے رہا تھا لیکن باپ کے چہرے پر کسی قسم کا رنج و غم نہیں پایا جاتا تھا۔ بیٹے کو باپ کے اس سکون اور اطمینان پر بڑا دکھ ہوا اور اس نے آنکھیں بند کرلیں، گویا سو گیا ہو۔ وہ باپ سے کسی قسم کی بات تک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ابوسعیدؒ بیٹے کی بند آنکھیں دیکھ کر گھبرا گئے، سرہانے کھڑے ہوکر مضطربانہ آواز دی۔ ''بیٹے! کیا بات ہے؟ کیسی طبیعت ہے؟ کیا تکلیف بڑھ گئی ہے؟''

بیٹے نے نہ تو آنکھ کھولی اور نہ ہی کوئی جواب دیا۔ آپ اور زیادہ گھبرا گئے، پھر آواز دی۔ "بیٹے! کیا بات ہے۔ تو جواب کیوں نہیں دیتا؟ اب تکلیف کا کیا حال ہے؟"

بیٹے نے ڈبڈبائی آنکھیں کھول دیں، آہستہ سے جواب دیا۔ "باواجان! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور اس احساس نے میرے دکھ اور تکلیف میں اور زیادہ اضافہ کر دیا ہے کہ آپ کو میری کوئی فکر نہیں، آپ کو مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

ابوسعیدؒ کا پیمانہ صبر چھلکنے لگا، بہ مشکل طبیعت پر قابو پا کر جواب دیا۔ "میرے بیٹے! یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے؟ میں تیرا باپ ہوں۔ کیا میں تجھ سے محبت نہیں کرتا؟ کیا میں تجھ میں دلچسپی نہیں لیتا؟ تو یہ مہمل اور فضول باتیں کیوں سوچتا ہے؟"

بیٹا زار و قطار رو رہا تھا، اس نے ہچکیوں میں جواب دیا۔ "باواجان! میں مر رہا ہوں لیکن آپ کا چہرہ پرسکون ہے۔ میں آخری ہچکی لینے کی حالت میں ہوں لیکن آپ مطمئن ہیں۔ ایسا کیوں ہے، آخر ایسا کیوں ہے؟"

ابوسعیدؒ نے بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور رقیق لہجے میں کہا۔ "بیٹے! تجھے ایسی باتیں نہیں سوچنا چاہئیں۔ میں تجھ سے بے حد محبت کرتا ہوں۔"

بیٹا بھی بڑا ہی منطقی تھا، بولا۔ "اچھا باواجان! اب آپ ایک بات تو بتائیے، کیا میں آپ سے یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ یہ ایک ہی دل میں دو محبتیں کس طرح جمع ہو سکتی ہیں؟ اسی ایک دل میں میری محبت بھی ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کی محبت بھی ہے۔ اب ان دو میں سے کسی ایک کی محبت کا تو آپ دعویٰ کر سکتے ہیں لیکن دونوں کی محبت کا دعویٰ ہرگز نہیں کر سکتے۔"

ابوسعیدؒ کو رونا آ گیا، کہا۔ "بیٹے! خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کر، ورنہ میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھوں گا۔"

بیٹے نے کرب سے منہ بنایا اور عرض کیا۔ "باواجان! یہ میری آخری سانس معلوم ہوتی ہے۔ میں کیا کروں؟"

ابوسعیدؒ نے جواب دیا۔ "بیٹے! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"

بیٹے نے جواب دیا۔ "باواجان! میں نے جو کچھ کہا، درست کہا ہے۔"

ابوسعیدؒ نے لجاجت سے کہا۔ "بیٹے! خدا کے لیے تو مایوس نہ ہو۔ خدا تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے... خدا کی رحمت کی طرف سے مایوس نہ ہو۔"

بیٹے نے کہا۔ "باواجان! میں مایوس کب ہوں؟ میں پرامید ہوں اور مجھے اپنے آپ پر اعتماد بھی ہے کہ میں نہ تو خود پشیمان ہونا پسند کرتا ہوں اور نہ ہی آپ کو شرمندہ کراؤں گا۔ آپ مطمئن رہیں باواجان! اور ذرا بھی پریشانی کو دل و دماغ میں داخل نہ ہونے دیں۔"

ابوسعیدؒ نے بیٹے کی پیشانی چوم لی، بولے۔ "بیٹے! کیا میں اپنے سکون کی خاطر تیرا غم بھی نہ مناؤں؟ واللہ! اگر تو نے اپنی مرضی کی تو میں بھی اپنی مرضی کروں گا۔" اس کے بعد انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور عرض کیا۔ "خدایا! تو جانتا ہے میں تیرا کیسا بندہ ہوں، پھر اپنے عاجز بندے کا تو کسی قسم کا غم کیوں نہیں بٹوا دیتا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ کیا میں اپنے پیارے بیٹے کی خاطر دنیا کی ساری چیزیں چھوڑ دوں؟ اللہ العالمین! میں کیا کروں؟"

بیٹے کی حالت ایک دم بگڑنے لگی۔ اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی اور آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ اس وقت ابوسعیدؒ مسجد میں تھے۔ کسی نے مسجد ہی میں بیٹے کی غیر حالت کی اطلاع دے دی۔

آپ نے جواب دیا۔ "لوگو! اللہ کی مرضی مقدم ہے، میں کسی پر کسی قسم کا الزام نہیں دوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جن حالات سے میں اور میرا بیٹا گزر رہا ہے اس میں صبر و تحمل بڑی مشکل چیز ہے لیکن میں پھر بھی اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

اس کے بعد آپ مسجد سے باہر آئے اور گھر کے لیے روانہ ہو گئے لیکن آپ بہت مضطرب اور بے چین سے نظر آ رہے تھے۔ آپ پاؤں رکھتے کہیں تھے اور وہ پڑتے کہیں تھے۔ پھر یکایک آپ کو جیسے ہوش آ گیا، بولے۔ "میرا بیٹا کہاں ہے؟"

کسی نے جواب دیا۔ "اپنے گھر میں۔"

آپ نے پھر صبر و تحمل کا دامن پکڑا، بڑے سکون سے کہا۔ "کیا اس کی حالت روبہ صحت ہے؟"

ایک شخص نے جی کڑا کر کے جواب دیا۔ "حضرت! آپ اپنے بیٹے کی روبہ صحت حالت کا ذکر فرما رہے ہیں لیکن جہاں تک اس عاجز کا تعلق ہے، یہ جانتا ہے کہ آپ کے صاحبزادے کی حالت اتنی خراب ہے، اتنی خراب ہے کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

آپ گھر میں داخل ہوئے تو ہر ایک کو روتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے ترش لہجے میں پوچھا۔ "وہ زندہ ہے یا مر گیا؟"

کسی نے جواب دیا۔ "میاں جی! اس کا انتقال ہو گیا۔"

آپ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "خدایا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے اس آزمائش میں مجھے سرخرو کیا، تیری امانت تھی، تو نے واپس

لے لی۔ اب میں کس کا ماتم کروں؟ اور کس کا گلہ؟''

بیوی نے روتے ہوئے شکایتاً کہا۔ ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم اگر چاہتے تو میرا بچہ زندہ ہوتا۔''

ابوسعیدؒ نے کہا۔ ''نیک بخت! یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟''

بیوی نے جواب دیا۔ ''میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم مستجاب الدعوات تھے۔ تم اگر اپنے بیٹے کے حق میں دعائے صحت کرتے تو میرا بیٹا ضرور اچھا ہو جاتا لیکن تم نے یہ نہیں کیا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تو یہ کیسی باتیں کر رہی ہے آج۔ اس کی زندگی پوری ہو چکی تھی۔ پھر یہ کہ مشیتِ ایزدی یہی تھی۔ میں دعا مانگ کر اس میں کیا اور کیوں دخل دیتا۔''

بیوی نے آنچل میں چہرہ چھپالیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم صرف باپ ہو۔ اے کاش تم ماں ہوتے تو بیٹے کے غم کا اندازہ ہوتا۔''

وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ آپ حیران اور پریشان بیوی کی صورت دیکھنے لگے۔ پھر اچانک مرحوم بیٹے کا خیال آ گیا۔ آپ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھے۔ بیٹے کے چہرے پر سے چادر سرکائی اور اس کو نظر بھر کر دیکھنے لگے۔ پھر آہستہ آہستہ فرمایا۔ ''بیٹے! میں جانتا ہوں کہ تو اپنے خالقِ حقیقی کے بلاوے پر اس کے پاس چلا گیا ہے۔ تو ہی بتا میں تجھے کس طرح روکتا؟ تیری ماں کہتی ہے کہ میں تجھے روک سکتا تھا مگر نہیں روکا۔ آہ میں کتنا مجبور اور بےبس انسان ہوں۔ میری دعا ہے کہ خدا تجھے خوش رکھے اور تجھ سے راضی رہے۔''

اس کے بعد آپ نے بیٹے کی پیشانی چوم لی۔

چند دنوں بعد آپ نے مرحوم بیٹے کو خواب میں دیکھا۔ بےچینی سے پوچھا۔ ''بیٹے! تو خوش تو ہے؟''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''میں بہت خوش ہوں، بابا جان!''

آپ نے پوچھا۔ ''خدا نے تیرے ساتھ کیسا سلوک کیا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''بہت اچھا۔ اس نے مجھے اپنا قرب عطا فرما دیا ہے۔''

آپ نے بےساختہ کہا۔ ''زہے نصیب، یہ وہ مرتبہ ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے برگزیدہ لوگ اس کی تمنا لیے ہوئے قبر میں جا سوتے ہیں اور اس کا قرب نہیں حاصل ہوتا اور تجھے اس کا قرب حاصل ہو گیا۔''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''بابا جان! اس میں مجھے آپ کا تعاون بھی حاصل تھا ورنہ شاید میں یہ مرتبہ حاصل نہ کر سکتا۔''

آپ نے بیٹے سے کہا۔ ''بیٹے! اپنے باپ کو کوئی نصیحت کر۔''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''بابا جان! بددلی سے عبادت نہ کیجیے اور جسم پر جو لباس موجود ہو، اس کے علاوہ کوئی لباس پاس نہ رکھیے۔ اگر میری اس نصیحت پر آپ نے عمل کیا تو آپ کو وہ مرتبہ حاصل ہو جائے گا کہ بہتوں نے زندگی بھر عبادت کر کے بھی نہ حاصل کیا ہوگا۔''

جب آپ کی آنکھ کھلی تو یوں محسوس کیا گویا پورا... کمرا خوشبو سے مہکا ہوا ہے۔

تنگی اور عسرت میں سالہا سال گزار کر آپ نے اپنے بیوی بچوں کے لیے خدا سے کچھ طلب کرنا چاہا۔ آپ کو یقین تھا کہ خدا آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔ آپ خشوع وخضوع سے جب خدا کی بارگاہ میں سربسجود ہوئے اور خدا سے کچھ مانگنا چاہا تو اندر سے ایک ایسی آواز سنائی دی جو پہلے کبھی نہیں سننے میں آئی تھی۔ یہ آواز کہہ رہی تھی۔ ''ابوسعیدؒ! خدا کا قرب حاصل کرنے کے بعد اس سے اتنی معمولی چیز مانگنا افسوس ناک بات ہے۔ اللہ سے اگر کچھ مانگنا ہی ہے تو اس سے اللہ کے سوا مانگنا شرمناک ہے۔''

آپ رونے لگے اور رو رو کر خدا سے اپنی اس غلطی کی معافی مانگنے لگے کہ ان کے دل میں خدا سے کچھ مانگنے کی خواہش پیدا ہی کیوں ہوئی؟ آپ نے رو رو کر اپنے دونوں رخسار تر کر لیے اور یہ عہد کر لیا کہ وہ آئندہ خدا سے کچھ بھی نہ مانگیں گے۔

ایک بار آپ دورانِ سفر جنگل سے گزر رہے تھے۔ سامانِ سفر میں آپ کے پاس کھانے کو کھجور تک نہ تھی اور کئی دن کے فاقوں نے حالت غیر کر رکھی تھی۔ نفس نے سرکشی اختیار کی اور اس نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ کھانے کے لیے خدا سے رزق طلب کریں لیکن آپ نے اپنے نفس کو سختی سے جھڑک دیا اور کہا۔ ''اے نفس! میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ میں اس سے کچھ بھی نہ مانگوں گا۔ پھر میں اس سے رزق کیوں طلب کروں؟''

نفس نے خوشامد کی، کہا۔ ''کئی دن کے فاقوں نے اعضائے جسمانی کو بیکار اور معطل کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر رزق نہیں مانگتے تو نہ سہی اس سے صبر کی توفیق ہی مانگ لو۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اے نفس! تو مجھے یہ کیسے الٹے سیدھے مشورے دے رہا ہے۔ جب میں نے ایک بات تجھ پر واضح کر دی ہے کہ میں اپنے اللہ سے کچھ بھی نہ مانگوں گا تو اس وقت اس سے رزق یا صبر کی توفیق کیوں مانگوں، میرا خالق دلوں کے حال جانتا ہے، وہ

انسانوں کی ضروریات اور احتیاجات کا علم رکھتا ہے تو میں اس سے کیا مانگوں؟ اب تو اس کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے بھی میں شرم محسوس کرتا ہوں۔''

آپ فاقوں کی اذیتیں برداشت کرتے رہے یہاں تک کہ ایک منزل پر آپ نے پڑاؤ کیا۔ اس پڑاؤ کے پاس ہی کھجوروں کا ایک باغ تھا جو کھجوروں سے لدا ہوا تھا۔ آپ نے اس باغ پر سرسری نظر ڈالی اور وہاں پڑاؤ کرنے کے بجائے قریب کے جنگل میں واپس چلے گئے۔ کسی شخص نے پوچھا۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرا نفس ایک گونہ سکون اور خوشی محسوس کر رہا ہے اور میں اسے اس خوشی اور سکون کی سزا دینا چاہتا ہوں۔''

آپ جنگل میں قیام فرما ہو گئے۔ ابھی آپ کو قیام کیے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک شخص آپ کو تلاش کرتا ہوا جنگل میں پہنچ گیا اور پوچھا۔ ''جناب! کیا ابوسعیدؒ آپ ہی کا نام ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، کیوں؟ تجھے میرے پاس کس نے بھیجا ہے؟''

اجنبی نے کہا۔ ''اگلے پڑاؤ پر میں ایک قافلے کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا کہ کسی آواز نے مجھے ہدایت کی کہ جنگل میں جا، وہاں ابوسعیدؒ نامی ایک شخص چھپا ہوا ہے، تو اسے اپنے ساتھ قافلے میں لے آ۔''

ابوسعیدؒ نے پوچھا۔ ''اس آواز نے اور کیا کہا؟''

اجنبی نے جواب دیا۔ ''اس آواز نے اور جو کچھ کہا، میں بیان نہیں کروں گا۔''

ابوسعیدؒ نے کہا۔ ''میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اس سے میں یہ اندازہ لگاؤں گا کہ وہ آواز کس کی ہے اور اس کو مجھ سے کس حد تک محبت ہے۔''

اجنبی نے جواب دیا۔ ''اس آواز نے مجھ سے کہا کہ ابوسعیدؒ میرا متوکل بندہ ہے، وہ انتہائی بھوکا ہونے کے باوجود کھجوروں.. کا باغ دیکھ کر بھاگ گیا اور کھجوروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔''

ابوسعیدؒ کو اندازہ ہو گیا کہ یہ آواز خدا کی طرف سے تھی اور رب خدا کو ان کی احتیاج اور حالت زار پر رحم آ گیا ہے۔ آپ اس شخص کے ساتھ ہو لیے اور اس پڑاؤ پر پہنچ گئے جہاں اب ایک قافلہ ٹھہرا ہوا تھا اور ہر طرف چہل پہل ہو رہی تھی۔ اجنبی میزبان نے آپ کی شاندار ضیافت کی، آپ کھاتے جاتے اور اپنے رب کا شکر ادا کرتے جاتے۔

آپ کا یہ قاعدہ تھا کہ دور دراز کی سیاحت اس لیے اختیار فرماتے کہ بزرگانِ دین کے مزارات کی زیارت ہو جاتی اور جو بزرگ زندہ ہوتے ان سے ملاقات ہو جاتی۔ آپ اس مقصد سے سفر فرما رہے تھے کہ ایک دریا کے کنارے کشتی کے انتظار میں رک گئے۔ آپ کو انتظار کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئی لیکن کشتی نہیں آئی۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ آپ کو یقین ہو گیا کہ رات اس کنارے پر گزارنا ہو گی کیونکہ رات کو کشتی ملنے کا کوئی امکان نہیں۔ آپ اسی فکر میں تھے کہ آپ نے اپنے سے ذرا فاصلے پر ایک سایہ سا محسوس کیا۔ آپ اس سائے کے پاس چلے گئے اور اس خیال سے کہ شاید وہ بھی کشتی کے انتظار میں بیٹھا ہے، سوچا کہ چلو اس سے کچھ باتیں ہی ہو جائیں گی۔ لیکن جب قریب پہنچے تو پتا چلا کہ وہ کوئی مسافر نہیں۔ وہ ساحلی ریت پر بڑی شانِ استغنا سے بیٹھا تھا۔ دوات اس کے داہنی طرف رکھی تھی، زانو پر کوئی کاپی یا کتاب رکھی تھی اور قلم ہاتھ میں لیے وہ کچھ سوچنے میں محو تھا۔ آپ کو حیرت تھی کہ یہ شخص اندھیرے میں کس طرح اور کیا لکھ رہا ہو گا۔ جب آپ بالکل اس کے سر پر پہنچ گئے تو دریافت کیا۔ ''اے شخص! تو کون ہے اور یہاں اندھیرے میں کیا کر رہا ہے؟''

اس شخص نے نظر اٹھا کر آپ کی طرف دیکھا بھی نہیں، جواب دیا۔ ''ابوسعیدؒ! تم کشتی کا انتظار کرو، میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟''

ابوسعیدؒ نے حیرت سے پوچھا۔ ''تم کو میرا نام کس نے بتایا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میرا دل آئینے کی طرح ہے جس میں ہر شخص اپنے نام اور کردار کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ اس لیے نام اور کام پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی۔''

ابوسعیدؒ نے خوب اچھی طرح سمجھ لیا کہ یہ شخص اللہ والوں میں سے ہے اور قربِ خداوندی کا حامل ہے۔ آپ نے بڑے ادب سے پوچھا۔ ''حضرت! معاف کیجیے گا۔ میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔ کیا میں آپ کا تعارف حاصل کر سکتا ہوں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''تعارف؟ کیسا تعارف؟ کس کا تعارف؟ میں نے تم سے تعارف نہیں چاہا تھا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اے شخص! میں جانتا ہوں کہ آپ کو خدا کا قرب حاصل ہے۔ لیکن میں اس سے زیادہ جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔''

اس نے کہا۔ ''جا بابا! اپنا کام کر، مجھے تنگ کرنے سے کیا حاصل؟''

آپ کا اضطراب اور تجسس بڑھتا رہا، پوچھا۔ ''جب تک میں آپ کا تعارف نہ حاصل کر لوں، مزید کوئی اور بات نہیں کروں گا۔''

اس شخص نے کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ اس وقت زیادہ اندھیرا ہو چکا تھا۔ ابوسعیدؒ کو حیرت بھی کہ آخر اس اندھیرے میں یہ لکھ کس طرح رہا ہے۔ آپ نے کہا۔ ''میری حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آپ اندھیرے میں کیا اور کس طرح لکھ رہے ہیں؟''
اس نے جواب دیا۔ ''میں کیا اور کیونکر لکھ رہا ہوں۔ اس کا میں کیا جواب دوں، خود دیکھ لے۔''
آپ نے جھک کر کتاب کی طرف دیکھا۔ اس پر نورانی شعاعیں پڑ رہی تھیں اور وہ لکھ رہا تھا۔ ''ابوسعیدؒ اپنے دل میں سوچ رہا ہے کہ مجھ سے معلوم کرے، خدا سے ملنے کا کیا طریقہ ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا جواب دوں لیکن اگر کوئی مجھ سے یہی سوال کرے تو میں یہی جواب دیتا کہ اس سے ملنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو عام راستہ ہے اور دوسرا خاص راستہ۔ عام راستہ عام لوگوں کے لیے ہے اور خاص راستہ خاص لوگوں کے لیے۔''
آپ کتاب پر روشنی دیکھ کر مبہوت رہ گئے، بولے۔ ''کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ کتاب پر یہ روشنی کیسی ہے؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''تو کتاب کی بات کر رہا ہے، میں تو یوں ہی کہہ رہا ہوں۔ اگر روشنی ہی دیکھنی ہے تو ذرا آنکھیں بند تو کر، پھر دیکھ تماشا۔''
آپ نے اپنی طرف سے کہا۔ ''میں سمجھ گیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ دراصل تو اپنی روحانیت کا اس طرح سکہ جما کر مجھے مرعوب اور گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں کسی کے بھی رعب میں نہیں آؤں گا۔''
اس شخص نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''ابوسعیدؒ! نہ تو میں نمائشی عبادت اور ریاضت کرتا ہوں اور نہ ہی پسند کرتا ہوں۔ تم نے اس وقت میری ہمت اور مرتبے کا اندازہ لگانا چاہا لیکن میں جو کچھ ہوں، تم نہیں جان سکتے کیونکہ تم نے جس طرح خدا کا قرب حاصل کیا ہے۔ وہ ایک عام راستہ ہے، حالانکہ تجھے خاص راستہ زیب دیتا تھا۔''
آپ نے پوچھا۔ ''خدا تک پہنچنے کا عام راستہ کون سا ہوتا ہے؟''
اس نے جواب دیا۔ ''یہ کہ میں نے اپنی عبادت کو کبھی بھی ذریعۂ وصال نہیں بنایا، جب کہ تم نے یہی کیا ہے۔ تم دولت کو حجاب تصور کرتے ہو جبکہ میں یہ نہیں سمجھتا۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''اے شخص! تو باتیں تو بڑے کام کی اور حیرت انگیز کر رہا ہے، اب میں تجھ سے کیا باتیں کروں۔''
اس نے طنزاً کہا۔ ''بس، دے گئی ہمت جواب۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے حقیقت بیان کر دی، کیونکہ میں نے تجھے اتنا ہی سمجھا تھا۔''
اس شخص نے کہا۔ ''بابا! جس کی جتنی استطاعت اور مقدرت ہے اتنی ہی اس کی رسائی اور پہنچ ہے، اب میں اور کیا کہوں۔''
آپ نے کہا۔ ''تو نے عبادت کو ذریعۂ وصال نہیں بنایا، یہ کیوں؟ اور وصال عبادت کے بغیر کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟''
اس نے جواب دیا۔ ''ابوسعیدؒ! یہ تو تم خود بھی تسلیم کرو گے کہ عبادت سے وصال حاصل کرنا ایک عمومی راستہ ہے، حالانکہ میں خود عبادت نہیں کرتا بلکہ میرا ہر بُنِ مو مستقل عبادت بن گیا ہے، اس لیے مجھے عبادت کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ جب اللہ کا کوئی بندہ اپنے ہر بُنِ مو سے اس کی عبادت کرتا ہے تو گویا وہ ذات حقیقی میں گم ہو جاتا ہے اور اسے اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ وہ ظاہری عبادت بھی کرے۔''
آپ نے پوچھا۔ ''اچھا، یہ بتاؤ کہ دولت حجاب کیوں نہیں ہے؟''
اس نے جواب دیا۔ ''ابوسعیدؒ! ہر چیز کا افادہ اور نقصان دو طرح سے ہوتا ہے۔ چھری سے چاہو تو سبزی کاٹ لو، چاہو تو پیٹ چاک کر دو۔ یہ دونوں ہی کام چھری انجام دے سکتی ہے، چنانچہ اگر چھری کو اس لیے مسترد کر دیا جائے کہ اس سے پیٹ چاک کر دیے جاتے ہیں تو پھر اس کا افادی پہلو ہمیں کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ ہمیں اس کے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھ کر کام لینا ہوگا۔''
آپ نے پوچھا۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم دولت کو بھی مفید سمجھتے ہو؟''
اس نے جواب دیا۔ ''ہاں، اس میں کیا شک، دولت کو خدا کے نام پر خرچ کر کے جنت میں مقام حاصل کر سکتے ہو، دولت سے نہریں باغات مدرسے بنوا کر صدقۂ جاریہ جاری کر سکتے ہو۔''
ابوسعیدؒ خاموش ہو گئے۔ اس شخص نے آپ کے فکر کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ آپ کا اندازِ فکر ہی بدل دیا تھا۔ اس رات آپ اسی درویش کی صحبت میں رہے اور اس کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔
آپ بغداد سے دور کسی جنگل سے گزر رہے تھے۔ اچانک کسی گوشے سے غرانے کی آواز سنائی دی۔ آپ نے ادھر توجہ ہی نہیں دی اور سفر کرتے رہے۔ ابھی آپ کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ ان غراہٹوں میں اضافہ ہو گیا۔ یہ بہت سے کتوں کی غراہٹ تھی۔ آپ نے غیر ارادی طور پر اس طرف دیکھا جدھر سے کتوں کے غرانے کی آواز آ رہی تھی۔ آپ نے دیکھا دس..... شکاری کتے آپ کی طرف بڑھے چلے

آرہے ہیں۔ آپ ذرا بھی نہیں گھبرائے، کتے دم بدم قریب آتے جارہے تھے۔ آپ نے ذہن مصلٰی بچھادیا اور مراقبہ اختیار کیا۔ آپ کو کچھ پتا نہیں چلا کہ اس کے بعد کیا ہوا۔

دس کتے بھونکتے ہوئے آپ کی طرف بڑھتے لیکن آپ جیسے ہی مراقبے میں گئے، ان میں کا ایک سفید کتا ان سے الگ ہوگیا اور اپنے ساتھیوں پر جھپٹا۔ نو کتوں نے اس کا مقابلہ کیا لیکن سفید کتا ان سب سے زیادہ طاقتور تھا، اس نے اپنے ساتھی کتوں پر شیر کی طرح حملہ کیا اور ذرا سی دیر میں انہیں بھاگ جانے پر مجبور کردیا۔ جب وہ بھاگ گئے تو سفید کتا آپ کے پیچھے اس طرح آبیٹھا گویا ابوسعیدؒ کا محافظ ہے۔ آپ جتنی دیر مراقبے میں رہے سفید کتا پہرا دیتا رہا۔ کافی دیر بعد جب آپ نے مراقبے سے فراغت حاصل کی اور چلنے کے لیے کھڑے ہوئے تو سفید کتا بھی آپ کے ساتھ چل پڑا اور جب تک ابوسعیدؒ کا سفر جنگل میں رہا، کتا آپ کے ساتھ رہا۔ جب جنگل کی حدود سے نکل گئے تو کتے نے آپ کی طرف الوداعی نظر ڈالی، بھونکا اور کھڑے ہوکر دم ہلانے لگا۔

آپ نے مڑکر کتے کی طرف دیکھا اور محبت سے فرمایا۔ ''اب تم جاسکتے ہو۔''

لیکن وہ کتا اس وقت تک اپنی جگہ پر کھڑا رہا جب تک آپ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئے۔

یہ عباس مہدی کا زمانہ تھا۔ اس نے آپ کی تحریریں پڑھی تھیں اور ان تحریروں سے اسے بڑا غصہ آیا تھا۔ اس نے ایک ملازم کے ذریعے آپ کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ آپ نے دربار میں جانے سے انکار کردیا اور کہلوایا کہ ''خلیفہ سے کہہ دینا، ایک فقیر کا دربار میں حاضری دینا تقوٰی کے خلاف ہے۔''

جب ملازم نے خلیفہ تک آپ کی بات پہنچائی تو وہ بہت ناراض ہوا۔ اس نے حکم دیا۔ ''ابوسعیدؒ کو دربار میں زبردستی لایا جائے۔''

شاہی پیادے آپ کو گرفتار کرنے پہنچ گئے۔ آپ نے انہیں بھی یہی جواب دیا.... ''میں خلیفہ کے پاس نہیں جاؤں گا کیونکہ ایسا کرنا تقوٰی کے خلاف ہے۔''

شاہی پیادوں نے جواب دیا۔ ''حضرت! ہم خلافت کے ملازم ہیں، اگر آپ اپنی مرضی سے ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ نہ ہوئے تو ہمیں مجبوراً آپ کو زبردستی لاد کرلے جانا پڑے گا اور اگر ہمیں ایسا کرنا پڑے تو ہم اپنے اس فعل پر بہت شرمندہ ہوں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''لیکن، افسوس کہ میں بخوشی دربار نہیں جاؤں گا کیونکہ ہم فقرا اسے تقوٰی کے خلاف تصور کرتے ہیں۔''

پیادوں میں سے ایک نے جھپٹ کر آپ کو گرادیا اور بقیہ نے آپ کو باندھ لیا اور پھر وہ سب زبردستی آپ کو لے کر دربار کی طرف روانہ ہوگئے۔ عباس مہدی بڑی بے چینی سے آپ کے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ پیادوں نے آپ کو جیسے خلیفہ کے قدموں میں لا پٹخا، تھوڑی دیر تک وہ یہی نہیں سمجھ سکا کہ یہ ابوسعیدؒ ہیں جو باندھ کر لائے گئے ہیں اور انہیں خلیفہ کے قدموں میں پٹخ دیا گیا ہے۔ خلیفہ نے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟ ابوسعیدؒ کہاں ہیں جن کا میں انتظار کررہا ہوں۔''

ایک نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین! یہی تو ابوسعیدؒ ہیں۔''

خلیفہ نے حیرت سے کہا۔ ''یہ ابوسعیدؒ ہیں؟ واللہ یہی ابوسعیدؒ ہیں؟ لیکن یہ اس طرح کیوں لائے گئے ہیں؟''

اسی پیادے نے جواب دیا۔ ''امیرالمومنین! یہ شخص کہتا تھا کہ خلیفہ کے پاس جانا فقرا کے تقوٰی کے خلاف ہے، میں نہیں جاؤں گا اور جب اس نے انکار کیا تو ہم لوگ اسے زبردستی اٹھا لائے۔''

خلیفہ نے ان کی تعریف کی، بولا۔ ''تم لوگوں نے وہ کام کیا ہے کہ اس کے عوض میں تم سب کو بڑے سے بڑا انعام دے سکتا ہوں۔ خیر ابھی تو تم لوگ جاؤ، میں انعام کے لیے دوبارہ تمہیں بلواؤں گا۔''

پیادے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی خلیفہ نے ابوسعیدؒ کو اپنے ہاتھوں سے کھولا اور کہا۔ ''ابوسعیدؒ! مجھے افسوس ہے کہ میرے پیادوں نے آپ کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔''

آپ نے ترشی سے جواب دیا۔ ''اپنے یا اپنے پیادوں کے اس ناشائستہ رویے پر افسوس نہ کر، کیونکہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا، اس میں تیرا حکم اور تیری رضا شامل تھی۔ یہ کام اگر وہ اپنی مرضی سے انجام دیتے تو واقعی تیرا یہ افسوس تجھ پر پھب جاتا لیکن ایسا نہیں ہے۔''

خلیفہ نے تلخی سے کہا۔ ''ابوسعیدؒ! یہ تم کس قسم کی باتیں کررہے ہو؟ کیا تم آدابِ شاہی سے بھی واقف نہیں، جو اس قسم کی باتیں کررہے ہو۔''

ابوسعیدؒ نے جواب دیا۔ ''میرا اور تمہارا بلکہ ساری دنیا کا ایک ہی بادشاہ ہے اور میں اس کا بہت زیادہ احترام کرتا ہوں۔ اس کی شان میں کبھی کوئی گستاخی نہیں کرتا۔''

عباس مہدی نے کہا۔ ''تم سخت گستاخ ہو، میں امیرالمومنین ہوں۔ کیا تم یہ ذرا سی حقیقت بھی نہیں جانتے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں تجھے امیرالمومنین نہیں سمجھتا کیونکہ تو نے مومنوں کے حقوق غصب کیے ہیں، مسلمانوں کے حقوق کا

اختلاف کیا ہے۔ پھر میں تمہیں کس طرح اپنا اور مسلمانوں کا امیر کہہ سکتا ہوں۔"

عباس مہدی کے لیے اب مزید برداشت کرنا ناممکن ہو گیا تھا، اس نے غصے میں آپ کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ آپ کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ ناک صاف کرتے ہوئے بولے۔ "عباس مہدی! یہ تو نے کیا کر دیا؟ تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، تو نے میرا نہیں، اپنا خون بہایا ہے۔"

خلیفہ نے غصے میں پوچھا۔ "یہ تو ہر وقت تقویٰ تقویٰ کی کیا بات کرتا رہتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، میں تقویٰ کی بات کرتا رہتا ہوں اور کان کھول کر سن لے کہ فقراء کا شاہی درباروں میں جانا تقویٰ کے خلاف ہے۔"

عباس مہدی نے کہا۔ "اے ابوسعیدؒ! ذرا یہ تو بتا کہ جس زمین پر تیرا گھر ہے، وہ کس کی ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "یہاں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے۔"

خلیفہ نے جھنجلا کر کہا۔ "تو بکتا ہے جس زمین پر تیرا گھر ہے، وہ زمین خدا کی نہیں، خلافت کی ہے، میری ہے۔"

آپ نے کہا۔ "دیکھ عباس مہدی! زیادہ غرور کی باتیں نہ کر، ورنہ خدا تجھے اس کی سزا دے گا۔"

خلیفہ نے پھر سوال کیا۔ "اور وہ نہر، جس کے پانی سے تو وضو کرتا ہے، جس کا پانی تو پیتا ہے، وہ کس کی ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ دیا کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی ہے، اللہ کا ہے، میں کسی انسان کی ملکیت نہیں تسلیم کرتا۔"

خلیفہ نے غصے میں کہا۔ "اے انسان! شاہی زمین پر رہ کر اور شاہی نہر کا پانی پی کر تو تقویٰ کی بات کر رہا ہے۔ ان حالات میں تیرا دعویٰ احمقانہ ہے۔"

آپؒ نے اسی کر و فر اور طنطنے سے جواب دیا۔ "جب میں نے تجھ پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ میں کسی انسان کی ملکیت نہیں تسلیم کرتا۔ میں اپنے اللہ کو اس جہان اور اس کی کائنات کی ہر چیز کا مالک سمجھتا ہوں، پھر ایسی الٹی سیدھی باتیں کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟"

خلیفہ عاجز آ گیا، بولا۔ "ابوسعیدؒ! تم تو بہت ہی مضبوط انسان نکلے، اس دربار میں بڑے بڑوں کی گردنیں جھک گئیں مگر شاباش اور آفرین ہے تم پر کہ تم مجھ سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "عباس مہدی! جو شخص اپنے خدا سے ڈرے گا وہ کسی اور سے نہیں ڈرے گا، پھر میں تجھ سے کیوں ڈرتا۔"

عباس مہدی نے کہا۔ "حضرت! مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "تو جانتا ہے کہ مالداروں کا حق فقراء کو کیوں نہیں پہنچتا؟"

خلیفہ نے کہا۔ "حضرت! آپ ہی اس کی وضاحت فرمائیں، میں کیا جواب دوں گا۔"

آپ نے فرمایا۔ "مالداروں کا حق فقراء کو اس لیے نہیں پہنچتا کہ اول تو ان کی دولت ہی ناجائز ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کا عمل دولت کے مطابق نہیں ہوتا۔ تیسرے یہ کہ فقراء خود ہی صاحبِ قناعت ہوتے ہیں۔"

خلیفہ نے درخواست کی۔ "حضرت! اور کچھ؟"

آپؒ نے فرمایا۔ "ایک چیز ہے خدا کا مشاہدہ کرنا اور جب کوئی شخص خدا کا مشاہدہ کر لیتا ہے تو کوئی حجاب اس کے درمیان میں باقی نہیں رہتا۔ نورِ فراست سے مشاہدہ کرنے والا گویا نورِ خداوندی سے مشاہدہ کرتا ہے اور اس کے علم کا منبع صرف ذاتِ الٰہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ سہو و غفلت کا مرتکب نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے منہ سے نکلنے والا کلام درحقیقت خدا ہی کا کلام ہوتا ہے لیکن خدا کے بعض ایسے بندے بھی ہیں جو اس کے خوف سے خاموشی کے ساتھ مشغولِ عبادت رہتے ہیں۔"

عباس مہدی نے کہا۔ "حضرت! آپ کے کلام کی صداقت ہم پر عیاں ہو یا نہ ہو لیکن اس کا فتنہ ضرور ظاہر ہو رہا ہے۔ اگر آپ کے خیالات عام ہو جائیں تو مخلوق میں ہر طرف فتنہ و فساد برپا ہو جائے۔"

آپؒ کا انتقال بغداد ہی میں ہوا اور یہیں آپؒ کا مزار مرجعِ خاص و عام رہا لیکن آپؒ نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، آپ کے بعد منصور حلاج نے اس کا برملا اعلان کر دیا اور انا الحق کا نعرہ لگا کے دار پر چڑھ جانا گوارا کر لیا مگر اپنے قول، انا الحق سے نہیں پھرے۔ بعد میں ابوسعیدؒ کو صوفیائے کرام نے "لسان التصوف" کا خطاب عطا فرمایا۔

ماخذات: سفینتہ الاولیاء، شہزادہ داراشکوہ۔ طبقات الکبریٰ، علامہ شعرانی۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار۔ انوار اولیاء، رئیس احمد جعفری۔ خزینۃ الاصفیاء، مفتی غلام سرور لاہوری

راز

بابر نعیم

وارداتِ قلبی اکثر زندگی کی سمت ہی بدل دیتی ہے۔ وہ بھی اچانک ایک ایسے ہی سحر میں مبتلا ہو گیا تھا جس کے بعد اس کی شخصیت ایک راز میں ڈھلتی چلی گئی... ایک ایسا راز جس سے وہ خود بھی سامنا کرتے ہوئے کتراتا تھا... لیکن ایک کمزور لمحے نے اسی راز سے پردہ اٹھا دیا... کیونکہ وہ اس کا مزید بوجھ نہیں سہار سکا تھا۔

بھولی بسری یادوں میں گمشدہ جذبات کو پانے والے سراغ رساں کا انداز

اس سال خزاں کا موسم شروع ہو جانے کے باوجود اچھی خاصی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ گھر کے سامنے وھیل چیئر پر بیٹھا ہوا بوڑھا شخص حدِ نظر تک موسم کے بدلتے رنگوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ فالج نے اس کی ٹانگوں اور آواز کو متاثر کیا تھا لیکن اس کی آنکھیں سلامت تھیں جن کی مدد سے وہ گھر بیٹھے ہی چراگاہ کے پار جنگل کے سرے تک دیکھ سکتا تھا۔ اسے وہاں پولیس کی گاڑیاں نظر آئیں۔ جن کے ساتھ ایک تابوت لے جانے والی گاڑی بھی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد



سفید کوٹ میں ملبوس کچھ لوگ جنگل سے برآمد ہوئے۔ انہوں نے کھدائی کا سامان ایک گاڑی میں رکھا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اب جنگل کے کنارے صرف ایک پولیس کار رہ گئی تھی۔

''انہیں وہاں سے ایک لاش ملی ہے۔'' اس کے پندرہ سالہ پوتے اینڈریس نے اطلاع دی جو اسی وقت اسکول سے واپس آیا تھا۔ بوڑھے نے اپنا بایاں بازو اوپر اٹھایا۔ اینڈریس اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولا۔ ''اس شخص کو کافی عرصہ پہلے وہاں دفنایا گیا تھا اب تو صرف اس کی ہڈیاں اور بیلٹ کا بکل ہی ملا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس شخص کی لاش ہے۔''

عقب کی کھلی کھڑکی سے ایک آواز سنائی دی۔ ''اینڈریس! کھانا لگ گیا ہے۔''

اینڈریس اپنے دادا کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا گھر کے اندر لے گیا اور اسے کھانے کی میز کے ساتھ لگا دیا۔ چند منٹوں بعد اینڈریس کا باپ بھی آ گیا اور ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔ اینڈریس نے اس کے سامنے بھی لاش کے ملنے کا قصہ چھیڑ دیا۔ اس پر وہ بولا۔ ''یہ یقیناً بہت پرانی لاش ہے۔ اسے معائنے کے لیے لیبارٹری بھیج دیا گیا ہے۔ وہاں کی رپورٹ آنے کے بعد ہی کچھ پتا چل سکے گا۔''

کھانے کے بعد اینڈریس اپنے دادا کو معمول کے مطابق اس کے بیڈروم تک لے گیا لیکن بستر پر لیٹنے کے بجائے اس نے کتابوں کی الماری کا رخ کیا اور بک شیلف پر رکھی ایک تصویر کو دیکھنے لگا جو ایک سادہ سے لکڑی کے فریم میں آویزاں تھی۔ یہ ایک اجنبی خاندان کی تصویر تھی۔ جس میں ایک درمیانی عمر کا جوڑا، ایک نوجوان لڑکی اور ایک لڑکا نظر آ رہے تھے۔ دادا نے وہ تصویر اپنے زانو پر رکھ لی اور کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ اس موقع پر اینڈریس نے تصویر والی فیملی سے تھوڑا سا حسد محسوس کیا کیونکہ وہ اپنے اور دادا کے درمیان کسی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

پورے چاند میں دو دن باقی تھے جب جارج کے باپ نے صبح کے تین بجے اسے بتایا۔ ''اطلاع ملی ہے کہ ہمارے جنگل میں ایک زخمی ہرن موجود ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے جارج کے ہاتھ میں شاٹ گن تھمائی اور بولا۔ ''سورج نکلنے سے پہلے وہاں چلے جاؤ اور بارڈر کے آس پاس اسے تلاش کرو۔''

جارج کو بھی صبح کے اوقات میں شکار پسند تھا۔ وہ اپنی مچان پر چڑھ کر بارڈر کے ساتھ ساتھ گشت کرنے والے سپاہیوں کو دیکھتا رہتا۔ ان میں سے زیادہ تر شہری لڑکے تھے۔ انہیں جنگل کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں جارج کی عمر صرف سولہ سال تھی لیکن وہ ان سے کہیں زیادہ جانتا تھا۔ وہ ابھی مچان کی سیڑھی تک پہنچا ہی تھا کہ اسے ایک آواز سنائی دی۔ یوں لگا جیسے کوئی سوکھے پتوں پر چل رہا ہو۔ اس نے غور سے آواز سننے کی کوشش کی لیکن یہ کوئی ہرن نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے گشت کرنے والے سپاہی وقت سے پہلے آ گئے ہوں۔ اس نے سوچا تھوڑی ہی دیر بعد وہ انہیں دیکھنے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ وہ چار افراد تھے۔ ان میں تین کا قد لمبا اور ایک قدرے چھوٹا تھا۔ جارج نے اپنی شاٹ گن کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور ان کی جانب بڑھنے لگا۔ جارج کو اپنی جانب آتے دیکھ کر وہ چاروں خوف زدہ ہو گئے۔ جارج نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ کوئی خاندان تھا۔ مرد کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا جبکہ بریف کیس اس نے کندھے پر لٹکایا ہوا تھا۔ عورت کے سیدھے ہاتھ میں شاپنگ بیگ اور بائیں ہاتھ میں ہینڈ بیگ تھا۔ لڑکی تقریباً جارج ہی کی ہم عمر تھی جبکہ لڑکا آٹھ سال کا ہوگا۔ یہ ضرور یہودی ہوں گے جنہیں نازی اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ جارج کبھی کسی یہودی سے نہیں ملا تھا لیکن اس نے شہر میں ان کے خلاف نفرت آمیز پوسٹرز ضرور دیکھے تھے۔ ان چاروں نے ہلکے کوٹ پہن رکھے تھے، جبکہ عورت کے سر پر ہیٹ بھی تھا۔

جارج نے اپنی شاٹ گن خالی کر دی اور کارتوس بیگ میں ڈال لیے تاکہ ان اجنبیوں پر ظاہر ہو سکے کہ وہ انہیں نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

''ہم یہاں سے کہاں جائیں گے پاپا؟'' لڑکی نے اپنی ماں کی آڑ لیتے ہوئے پوچھا۔

''سب کچھ ختم ہو چکا ہے سارہ۔'' اس کی ماں ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی اور اپنا بھاری بیگ زمین پر رکھ دیا۔

جارج نے کہا۔ ''میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟''

سارہ ایک قدم آگے بڑھی اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''سوئٹزرلینڈ!''

وہ قد میں اس کے برابر ہی تھی۔ جارج اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اسے لڑکی کی جرأت اچھی لگی۔ اس کے ماں باپ تو شاید ہمت ہار بیٹھے تھے لیکن اس نے اپنا ارادہ ترک نہیں کیا تھا۔ سارہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں سارہ گرنبرگ

ہوں۔ ہمیں سوئٹزرلینڈ جانے کے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟"

کتے کے بھونکنے اور کسی کے قدموں کی آواز نے جارج کو پھر چونکا دیا تھا۔ شاید گشت کرنے والے سپاہیوں نے جنگل میں گشت شروع کر دیا تھا۔ ان کے آنے کا نہ کوئی وقت مقرر تھا اور نہ ہی سمت۔ وہ کسی بھی جانب سے آسکتے تھے۔

"شکارگاہ سے ہٹ کر چلنا ہوگا۔" جارج نے سرگوشی کی پھر اس نے کان لگا کر کتے کے بھونکنے کی آواز سنی اور شکارگاہ کے مشرقی حصے میں جھاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس طرف۔"

وہ سب خاموشی سے اس جانب بڑھے تو جارج نے انہیں زمین پر لیٹنے کا اشارہ کیا۔ سارہ کے بال چاند کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ جارج نے کہا۔ "سارہ کے بالوں پر سیاہ کپڑا لپیٹ دو اور سب لوگ زمین کی طرف منہ کرلو۔"

سارہ کی ماں نے اپنے شاپنگ بیگ سے ایک سیاہ رنگ کا ہیٹ نکالا اور سارہ کے سر پر رکھ دیا۔ جارج نے احتیاط سے اپنا سر اٹھایا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا پھر اسے سپاہی نظر آ گئے۔ وہ تعداد میں چھ تھے اور وہ شکارگاہ کی دوسری جانب درختوں کی آڑ میں چل رہے تھے۔ کئی منٹ اسی انتظار میں گزر گئے۔ بالآخر سپاہیوں کے قدموں کی چاپ دھیمی ہوتی گئی اور وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جارج کو اپنے عقب میں سارہ کی سرگوشی سنائی دی۔ "کیا وہ چلے گئے؟" جارج نے گھوم کر دیکھا، وہ اس کے بالکل قریب آ چکی تھی۔

"نیچے بیٹھ جاؤ۔ وہ دوبارہ بھی آسکتے ہیں۔" پھر اس نے اپنی جیب سے چھوٹی سی ٹارچ نکالی اور اس کی روشنی میں گھڑی دیکھنے لگا۔ وہ تقریباً دس منٹ تک انتظار کرتا رہا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ گشت کرنے والے سپاہی جنگل کے شمالی مغربی حصے کی جانب نکل گئے ہوں گے تو وہ آہستہ سے اٹھا اور دوسروں کو بھی کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ جگہ جگہ درختوں کی ٹوٹی ہوئی شاخیں اور ڈالیاں بکھری ہوئی تھیں جن کی وجہ سے ان لوگوں کو چلنے میں دشواری پیش آسکتی تھی۔ اس لیے جارج نے پہلے خود آگے جا کر ان کے لیے ایک محفوظ راستہ تلاش کرنا ضروری سمجھا۔

"میرے واپس آنے تک تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ اگر کوئی آواز سنو تو فوراً زمین کی طرف منہ کر کے لیٹ جانا اور کسی قسم کی آواز مت نکالنا۔" وہ بالکل اپنے اسکاؤٹ لیڈر والی کے انداز میں ہدایات دے رہا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ سوئٹزرلینڈ کی طرف کون سا راستہ جاتا ہے؟" سارہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں یہی دیکھنے جا رہا ہوں کہ تمہارے لیے کون سا راستہ محفوظ رہے گا اور سپاہی کس جانب گشت کر رہے ہیں۔ یہاں سے کہیں مت جانا۔ سپاہی واپسی کے لیے دوسرا راستہ اختیار کریں گے۔ اس لیے تم ایک گھنٹے تک بالکل محفوظ ہو۔"

☆☆☆

لاش کے ملنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ شام کو گھر جانے سے پہلے فلورین اس طرف آ گیا۔ اس نے ہر ایک کی خیریت دریافت کی۔ باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اینڈریس کے باپ نے پوچھا۔ "لاش کے بارے میں مزید کچھ معلوم ہوا؟"

"اب تو وہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچا ہے لیکن جبڑوں کی ساخت بتاتی ہے کہ یہ کسی جوان آدمی کی لاش ہے۔ اس کا دایاں بازو ٹوٹا ہوا ہے لیکن اس کے علاوہ کسی بیماری، چوٹ یا زخم کے آثار نہیں ملے۔ جس جگہ لاش پڑی ہوئی تھی وہ کافی خشک ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ یہ ڈھانچا کافی پرانا ہے۔ شاید ساٹھ سال سے بھی زیادہ۔"

"تمہارے خیال میں یہ جنگ میں لڑنے والے کسی سپاہی کی لاش ہوسکتی ہے؟"

"ممکن ہے، اس کے پاس سے... ایک دھات کا بنا ہوا پیٹی کا بکل بھی ملا ہے جو عام طور پر گستاپو سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنی بیلٹوں میں لگایا کرتے تھے لیکن پہلی نظر میں دیکھنے پر کسی گولی کے زخم کا نشان نظر نہیں آیا۔"

"لاش کہاں سے ملی؟" اس سوال پر دادا نے چونک کر بیٹے کی طرف دیکھا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جانتا ہوں کہ وہ ہمارے جنگل سے ملی ہے لیکن اتنے عرصے بعد کیسے برآمد ہو گئی؟"

"یہ لاش اس جگہ دفنائی گئی تھی جہاں ہر سال سردیوں میں لکڑی کے تنے اور کٹی ہوئی لکڑی رکھی جاتی ہے۔ اس وقت وہاں کچھ نہیں ہے کیونکہ پچھلے سال کی لکڑی جا چکی ہے اور نئی لکڑی آئندہ ماہ آئے گی۔ ایک مزدور اس جگہ کو ہموار کر رہا تھا کہ اس کا بیلچہ اس ڈھانچے سے ٹکرایا۔ مسٹر ربیس کا کہنا ہے کہ یہ لاش ہمارے کسی پرانے وقتوں کے عزیز کی ہوسکتی ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" اینڈریس نے پوچھا۔ مسٹر ربیس گاؤں کے ریٹائرڈ پولیس چیف تھے اور ان کی

عمر کم و بیش اس کے دادا جتنی ہی ہوگی۔

''یہ بڑی پرانی کہانی ہے شاید 1942ء سے بھی پہلے کی۔ ہیکو ڈرسٹ نامی ایک شخص غائب ہوگیا تھا۔ وہ ایک متعصب نازی تھا۔ مسٹر ریس کا کہنا ہے کہ جن دنوں وہ پولیس اکیڈمی میں زیر تربیت تھے تو ہیکو وہاں پولیس آفیسر کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ کیڈٹس کو ہراساں کرنا اور انہیں تنگ کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا پھر وہ اچانک ہی غائب ہوگیا لیکن اس تھوڑے سے عرصے میں اس نے کئی دشمن بنا لیے تھے۔''

''کسی نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟'' اینڈریس نے پوچھا۔

''جنگ کے زمانے میں لوگوں کا غائب ہوجانا ایک عام سی بات تھی۔ جانے اس طرح اور کتنے ڈھانچے زمین میں دفن ہوں گے۔'' اینڈریس کی ماں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''تم نہیں جانتے کہ ہم کتنے خوش نصیب ہیں اور گزشتہ ساٹھ سال سے امن کی زندگی گزار رہے ہیں۔ تمہارے دادا کو بھی جنگ کے آخری دو سالوں میں اینٹی ایئر کرافٹ آرٹلری ڈویژن میں شمولیت اختیار کرنا پڑی تھی حالانکہ انہیں ٹی بی تھی۔''

''کیا یہ ڈھانچا اتنا ہی پرانا ہے؟'' اینڈریس کا اصرار جاری رہا۔

''انہوں نے ڈی این اے کے لیے اس کی ہڈیاں لیبارٹری بھیجی ہیں۔ ویسے ہیکو کی بہن بھی زندہ ہے۔ اسے بھی اطلاع دی گئی ہے، اگر ڈی این اے سے ثابت ہوگیا کہ وہ ہیکو ہی ہے تو یہ ڈھانچا اس کی بہن کو تدفین کے لیے دے دیا جائے گا۔ یہ بھی محض اتفاق ہے کہ اتنے عرصے بعد اس کا کوئی رشتے دار مل گیا۔''

دادا نے اپنے مخصوص انداز میں گلاس اٹھایا اور اسے دو تین گھونٹ میں خالی کرنے کے بعد بہو کی جانب اشارہ کیا۔ اینڈریس کی ماں نے دوبارہ گلاس بھر دیا اور بولی۔ ''تمہیں اتنی زیادہ ڈرنک نہیں کرنی چاہیے۔'' پھر وہ اینڈریس سے مخاطب ہوئی۔ ''اگر تمہارے دادا بول سکتے تو تمہیں نازیوں کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتے تھے۔ فالج کا حملہ ہونے سے پہلے وہ ٹیلی وژن پر تمام پروگرام اور دستاویزی فلمیں بڑے شوق سے دیکھتے تھے۔''

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد جارج واپس آگیا اور اس نے دیکھا کہ وہ اس خاندان کو جس جگہ چھپنے کا کہہ کر گیا تھا، وہ وہاں سے ہٹ کر ایک درخت کے نیچے کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جارج کو دیکھ کر سارہ کا باپ اس کی طرف بڑھا اور بولا۔

''تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

جارج نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں!'' لیکن اس کی حالت خاصی مخدوش نظر آرہی تھی۔ اس کی ٹوپی غائب تھی اور چہرہ خون آلود ہو رہا تھا۔ ناک سے خون بہہ کر اس کی قمیص کو رنگین کر رہا تھا جبکہ چمڑے کے جوتے بھی گندے ہو رہے تھے۔ سارہ بھی اسے دیکھ کر آگے آئی اور اپنا رومال اسے دیا تاکہ وہ چہرے اور ناک سے خون صاف کر سکے۔

''کیا کسی نے تمہیں روکنے کی کوشش کی تھی؟'' سارہ کے باپ نے فکرمندی سے پوچھا۔ اس کی آواز سے لگ رہا تھا جیسے اس کی آخری امید بھی دم توڑ گئی ہو۔

جارج نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم سورج نکلنے تک بارڈر کراس کرلیں گے۔''

اس کی بات سنتے ہی سب کی آنکھوں میں امید کی کرنیں جھلملانے لگیں اور انہوں نے تائید میں سر ہلا دیا۔

جارج نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں چاہتا ہوں کہ جیکب اور اس کی ماں میرے پیچھے پیچھے چلیں۔ جیکب! تم اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے رہنا۔ میں سارہ کا ہاتھ تھام لوں گا اور مسٹر گرنبرگ تم سب سے پیچھے رہو گے۔ اگر کوئی شاخ بھی ٹوٹ کر چہرے پر آگرے، تب بھی کوئی آواز نکالنے کی ضرورت نہیں۔ میں بڑی شاخوں اور جھاڑیوں میں سے راستہ بناتا جاؤں گا۔ ہمیں یہ ہمارا سفر دبے قدموں اور خاموشی سے طے کرنا ہے۔''

سب نے تائید میں سر ہلایا جیسے سب کچھ سمجھ گئے ہوں۔ جارج نے کہا۔ ''اگر میں ڈاؤن کہوں تو فوراً ہی گھٹنوں کے بل جھک کر کوئی آواز نکالے بغیر زمین کی طرف منہ کرکے لیٹ جانا۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی سارہ آگے بڑھی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ جارج کو ایک جھٹکا سا لگا جیسے سارہ نے صرف ہاتھ ہی نہیں تھاما بلکہ اپنا آپ بھی اس کے حوالے کر دیا ہو۔ اس نے ایک بار پھر تمام تیاریوں کا جائزہ لیا۔ اپنے ذہن میں اس راستے کو بٹھانے کی کوشش کی جس پر انہیں آگے بڑھنا تھا۔ تمام ممکنہ خطرات اور مشکلات کے بارے میں سوچا اور انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے خشک جھاڑیوں اور درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔

ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گیا اور کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ دوسرے بھی اس کی تقلید میں رک گئے اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں جو بتدریج دور ہوتی گئیں۔

''ہمیں پہاڑی پر چڑھ کر چوٹی کے ساتھ ساتھ چلنا ہوگا۔ ہوا مخالف سمت میں چل رہی ہے۔ اس لیے کتے ہماری بو نہیں سونگھ پائیں گے۔ ہم بھی وہی راستہ اختیار کریں گے جس پر وہ چل رہے ہیں لیکن ان سے پندرہ منٹ کی دوری پر رہیں گے۔ صرف اسی صورت میں ہم محفوظ رہ سکتے ہیں۔''

چاروں نے ایک بار پھر اس کی تائید میں سر ہلایا۔ اس نے سارہ کی طرف دیکھا اور گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ سارہ کے پاس جواب میں ایک بے جان مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر انہوں نے پہاڑی پر چڑھنا شروع کردیا۔ خوفزدہ خاندان اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ چوٹی پر پہنچ کر جارج رک گیا اور اطراف کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔ دو ہرن وہاں کھڑے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ آس پاس کوئی سپاہی موجود نہ تھا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ بہ ظاہر یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سفر کبھی ختم نہ ہوگا پھر اچانک ہی سارہ نے اسے..... بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ ڈر رہا تھا کہ تھکن سے چور یہ خاندان کہیں بہت پیچھے نہ رہ گیا ہو۔ اس نے دیکھا کہ مسز گرنبرگ بڑی مشکل سے جیکب کو لے کر آگے بڑھ رہی تھی جو تقریباً نیند کی حالت میں تھا۔ اس نے رک کر ایک درخت کے گرے ہوئے تنے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ لوگ بہت تھک چکے تھے۔ مسز گرنبرگ نے جیکب کو وہاں بٹھا دیا اور خود بھی ستانے کے لیے اس تنے پر بیٹھ گئیں۔ جارج نے انہیں آرام کرنے کے لیے پندرہ منٹ دیے تھے۔ پہاڑ کی چوٹی کے پرے مشرق سے سورج کی پہلی کرن نمودار ہو رہی تھی۔ مسز گرنبرگ نے جیکب کو جگایا۔ سارہ نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ جارج کے ہاتھ میں دیا اور ان کا سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔

آدھ گھنٹے چلتے رہنے کے بعد جارج ایک بار پھر رک گیا۔ اس نے چاروں طرف متجسس انداز میں دیکھا اور بولا۔ ''تقریباً بیس منٹ بعد ہم سوئس سرحد میں داخل ہو جائیں گے۔''

یہ سنتے ہی ان سب کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے اور تھکن کا سارا احساس جاتا رہا۔ اس سے پہلے کہ ان میں

سنہرے موتی

☆ کسی انسان کو دکھ دینا ایسا ہی ہے جیسا سمندر میں پتھر پھینکنا مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ پتھر کتنی گہرائی میں گیا ہے۔

☆ سچے انسان کے جھوٹ میں شاید کوئی اچھا مقصد ہو سکتا ہے لیکن جھوٹے انسان کا سچ صرف آگ لگانے کے لیے ہوتا ہے۔

☆ محبت کا رشتہ جتنا مضبوط ہے اتنا ہی نازک، ایک معمولی سی دراڑ بھی اس کی بنیادوں کو ہلا دیتی ہے۔

☆ دل ایک آئینہ ہے، اگر برائی سے پاک ہو تو اس میں خدا بھی نظر آتا ہے۔

☆ اگر کسی کے دل میں جگہ پیدا کرنا چاہتے ہو تو اس کا پورا نام لے کر پکارو۔

☆ کتنے حسین ہیں وہ لوگ جو کسی کے دل کا سکون اور آنکھوں کا نور ہوتے ہیں۔

☆ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اسے اس طرح گزارو کہ لوگ آپ کی اچھی زندگی کی مثال دیں۔

مرسلہ۔ ایم عثمان انصاری،
ہائی سیکیورٹی نیو سینٹرل جیل، ملتان

عدالت

عدالت میں ایک اہم کیس کی سماعت ہو رہی تھی۔ وکیل اپنے موکل کے حق میں دلائل دے رہا تھا کہ ملزم نے مقتول کو قتل نہیں کیا۔ جج نے کہا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اب مخالف وکیل میدان میں اترا اور بولا کہ ملزم نے ہی قتل کیا ہے۔

جج صاحب بولے۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' عدالت میں سے ایک آدمی اٹھا اور کہا یہ دونوں تو متضاد باتیں کر رہے ہیں یور آنر اور آپ دونوں کو کہہ رہے ہیں کہ وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس پر جج صاحب نے اپنی عینک کو تھوڑا ناک پر رکھا اور بولے۔

''آپ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

مرسلہ۔ محمد قاسم رحمان، ہری پور

سے کوئی کچھ کہتا۔ جارج بولا۔ "ہمیں پہلے کی طرح خاموشی سے اپنا سفر جاری رکھنا ہوگا کیونکہ گشت کرنے والے سپاہی اکثر سرحدی حدود کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے تم لوگ اب بھی محفوظ نہیں ہو۔"

وہ جنوب کی جانب مزید پندرہ منٹ تک چلتے رہے۔ مسٹر گرنبرگ نے جیکب کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا تھا اور جارج اس کا سوٹ کیس لے کر چل رہا تھا۔ بالآخر وہ جنگل سے باہر نکل آئے۔ اب ان کی نگاہوں کے سامنے ایک گاؤں تھا۔ جارج ایک بار پھر رک گیا اور بولا۔ "اب میں یہاں سے رخصت ہوجاؤں گا۔"

مسز گرنبرگ نے اپنے شاپنگ بیگ سے تھرماس نکالا۔۔۔ اور اس میں سے کافی نکال کر سب میں تقسیم کی۔ اس کے ساتھ ہی مکھن لگے سلائس بھی تھے گوکہ ہر ایک کے حصے میں کافی کی تھوڑی تھوڑی مقدار آئی لیکن سہارے کے لیے یہ بھی غنیمت تھی۔

جارج نے گرنبرگ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نے یہاں کا وہ چرچ دیکھا ہے جہاں تم جانا چاہتے ہو؟"

گرنبرگ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "لیکن ہم تو یہودی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے کوٹ کے بائیں جانب اشارہ کیا جس پر پھٹے ہوئے زرد ستارے کے نشان نظر آرہے تھے۔

"اپنے کوٹ اتار کر بازوؤں پر اس طرح لے لو کہ گاؤں کے لوگوں کو یہ اسٹارز نظر نہ آسکیں۔ تمہیں سوئٹزرلینڈ میں بھی اپنے مخالف عقیدے کے لوگ ملیں گے۔ تم چرچ جاکر فادر بونی فیش کے بارے میں پوچھنا۔ وہ میرے گاڈ فادر ہیں۔ انہیں بتانا کہ جارج نے تمہیں بھیجا ہے۔ یہ سن کر وہ ضرور تمہاری مدد کریں گے۔"

گرنبرگ نے احسان مندی سے اس کی طرف دیکھا اور جیب سے اپنا بٹوا نکالنے لگا لیکن جارج نے کچھ لینے سے انکار کردیا اور بولا۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ لیکن میں نے اس لیے تمہاری مدد نہیں کی تھی۔"

اس کے ذہن میں بہت سے سوال تھے جو وہ مسٹر گرنبرگ سے کرنا چاہ رہا تھا مثلاً یہ کہ کس نے ان کے خاندان کو اتنے سالوں تک پناہ دیے رکھی؟ ان کا تعلق کس علاقے سے تھا؟ لہجے اور زبان سے تو وہ شمالی جرمنی کے رہنے والے لگ رہے تھے۔ انہوں نے محفوظ سرحد تک پہنچنے کے لیے کتنی راتیں سفر میں گزاریں وغیرہ وغیرہ لیکن اس میں یہ سوال کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو بہت پُرسکون محسوس کر رہا تھا کہ اس خاندان کو بہ حفاظت سرحد تک پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے گرنبرگ کی طرف دیکھا۔ "اس ملک میں بہت ناانصافیاں ہورہی ہیں۔ ان حالات میں تمہارے لیے یہی کچھ کرسکتا تھا۔"

یہ کہہ کر وہ مڑا اور اس نے آگے بڑھ کر اپنی شاٹ گن اٹھالی جو اس نے کافی پینے کے دوران ایک درخت کے تنے کے ساتھ رکھ دی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور گرنبرگ نے اپنا ہاتھ جارج کی طرف بڑھا دیا۔

☆☆☆

کچھ دنوں تک گاؤں کے لوگوں میں وہ لاش موضوعِ گفتگو بنی رہی پھر اس کے بعد اپنے روزمرہ مسائل میں الجھ کر سب اسے بھول گئے پھر ایک دن لیبارٹری رپورٹ بھی آگئی جس سے یہ تصدیق ہوگئی کہ وہ لاش ہیکو ڈرسٹ ہی کی تھی۔ فلورین خود اس کی باقیات لے کر گاؤں آیا تاکہ اس کی بہن یہاں کے قبرستان میں اس کی تدفین کرسکے۔ وہاں سے فارغ ہوکر وہ انڈریس کے گھر آیا اور اس کی ماں سے بولا۔

"اس وقت ہیکو جوان تھا لیکن اس کی بہن کا کہنا ہے کہ اتنے عرصے تک اس نے اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں سنی۔"

دادا نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور حسبِ عادت خاموشی سے اپنا گلاس بہو کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے حسبِ معمول وہ گلاس بھرا اور رٹا رٹایا جملہ بولنے لگی۔ "تمہیں اتنی زیادہ نہیں پینی چاہیے۔" اس نے دادا کے الٹے ہاتھ کی حرکت پر غور نہیں کیا۔ جسے وہ اپنے چہرے تک لے گیا اور کچھ صاف کرنے لگا۔ شاید کچھ یادیں یا ذہن کی آنکھ سے نظر آنے والے کچھ حقائق۔

☆☆☆

جارج نے جھک کر زمین پر پڑی ہوئی لاش کی جانب دیکھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ زمین پر گرتے ہی ہیکو ڈرسٹ کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ سورج کی روشنی میں اسے یہ سارا منظر بہت واضح نظر آرہا تھا۔ ہیکو کا سر ایک درخت سے ٹکرایا تھا اور ایک نکیلی تیز شاخ اس کے کندھے پر اتر گئی تھی۔ جس کی وجہ سے خون کی ایک پتلی دھار اس شاخ کے ساتھ ساتھ زمین پر گر رہی تھی۔ اب یہ خون خشک ہوچکا تھا۔ اس کا سر غیر فطری انداز میں داہنی جانب گھوم گیا تھا اور ہیکو ایک ایسے پتلے کے مانند نظر آرہا تھا جسے کسی نے بے پروائی سے زمین پر پھینک دیا ہو۔

پانچ سال پہلے ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا جس نے جارج اور ہیکو کے درمیان دشمنی کا بیج بو دیا۔ جارج کی گیارھویں سالگرہ پر اسے سوئٹزرلینڈ سے اس کے گاڈ فادر نے تحفے میں ایک ساسر بال بھیجی۔ ہیکو نے وہ گیند لی اور اسے شکاری چاقو سے چاک کر دیا۔ جارج اس واقعے کو کبھی نہیں بھول پایا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ سبھی جانتے تھے کہ جنگل میں موجود یہ شکارگاہ جارج کے باپ کی ملکیت ہے اور اس لیے جارج کو بھی یہاں شکار کھیلنے اور شاٹ گن ساتھ رکھنے کا حق تھا لیکن ہیکو زبردستی شکارگاہ میں چلا آتا۔ اس نے جارج کو دھمکی بھی دی کہ اگر اس نے اس کے راستے کی رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو وہ اسے غیر قانونی اسلحہ رکھنے کے الزام میں پولیس اسٹیشن لے جائے گا۔ جارج پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے ہیکو کو وہاں سے چلے جانے کے لیے کہا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی نظر اس خاندان پر پڑے جو اس کی واپسی کی راہ دیکھ رہا ہو گا۔

ہیکو نے جب دیکھا کہ جارج پر اس کی دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا تو اس نے کسی وارننگ کے بغیر ہی جارج پر حملہ کر دیا۔ وہ پہلے تو پیچھے ہٹا پھر سنبھل کر اس نے جوابی وار کیا۔ ہیکو اچانک ہی دور چلا گیا اور اس نے اپنا پستول نکال لیا۔ جارج کی شاٹ گن خالی تھی جسے اس نے نال کی طرف سے پکڑا ہوا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ہیکو گولی نہ چلا دے۔ لہٰذا اس نے اپنے بچاؤ کے لیے شاٹ گن کو گھمانا شروع کر دیا۔ اس کا بٹ ہیکو کے سر میں لگا اور وہ پیچھے کی جانب گر گیا۔ جارج کی ٹوپی لڑائی کے دوران پھٹ گئی تھی۔ اس نے وہی اتار کر ہیکو کے منہ پر ڈال دی۔ اسے واپسی کی جلدی ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہیکو کو دیکھ لے گا۔

یہودی خاندان کو بہ حفاظت اس کی منزل تک پہنچانے کے بعد اب جارج اپنے دشمن کی لاش کے پاس کھڑا اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ وہ جنگل سے گزرتا ہوا شکارگاہ کے اس سرے پر جا پہنچا جہاں جنگل کے مزدوروں نے درخت کاٹ کر رکھے ہوئے تھے۔ زمین پر لکڑی کا برادہ، چھوٹے بڑے ٹکڑے اور شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک روز پہلے کی کاٹی گئی لکڑی چھکڑوں پر رکھی جا چکی تھی اور اس جگہ کو نئی لکڑی ڈھیر کرنے کے لیے صاف کر دیا گیا تھا۔ اس نے لکڑی کا ایک لمبا اور چپٹا ٹکڑا اٹھایا اور اس سے زمین کھودنی شروع کر دی۔ اسے محض پچاس سینٹی میٹر گہرا گڑھا کھودنے میں بھی کافی دیر لگ گئی۔ اس کام کے دوران اس کے ہاتھ میں جگہ جگہ لکڑی کی پھانس اور کرچیاں چلی گئیں جن کی وجہ سے خون رسنے لگا۔ وہ ہیکو کی لاش کو گھسیٹتا ہوا وہاں تک لایا اور اسے گڑھے میں ڈال دیا۔ گڑھے کی بھرائی کرتے وقت اسے ہیکو کے پستول کا خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ اسے وہ کسی تالاب میں پھینک دے گا، پھر اس نے شاخوں کو جھاڑو کی طرح استعمال کرتے ہوئے لاش کو گھسیٹنے اور دفن کرنے کے سارے نشانات صاف کیے..... اس نے اردگرد سے بہت سا لکڑی کا برادہ اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جمع کر کے اس گڑھے پر پھیلا دیے۔ خوش قسمتی سے اس نے مزدوروں کے آنے سے پہلے ہی سارا کام نمٹا لیا تھا۔ اب اسے صرف یہ فکر تھی کہ گھر واپس جا کر دیر ہو جانے اور ان زخموں کی کیا وضاحت پیش کرے گا۔

☆☆☆

دادا نے ساری دوپہر اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے ہی گزار دی۔ اینڈریس اس کے کمرے میں لیمپ روشن کرنے لگا تو اس وقت بھی وہ اس اجنبی خاندان کی تصویر ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ جب اینڈریس نے اس سے کچھ کہنا چاہا تو وہ تصویر اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر جا گری اور اس کا فریم علیحدہ ہو گیا۔ اینڈریس نے جھک کر اسے اٹھا لیا اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔ تصویر میں موجود مرد کی عمر تقریباً ساٹھ برس ہو گی جبکہ عورت کی عمر بھی اسی کے لگ بھگ تھی۔ نوجوان مرد یونیورسٹی کے گاؤن میں ملبوس تھا اور لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ تصویر کی پشت پر پنسل سے لکھا تھا۔ ''جیکب کی میڈیکل اسکول گریجویشن کے موقع پر لی گئی سارہ اور جیکب کے ساتھ گرنبرگ فیملی کی تصویر 1959ء''

اینڈریس نے تصویر کو فریم میں رکھا اور اسے دادا کے حوالے کر دیا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے باپ سے اس تصویر کے بارے میں پوچھا تھا لیکن وہ صرف اتنا ہی بتا سکا کہ دادا کو یہ تصویر کئی سال پہلے سوئٹزرلینڈ سے کسی نے ڈاک کے ذریعے بھیجی تھی۔ اچانک ہی اینڈریس کی نظر اپنے دادا پر گئی جو اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی کو تصویر والی لڑکی کے چہرے پر پھیر رہا تھا۔ یقیناً وہ دادا کی جوانی میں اس کی محبوبہ رہی ہو گی۔ اسے اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ اس نے ایک ایسے راز کا پتا چلا لیا تھا جس پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا لیکن وہ یہ بھی نہ جان سکا کہ ہیکو کی لاش ملنے کی خبر سن کر دادا کے مفلوج جسم میں رعشہ کیوں پیدا ہوا تھا۔





تخته

ش م جمیل

آنکھوں میں دھول جھونکنا کسی زمانے میں بہت مشکل ہوا کرتا تھا مگر اب تو یہ ایک فیشن بن گیا ہے پکڑے گئے تو مذاق کہہ دیا اور اگر نکل گئے تو وارے کے نیارے... بس یہی مشن اس کا بھی تھا لیکن وہ یہ بھول گیا تھا کہ ایک ہی لاٹھی سے سب کو نہیں ہانکا جاسکتا۔

بدیسی معاشرے میں جرائم کا انوکھا طریقہ واردات

''کرنل یہ شخص میرا بہنوئی ہے۔ اس پر کوئی داؤ آزمانا بے کار ثابت ہوگا۔''

ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ آرتھر ہمارے عقب میں کھڑا تھا اور کرنل کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا، جو اسکاٹ لینڈ یارڈ کے جہاندیدہ سراغ رسانوں کا خاصہ ہوتا ہے۔

''میں پولیس والوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا قطعی پسند نہیں کرتا۔''

کرنل نے نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ بھی جو ان کے رشتے دار ہوں۔'' میں اسے ریستوران سے باہر جاتا ہوا دیکھتا رہا، اس کی چال میں بڑا وقار تھا۔

آرتھر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ "کیا اس نے تعارف حاصل کرنے کے لیے تمہارا گلاس گرایا تھا؟" اس نے دریافت کیا اور میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بڑھاپا بہت بری چیز ہے۔ اب یہ ان حرکتوں پر اتر آیا ہے۔ کبھی یہ شخص اپنے وقت کا بہترین دھوکے باز تھا۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کے فوراً بعد کا ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب میں وردی اتار کر سادہ لباس...... سراغ رسانوں کی صف میں شامل ہوا تو کرنل کی گرفتاری میرا قابلِ ذکر کارنامہ تھا اور اس میں میری محنت یا ذہانت کو کوئی دخل نہیں تھا، وہ سراسر کرنل کی بدقسمتی تھی۔"

"لیکن ایسی شاندار شخصیت کے مالک کو آخر کس واقعے نے جرائم کی طرف راغب کیا؟"

"اس کے مجرم بننے میں کسی واقعے کا کوئی دخل نہیں۔" آرتھر نے جواب دیا۔ "یہ پیدائشی مجرم ہے جس طرح کہ دوسرے تمام بڑے مجرم ہوتے ہیں۔"

"اسے فوج سے کیوں نکالا گیا تھا؟"

"فوج میں اس کی ملازمت کل چھ مہینے کی تھی، یہ وہاں باورچی تھا اور پھر اسے ایک سال کی سزا بھگتنی پڑی۔ کیونکہ اس نے راشن چرا کر بازار میں فروخت کر دیا تھا۔"

"تو یہ کرنل نہیں ہے، لیکن دیکھنے میں تو یہ کوئی اعلیٰ فوجی افسر نظر آتا ہے۔"

"کرنل چھوڑ یہ ایڈمرل بھی نظر آتا ہے۔ ایک دفعہ اس نے ایک ہوٹل میں سپریم کورٹ کے ایک وکیل کی حیثیت سے قیام کیا تھا اور بل کی ادائیگی جعلی چیک سے کی تھی جسے ہوٹل کے منیجر نے بلا جھجک قبول کر لیا تھا۔ ویسے تو اس نے کوئی پیشہ نہیں چھوڑا لیکن یہ کرنل بننے کو ترجیح دیتا ہے۔"

آرتھر خاموش ہو گیا۔

"اور تم نے اسے ایک مرتبہ گرفتار کیا تھا۔" میں نے آرتھر کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ ایک دلچسپ کہانی سنانے والا ہے۔

☆☆☆

"کوئی بھی کام کرنے سے پہلے سوچ بچار، منصوبہ بندی اور تیاری پر جو وقت صرف کیا جائے وہ کبھی ضائع نہیں ہوتا، ہمیشہ فائدہ پہنچاتا ہے۔" آرتھر نے کہانی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "کرنل نے یہ سنہرا قول کہیں پڑھا تو گرہ میں باندھ لیا اور ہمیشہ اس پر عمل کرتا رہا۔ میں جس واردات کا ذکر کرنے والا ہوں اس کے لیے وہ پورا ایک سال تیاری کرتا رہا، اس کے بعد وہ ایک روز ریٹائرڈ کرنل کے روپ میں مشہور جوہری فیز کی دکان میں پہنچا۔ اسے قیمتی پتھروں اور ہیروں کی پہچان بھی تھی اور ان کی مالیت کے بارے میں بھی کچھ واقفیت رکھتا تھا۔ اس نے جوہری کو بتایا کہ وہ حال ہی میں فوج سے ریٹائر ہوا ہے اور کمیشن پر جواہرات فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے پہلے جوہری سے کم قیمت والے چند زیورات خریدے اور بتایا کہ گلاسگو میں ایک گاہک کے لیے خریداری کر رہا ہے۔ اگر فیز کی جگہ کوئی دوسرا جوہری ہوتا تو پہلی ہی خریداری میں کرنل کی کھال اتار دیتا لیکن فیز بہت ذہین اور چالاک ہے۔ وہ دودھ دینے والی گائے کو ایک ہی مرتبہ ذبح کرنے کا قائل نہیں ہے۔

"کرنل نے پہلی خریداری کی ادائیگی چیک کے ذریعے کی اور فیز سے کہا کہ وہ فی الحال پیرس جا رہا ہے اور واپسی پر اس سے خریدے ہوئے زیورات لے جائے گا جہاں وہ مزید کچھ خریداری کرنا چاہتا ہے۔ فیز کو بھلا اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ چیک کی ادائیگی تک ویسے بھی مال دینے کا قائل نہیں تھا جب کہ خریدار اس کے لیے بھی اجنبی ہو۔ کرنل کا دیا ہوا چیک صحیح ثابت ہوا، ایک ہفتے بعد کرنل فیز سے وہ زیورات لے گیا۔

"ایک ماہ بعد کرنل پھر آیا۔ اس نے فیز کا شکریہ ادا کیا کہ اس کے گاہک کو زیورات پسند آئے تھے جس کے عوض اسے سو پاؤنڈ کمیشن بھی ملا اور اب اس کے گاہکوں میں تیزی سے اضافہ بھی ہوتا جا رہا تھا۔ اس مرتبہ اس نے فیز سے پانچ ہزار پاؤنڈ کی مالیت کے زیورات خریدے اور نقد ادائیگی کی۔ تیسری مرتبہ اس نے نیویارک سے فیز کو ٹیلیفون کیا۔ وہ جوش میں بھرا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے فیز سے پوچھا کہ کیا اس نے کبھی ہیسٹر لے کے ہیروں کا ذکر سنا ہے؟ لندن کے کسی جوہری نے ان کا ذکر نہیں سنا تھا۔ وہ گزشتہ پانچ سال سے مارکیٹ میں فروخت کے لیے موجود تھے لیکن لارڈ ہیسٹر لے کی بیوہ نے ان کی کم سے کم قیمت فروخت ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈ مقرر کی ہوئی تھی، جب کہ ان کی مالیت اس سے کم تھی اور یہی وجہ تھی کہ پانچ سال گزرنے کے باوجود لندن کا کوئی تاجر انہیں فروخت نہیں کر سکا تھا۔ فیز نے کرنل سے پوچھا کہ آخر اسے ان ہیروں سے یکایک کیوں دلچسپی پیدا ہو گئی ہے؟

"کرنل نے اس سے کہا کہ کیا وہ ان ہیروں کا سودا ایک لاکھ 30 ہزار پاؤنڈ میں کرا سکتا ہے؟ فیز نے حوصلہ افزا جواب دیا کیونکہ ایک سال قبل لارڈ ہیسٹر لے کی بیوہ بھی فوت ہو گئی تھی اور ورثا ان ہیروں کی فروخت میں بہت دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ ایک لاکھ تیس ہزار پاؤنڈ میں ان کا سودا کرا دے گا لیکن کیوں؟

"کرنل نے اسے ہدایت کی کہ وہ بڑی خاموشی کے ساتھ یہ معلوم کرے کہ کیا ہیروں کا سودا ایک لاکھ تیس ہزار پاؤنڈ میں ہوسکتا ہے اور دوسرے دن چار بجے وہ نیویارک کے ہوٹل والڈروف آسٹوریا میں اس سے رابطہ قائم کرکے صحیح جواب دے تاکہ وہ اپنے گاہک سے کوئی حتمی بات چیت کرسکے۔

"دوسرے دن فیئر نے کرنل سے ٹیلی فون پر بات کی اور اسے بتایا کہ اس نے بڑی مشکل سے لارڈ ویسٹر لے کے وارثوں کو ایک لاکھ تیس ہزار پاؤنڈ میں ہیرے فروخت کرنے پر آمادہ کرلیا ہے۔ اس پر کرنل نے پوچھا کہ اسے کیا کمیشن ملے گا؟ فیئر نے پانچ ہزار پاؤنڈ کمیشن ادا کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے آگے ایک لاکھ پاؤنڈ ہی میں بات کی تھی۔ کرنل کمیشن پر بحث کرنے لگا۔ وہ دس ہزار کا مطالبہ کررہا تھا۔ فیئر آہستہ آہستہ کمیشن کی رقم بڑھاتے بڑھاتے ساڑھے سات ہزار پاؤنڈ تک آگیا اور پھر اس رقم میں ایک پاؤنڈ کا بھی اضافہ نہیں کیا۔

"میں آج رات کی فلائٹ سے لندن پہنچ رہا ہوں۔" کرنل نے اسے بتایا اور یہ بھی کہا کہ وہ کل دن میں کسی بھی وقت فیئر کے دفتر آئے گا اور ہیرے لے کر اسی رات واپس نیویارک چلا جائے گا۔ "اور رقم کا کیا ہوگا؟ وہ رقم لیے بغیر جواہرات اس کے حوالے نہیں کرسکتا۔" فیئر نے پوچھا۔

"ظاہر ہے، ظاہر ہے۔" کرنل نے فیئر سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ فیئر کو اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کا گاہک بینک ڈرافٹ کی شکل میں ادائیگی کرے گا جس کی ضمانت ایک بڑا مالیاتی ادارہ کرے گا۔

اگلے دن کرنل پہنچا تو فیئر نے پوچھا تمہارا گاہک کون ہے مگر کرنل نے کہا یہ اس کا اپنا تجارتی راز ہے۔ "ٹھیک ہے۔" فیئر نے جواب دیا۔ "لیکن یہ خیال رہے کہ جب تک ہیروں کی قیمت ادا نہیں ہوجاتی وہ ان کی تحویل تبدیل نہیں کرے گا کیونکہ ان کی ساری ذمے داری اس کے سر ہے۔"

"اوہ میرے خدا۔" کرنل نے کہا۔ "میں بھی کتنا بے وقوف ہوں، ہیروں کے سحر میں کھوکر کاروبار بھول ہی گیا۔ آپ ذرا سر تھامس سیکیورٹی کارپوریشن کا نمبر ملا کر ڈائریکٹر جیمس مارٹن سے میری بات کرادیں۔"

"تمہیں پتا ہے کہ سر تھامس سیکیورٹی کارپوریشن لندن کا مشہور مالیاتی ادارہ ہے جس کا دفتر شہر میں جدید ترین بیس منزلہ عمارت میں واقع ہے۔"

"کیا نمبر ہے ان کا؟" فیئر نے دریافت کیا۔

"نمبر تو مجھے یاد نہیں، آپ ٹیلی فون ڈائریکٹری میں دیکھ لیں۔"

"کرنل نے جواب دیا اور ایک مرتبہ پھر جگ مگ جگ مگ کرتے ہوئے ہیروں کے سحر میں کھوگیا۔ فیئر نے ڈائریکٹری میں سر تھامس سیکیورٹی کارپوریشن کا نمبر تلاش کیا اور رابطہ قائم ہونے پر ٹیلیفون آپریٹر سے جیمس مارٹن سے بات کروانے کی درخواست کی۔ آپریٹر نے جیمس مارٹن کی سیکریٹری سے رابطہ کرادیا جو فیئر سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہ ڈائریکٹر صاحب سے کیوں اور کس سلسلے میں گفتگو کرنا چاہتا ہے، وہ خود کون ہے اور کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ کچھ دیر بعد فون کرلے؟ فیئر نے تنگ آکر ریسیور کرنل کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔ "لیجیے آپ ہی بات کرلیں کوئی سیکریٹری ہے جو مسٹر جیمس مارٹن سے بات نہیں ہونے دیتی۔"

"آپ اس سے کہیں کہ کرنل کینس ورتھ بات کرنا چاہتے ہیں۔" کرنل نے ہیروں سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ فیئر نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور سیکریٹری نے جیسے ہی کرنل کینس ورتھ کا نام سنا فوراً اس کا رویہ تبدیل ہوگیا۔

"میں ابھی بات کراتی ہوں جناب، ذرا ایک منٹ توقف فرمائیں۔ مسٹر جیمس مارٹن دراصل خود کرنل صاحب کی تلاش میں تھے۔ وہ ان سے ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ کلک کلک کی آوازیں آئیں اور دوسرے لمحے فیئر نے جیمس مارٹن کی بھاری بھرکم آواز سنی۔

"تم کہاں ہو کینس ورتھ، بوڑھے کتے، میں کب سے تمہیں تلاش کررہا ہوں احمق، میں نے کہا تھا کہ ٹھیک ساڑھے چار بجے دفتر سے اٹھ جاؤں گا۔"

فیئر نے جلدی سے ریسیور کرنل کی طرف بڑھا دیا۔

"معاف کرنا مارٹن۔" کرنل نے معذرتی لہجے میں کہا۔ "میں اس قدر مصروف رہا کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ اس وقت میں مسٹر فیئر کے آفس میں موجود ہوں، کیا وہ تصدیق شدہ ڈرافٹ تیار ہے؟"

"بالکل تیار ہے۔" جیمس مارٹن نے اسے یقین دلایا اور کہا کہ کیا وہ دوسرے دن صبح تک انتظار نہیں کرسکتا کیونکہ اسے ٹھیک ساڑھے چار بجے دفتر سے اٹھنا ہے۔

"ہرگز نہیں۔" کرنل نے جلدی سے جواب دیا۔ اسے رات کی فلائٹ سے واپس نیویارک جانا ہے اور وہ مسٹر فیئر کے ساتھ فوراً اس کے دفتر پہنچ رہا ہے تاکہ مسٹر فیئر کو ڈرافٹ دے کر وہ ان سے جواہرات لے سکے۔ فون بند کرکے وہ جلدی جلدی مسٹر فیئر کی گاڑی میں بیٹھا، جواہرات کا اٹیچی کیس مسٹر فیئر

کے ہاتھ میں تھا اور اس کے ساتھ ایک مسلح محافظ بھی تھا جو ڈیل ڈول میں... باکسنگ کا سابق عالمی چیمپئن نظر آتا تھا۔ سرتھامس سیکیورٹی کارپوریشن جیسے مستحکم مالیاتی ادارے کے ڈائریکٹر تھے اور جو ڈرافٹ کے صحیح ہونے کی ضمانت لے رہے تھے۔ اس لیے فیز جیسے محتاط اور شکی مزاج تاجر نے بھی ڈرافٹ لے کر جواہرات کرنل کے حوالے کرنے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا۔

''سرتھامس... سیکیورٹی کارپوریشن کا دفتر ایک بیس منزلہ عمارت میں واقع ہے۔ وہ عمارت اتنی لمبی چوڑی ہے کہ ایک ناواقف شخص آسانی سے اس میں گم ہو سکتا ہے۔ گراؤنڈ فلور پر کمپنی کا بینک واقع ہے جو دوسرے تمام بینکوں کی طرح کام کرتا ہے اور دوپہر ایک بجے بند ہو جاتا ہے۔ وہ ایک پچھلے دروازے سے داخل ہوئے اور لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر پہنچے۔ وہ بالکل ٹھیک وقت پر پہنچے تھے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ کرنل کی منصوبہ بندی بہت اعلیٰ درجے کی تھی۔ جیسے ہی لفٹ کا دروازہ کھلا انہیں ڈائریکٹر جیمس مارٹن اپنے کمرے سے باہر نکلتا ہوا نظر آیا جو لفٹ کے بالکل سامنے تھا اور دروازے پر اس کے نام کی سنہری تختی لگی ہوئی تھی۔ مسٹر جیمس مارٹن کے ایک ہاتھ میں ہیٹ تھا اور دوسرے ہاتھ میں انتہائی قیمتی بریف کیس۔ کرنل پر نظر پڑتے ہی ان کے چہرے پر ایک گرم جوش مسکراہٹ پھیل گئی۔

''گمینس ورتھ، نامعقول آدمی، تم کہاں رہ گئے تھے۔'' انہوں نے بریف کیس قالین پر رکھ کر جیب میں سے ڈرافٹ نکالا۔ ''میں نے سوچا کہ راستے میں تمہارے ہوٹل میں ڈرافٹ دیتا چلا جاؤں گا۔''

کرنل نے ڈرافٹ لے کر اس پر سرسری نظر ڈالی اور ڈرافٹ فیز کی طرف بڑھا دیا۔ مسٹر جیمس مارٹن نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا اور لفٹ بلانے کے لیے بٹن دبایا لیکن ٹھیک اسی وقت کسی نے نیچے لفٹ روک لی تھی۔ فیز نے خود کو اس تاخیر کا مجرم محسوس کرتے ہوئے مسٹر جیمس مارٹن سے معذرت شروع کر دی جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ آئندہ ملاقات ہونے پر مسٹر جیمس مارٹن اسے پہچان لیں۔ ٹھیک اس وقت ان کے عقب میں کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ سب نے پلٹ کر پیچھے دیکھا دروازے پر لگی ہوئی تختی گر گئی تھی۔

اس کے بعد جیسے وہاں زلزلہ آ گیا۔ مسٹر جیمس مارٹن کا حوصلہ جواب دے گیا وہ بہت تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکا لیکن فیز کا مسلح محافظ اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ وہ ایک نظر ڈالتے ہی سارا معاملہ بھانپ گیا تھا۔ اس نے چھلانگ مار کر جیمس مارٹن کو دبوچ لیا اور اس کی گردن میں قینچی ڈال کر اسے بے بس کر دیا۔ ادھر فیز کو بھی اس قسم کے ہنگامی حالات کا خاصا تجربہ تھا۔ اس نے اپنا بھاری بھرکم اٹیچی کیس فضا میں لہرایا اور وہ اٹیچی کیس زوردار آواز کے ساتھ کرنل کے سر پر پڑا۔

''اور اس طرح محض نام کی ایک تختی دروازے پر سے گرنے کی وجہ سے کرنل کا وہ شاندار اور بے داغ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ عدالت نے کرنل کو پانچ اور اس کے ساتھی کو تین سال قید کی سزا سنائی جو جیمس مارٹن بنا ہوا تھا۔ وہ پہلا موقع تھا جب ہم اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس سے پہلے ہم اس کی سرگرمیوں سے تو واقف تھے لیکن کبھی کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکے تھے۔''

☆☆☆

''لیکن آرتھر نے تو بتایا تھا کہ فیز نے فون پر اصلی جیمس مارٹن سے گفتگو کی تھی، اتنا بڑا آدمی کس طرح کرنل کا شریک کار ہو سکتا ہے؟'' میں نے آرتھر سے پوچھا۔

''فیز نے فون پر اصلی جیمس مارٹن سے گفتگو نہیں کی تھی' وہ نقلی جیمس مارٹن تھا، کرنل کا شریک جرم۔'' آرتھر نے جواب دیا۔

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے اتم نے تو بتایا تھا کہ فیز نے خود ٹیلی فون ڈائریکٹری میں سرتھامس سیکیورٹی کارپوریشن کا نمبر تلاش کر کے خود اس مالیاتی ادارے کا نمبر ملایا اور جیمس مارٹن سے گفتگو کی تھی؟''

''بے شک میں نے یہی کہا تھا اور فیز نے واقعی ٹیلی فون ڈائریکٹری میں فون نمبر تلاش کر کے خود نمبر ملایا تھا اور جیمس مارٹن سے بات کی تھی اور یہی کرنل کے منصوبے کی شاندار ترین کڑی تھی۔ کرنل کی ذہانت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہوا یہ تھا کہ گزشتہ ملاقات پر جب کرنل نے فیز سے پانچ ہزار پاؤنڈ کے زیورات خریدے تھے، کرنل نے بڑی صفائی سے فیز کی ٹیلی فون ڈائریکٹری تبدیل کر دی تھی اور اس کی جگہ بالکل ویسی ہی دوسری ڈائریکٹری رکھ دی تھی جس میں ایک صفحہ تبدیل کر دیا گیا تھا تم سمجھ گئے ہو گے، جو صفحہ تبدیل کیا گیا تھا اس پر سرتھامس سیکیورٹی کارپوریشن کا نمبر موجود تھا۔ کرنل نے وہ صفحہ بالکل اسی طرح چھپوایا تھا۔ بس کارپوریشن کا ٹیلی فون نمبر تبدیل کر دیا تھا۔ ہم نے کرنل کی نشاندہی پر اس پریس والے کو بھی گرفتار کر لیا تھا جس نے ٹیلی

فون ڈائریکٹری کا وہ صفحہ چھاپا تھا اور اسی سے کرنل نے وہ ڈرافٹ بھی چھپوایا تھا جو فیر کو دیا جانے والا تھا۔ فیر نے تبدیل شدہ ڈائریکٹری میں کارپوریشن کا جعلی نمبر دیکھا اور وہی نمبر ملایا اور جعلی جیمس مارٹن سے گفتگو کی۔''

''لیکن، لیکن۔'' میں بری طرح الجھ گیا تھا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ کرنل فیر اور اس کے محافظ کو اس عمارت میں لے گیا جہاں کارپوریشن کا دفتر واقع تھا۔ اس عمارت میں کارپوریشن کے علاوہ اور کسی ادارے کا دفتر نہیں ہے، پھر یہ سب کیسے ممکن ہوا؟''

''ٹھہرو میں تمہیں شروع سے بتاتا ہوں۔'' آرتھر نے میری کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ کرنل ہر جرم کی تیاری بہت احتیاط سے کرتا تھا اور احتیاط بہرحال فائدے مند ثابت ہوتی ہے۔ اسے کارپوریشن کی عمارت میں تو کوئی دفتر کرائے پر نہیں مل سکتا تھا۔ اس نے برابر والی عمارت میں ایک چھوٹا سا دفتر کرائے پر لیا اور اس میں دو لڑکیاں ملازم رکھیں۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری میں جو جعلی نمبر لکھا گیا تھا۔ وہ اسی دفتر کا تھا فیر نے اسی دفتر کا نمبر ملایا تھا اور فون پر کرنل کے شریک جرم نقلی جیمس مارٹن سے گفتگو کی تھی اور یہ سارا ڈراما ان دو لڑکیوں کی مدد سے کھیلا گیا تھا۔ جن میں ایک آپریٹر بنی تھی اور دوسری جیمس مارٹن کی سیکریٹری۔ ہم ان لڑکیوں کے خلاف کچھ ثابت نہیں کرسکتے کیونکہ انہوں نے محض ایک مذاق سمجھتے ہوئے اس ڈرامے میں حصہ لیا تھا۔ وہ ان کے مجرمانہ عزائم سے لاعلم تھیں۔''

''بہت خوبصورت منصوبہ تھا لیکن یہ سمجھ نہیں آیا کہ وہ آخر پکڑے کیسے گئے؟ تم نے بتایا تھا کہ محض نام کی تختی گرنے سے ان کا سارا منصوبہ ناکام ہوگیا تھا۔''

آرتھر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''انہوں نے ٹیلی فون پر تو فیر کی گفتگو جیمس مارٹن سے کرادی تھی لیکن فیر کو اتنی بڑی رقم کا ڈرافٹ قبول کرنے کے لیے ضروری تھا کہ کارپوریشن کی عمارت میں اس کی ملاقات جیمس مارٹن سے کرائی جائے تاکہ وہ بالکل مطمئن ہوکر جواہرات ان کے حوالے کردے اور اس کے عوض کاغذ کا ایک پرزہ قبول کرلے۔ انہیں کارپوریشن کی بیس منزلہ عمارت میں تو کوئی دفتر کرائے پر نہیں مل سکتا تھا۔ انہوں نے منصوبے کا یہ حصہ بڑی احتیاط اور ذہانت سے اپنایا تھا۔ جب فیر نے فون پر جیمس مارٹن سے گفتگو کرلی تو کرنل کا ساتھی برابر والی عمارت سے نکل کر بھاگتا ہوا کارپوریشن کی عمارت میں پہنچا۔ پانچویں منزل پر لفٹ کے بالکل سامنے ایک ایسا کمرا تھا جو ان کے لیے انتہائی موزوں تھا تاکہ جیسے ہی فیر کرنل کے ساتھ لفٹ سے برآمد ہو وہ جیمس مارٹن کو اس دروازے سے باہر نکلتا ہوا دیکھ لے۔ جس پر سنہرے حروف میں جیمس مارٹن منیجنگ ڈائریکٹر کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی اور ایسا ہی ہوا، اس کمرے میں داخل ہونے کی نوبت نہیں آئی جس پر وہ تختی لگی ہوئی تھی لیکن... بدقسمتی سے عین وقت پر وہ تختی گرگئی اور ایسے شاندار منصوبے کا بیڑا غرق ہوگیا۔''

''لیکن آرتھر تختی گرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس قسم کے واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔''

''درست ہے لیکن غضب یہ ہوا کہ جس دروازے پر نام کی وہ تختی لگائی گئی تھی، اس تختی کے نیچے دروازے پر پہلے ہی کچھ لکھا ہوا تھا۔''

''وہ کیا!'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''بیت الخلا۔'' آرتھر نے جواب دیا۔

''کیا؟''

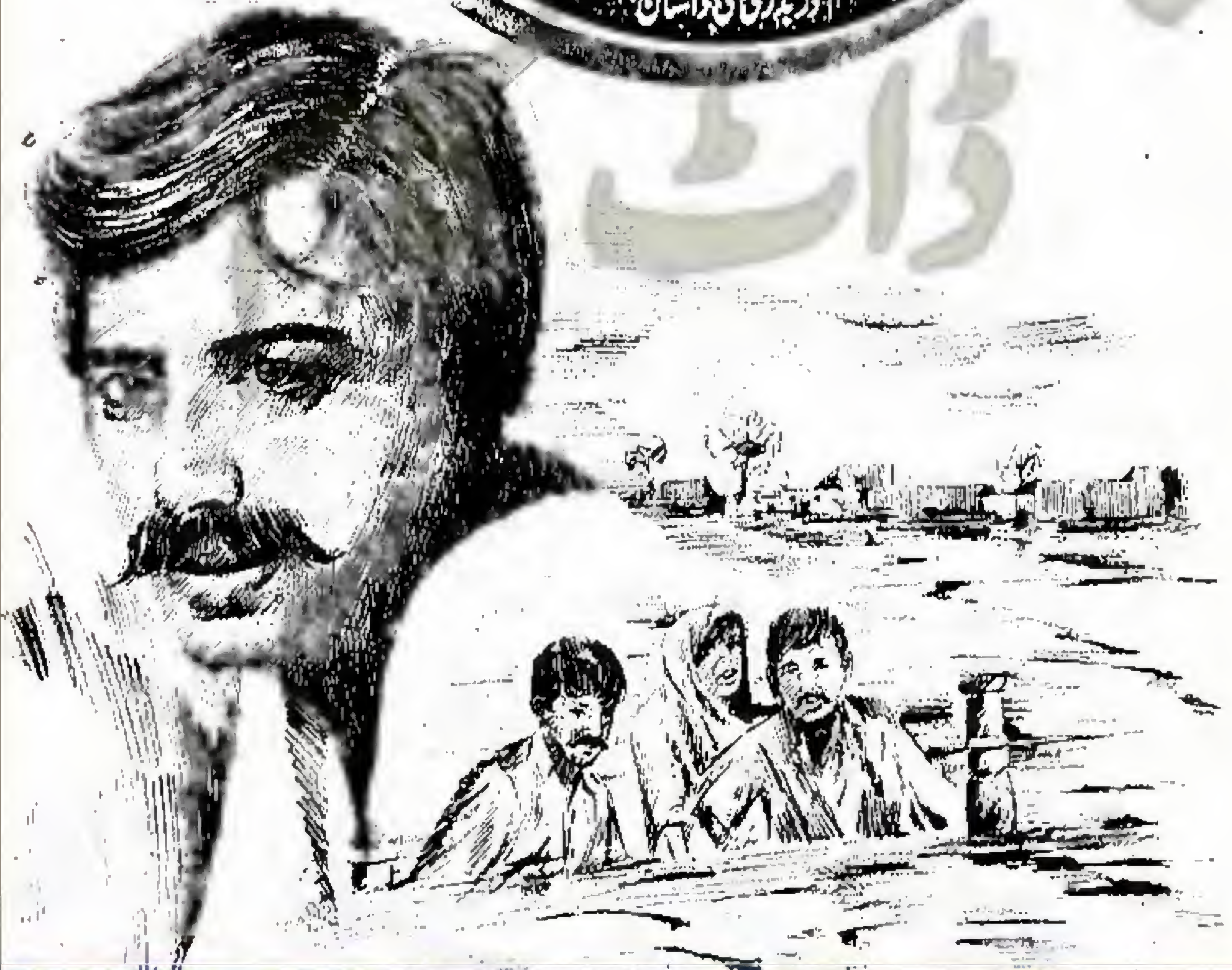
آرتھر زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔'' وہاں اس دروازے پر بیت الخلا لکھا ہوا تھا اور وہ واقعی بیت الخلا تھا۔ بدقسمتی سے اس عمارت کے تمام دروازوں پر آہنی چادر لگی ہوئی تھی۔ کرنل کا ساتھی فیر سے فون پر گفتگو کرکے جیسے ہی پانچویں منزل پر پہنچا تو اس منصوبے کے مطابق بریف کیس سے جیمس مارٹن منیجنگ ڈائریکٹر کے نام کی تختی نکالی اور چھوٹی سی کیلوں کی مدد سے وہ تختی دروازے پر لگانے لگا اور تب اس پر انکشاف ہوا کہ دروازے پر آہنی چادر لگی ہوئی ہے اور وہ اس میں اتنی چھوٹی کیلیں نہیں گاڑ سکتا۔ وقت بہت کم تھا کرنل اپنے شکار فیر کے ساتھ وہاں آنے کے لیے نکل چکا تھا۔ کرنل سے بس یہی ایک غلطی ہوئی تھی۔ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ دروازوں پر آہنی چادر لگی ہوئی ہے اور یہی غلطی انہیں لے ڈوبی۔ کرنل کا شریک جرم جلدی سے نیچے گیا، قریب ہی ایک اسٹیشنری کی دکان تھی، اس نے ایک ٹیپ خریدی، واپس آیا تو تختی کو ٹیپ کی مدد سے بیت الخلا کے لفظوں کے اوپر چپکا دیا۔ ایک تو تختی کچھ وزنی تھی، دوسرے ٹیپ آہنی چادر پر چپکائی گئی تھی، وہ زیادہ دیر وزن نہیں سنبھال سکی اور انتہائی غلط وقت پر تختی نیچے گرگئی۔ اس کے نیچے گرتے ہی دروازے پر لکھے ہوئے بیت الخلا والے حروف سامنے آگئے جس پر نظر پڑتے ہی فیر کے محافظ نے سب کچھ بھانپ لیا اور کرنل کا شاندار منصوبہ پل بھر میں برباد ہوگیا۔''

سیلاب لے گیا

منظر امام

جس طرح خوابوں اور خیالوں کی کوئی زمین نہیں ہوتی اسی طرح محبت کا بھی کوئی وطن نہیں ہوتا... بس جہاں جگہ مل جائے گھر بنا لیتی ہے اور ویسے بھی عشق کی بازی لگانا سیانوں کا نہیں دیوانوں کا کھیل ہے... جو اسے جی جان سے کھیلتا ہے فتح اسی کی ہوتی ہے۔ یہ اور بات کہ ساتھ ملے نہ ملے لیکن... دل کی جاگیر ضرور اپنے نام ہو جاتی ہے۔ وہ جو حسن کا شیدائی تھا، بڑے کروفر سے دنیا فتح کرنے نکلا تھا، ایک معمولی کنیز کے آگے کتنا بے بس ہو کر رہ گیا تھا اور ایک وہ تھی جو ہر احساس سے بے خبر اپنی ہی ایک چھوٹی سی کائنات میں گم تھی... جسے دیکھ کر کتنے دلوں کی دھڑکن بے قرار ہو کر آنکھوں میں سپنے سجا لیتی تھی اور اسی ادھیڑبُن میں اس کے دن گزر رہے تھے... کہ اچانک دنیا کی بے ثباتی نے اس کے خوابوں کو ریزہ ریزہ کیا تو کسی کے آشیانے کو تنکا تنکا بکھیر دیا۔ خوفناک سیلابی ریلوں نے ہنستی بستی بستیاں اجاڑ دیں اور لہو کے مانند دوڑتے والے رشتوں کو اپنی تندو تیز لہروں میں جانے کہاں گم کر دیا۔ پانی کے یہ قطرے جب سیلاب بن کر ظلم ڈھاتے ہیں تو اجڑے نگروں کو دوبارہ آباد ہونے میں برسوں لگ جاتے ہیں... مگر اس سے بڑا ظلم تو وہ بااختیار طبقہ مشکلات سے آنکھیں چُرا کر کرتا ہے جو آسانی مہیا کر سکتا ہے، اس کے باوجود یہ کچے گھروں میں رہنے والے وعدوں کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ جان چلی جاتی ہے مگر ایفائے عہد کی مثال قائم کر جاتے ہیں۔

قدم قدم پر طلب گاروں میں گھرے ایک کرشمہ ساز حسن کی دربدری کی داستان






اس نے پاکستان میں آنے والے زلزلے کی تباہ کاریاں ٹی وی چینلز پر دیکھی تھیں۔ یہ کئی برس پہلے کی بات تھی۔ وہ انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ عبید ان نوجوانوں میں سے تھا جو وطن سے دور ہونے کے باوجود وطن سے دور نہیں ہوتے۔ مٹی کی محبت ان کے پورے وجود میں بسی رہتی ہے۔ اس کے وطن کو اس وقت اس کی ضرورت تھی' اس نے سوچا کہ وہ پاکستان چلا جائے لیکن اس کے ایک ساتھی نے اسے روک دیا۔

''بے وقوف ہو تم' وہاں جا کر کیا کرو گے؟''

''اپنے ہم وطنوں کی مدد۔''

''وہ تو تم یہاں سے بھی کر سکتے ہو۔'' اس کے دوست نے کہا۔ ''اس وقت انہیں پیسوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ دیکھو جو لوگ مر گئے ہیں ہم انہیں واپس تو نہیں لا سکتے لیکن جو برباد ہو گئے ہیں ہم ان کی مدد ضرور کر سکتے ہیں۔''

''اور یہ ایک کام کیسے ہوگا؟''

''تم یہاں سے فنڈنگ کر سکتے ہو۔'' دوست نے بتایا۔ ''انگلینڈ میں اس وقت سیکڑوں لوگ ہیں جو اپنا فرض ادا کرنے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں لیکن انہیں کوئی پراپر چینل نہیں مل رہا تم کھڑے ہو جاؤ تو دوسرے بھی تمہارا ساتھ دیں گے۔'' عبید نے فنڈ ریزنگ شروع کر دی۔

اس نے انگلینڈ سے ہزاروں پاؤنڈز جمع کر کے پاکستان بھجوا دیے تھے یہ اس کا پہلا تجربہ تھا اور اسے بہت خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا فرض ادا کر کے سکون محسوس کیا تھا۔ وہ ایک کاروباری شخص کا بیٹا تھا۔ حمید فیضی خود بھی اس مزاج کا آدمی تھا۔ مشہور صنعت کار ہونے کے باوجود وہ فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔

عبید نے انگلینڈ آ کر تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی اس کے باپ کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اس کے بزنس سیٹ اپ کو سنبھال لے۔

انگلینڈ میں ہی عبید کی ملاقات مارتھا سے ہو گئی تھی۔ وہ ایک یہودی لڑکی تھی۔ وہ بھی یروشلم سے تعلیم حاصل کرنے لندن آئی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے ملے اور ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ مارتھا اور عبید کے درمیان کبھی کبھی اچھی خاصی جھڑپ بھی ہو جاتی۔ مارتھا اکثر اس سے کہا کرتی۔ ''عبید! سمجھ میں نہیں آتا کہ سارے جہاں کا درد تم پاکستانیوں کو کیوں ہوتا ہے۔''

''یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا؟''

''دیکھو نا۔ دنیا میں اور بھی اسلامک ممالک ہیں لیکن ناانصافی کے خلاف سب سے زیادہ شور تم لوگ کرتے ہو۔''

''مارتھا! کبھی تم نے غور کیا کہ ایسا کیوں ہے؟''

''کیا ضرورت ہے غور کرنے کی۔''

''غور کرو تو تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ تمہاری قوم کس طرح ہمیں اپنے گھیرے میں لے رہی ہے۔''

''بہت سے اسلامی ممالک ہمارے دوست ہیں۔''

''یہی تو تم یہودیوں کی پالیسی ہے۔ تمہاری حکمتِ عملی ہی اس طرح کی ہوتی ہے کہ تم یا تو دوست بن جاتے ہو یا پھر دشمن۔ دشمن بن کر تم سامنے سے نقصان پہنچاتے ہو اور دوست بن کر اپنی سازشوں، اپنی مارکیٹنگ سے برباد کرتے ہو تمہارا مقصد ہماری تباہی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔'' اس بات پر دونوں کے درمیان پھر ایک زوردار جھڑپ ہوئی اور دونوں نے کئی کئی دنوں تک ایک دوسرے سے بات نہیں کی لیکن کچھ دنوں کے بعد پھر ایک ہو گئے۔

جس وقت پاکستان میں زلزلہ آیا تھا' اس وقت بھی ان دونوں کے درمیان اسی قسم کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ مارتھا نے اس سے کہا تھا۔ ''عبید! تم ہمیں برا کہتے ہو لیکن اس زلزلے میں تمہاری سب سے زیادہ مدد ہم نے کی ہے۔''

''وہ کس طرح کیونکہ ہم نے تو تمہارے ملک کی مدد قبول ہی نہیں کی۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے تمہیں کیا معلوم کہ ہماری کتنی این جی اوز تمہارے یہاں کام کر رہی ہیں۔'' مارتھا نے بتایا۔

''یہی تو مسئلہ ہے کہ تم لوگ ہمیشہ بھیس بدل کر اپنا کام کرتے ہو اور تمہاری یہ مدد بھی ایک طرح کی مارکیٹنگ ہے۔''

دو چار دن کے لیے دونوں پھر ایک دوسرے سے روٹھ گئے۔

ایک بار مارتھا نے عبید کو اپنے باپ ڈیوڈ ملانک سے بھی ملوایا تھا۔ وہ ایک قدامت پسند یہودی تھا۔ اس کی نظر میں پوری دنیا میں صرف ایک قوم حق پر تھی اور وہ یہودیوں کی قوم تھی۔ وہ کسی اور کو خاطر میں ہی نہیں لاتا تھا۔ اس نے عبید کے ساتھ بھی سرد مہری کا برتاؤ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''مسٹر عبید، مسئلہ یہ ہے کہ ہم انفرادی اور ذاتی مسئلے پر تو کسی ایک مسلمان یا پاکستانی کے دوست ہو سکتے ہیں لیکن بحیثیت قوم ہم تمہیں قبول نہیں کر سکتے۔ تمہاری بات اور ہے کیونکہ تمہارا اور مارتھا کا معاملہ انفرادی ہے۔''

''مسٹر ڈیوڈ پھر مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی قوم سے

الگ نہیں ہوں۔" عبید نے کہا۔

"بس یہی جذباتیت تم لوگوں کو نقصان پہنچا رہی ہے۔" مارتھا نے کہا۔ "توہین آمیز خاکے ڈنمارک میں شائع ہوتے ہیں اور گاڑیاں پاکستان میں جلتی ہیں، دکانیں لوٹ لی جاتی ہیں آخر تم لوگ کس ڈگر پر جا رہے ہو؟" عبید کے پاس مارتھا کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب اس نے اپنی تعلیم مکمل کر لی اور اسے پاکستان واپس جانا تھا۔ اس نے روانگی سے پہلے مارتھا سے کہا تھا۔ "مارتھا! میں یہ چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ پاکستان چلو۔"

"وہ کیوں؟"

"تاکہ ہم وہاں اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکیں۔"

"دیکھو عبید! مسئلہ یہ ہے کہ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ تم میری پسند بھی ہو لیکن صرف تم..... تمہاری پوری قوم نہیں، تم نے ڈیڈ کی وہ بات تو سن لی ہوگی کہ ہم انفرادی طور پر ایک دوسرے کے دوست تو ہو سکتے ہیں لیکن اجتماعی طور پر ہم کبھی بھی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں ہو سکتے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے مجھ سے محبت نہیں کی؟"

"عبید! تم بہت جذباتی اور بے وقوف ہو اپنی پوری قوم کی طرح۔ میں نے تمہاری محبت سے کبھی انکار نہیں کیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمہاری پوری قوم سے محبت کروں۔ اسی لیے میرے اور تمہارے راستے الگ الگ ہیں۔ البتہ اگر تم یہیں رہ جاؤ تو پھر میں زندگی بھر تمہارے ساتھ رہنے کو تیار ہوں۔"

"یہ میری مجبوری ہے مارتھا۔" عبید نے کہا۔ "کیونکہ میرے ملک کو میری ضرورت ہے۔ مجھے وہاں جا کر بہت کام کرنے ہیں۔ سب سے پہلے ایک این جی او بناؤں گا پھر اس کے ذریعے اپنا کام شروع کروں گا۔"

"پھر تم جاؤ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

عبید مارتھا کو رخصت کر کے پاکستان آ گیا تھا۔

☆☆☆

بلا کی گرمی پڑ رہی تھی۔ اس گرمی نے ان لوگوں کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا حالانکہ وہ اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ یہاں کے سارے موسم ان کے تجربوں سے گزرے تھے۔ اس کے باوجود ایسی گرمی انہوں نے اپنے ہوش میں نہیں دیکھی تھی۔

قاسم اپنی جھونپڑی سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا حالانکہ اس کا بھی جسم پسینے سے نہایا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اسے احساس ہو رہا تھا جیسے اس پر گرمی کا کوئی اثر نہ ہو۔ وہ سب خاموش ہو کر قاسم کی طرف دیکھنے لگے جس کی نگاہیں ایک ایک کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"کیوں بہت گرمی لگ رہی ہے تم لوگوں کو؟" اس کی آواز گونجی۔

"ہاں سردار۔" ایک ڈاکو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج تو بدن کا تیل نکل رہا ہے۔"

"تو پھر کیا چاہتے ہو تم لوگ۔ فضل داد کی حویلی میں رہا جائے؟" سب خاموش رہے۔

"جواب دو یہی چاہتے ہو نا؟" اس نے غصے سے پوچھا۔ "اسی لیے نا کہ وہاں ٹھنڈی مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ پوری حویلی ٹھنڈی رہتی ہے۔ لعنت ہو تم لوگوں پر جسم پر چربی چڑھالی ہے تم لوگوں نے، چلو کھڑے ہو جاؤ۔" سب اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے روبوٹ ہوں۔

"اب اپنی اپنی بندوقیں ہاتھوں میں اٹھاؤ۔ ہاتھوں کو اوپر کرو اور دو دو میل کی دوڑ لگا کر واپس آؤ۔"

قاسم کے حکم سے انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ذرا سی دیر میں سب کے سب اس تپتی دھوپ میں دوڑ لگانے چل پڑے۔ "نِرے حرام ہو گئے ہیں سارے۔" قاسم دوڑتے ہوئے ڈاکوؤں کی طرف دیکھ کر بڑبڑایا۔

وہ اس علاقے کی دہشت تھا۔ اس کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر حکومت کی طرف سے لاکھوں کا انعام بھی مقرر کیا جا چکا تھا لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں ہو سکی تھی کہ اس کے قریب آنے کی بھی کوشش کرتا۔ اس نے بہت بے جگری اور ہوشیاری کے ساتھ اپنا گروہ ترتیب دیا تھا۔ قاسم کی کہانی بھی دوسرے ڈاکوؤں کی کہانیوں سے مختلف نہیں تھی۔ حالات اور واقعات نے اسے ڈاکو بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے ڈاکو بننے کی پیش گوئی بہت پہلے ایک ملنگ نے کی تھی۔ اس وقت اس کی عمر صرف دس سال تھی جب اس کے باپ کو تشدد کر کے مار دیا گیا تھا۔

اس کا باپ ایک سیدھا سادہ غریب مزدور تھا۔ اس کے ہاتھ میں ..... ہنر تھا، پورے علاقے میں لکڑی پر خوبصورت نقش و نگار ابھارنے والا اس سے بہتر اور کوئی نہیں تھا۔ اگر وہ شہر میں ہوتا تو اس کے اس آرٹ کی قدر کی جاتی لیکن اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ ایک ایسے علاقے میں تھا جہاں وڈیرے نواز کی حکومت تھی۔ اس کا صرف ایک بیٹا تھا۔ اس نے قاسم کو بھی یہ ہنر سکھانا شروع کر دیا۔ بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اولاد صرف ایک تھی اسی لیے اسے قاسم سے بڑی

امیدیں تھیں۔ وہ اکثر کہا کرتا کہ بڑا ہو کر اس کا بیٹا اس کے اس فن کو زندہ رکھے گا۔

ایک دن وڈیرے نواز نے اسے اپنی حویلی میں بلا لیا۔ وہ ایک دیوہیکل قسم کی چڑھی ہوئی مونچھوں والا انسان تھا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تو لکڑیوں کو تراشنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔''

''جی سرکار! اوپر والے نے یہ ہنر دے دیا ہے۔ اسی کی روزی کما رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے اب ہماری حویلی کے سارے دروازوں پر پھول پتیاں بنا دے لیکن بہت خوبصورت ہوں۔''

''اس کی آپ فکر مت کریں سرکار لیکن کچھ سامان کی ضرورت ہوگی۔''

''سامان کی فکر نہیں کر ہمارے آدمی کو بتا دے وہ شہر سے لے آئے گا۔'' سامان بھی آ گیا اور اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس حویلی کی مزدوری سے اسے بہت سی امیدیں تھیں۔ قاسم کے پاس کپڑے نہیں تھے، جوتے نہیں تھے یہ سب آنے والے تھے۔

اسے یہ بہت بڑا کام ملا تھا۔ چالیس دروازے تھے، ہر دروازے پر دو دو دن کی محنت ہو رہی تھی، اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہی محنت ایک ایک ہفتے تک ہوتی رہتی۔

نواز بھی کبھی آ کر معائنہ کر کے واپس چلا جاتا تھا۔

''شاباش۔'' وہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا۔ ''بہت اچھا جا رہا ہے تو۔''

''یہ سب آپ کی مہربانی ہے سرکار۔''

اس نے نواز سے اب تک پیسوں کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ وہ ایک ساتھ اپنی مزدوری لینے کا سوچ رہا تھا۔ بہرحال اس نے بڑی محنت سے صرف دو مہینوں میں اپنا کام مکمل کر لیا اور کام بھی ایسا کہ ہر دروازہ جیسے بولتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''تو نے بہت سلیقے سے کام کیا ہے۔'' نواز نے کہا۔ ''مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔''

''سرکار! اب مجھے اجازت دیں۔''

''ہاں اب تو جا۔'' لیکن وہ وہیں کھڑا رہا۔

''اب کیا بات ہے؟''

''سرکار، وہ میری مزدوری۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''مزدوری.....'' نواز کے تیور بدل گئے۔ ''کیا پاگل ہو گیا ہے؟ ہماری حویلی میں کام کرنے کے پیسے مانگ رہا ہے؟ تیرے لیے تو یہ عزت کی بات ہے کہ ہم نے تجھ سے کام لیا ہے۔''

''معاف کیجیے سرکار۔ میں ایک غریب مزدور ہوں اور یہ میرے خون پسینے کی کمائی ہے۔ رزق حلال ہے میرا..... میں یہ تو نہیں چھوڑ سکتا۔'' بس اتنی سی بات تھی کہ نواز کے اشارے پر اس کے آدمیوں نے اس غریب مزدور کو مارنا شروع کر دیا۔ اس دوران اسے بھی موقع مل گیا۔ اس کے ہاتھ میں جو لکڑی تھی، وہ نواز نے اس کے سر پر مار دی۔ نواز کا سر پھٹ گیا۔ بس اس کے بعد اس بے چارے کی کہانی ختم کر دی گئی اور اس کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔

جنازے میں صرف سات، آٹھ آدمی تھے جو پاس پڑوس کے تھے اور جنازے کے پیچھے ایک دس سالہ بچہ بابا، بابا روتے ہوئے پکارتا چلا جا رہا تھا..... وہ قاسم تھا۔

اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے باپ کے ساتھ کیا ہوا ہے لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ صرف رونا اس کے اختیار میں تھا اور وہ روئے جا رہا تھا۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اب وہ کس کے رحم و کرم پر زندگی گزارے گا؟ کون اس کی پرورش کرے گا؟ آس پاس کے افراد جنازے کو دفن کر کے واپس چلے گئے تھے۔

کسی نے اسے ساتھ لے جانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اکیلا باپ کی قبر پر کھڑا روتا رہا۔ اسی وقت کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''چپ ہو جا۔ کیوں رو رہا ہے؟'' اس نے مڑ کر دیکھا وہ ایک ملنگ تھا۔ وحشت ناک آنکھوں والا۔

''تیرے بابا کو مار دیا ہے نا؟'' ملنگ نے پوچھا۔

''ہاں۔'' قاسم نے اپنی گردن ہلا دی۔

''چھین لینا ایک دن۔'' ملنگ نے کہا۔ ''خاک میں ملا دینا سب کو۔ تو بہت طاقت والا بنے گا۔ میں تیرے آنے والے دن دیکھ رہا ہوں۔ جس طرح وڈیرے نے تیرے باپ کو مارا ہے، اسی طرح ایک دن تو وڈیرے کو مارے گا۔'' پھر وہ ملنگ اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ اس نے قاسم کو علاقے کے ایک ڈاکو شہزاد (عرف شانی) کے سپرد کر دیا۔ شہزاد نے اس کی پرورش کی اور شہزاد کی موت کے بعد قاسم اس چھوٹے سے گروہ کا سردار بن گیا۔

سردار بن جانے کے بعد اس نے اپنے گروہ کو ترقی دی۔ جدید اسلحہ خریدا، گاڑیاں خریدیں، خطرناک قسم کے لوگ شامل کیے۔ اسی طرح اس کا گروہ علاقے کا سب سے خطرناک گروہ بن گیا۔ جب اس نے طاقت حاصل کر لی تو

سب سے پہلے وڈیرے نواز سے اپنے باپ کی موت کا بدلہ لیا۔ اس کے آدمیوں نے نواز کی لاش ایک جیپ کے ساتھ باندھ دی تھی اور وہ جیپ پورے گاؤں میں دوڑتی رہی۔

اس کے بعد قاسم اس علاقے کے لیے خوف اور دہشت کی علامت بن کر رہ گیا۔

اس کے آدمی دوڑ لگا کر واپس آچکے تھے۔ وہ سب بری طرح ہانپ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا جس کا تعلق اس گروہ سے نہیں تھا۔ نام ساون تھا اس کا۔ ادھیڑ عمر، دبلا پتلا اور ہر دم کھانستے رہنے والا آدمی۔ وہ قاسم کے لیے خبریں لاتا تھا۔

''ہاں پہلوان! کیا خبر لے کر آیا ہے؟'' قاسم نے پوچھا۔

''پہلے کچھ ہو جائے تو پھر......'' ساون اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

''تیری بدمعاشی نہیں جاتی۔ بوڑھا ہو گیا ہے پھر بھی۔'' قاسم نے ایک ڈاکو کو اشارہ کیا۔ وہ اندر سے ایک بوتل اٹھا کر لے آیا۔ ساون نے بوتل اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔

''سردار! اس بار کی خبریں بہت خطرناک ہیں۔'' وہ کئی گھونٹ لینے کے بعد بولا۔

''اب بکواس بھی کر کہ کیا خبریں ہیں؟''

''بیلا پور اور راست نگر دونوں ڈوب چکے ہیں سردار۔'' ساون نے بتایا۔

''کیسے ڈوب گئے ابھی تو بارش بھی پوری طرح شروع نہیں ہوئی، گرمی پڑ رہی ہے؟''

''کچھ علاقوں میں بارش شروع ہو چکی ہے سردار اور سنا ہے کہ انڈیا نے بھی بہت سا پانی ہماری طرف دھکیل دیا ہے۔''

''سائیں خیر کرے گا۔ سیلاب ادھر کبھی نہیں آیا۔''

''جو چیز کبھی نہ ہوئی ہو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہو بھی نہیں سکتی۔'' ساون نے کہا۔

''وڈیرے کا حال سنا؟''

''وہ تو تگڑا ہو رہا ہے سردار۔ اگلے الیکشن کی تیاریوں میں لگا ہے۔'' ساون نے بتایا۔

''اس کو ہمارا اسلام بول دینا۔ اب دفع ہو جا یہاں سے۔ کیا یہی خبر سنانے کے لیے آیا تھا؟''

''نہیں سردار! دوسری خبر یہ ہے کہ میری دو بھینسیں مر گئی ہیں، بہت نقصان ہوا ہے میرا۔''

''تو باز نہیں آئے گا۔'' قاسم نے ایک ڈاکو سے کہا۔ ''اس کو کچھ دے کر دفع کر دے۔ ورنہ یہ سب اپنے ساتھ لے جائے گا۔'' ساون ڈھٹائی کے ساتھ ہنستا اور کھانستا رہا۔

☆☆☆

کالو ماچھی کا کہنا تھا کہ اگر چاند بھی جی بھر کر برکھا کو دیکھ لے تو شرما کر رہ جائے۔ برکھا اس کی بیوی تھی۔ اس کے دو بچوں کی ماں لیکن اس کی تازگی اور دلکشی بے مثال تھی۔ وہ جب لہرا کر چلتی تو پھول سے کھلنے لگتے۔

شادی کے بعد کالو نے اس سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ بہت پیار دیا تھا اس کو کیونکہ وہ تھی بھی اسی قابل۔ انتہائی وفادار، خدمت گزار کسی کی بھی میلی نگاہیں اپنے بدن پر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

کالو ماچھی کے پاس دو بھینسیں تھیں۔ ان ہی کے دودھ سے گزارہ ہوتا تھا۔ برکھا پہلے اٹھ کر بھینسوں کی خدمت میں لگ جاتی تھی۔ اس کے پاس اردو کی دو کتابیں تھیں۔ وہ یہ کتابیں اپنے دونوں بچوں کو پڑھایا کرتی اور کالو ماچھی یہ سب دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔

برکھا نے تھوڑا بہت پڑھنا اپنی پڑوسن سے سیکھا تھا۔ جو اس کے گاؤں کے واحد سرکاری اسکول میں پڑھایا کرتی تھی۔ برکھا کو شوق تو بہت تھا لیکن اس کے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ وہ عجیب مزاج کی تھی۔ کسی اور لڑکی کو اتنا ڈھیر سارا حسن ملا ہوتا تو اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے لیکن اس نے کبھی کوئی خواب نہیں دیکھا۔ کبھی کسی ایسی چیز کی آرزو نہیں کی جو کالو ماچھی کے بس سے باہر ہو۔ کالو ماچھی سے شادی کے بعد وہ بہت خوش تھی۔

یہی گھر اس کی جنت تھا۔ اس جنت میں اس کے دونوں بچے تھے اور کالو ماچھی تھا۔ اس سے پیار کرنے والا شوہر اس کے علاوہ اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔ ایک دن اس کی زندگی میں ایک ہلکا سا بھونچال آگیا۔ اس کی پڑوسن شاداں نے اس سے کہا۔ ''برکھا! تو سویرے سویرے اپنی بھینس کو لے کر مت نکلا کر۔''

''کیوں......؟'' برکھا نے تعجب سے پوچھا۔ ''میرا تو کام ہی یہی ہے لیکن تو کیوں منع کر رہی ہے؟''

''اس لیے کہ تجھ پر گندی نگاہیں اٹھتی ہیں۔'' شاداں نے بتایا۔

''ارے اٹھنے دے میں نے کب پروا کی ہے۔''

''میں نے فضل داد کو تجھے گھورتے ہوئے دیکھا ہے۔'' شاداں نے کہا۔

''لیکن وہ تو وڈیرا ہے، ہمارا سائیں ہے۔ ہماری عزت کا محافظ ہے۔''

''اس بھول میں مت رہ پگلی۔ وہ محافظ نہیں لٹیرا

ہے۔'' شاداں نے کہا۔ ''تیرا کالو ماچھی روتا رہ جائے گا اور تیرا پتا بھی نہیں چلے گا کہ تو کہاں غائب ہوگئی۔''

''شاداں تو مجھے کیوں ڈرا رہی ہے؟''

''ڈرا نہیں رہی ہوں برکھا، سچ کہہ رہی ہوں۔'' شاداں کے لہجے میں اداسی تھی۔ ''یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔''

''لیکن تو کیسے جانتی ہے؟''

''اس لیے کہ میں خود اس کی ہوس کی بھینٹ چڑھ چکی ہوں۔'' شاداں نے بتایا۔

''کیا.....؟'' برکھا یہ سن کر حیران رہ گئی۔

''میں تجھ سے سچ کہہ رہی ہوں۔'' شاداں نے کہا۔

''لیکن یہ سب کیسے ہوا، تو کیسے اس کے پاس پہنچ گئی؟''

''میں خود سے نہیں گئی تھی مجھے اٹھا کر لے گئے تھے۔'' شاداں نے بتانا شروع کیا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ''میں اپنے بابا کو روٹیاں دینے کھیت کی طرف جا رہی تھی کیونکہ فصل کی نگرانی کا زمانہ تھا۔ تو، تو جانتی ہے کہ جب فصل پکنے لگتی ہے تو چیل کوے بہت پریشان کرنے لگتے ہیں۔''

''ہاں، ہاں سب جانتی ہوں تو آگے بتا۔''

''اسی لیے بابا کو گھر آنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ روٹی میں خود دے کر آتی تھی تو اس دن بھی روٹی لے کر نکلی اور نہ جانے کہاں سے وہ کم بخت میرے سامنے آ گیا۔''

''کون آ گیا سامنے..... فضل داد؟''

''ہاں وہ اپنے گھوڑے پر جا رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور میرے پاس آ گیا۔ میں اس کے احترام میں کھڑی ہوگئی کیونکہ ہمیں تو یہی بتایا گیا تھا کہ وہ گاؤں کا مالک ہے، عزتوں کا محافظ ہے' یہ سوچ کر میں نے اسے سلام کیا۔ اس نے پوچھا کہ میں کون ہوں۔ میں نے اپنے بابا کا نام بتا دیا۔ وہ گہری نگاہوں سے مجھے گھورتا ہوا واپس چلا گیا۔''

''شاداں تو نے یہ کہانی پہلے تو نہیں بتائی؟''

''کیا کرتی بتا کر، کون اپنی بربادی کی داستان سناتا ہے۔'' شاداں نے کہا۔ ''یہ تو میں تجھے ہوشیار رہنے کے لیے بتا رہی ہوں کہ آج تو اس کی نگاہوں میں آ گئی ہے۔''

''تو اپنی داستان سنا پھر کیا ہوا تیرے ساتھ؟''

''ہونا کیا تھا اس نے بابا کو بلا کر ان سے کہا کہ وہ دو چار مہینوں کے لیے مجھے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔''

''غضب خدا کا..... ایسی بات کر دی؟''

''ہاں اس نے کہا تھا کہ وہ بابا کو دس ہزار دے گا۔ بابا گھر آ کر بہت دیر تک روتا رہا۔ اس کی کچھ نہیں سمجھ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ پھر میں نے اسے غیرت دلائی۔ میں نے اس سے کہا کہ بابا جا کر صاف انکار کر دے۔ اس سے کہہ دے کہ بیٹیاں اس لیے نہیں ہوتیں کہ دس بیس ہزار کے لیے کسی کے حوالے کر دی جائیں۔ بابا میری بات مان کر چلا گیا۔ اس نے وہی کہا جو میں نے کہا تھا۔ اس وقت فضل داد نے کچھ نہیں کہا لیکن تیسری رات مجھے اٹھا لیا گیا۔'' شاداں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ برکھا اس کی کہانی سن کر بے چین ہوگئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ شاداں کے ساتھ کیا گزری ہوگی۔

''اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ تو ہوشیار رہ۔'' شاداں نے کہا۔ ''میں نے اس کی آنکھوں میں تیرے لیے ہوس دیکھ لی ہے۔ میں اس وقت کچھ دور کھڑی تھی جب وہ تجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔''

''شاداں پھر تو ہی بتا میں کیا کروں؟''

''چلی جا گاؤں چھوڑ کر۔'' شاداں نے کہا۔ ''کالو ماچھی کو بول کہ تجھے یہاں سے لے جائے۔ ورنہ سر پر ہاتھ رکھ کر روتا رہے گا۔'' لیکن برکھا کالو ماچھی سے اس شام کچھ نہیں کہہ سکی۔ کالو اس شام بہت خوش تھا۔ وہ برکھا کے لیے ایک نیا جوڑا خرید کر لایا تھا۔

برکھا نے سوچا کہ اگر اس نے ابھی کالو ماچھی کو بتا دیا تو اس کی ساری خوشی خاک ہو جائے گی اسی لیے وہ خاموش رہی۔

☆☆☆

اس کی زمینیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ زمینیں اس کے باپ دادا کے زمانے سے چلی آ رہی تھیں اور کچھ زمینوں پر اس نے اپنی سازشوں سے قبضہ کر رکھا تھا۔ اس کی زمینوں کے جنوب میں ایک بڑا سا بند تھا جو دریا کا پانی کنٹرول کرتا تھا لیکن فضل داد کے لیے اس بند کی صرف اتنی ہی اہمیت تھی کہ وہ ایک شگاف ڈال کر اپنی زمینوں کے لیے اپنی مرضی سے پانی حاصل کر لیا کرتا تھا۔ اسی لیے اس کی زمینیں سارا سال زرخیز رہتی تھیں۔

اس نے اپنے باپ دادا کے زمانے سے طاقت حاصل کی تھی اور اپنی طاقت میں اضافہ ہی کرتا جا رہا تھا۔ اس کے تعلقات جہاں ایک طرف بڑے بڑے سیاست دانوں، وڈیروں اور آفیسروں سے تھے تو دوسری طرف بہت سے ڈاکوؤں کو بھی اس کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کے خلاف کوئی بھی آواز نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس کے علاقے کی

خوبصورت عورتیں اس کے رحم وکرم پر ہوتیں اور اس کا ایک اشارہ انہیں تاراج کر کے رکھ دیتا۔

ایک صبح سیر کرتے ہوئے اس نے ایک بہت حسین عورت دیکھی تھی۔ وہ اپنی سیر ختم کر کے اپنی حویلی واپس آ گیا۔ وہ اس عورت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا لیکن اسے اس کا وقت ہی نہیں مل سکا۔ ایک دوسرے معاملے نے اسے الجھا دیا۔ شہر سے انجینئر آیا ہوا تھا جو اسے بڑی بھیانک خبریں سنا رہا تھا۔

''جناب! اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ اس بار آنے والا سیلاب بہت بھیانک ہوگا۔''

''اگر سیلاب بھیانک ہوگا تو پھر تم لوگ کس مرض کی دوا ہو؟''

''یہ تو قدرتی آفت ہے جناب۔ ہم اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔'' انجینئر نے کہا۔

''کچھ بھی کرو بس ہماری زمینوں کا نقصان نہ ہو۔ میں نے بڑی مشکل اور بہت پیار سے اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کی ہے۔''

''ہماری تو یہی کوشش ہوگی جناب لیکن میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

انجینئر کے جانے کے بعد فضل داد کا ذہن اسی خبر میں الجھا رہا۔ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے وقتی طور پر اس عورت کو اپنے دھیان سے نکال دیا جس کو وہ دیکھ چکا تھا۔ وہ عورت کہاں جانے والی تھی۔ اصل مسئلہ تو سیلاب کی صورت میں سامنے آنے والا تھا۔

یہ تو ایک خبر تھی۔ اس دن اسے ایک اور ایسی خبر ملی جس نے اس کا موڈ خراب کر دیا۔ اس کی خاص ملازمہ ہاتھ باندھے ہوئے اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔

''سائیں وہ مرگئی ہے جی۔''

''ارے کون مرگئی ہے؟''

''وہی..... گلابو۔'' ملازمہ نے بتایا۔''وہ بچے کو جنم دیتے ہوئے مرگئی۔'' فضل داد کو گلابو کی موت کی خبر نے ذرا سی دیر کے لیے پریشان کر دیا۔ گلابو ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کا باپ اسی حویلی میں کام کرتا تھا۔ فضل داد نے جب گلابو کو دیکھا تو وہ اس کے دھیان میں رہنے لگی تھی۔

ایک دن اس نے گلابو کے باپ کو بلا کر کہا۔''میں تیرے کام سے بہت خوش ہوں۔ مجھے تیرے ہی جیسے ایماندار اور محنتی آدمی کی ضرورت ہے۔''

''بڑی مہربانی سرکار۔'' گلابو کے باپ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ لیے۔

''میں نے تیری ڈیوٹی شہر والی کوٹھی میں لگا دی ہے۔'' فضل داد نے کہا۔''تجھے وہاں اچھے پیسے ملیں گے۔'' فضل داد کی ایک کوٹھی شہر میں بھی تھی۔

''لیکن سرکار یہاں میری ایک جوان بیٹی بھی ہے۔ میں چلا گیا تو اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟''

''تو اس کی فکر مت کر۔ وہ حویلی میں رہے گی۔'' فضل داد نے کہا۔''وہ مالکن کی خدمت کرے گی۔ اس کو الگ سے پیسے ملتے رہیں گے۔''

''سرکار کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ میں گلابو کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں؟'' گلابو کے باپ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''کیا مطلب ہے تیرا؟'' فضل داد پھنکارنے لگا۔ ''کیا تجھے حویلی والوں پر بھروسا نہیں ہے؟''

''نہیں سرکار، ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ حویلی والے تو ہمارے مائی باپ ہیں۔'' گلابو کے باپ نے کہا۔

''تو بس بے فکر ہو کر چلا جا اور یہ لے یہ کچھ پیسے رکھ لے۔'' فضل داد نے کچھ نوٹ اس کے حوالے کر دیے۔

''میں نے شہر والوں کو بتا دیا ہے وہ تجھے لینے کے لیے لاری اڈے آ جائیں گے۔'' اب تو انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ اس بے چارے کو شہر جانا پڑا اور گلابو کو حویلی میں پہنچا دیا گیا۔ وہ چونکہ بہت منہ زور اور ضدی ثابت ہو رہی تھی اس لیے اسے حویلی کے تہ خانے میں رکھنا پڑا اور اب فضل داد کی خاص ملازمہ نے اس کی موت کی خبر سنا دی تھی۔ وہ ایک بچے کو جنم دیتے ہوئے مرگئی تھی۔

''تو نے ٹھیک کارروائی نہیں کی ہوگی۔'' فضل داد نے غصے سے کہا۔

''نہیں سرکار، میں نے تو پوری کوشش کی تھی۔'' ملازمہ نے کہا۔''لیکن کیس بگڑ گیا تھا۔''

''اچھا اچھا جا یہاں سے اور ہاں بٹھل کو بھیج دینا۔ وہ رات کے وقت اس کی لاش کو ٹھکانے لگا دے گا۔'' ملازمہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن خاموش رہی۔

''کیا بات ہے کچھ کہنا چاہتی ہے؟''

''سرکار اس کا باپ واپس آ کر پوچھے گا تو؟''

''عقل مند ہوگئی ہے۔'' فضل داد مسکرا دیا۔''وہ تو اسی وقت پوچھے گا جب اس کی واپسی ہوگی۔ شہر میں گاڑیوں کے نیچے آ کر لوگ مرتے ہی رہتے ہیں۔'' ملازمہ بے چاری کانپ کر رہ گئی۔

☆☆☆

عبید نے پاکستان آکر اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں اس کے ڈیڈ نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔

''دیکھو بیٹا ہمارا بہت بڑا بزنس سیٹ اپ ہے تم کہاں ان چکروں میں پڑ رہے ہو؟ یہ سب وقت کی بربادی ہے۔''

''نہیں ڈیڈ، وقت کی بربادی نہیں ہے۔ میں ایک وسیع پیمانے پر این جی او چلانا چاہتا ہوں۔ بالکل سائنسی انداز سے۔ سوشل ورک پوری دنیا میں ایک بہت بڑا سبجیکٹ ہے۔''

''تو کیا ہمارے ملک میں اس کی گنجائش ہے؟''

''نہیں تو گنجائش ہے ڈیڈ کیونکہ لوگوں کو ابھی اپنے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ وہ یہ جانتے ہی نہیں ہیں کہ اپنا حق کس طرح لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے ایک بات اور دیکھی ہے۔''

''وہ کیا ہے؟''

''اس قوم میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق پاکستان میں سب سے زیادہ خیرات دی جاتی ہے لیکن چونکہ کوئی اصول اور کوئی سسٹم نہیں ہے اس لیے سب برباد ہو جاتا ہے۔''

''اور تم اس قوم کو یہ سب سکھاؤ گے؟''

''کوشش کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے ڈیڈ۔'' عبید نے کہا۔ ''آپ نے زلزلے کے دوران میں دیکھا ہو گا۔ لوگوں میں مدد کرنے کا جذبہ تو ہے لیکن سائنٹیفک اپروچ نہیں ہے۔''

''بیٹے میں بھی تمہارے راستے میں رکاوٹ نہیں بنا ہوں۔''

''اس کا مجھے احساس ہے ڈیڈ اور یقین بھی ہے کہ اس پروجیکٹ میں بھی آپ میرا ساتھ دیں گے۔''

''کیا تمہارے پاس ٹیم ہے؟''

''جی ڈیڈ، کچھ سرپھرے نوجوان مل گئے ہیں جو پوری طرح میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔'' لیکن اس وقت عبید کو اندازہ نہیں تھا کہ یہاں فلاحی کام کرنے میں اتنی دشواریاں ہو سکتی ہیں۔ سب سے پہلا مرحلہ این جی او کی رجسٹریشن کا تھا۔ اس کے لیے لمبی چوڑی شرائط سامنے رکھی گئی تھیں۔ این او سی، اتنے آدمیوں کے دستخط۔ ان کے بیک گراؤنڈ اور جانے کیا کیا۔

اس کا ساتھ دینے والوں میں رمیز اور مونا تھے۔ یہ دونوں بھی اسی کی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جوش و جذبے سے بھرے ہوئے تھے۔ مونا کے ساتھ کام کرتے کرتے عبید کو کبھی کبھی مارتھا بھی یاد آجاتی۔ وہ اس وقت جانے کہاں ہو گی اور کیا کر رہی ہو گی؟ پھر وہ اس کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔

ایک خوبصورت سا دفتر، اسٹاف، رمیز اور مونا کے ہمراہ...... بہت کچھ کر گزرنے کے جذبے کے ساتھ بالآخر کئی ہفتوں کی کوششوں کے بعد این جی او رجسٹر ہو گئی۔ اس کے بعد اصل کام شروع ہونے والا تھا۔

ایک دن کسی نے اسے فون کیا۔ فون کرنے والے نے اپنا نام کرنل سنگھ بتایا تھا۔ وہ تھرپارکر رہنے والا تھا۔ اس نے کسی طرح عبید کی این جی او کا فون نمبر حاصل کر لیا تھا۔

''سائیں میرا نام کرنل سنگھ ہے۔'' اس نے بتایا۔

''دو چار دنوں کے لیے کراچی آیا ہوں کیا میں آپ کے دفتر آکر آپ سے مل سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں ہمارا دفتر سب کے لیے کھلا ہوا ہے۔ آپ آسکتے ہیں تو ابھی آجائیں۔'' کرنل سنگھ آدھ گھنٹے کے اندر اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ راجپوت تھا۔ چڑھی ہوئی مونچھیں اور مضبوط بدن۔ اس کا لباس بھی اس کی ثقافت کے لحاظ سے کرتہ شلوار اور لال رنگ کی ایک بڑی سی پگڑی تھی۔

عبید نے اس کے لیے چائے منگوائی۔ چائے پینے کے دوران میں خاموشی رہی پھر کرنل سنگھ نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

''سائیں، میں اپنے علاقے کا ایک زمیندار ہوں۔ بہت زمینیں ہیں میرے پاس لیکن میری پریشانی روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے۔''

''کیسی پریشانی؟''

''سائیں ہمارے علاقے کا سب سے بڑا مسئلہ پانی ہے۔ ہمارے پاس پینے تک کو پانی نہیں ہے۔ ہم کھیتوں کو پانی کہاں سے دیں گے؟ سائیں میں نے اپنے خرچے پر اپنے علاقے میں کئی کنوئیں کھدوائے ہیں لیکن یہ کام اکیلے آدمی کے بس کا نہیں ہے۔''

''یہ تو ہے...... یہ تو بہت بڑا پروجیکٹ ہے کرنل سنگھ جی۔''

''میں جب اپنے آدمیوں کو میلوں میلوں تک پانی کے لیے بھٹکتا ہوا دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان بے چاروں کے لیے کیا کروں؟''

''آپ کا یہ جذبہ تعریف کے قابل ہے کہ آپ کو اپنے آدمیوں کا اتنا خیال ہے۔'' مونا نے کہا۔

''اس سے کیا ہوتا ہے بی بی۔ اتنے پیاسوں کے لیے

تو ہم سب کو کوشش کرنی ہوگی۔" کرمل سنگھ گہری سانس لے کر بولا۔ "خود سوچیں جب ہمارے پاس زندگی کی سب سے بنیادی ضرورت ہی نہیں ہوگی تو ہم کیا کریں گے۔ آپ ہماری مدد کریں۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ میں دینے کو تیار ہوں لیکن کوئی ہمارا ساتھ دینے والا تو ہو۔"

"کرمل سنگھ جی! ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ یہاں کے زمیندار اور وڈیرے تو سب کچھ چھین لینے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک آپ ہیں جو سب کچھ لٹانے کو تیار ہیں، آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ میرے لوگ ہی میری دولت اور میری طاقت ہیں۔ بھائی صاحب اگر یہی نہیں رہے تو ہم وڈیروں اور زمینداروں کے پاس کیا رہ جائے گا۔"

"واہ کرمل سنگھ جی۔ آپ نے بہت آسانی سے ایک اہم بات ہمیں سمجھا دی ہے۔" عبید نے اس کی تعریف کی۔ "آپ ہماری طرف سے مطمئن ہو جائیں۔ ہم سے جو ہوگا وہ ہم کرنے کو تیار ہیں۔"

"تو پھر آپ لوگ ہمارے علاقے میں آ رہے ہیں؟"

"ضرور آئیں گے۔" موٹا نے کہا۔ "اگر ہماری ذات سے آپ کے علاقے کے ایک حصے میں پانی آ گیا تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔" کرمل سنگھ کے جانے کے بعد تینوں ایک جگہ بیٹھ گئے۔ مسئلہ پانی کا تھا۔ اس ملک میں کچھ ایسے علاقے ہیں جہاں پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں ہے۔ اسی وقت عبید کے موبائل پر کسی نے اسے اطلاع دی۔

"جناب عالی! میں بیلا پور سے بول رہا ہوں۔ بڑی مشکلوں سے آپ سے رابطہ ہو سکا ہے۔ ہمارا پورا شہر سیلاب میں ڈوب گیا ہے جناب میں خود ایک مکان کی چھت سے آپ کو فون کر رہا ہوں۔"

☆☆☆

یہ بہت بھیانک رات تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ بارش پوری دنیا کو بہا کر لے جائے گی۔ بارش ہی نہیں بلکہ آنے والا سیلاب بھی بہت بھیانک شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ خبریں آ رہی تھیں کہ دریا بہت غضب ناک ہو کر بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ جانے اس نے ایسے کتنے گاؤں ڈبو دیے ہیں۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہو گئے ہیں۔ ہزاروں مکانات گر چکے ہیں۔

چھوٹا موٹا سیلاب تو ہر سال آتا ہے لیکن کالو ماچھی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس بار کا سیلاب اتنا بھیانک ہوگا۔

ویسے تو کئی دنوں سے بتایا جا رہا تھا کہ بہت بڑا سیلاب آنے والا ہے۔ لوگ اپنے گاؤں خالی کر دیں۔ ورنہ پانی سب کچھ بہا کر لے جائے گا۔ دریا بپھر گیا ہے۔ وہ راستے میں آنے والی ہر چیز کو فنا کرتا ہوا چلا آ رہا ہے لیکن کالو ماچھی نے ان افواہوں پر کان نہیں دھرا تھا۔ ایسی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے پاس سوائے دو بھینسوں کے اور تھا ہی کیا۔

اس کا گزارہ ان ہی دونوں بھینسوں پر تھا۔ ان کے دودھ کو بیچ کر وہ آٹا خریدتا، سبزیاں خریدتا اور اپنے بیوی بچوں کے لیے کپڑے خریدتا۔ یہ بھینسیں اس کی... ان داتا تھیں۔ اس کے گھر کا چولہا ان ہی بھینسوں کی بدولت چلتا تھا۔

کالو ماچھی کے دو بچے تھے۔ ایک بارہ برس کا اور دوسرا دس برس کا۔ اس کی بیوی برکھا بہت خوبصورت تھی۔ اس کے خدوخال تیکھے تھے اور بال بہت لمبے تھے۔ اس کا قد بہت متناسب تھا اور اس کی چال ہیجان خیز تھی۔

نہ جانے کتنے لوگوں نے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کالو ماچھی کے نصیب میں آئی تھی۔ آس پاس کے کئی زمیندار، جاگیردار اور پٹواریوں نے اسے اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کی تھی لیکن اسے کالو ماچھی سے اچھا کوئی نہیں لگتا تھا کیونکہ اس کے ساتھ اس کا جنم جنم کا ناتا تھا حالانکہ برکھا کے ماں باپ بھی اسی گاؤں کے سیدھے سادے لوگ تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی بیٹی کا نام برکھا رکھ دیا۔ جس کے گھنے بال برکھا کی ہی یاد دلاتے تھے۔

اس رات وہ سب اپنی جھونپڑی میں بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ کالو ماچھی کو معلوم تھا کہ سیلاب آ رہا ہے لیکن وہ ابھی اس کے گاؤں سے بہت دور تھا اور شہر سے آئے ہوئے کچھ سیانوں نے یہ بتایا تھا کہ سیلاب کا رخ اس طرف نہیں ہوگا۔ اس لیے وہ لوگ مطمئن تھے۔

بارش اس رات بھی ہو رہی تھی لیکن اس کے تیور زیادہ خطرناک نہیں تھے۔ ایسی بارش کے موقع پر جب کبھی بجلی چمکتی اور بادل گرجتے تو برکھا ایک چیخ کے ساتھ ڈر کر کالو کے سینے سے چمٹ جاتی۔ اس وقت کالو کو اس پر پیار بھی آتا اور ہنسی بھی۔

"برکھا! تو دو دو بچوں کی ماں ہو گئی پھر بھی بچوں کی طرح ڈرتی ہے۔"

"تو کیا کروں، بادلوں سے ڈر بھی تو لگتا ہے۔"

بہت چھوٹی سی دنیا تھی ان کی۔ اس دنیا میں ان کے

سے ڈھیر ساری خوشیاں تھیں ایک دوسرے کی صورت میں، بچوں کی صورت میں، بھینسوں کی صورت میں اور جھونپڑی کے باہر پھیلی ہوئی ہریالی اور دور سے نظر آنے والے دریا کی صورت میں۔ یہ سب ان کے لیے بہت تھا۔ انہیں اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔

کالو ماچھی شاید کوئی خواب دیکھ رہا تھا کچھ عجیب سا خواب۔ جیسے وہ دریا میں ڈوب رہا ہو اور برکھا بھی اس کے قریب ہی کہیں ہے۔ وہ بھی اسے پکار رہی ہے لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ اس کا احساس فوراً ہی اسے ہوگیا۔ جب اسے ایسا لگا جیسے اس کی چارپائی ہلکورے لے رہی ہے پھر اس نے برکھا کی چیخ سنی، تیز چیخ۔ اس کے ساتھ ہی بچوں کے رونے اور بابا، بابا پکارنے کی آوازیں۔ ایک لمحے کے لیے بجلی چمکی اور سب کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا۔

سیلاب اس کے گاؤں میں آ گیا تھا۔ اس لیے جھونپڑی، اس کے بچے، اس کی بھینسیں اور اس کی برکھا ڈوب رہی تھی۔

اس نے اندھیرے میں ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کے ہاتھ نے کسی کو چھوا، یہ برکھا تھی جو چیخ رہی تھی۔

''کالو بچوں کو بچا۔'' کالو کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ پانی اب ان کی گردن تک پہنچ رہا تھا۔ کہاں تھے بچے؟ اندھیرے میں اسے بچوں کے رونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اس کے پیروں کے پاس ہی غوطے کھا رہے تھے۔

کالو نے ایک جھٹکے سے دونوں کو اٹھا کر اپنے کاندھوں پر بٹھالیا۔

''برکھا تو میری کمر پکڑ لے۔'' وہ چیخ کر بولا۔ ''ہم کو یہاں سے نکلنا ہے۔''

''اور ہمارے جانور...... ان کا کیا ہوگا؟''

''اس وقت جانور کو بھول جا جلدی کر۔ ورنہ سب ڈوب جائیں گے۔'' ایک بھیانک اندھیرا اور پانی کا ایسا زبردست ریلا جو اس کے قدموں کو کمزور تنکے کی طرح ادھر ادھر کر رہا تھا۔ برکھا نے اس کی کمر تھام رکھی تھی۔ اس کے دونوں بچے اس کے کاندھوں پر سوار تھے اور چاروں طرف موت رقص کر رہی تھی۔

جھونپڑی نہیں رہی تھی۔ اس لیے چاروں طرف ایک ہی جیسا ہو گیا تھا۔

پانی شاید آسمان تک بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف سے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ ڈوب رہے تھے۔ ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ رو رہے تھے لیکن اس وقت سوائے خدا کے ان کی مدد کرنے والا اور کوئی نہیں تھا اور شاید خدا بھی ان سے ناراض تھا۔

کالو ماچھی کے مویشی بھی شاید اس سیلاب میں کہیں بہہ نکلے۔ ذرا سی دیر کے لیے بجلی چمکی اور پانی میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے بہت سے لوگ دکھائی دے گئے۔ یہ سب اس کے اپنے لوگ تھے۔ اپنے گاؤں کے۔

اچانک پانی کے ایک تیز ریلے نے اس کے پاؤں اکھاڑ دیے۔ اب تک وہ کسی نہ کسی طرح پیروں کو جماتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا لیکن یہ ریلا اس کو اپنے ساتھ بہا لے گیا۔

اس نے پانی میں گرتے ہوئے دونوں بچوں کی آوازیں سنیں۔ اس کے کندھے سے بچے گر گئے تھے۔ اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر دونوں کو تھام لیا لیکن اس دوران برکھا کا ہاتھ اس کی کمر سے چھوٹ گیا۔ اس نے گھبرا کر آواز لگائی۔

''برکھا...... برکھا۔'' شاید برکھا کی آواز اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ یا وہ برکھا کی آواز نہیں سن پا رہا تھا۔ ایک تو اندھیرا تھا۔ گھور اندھیرا۔ اوپر سے سیلاب۔ اس کے دونوں بچے ایک بار پھر اس کے کندھوں پر تھے لیکن برکھا کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ جانے پانی اسے کہاں لے گیا تھا۔

اس وقت اس کے پاس اتنی فرصت بھی نہیں تھی کہ وہ برکھا کی ایسے جدائی پر واویلا کرتا۔ اس وقت اسے سب کی جان بچانی تھی بلکہ اپنی جان سے زیادہ بچوں کی فکر تھی جو اس کی برکھا کی نشانی تھے۔ بچے اماں، اماں پکار رہے تھے لیکن اماں کا کوئی پتا نہیں تھا کالو ماچھی اسی طرح آگے بڑھتا چلا گیا۔

☆☆☆

فضل داد کی حویلی بہت شاندار تھی۔ اس کی زمینیں بھی بہت شاندار تھیں سونا اگلنے والی۔ بہت کچھ تھا اس کے پاس۔ سیکڑوں ایکڑ زرعی زمین، شہر میں کاروبار، قیمتی گاڑیاں اور اقتدار۔ کئی بار اپنے حلقے سے اسمبلی میں بھی منتخب ہو چکا تھا۔ حکومت میں اس کا بہت اثر و رسوخ تھا۔ لوگ اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔

اس کے دو بیٹے تھے۔ دونوں بیرون ملک تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ بیوی صرف ایک تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی کے میکے والے بھی طاقت ور لوگ تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنی زندگی میں کبھی عورت کی کمی محسوس نہیں کی۔

آس پاس کے گاؤں کی بہت سی عورتیں اور لڑکیاں

اس کے دائرۂ اختیار میں تھیں۔ وہ جب چاہتا اس کے کارندے کسی ایک کو لے آتے۔ اس کے علاوہ شہر میں اس کی اپنی کوٹھی تھی۔ وہاں بھی عورتوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس لیے اس نے دوسری شادی کی حماقت نہیں کی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ بہت پریشان تھا۔ یہ پریشانی سیلاب کی تھی۔ سنا گیا تھا کہ سیلاب بہت تیزی سے اس کے علاقے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اسے ٹی وی سے بھی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ شہر سے آنے والے ایک انجینئر نے اسے بتا دیا تھا۔

''سر، سیلاب کی صورت میں بند کو توڑنا پڑے گا۔''

''وہ کیوں؟'' فضل داد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''سر، اگر بند نہیں توڑا گیا تو آس پاس کے سارے دیہات ڈوب جائیں گے۔''

''کیا پاگل ہوگئے ہو؟'' فضل داد غرانے لگا۔ ''معلوم ہے اگر بند ٹوٹ گیا تو ہماری زمینوں کا کیا حشر ہوگا۔ سب کی سب تباہ ہو جائیں گی۔''

''جی سر لیکن بند نہ ٹوٹنے کی صورت میں لوگوں کی کتنی جانیں ضائع ہو جائیں گی۔''

''بابا، تمہاری تعلیم کچی معلوم ہوتی ہے۔ تم نے ابھی کچھ نہیں سیکھا۔ ارے بھائی، ان لوگوں کو روزگار کون دیتا ہے، ہماری زمینیں دیتی ہیں۔ اگر زمینیں نہ رہیں تو یہ لوگ تو ویسے ہی مر جائیں گے۔ تین چار سو کے مرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بس تم اپنی زبان بند رکھو۔ ہر ایک کو یہ مشورہ دینے مت بیٹھ جانا۔''

''ٹھیک ہے سرکار، میں اب کچھ نہیں بولوں گا۔'' لیکن وہ تو پانی کا سیلاب تھا جو آنے والا تھا۔

ایک سیلاب تو فضل داد کی زندگی میں آچکا تھا۔ یہ اس کے جذبات کا سیلاب تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی عملداری میں ایک ایسی عورت بھی رہتی ہے جو ہزاروں پر بھاری ہے۔ وہ اس عورت کو دیکھ کر بے تاب ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے خاص کرگے مستا سے پوچھا۔

''مستا کون ہے یہ عورت جو سامنے کنوئیں کے پاس کھڑی ہے، پیلے رنگ کا دوپٹا پہنے ہوئے؟''

''مائی باپ یہ کالو ماچھی کی عورت ہے۔''

''اس کی عورت اتنی زبردست ہے۔ اس کے بارے میں پہلے کیوں نہیں بتایا اور میں نے کیوں نہیں دیکھا اس کو؟''

''مائی باپ کالو ماچھی اس کو سات پردوں میں چھپا کر رکھتا ہے۔ جانے آج کیسے نکل آئی۔''

''مستا اس کو میری قسمت باہر نکال کر لائی ہے۔ اب تو بتا تو کیا کر سکتا ہے؟''

''جو آپ کا حکم مائی باپ۔ آج ہی رات کو یہ اٹھ جائے گی۔''

''شاباش، خوش کر دوں گا تجھے۔'' لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ اسی رات کو بستی میں سیلاب امڈ آیا جس کے بارے میں کئی دنوں سے بتایا جا رہا تھا۔ مستا اپنے آدمیوں کو لے کر کالو ماچھی کی طرف گیا تو تھا لیکن اسے وہاں سے خالی ہاتھ آنا پڑا۔ وہ فضل داد کے سامنے کھڑا اپنی صفائی بیان کر رہا تھا۔

''مائی باپ، سارا بندوبست ہو گیا تھا۔ میں اپنے آدمیوں کو لے کر پہنچ گیا تھا کہ اچانک پانی نے گھیر لیا اور وہ بھی ایسا پانی کہ ہمارا ایک آدمی بہتا ہوا جانے کہاں چلا گیا پھر کالو ماچھی اپنی بیوی بچوں کو لے کر باہر نکلا۔ اور اس افراتفری میں وہ بھی ڈوب گئی سرکار۔''

''کیا کہا وہ عورت بھی ڈوب گئی؟''

''ہاں سرکار۔ وہاں تو قیامت تھی قیامت۔ ڈنگر بہے جا رہے تھے، انسان ڈوب رہے تھے، مکان دھڑا دھڑ گر رہے تھے۔ ہماری قسمت تھی کہ ہم زندہ نکل کر آگئے۔ خود میرا باپ بھی ڈوب کر مر گیا ہے۔ میں تو آپ کو یہی خبر دینے آیا تھا۔''

''اچھا اچھا جاؤ یہاں سے۔'' برکھا کے ڈوب جانے کی خبر نے فضل داد کا موڈ خراب کر دیا۔ ''اور ہاں جاتے جاتے اس کم بخت انجینئر کو میرے پاس بھیج دینا۔''

مستا نے کچھ دیر بعد آکر یہ خبر سنائی کہ انجینئر تو جانے کب کا شہر جا چکا ہے۔ یہ سن کر فضل داد اور پریشان ہو گیا۔

''اب وہ کم بخت شہر جا کر ڈھنڈورا پیٹے گا کہ میں نے بند نہیں توڑنے دیا تھا۔ اسی لیے ہزاروں لوگ ڈوب گئے۔''

''یہ تو اوپر والے کا عذاب ہے مائی باپ، اس میں آپ کا کیا قصور۔ اب یہ دیکھیں کہ خود میرا باپ بھی ڈوب گیا ہے۔''

''اب بار بار اپنے باپ کی خبر مت سنا۔'' فضل داد جلدی سے بولا۔ ''اور دفع ہو جا یہاں سے۔'' مستا دفع ہو گیا۔ ویسے فضل داد کو اس بات پر خوشی تھی کہ اس کی زمینیں بچ گئی تھیں اور سیلاب نے آس پاس کے دیہاتوں کا رخ کر لیا تھا۔

☆☆☆

قاسم کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ سیلاب کا رخ اس کے علاقے کی طرف ہو جائے گا۔ وہ ایک ڈاکو تھا۔ اس کے گروہ میں پندرہ بیس خطرناک قسم کے لوگ تھے اور سب سے زیادہ خطرناک خود قاسم ہی تھا۔ دور دور تک دہشت تھی اس

کی۔ آس پاس کے دیہات اس کا نام سن کر کانپ جاتے۔

وہ پہلے ایسا نہیں تھا لیکن ہزاروں کہانیوں کی طرح اس کے ساتھ بھی ناانصافیاں ہوئیں۔ اس نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن اس کی فریاد نہیں سنی گئی پھر اس کے خلاف فیصلہ دے دیا گیا۔

فیصلہ سن کر اس نے دو قتل کیے۔ پہلا قتل اسی آدمی کا تھا جس نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی اور دوسرا قتل اس جج کا تھا جس نے اس کے خلاف فیصلہ دیا تھا کیونکہ وہ قاسم سے زیادتی کرنے والے شخص کا بہنوئی تھا۔

قاسم نے اس کے بعد پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس نے اپنا ایک گروہ بنا لیا۔ اب پندرہ، بیس آدمی اس گروہ میں تھے۔

ان کے پاس جدید ترین ہتھیار تھے۔ جنگل میں ٹھکانا تھا۔ آس پاس کے طاقت ور لوگوں سے دوستی تھی اور پولیس کے کچھ لوگوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کے گروہ پر ابھی تک کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکا تھا۔ قاسم اور اس کے گروہ کے لیے اب تک سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔

سیلاب کی خبریں ان تک بھی پہنچ رہی تھیں اور اس رات سیلاب اچانک ان پر کسی بلا کی طرح مسلط ہوگیا۔

معمول کے مطابق قاسم نے دو آدمیوں کو درختوں پر نگرانی کی ڈیوٹی پر لگا دیا۔ ہر رات اور دن میں ایسا ہی انتظام تھا۔ اس کے دو آدمی دوربینیں لے کر سب سے بلند درخت پر چڑھ جاتے اور پولیس کی سرگرمیوں سے خبردار کیا کرتے یا پھر اگر کوئی اور غیر معمولی نقل و حرکت دکھائی دیتی تو وہ اس سے بھی آگاہ کرتے تھے لیکن اس رات ڈیوٹی دینے والوں کو یہ اندازہ ہی نہیں ہو پایا تھا کہ سب سے خطرناک اور طاقت ور دشمن یوں اچانک انہیں چاروں طرف سے گھیر لے گا۔

انہیں اندازہ اس وقت ہوا جب انہوں نے درختوں کے پاس لہروں کی آوازیں سنیں۔ یہ لہریں درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر پھنکار رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے گھبرا کر ٹارچ روشن کی اور اسے ایسا لگا جیسے اس کا درخت اچانک کسی دریا کے بیچ میں آ گیا ہو۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔

اس نے بوکھلا کر زور زور سے سیٹیاں بجانی شروع کر دیں۔ یہ خطرے کا اعلان تھا لیکن اس کے اعلان سے پہلے ہی سیلاب ان سب کو گھیر چکا تھا۔ وہ کسی خوفناک اور خونخوار اژدھے کی طرح پھنکاریں لیتا اور سرسراتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ قاسم کو بھی اس وقت ہوش آیا جب اس نے خود کو مکمل طور پر پانی میں ڈوبا ہوا محسوس کیا۔ اس کے سارے ساتھی بھی اس وقت چھپ چھپ کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔

بپھرا ہوا پانی انہیں پوری قوت سے اپنے ساتھ بہائے لے جا رہا تھا۔ قاسم نے چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو سنبھلنے کی ہدایت کی۔ ان سے کہا کہ فوری طور پر قریبی درختوں پر چڑھ جائیں۔

قاسم اور اس کے آدمیوں نے درختوں پر پناہ لے لی۔ گھور اندھیرے میں کچھ بھی پتا نہیں چل رہا تھا۔ انہیں اپنے نقصان کا اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ قاسم کو اپنے آدمیوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس بھیانک سیلاب نے اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔

بپھرا ہوا سیلاب اس بھیانک اندھیرے میں انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے کھڑا تھا اور اسی عالم میں صبح ہوگئی۔ صبح ایک ناقابلِ یقین صبح۔ وہ جیسے کسی سمندر میں تھے۔ جہاں تک نگاہ جا رہی تھی، صرف پانی ہی پانی تھا۔ قاسم نے اپنے آدمیوں کو پکارنا شروع کر دیا۔ آس پاس کے درختوں سے بھی جواب آنے لگے۔

درختوں سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ اس پہاڑی پر پناہ لی جا سکتی تھی۔ قاسم نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ درختوں سے اتر اتر کر اس پہاڑی کی طرف بڑھنا شروع کر دیں۔

پانی ان کے کاندھوں تک آ رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح قاسم اس پہاڑی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے کچھ ساتھی بھی تھے۔ اس کے گروہ میں تیس آدمی تھے۔ پانچ آدمیوں کا پتا نہیں چل رہا تھا۔

''سردار! ایسا لگتا ہے کہ وہ پانچوں سیلاب میں بہہ گئے ہیں۔'' اس کے ایک ساتھی نے کہا۔

قاسم نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ سیلاب تو بہت ظالم ہے۔ دور دور تک تباہی ہوگئی ہوگی اس سے۔''

''سردار، ہمارے لیے سیلاب میں بھی ایک اچھی بات ہوئی ہے۔'' ایک ڈاکو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا ہے؟''

''سردار! ایک زبردست مال ہاتھ لگا ہے۔'' ڈاکو نے بتایا۔ ''بہتا ہوا اس طرف آ نکلا تھا۔''

''صاف صاف بتا کیا بکواس کر رہا ہے۔''

''سردار! ایک بہت زبردست عورت ہے۔ بہت

زبردست! میں نے سویرے سویرے اسے بہتے ہوئے پانی سے نکالا ہے۔ اس وقت تو اسے ہوش نہیں تھا لیکن اب ہوش میں آ گئی ہے۔''

''کہاں ہے؟'' قاسم نے چونک کر پوچھا۔

''وہ اس طرف ہے سردار۔'' ڈاکو نے پتھروں کے ایک اونچے سے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کے پیچھے بیٹھی ہوئی ہے۔''

''جا اسے لے کر آ۔ میں بھی تو دیکھوں کون ہے؟''

ڈاکو چند لمحوں بعد اس عورت کو قاسم کے سامنے لے آیا۔ اسے دیکھ کر قاسم بھی ترنگ میں آ گیا۔ کھلے ہوئے سیاہ بال جو کمر تک آ رہے تھے۔ بدن سے چپکا ہوا لباس اور دہشت زدہ آنکھیں۔

''کون ہے تو، کیا نام ہے تیرا؟'' قاسم نے اپنی آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔ عورت جواب دینے کے بجائے رونے لگی۔

''ارے روتی کیوں ہے، نام بتا۔ کہاں سے آئی ہے؟''

''برکھا...... برکھا نام ہے۔'' برکھا نے بتایا۔

''واہ۔'' قاسم مسکرا دیا۔ ''تو ہے بھی برکھا جیسی۔ کہاں رہتی تھی؟''

''دین پور میں۔'' برکھا نے بتایا۔ ''اپنے خاوند کے ساتھ۔ میرے دو بچے بھی ہیں۔ رات کو اچانک سیلاب آیا اور وہ......''

اس نے پھر رونا شروع کر دیا تھا۔

''اچھا اچھا رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا نام ہے تیرے خاوند کا؟''

''کالو ماچھی۔'' برکھا نے بتایا۔ ''میں اس کی کمر تھامے اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی پھر کوئی ہوش نہیں رہا۔ جانے وہ کہاں ہوگا...... میرے بچے کہاں ہوں گے؟''

''چل۔ ہم انہیں ڈھونڈ دیں گے۔ یہ بتا کچھ کھایا بھی ہے؟''

''نہیں...... کہاں سے کھاتی؟''

''کچھ ہے؟'' قاسم نے ایک ساتھی کی طرف دیکھا۔

''بہت کچھ ہے سردار۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ ہم کھانے پینے کی چیزیں سیلاب کے ڈر سے اونچی جگہ پر رکھتے ہیں۔ اس لیے ایک ہفتے کا راشن ہے ہمارے پاس۔''

''جا۔ اس کو کچھ کھلا پلا دے۔''

''نہیں، مجھے اپنے بچوں کے پاس جانا ہے۔'' برکھا مچلنے لگی۔

''کیا پاگل ہو گئی ہے...... اس سیلاب میں کہاں جائے گی؟'' قاسم نے کہا۔ ''تھوڑا سا زور کم ہونے دے پھر چلی جانا۔''

☆☆☆

عبید کی این جی او کو قائم ہوئے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ سیلاب کی خبریں آنے لگیں۔

''ڈیڈ۔'' اس نے اپنے باپ سے کہا۔ ''سیلاب کا چکر شروع ہو گیا ہے۔ میں سیلاب زدہ علاقوں کا سروے کرنے جا رہا ہوں۔''

''ارے یہ سب عام قسم کے سیلاب ہیں۔ ہر سال آتے ہیں۔''

''نو ڈیڈ۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ کوئی عام سیلاب نہیں ہے۔ بہت تباہی پھیلانے والا ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو پھر تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟''

''ڈیڈ! میں سروے کرنے جا رہا ہوں۔ یہ دیکھنے جا رہا ہوں کہ وہاں کے لوگوں کو کس قسم کی مدد کی ضرورت ہو سکتی ہے اور میں اکیلا نہیں جا رہا۔ میرے ساتھ مونا اور رمیز بھی ہیں۔'' رمیز اور مونا دونوں کا تعلق اس کی این جی او سے تھا۔ وہ دونوں بھی کھاتے پیتے گھرانوں سے تھے لیکن عبید ہی کی طرح ان کے مزاج بھی عوامی تھے۔

''ٹھیک ہے جاؤ۔'' اس کے باپ حمید فیض نے اجازت دے دی۔ ''اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو فوراً بتا دینا۔''

''او کے ڈیڈ۔ یہ بھی کہنے کی بات ہے۔'' پھر وہ تینوں وہاں سے ایک لینڈ کروزر پر روانہ ہو گئے۔

انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ جو کچھ دیکھنے جا رہے ہیں وہ اتنا بھیانک ہوگا۔ سیلاب کی سرزمین پر پہنچتے ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ کتنی زبردست تباہی پھیل چکی ہے۔ ہر طرف بپھرا ہوا پانی تھا اور خود کو بچانے کی کوششیں کرتے ہوئے لوگ...... جو کچھ بھی تھا پانی اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔ پانی میں مرے ہوئے مویشی تیر رہے تھے۔ درخت بہتے چلے جا رہے تھے۔ لوگ مکانوں کی چھتوں پر پناہ لیے ہوئے تھے۔ ہر طرف سوائے موت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

''میرے خدا۔'' مونا لرز کر بولی۔ ''یہ تو بہت بھیانک تباہی ہے۔''

''ہماری سوچ سے بھی زیادہ۔'' عبید نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے قیامت برپا ہو گئی ہے۔''

''میرے اندازے کے مطابق کروڑوں لوگ متاثر ہوئے ہیں۔'' رمیز نے کہا۔ ''کیونکہ ایسی ہی صورتِ حال

پورے ملک کی ہے۔

"ہم یہاں یہ دیکھنے کے لیے آئے تھے کہ ان لوگوں کو کن کن چیزوں کی ضرورت ہے لیکن اب تو ایسا لگتا ہے کہ انہیں سب کچھ چاہیے۔" عبید نے کہا۔ "اب ہم اس کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں کہ واپس جا کر چیزیں اکٹھی کریں اور وہاں سے یہاں پہنچنے کا بندوبست کریں۔"

"کچھ فاصلے پر کوئی فوجی کیمپ دکھائی دے رہا ہے۔" مونا نے اشارہ کیا۔ "چلو ان سے معلوم کرتے ہیں کہ ہم فوری طور پر ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔"

کیمپ میں موجود فوجیوں نے انہیں بتایا۔ "فوری طور پر دواؤں کی ضرورت ہے۔ ویسے تو اور بھی بہت کچھ چاہیے لیکن سیلاب سے بڑا خطرہ بیماریوں کی صورت میں سامنے آنے والا ہے۔"

"کون کون سی دوائیں؟"

"ہمارے کیمپ کے ڈاکٹر آپ کو بتا دیں گے۔"

ڈاکٹر میجر... رینک کا ایک دردمند دل رکھنے والا انسان تھا۔ اس نے کہا۔ "ایسی تباہی ہم نے پہلے نہیں دیکھی۔ ان بے چاروں کا سب کچھ تباہ ہو گیا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب! ہم ان کی ضروریات کا اندازہ کرنے آئے ہیں۔"

"ضرورت تو ہر چیز کی ہے لیکن فوری طور پر دوائیں چاہئیں۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "میں آپ کو دواؤں کی فہرست بنا کر دے دیتا ہوں۔ جتنی جلدی اور جتنی مقدار میں بھیج سکیں بھیج دیں۔" ڈاکٹر نے دواؤں کی فہرست دے دی تھی۔ واپسی میں انہیں ایک ایسا منظر دکھائی دیا جس نے ان کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔

وہ ایک بچہ تھا۔ آٹھ نو سال کا خوبصورت سا۔ وہ ہر شخص کے پیچھے بابا، بابا کہہ کر دوڑ لگاتا اور ہر گزرنے والی عورت کو اماں اماں کہہ کر آواز دیتا۔ لیکن ان لوگوں کے پاس اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ اس بچے پر دھیان دیتے۔ وہ اکیلا ادھر سے ادھر دوڑتا پھر رہا تھا۔

"میرے خدا! لگتا ہے یہ اپنے والدین سے بچھڑ گیا ہے۔" مونا نے کہا۔

"ہاں، ایسا ہی لگ رہا ہے میں اسے دیکھتا ہوں۔" عبید گاڑی سے اتر کر بچے کے پاس پہنچ گیا۔

"کیا بات ہے بیٹے کہاں ہیں تمہارے بابا اور اماں؟" بچے نے رونا شروع کر دیا۔ آنسو اس کے خوبصورت گالوں پر بہہ رہے تھے۔ اس دوران میں ریز اور مونا بھی بچے کے پاس آ گئے تھے بچہ روئے جا رہا تھا پھر عبید نے ایک فیصلہ کرتے ہوئے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"سنو تم دونوں شہر جا کر دواؤں کا بندوبست کر کے یہاں بھیج دو۔"

"اور..... اور تم نہیں چلو گے؟"

"نہیں، میں یہاں اس بچے کے ماں باپ کو تلاش کروں گا۔" عبید نے کہا۔ "میرے پاس موبائل ہے۔ جب تم واپس آؤ تو مجھ سے رابطہ کر لینا۔"

"اس علاقے میں سگنل کہاں آ رہے ہوں گے۔"

"تم اس کی پروا مت کرو، میں اس علاقے میں ہوں۔ ویسے تو تباہی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے لیکن ہمارے کام کرنے کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم کسی ایک علاقے کو فوکس کر لیں اور دوسرے لوگ کسی اور علاقے کو چن لیں۔ یہ پیغام جا کر شہر کی این جی اوز کو پہنچا دو۔ ورنہ کوئی ایک این جی او ایک وقت میں پورے ملک کو نہیں سنبھال سکے گی۔"

"ہاں یہ اچھی تجویز ہے لیکن اس دوران تم کہاں رہو گے؟" مونا نے پوچھا۔

"میری فکر مت کرو، میں ان فوجیوں کے ساتھ مل کر ان کا ہاتھ بٹاتا رہوں گا۔ اس کے ساتھ اس بچے کے ماں باپ کو بھی تلاش کرتا رہوں گا۔ اب تم جاؤ، خدا حافظ اور ہاں جاتے ہوئے میرے ڈیڈ سے مل لینا، وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"

☆☆☆

کالو ماچھی نے ایک کیمپ میں پناہ لے رکھی تھی۔ اس کا ایک بیٹا اس کے ساتھ تھا جب کہ دوسرا سیلاب کے ریلے میں بہہ کر نہ جانے کدھر چلا گیا تھا۔ اس کے سینے پر اب دو زخم لگ گئے تھے۔ ایک برکھا کا اور دوسرا اپنے بیٹے کا۔

وہ بچ جانے والے بچے کو ہر وقت خود سے چمٹائے رکھتا تھا۔ اس کی آنکھیں ویران ہو چکی تھیں۔ وہ اپنی اداس نگاہوں سے ہر طرف دیکھتا رہتا۔

اس نے جس کیمپ میں پناہ لی تھی، وہ کسی این جی او کی طرف سے لگایا گیا تھا۔ کیمپ کیا تھا بس ایک بڑا سا تمبو اور شامیانہ ایک اونچے ٹیلے پر بنا دیا گیا تھا جس سے کچھ فاصلے پر سیلاب بہہ رہا تھا۔

اب پانی کی طرف دیکھتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا۔ پانی جو زندگی کی علامت ہے، اب اس کے لیے موت کی علامت بن گیا تھا۔ اس پانی نے اس کی بیوی کو اس سے

جدا کر دیا تھا۔ اس کے بچے کو اس سے چھین لیا تھا۔ اس کیمپ میں دو، تین سو کے قریب لوگ تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں، مرد بھی تھے اور بچے بھی۔

وہ سب خوفزدہ تھے پانی سے، بھوک سے اور آنے والے دنوں سے، ان میں سے کسی کو بھی کچھ نہیں معلوم تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

این جی او سے جو کچھ بھی ہو رہا تھا، وہ کر رہے تھے لیکن کب تک......!

کالو ماچھی اپنے بچے کو چھپائے بیٹھا تھا کہ ایک آدمی اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وہ اسی علاقے کا معلوم ہوتا تھا۔

''تم کالو ماچھی ہو نا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' کالو نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''تم کون ہو؟''

''میرا نام بٹھل ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''کالو، مجھے معاف کر دے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں اب زندہ نہیں بچوں گا۔ یہ پانی مجھے مار ڈالے گا۔ یہ مجھے ڈھونڈ رہا ہے، مجھ گناہ گار کی وجہ سے ہزاروں بے گناہ بھی مارے جا رہے ہیں۔''

''میں نہیں سمجھا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں ہوں پھر معافی کس بات کی؟''

''میں فضل داد کا آدمی ہوں۔'' بٹھل نے بتایا۔

''کون...... وہ وڈیرا فضل داد؟'' کالو نے پوچھا۔

''ہاں، وہی۔''

''تو پھر میرا اس سے کیا واسطہ؟''

''اس نے ایک بار تمہاری عورت کو دیکھ لیا تھا۔'' بٹھل نے بتایا۔ ''پھر اس نے ایک رات ہمیں تمہاری طرف بھیجا تھا کہ تمہاری عورت کو اٹھا کر اس کے پاس پہنچا دیں لیکن اسی وقت سیلاب آ گیا۔ ہم تمہاری جھونپڑی کے پاس ہی تھے اور ہم خود اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے پھر اس ریلے میں تمہاری بیوی بہہ گئی اور خود میرا گھر بھی برباد ہو گیا۔ میری بیوی اور میرا ایک بیٹا بھی سیلاب میں بہہ گئے۔ شاید خدا نے مجھے سزا دی ہے اور اب میں اکیلا یہاں پڑا ہوا اپنی جان کو رو رہا ہوں۔''

''کیوں......؟'' کالو ماچھی نے غصے سے پوچھا۔ ''جس بدمعاش کے لیے تم نے یہ سب کیا تھا اس نے تمہیں نہیں پوچھا؟''

''نہیں، اس نے بھی نہیں پوچھا۔'' بٹھل نے جواب دیا۔ ''میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں بھائی۔ تیرے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں مجھے معاف کر دے۔ جانے کیوں تجھے دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے۔ دل نے کہا تجھ سے معافی مانگ لوں۔ زندگی کا کیا بھروسا، جو د سوچ اگر میں نہیں بتاتا تو تجھے زندگی بھر پتا نہیں چلتا۔ لیکن موت کو سامنے دیکھ کر اپنا گناہ قبول کر رہا ہوں۔ معاف کر دے مجھے۔''

''جی تو چاہتا ہے کہ اسی وقت تیری گردن دبا دوں لیکن اب کیا فائدہ، وہ تو چلی گئی۔''

''یہ بھی اچھا ہوا رے کہ وہ پانی میں چلی گئی۔ زندہ رہتی تو فضل داد کے پاس ہوتی۔'' برکھا کے ذکر سے کالو ماچھی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ وفادار عورت اس سے کتنا پیار کرتی تھی پھر اسے اپنا بیٹا یاد آنے لگا جو ہر وقت اس سے لپٹا رہتا تھا۔ اب اس وقت جانے کہاں ہوگا۔

زندہ ہوگا یا پانی نے اسے موت دے دی ہو گی۔ بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ فضل داد کا آدمی اس کے پاس بیٹھا امید بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بتا کالو تو نے مجھے معاف کر دیا نا۔''

''ہاں ہاں کر دیا معاف۔'' کالو جھلا کر بولا۔ ''اب رہ کیا گیا ہے۔ سب کچھ تو پانی میں بہہ گیا ہے۔''

''میرا بھی کوئی نہیں رہا بھائی، سب ختم ہو گئے۔''

''وڈیرا تو زندہ ہے نا۔''

''اس کی بات مت کر۔ اسی نے تو میرے سینے پر اتنا من بھر کا بوجھ رکھ دیا ہے۔ زندگی رہی تو یہ بوجھ بھی اتار دوں گا۔'' بٹھل نے کہا۔

اسی وقت کچھ لوگ اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ چینل کے لوگ تھے۔ ایک کے ہاتھ میں مائیک تھا اس کے ساتھ کیمرے والے تھے۔ کیمپ سے کچھ فاصلے پر ان کی شاندار گاڑی بھی کھڑی تھی۔

''تم کہاں سے آئے ہو بھائی؟'' اینکر نے دریافت کیا۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' کالو نے کہا۔ ''بس بہتا ہوا اس طرف آ گیا ہوں۔ اپنی بیوی اور ایک بچے کو کھو دیا ہے میں نے۔ بس یہ رہ گیا ہے میرے پاس۔'' اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور خدا کا شکر ہے کہ میری بیوی پانی میں ڈوب گئی۔ ورنہ اس کے ساتھ اور بھی برا ہوتا۔'' لیکن اس سے پہلے کہ کالو ماچھی کچھ بتا پاتا، بٹھل نے اسے ایک طرف کھینچ لیا۔

''کیا کرتا ہے کالو چپ رہ۔''

''کیوں، چپ کیوں رہوں تو، تو گواہی دینے والا ہے نا۔''

''اپنے بچ جانے والے بچے کی فکر کر۔'' بٹھل نے کہا۔ ''فضل داد بڑا ظالم آدمی ہے۔ اس کے ساتھ ہم بعد

میں نمٹ لیں گے۔ اس طرح سب کو بتانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" کالو کی سمجھ میں بات آگئی تھی۔ وہ ٹی وی والوں سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ اینکر پرسن کو اس کے رویّے سے بہت مایوسی ہوئی تھی کیونکہ ایک زبردست اسٹوری اس کے ہاتھ آتے آتے رہ گئی تھی۔

☆☆☆

برکھا نے چپ سادھ لی تھی۔ اس سے بولنے کی کوشش کی جاتی تو وہ ہوں ہاں کر کے رہ جاتی۔ ڈاکوؤں نے ابھی تک اس کی طرف پوری طرح توجہ نہیں دی تھی کیونکہ وہ سب ابھی سیلاب میں پھنسے ہوئے تھے۔ کسی بھی لمحے بپھرا ہوا پانی ان پر بھی حملہ آور ہوسکتا تھا۔

برکھا کو دیکھ کر قاسم جانے کیوں موم سا ہو جاتا۔ اس نے اپنے ایک خاص آدمی ڈھلون سے کہا۔ "ڈھلون، پتا نہیں اس عورت میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ میرے بڑھتے ہوئے ہاتھ رک جاتے ہیں۔"

"اسی کو تو حسن کا جادو کہتے ہیں سردار۔"

"پڑھے لکھوں جیسی باتیں مت کیا کر۔ یہ کوئی اور بات ہے یا شاید یہی ہو۔ ویسے ترس آتا ہے اس پر۔ اس کا خاوند اور دو بچے پانی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں، ڈھلون۔ ہم نے کبھی کوئی نیکی کا کام نہیں کیا۔ ہمارے مزاج ہی میں نہیں ہے۔ شاید یہی نیکی ہمارے کام آجائے۔"

"موت جو سامنے ہے سردار اس لیے نیکی یاد آرہی ہے۔"

"ڈھلون تو جانتا ہے کہ میں موت سے کبھی نہیں ڈرا۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے بچ کر نکلا ہوں۔ دشمنوں کی پوری فوج ہے میرے پیچھے لیکن مجھے کبھی ڈر نہیں لگا مگر اب جو کچھ ہو رہا ہے، یہ خدا کا عذاب ہے اور اس سے کون بچ سکتا ہے۔"

"یہ بات تو ہے سردار، یہ واقعی خدا کا عذاب ہے۔" ڈھلون نے تائید کی۔

"اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایک نیکی کرلوں۔ اس قہر سے تو بچ جاؤں۔" قاسم نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ اس کے خاوند اور بچوں کو تلاش کروں۔"

"کیسے ڈھونڈو گے سردار؟ وہ لوگ تو بہتے ہوئے کہاں سے کہاں چلے گئے ہوں گے؟"

"اس نے خود کو جس بستی کا بتایا ہے اس کا وڈیرا ہمارا آدمی ہے۔" قاسم نے بتایا۔ "فضل داد نام ہے۔ اس کو ہم فضل داد کے پاس لے چلیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے اس کے خاوند اور بچوں کا کچھ پتا ہو۔"

"لیکن ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے؟" ڈھلون نے کہا۔ "ہر طرف پانی ہی پانی پھیلا ہوا ہے۔"

"کسی کشتی کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ میں رانا کو بھیج دیتا ہوں، وہ کئی کشتی والوں کو جانتا ہے کسی کو پکڑ لائے گا۔"

"ٹھیک ہے سردار جو تمہاری مرضی لیکن یہ پہلا موقع ہوگا کہ کوئی عورت تم سے بچ کر چلی جائے گی۔"

"ارے وہ خود نہیں جارہی میں نکال رہا ہوں اس کو۔" قاسم نے کہا۔ "جا رانا سے کہہ دے اور اس عورت کو میرے پاس بھیج دے۔ مجھے اس سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

برکھا اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ اس سوگواری کی کیفیت نے اس کے حسن کو اور دوبالا کردیا تھا۔ قاسم ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اگر معاملہ نیکی کا نہیں ہوتا تو پھر وہ اس عورت کو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس ہی رکھ لیتا، وہ اسی قابل تھی۔

"تم نے اپنا نام برکھا بتایا تھا نا؟" قاسم نے پوچھا۔ برکھا نے گردن ہلا دی۔

"تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ کھانا، پانی تو مل رہا ہے نا؟"

"ہاں۔" برکھا نے مختصر جواب دیا۔

"دیکھ برکھا تو نے اپنے خاوند سے یا گاؤں والوں سے میرا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ میرا نام قاسم ہے، ڈاکو قاسم۔"

"ہاں جانتی ہوں میں۔" برکھا نے کہا۔ "بڑی دہشت ہے تیری۔"

"ہم جس عورت کو اٹھا کر لاتے ہیں، وہ آسانی سے واپس نہیں جاتی۔" قاسم اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن تمہاری بات اور ہے۔ تم پانی میں بہتی ہوئی اس طرف آنکلی ہو۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ تم پر زبردستی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ اسی لیے تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔"

"سودا۔" برکھا چونک اٹھی۔ "کیسا سودا؟"

"بہت آسان سا سودا ہے۔" قاسم نے بتایا۔ "میں نے کشتی کا بندوبست کرلیا ہے۔ ابھی تم کو لے کر تمہاری بستی جارہا ہوں، ہوسکتا ہے کہ تمہارا خاوند یہیں کہیں آس پاس بھٹک رہا ہو، ہم اس کو وہاں تلاش کریں گے۔"

"ہاں۔" برکھا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "اس بستی سے باہر بھی ڈھونڈیں گے۔ بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دیکھیں گے اس کو وہ ضرور ملے گا..... ضرور ملے گا۔"

"ہاں ہاں مل جائے گا۔" قاسم نے کہا۔ "ابھی سے۔

شورمت کر میں تجھ سے سودے کی بات کر رہا تھا۔ تو وہ سودا بھی سن لے اور وہ سودا یہ ہے کہ اگر وہ نہیں ملا تو پھر تو کہاں جائے گی بتا۔ کوئی رشتے دار ہے تیرا؟"

"نہیں، کوئی نہیں ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی بالکل اکیلے تھے۔"

"اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کہاں بھٹکتی پھرے گی؟" قاسم نے کہا۔ "تم کو پھر یہاں واپس آنا ہوگا۔ یہاں ہم لوگوں کے ساتھ رہنا پڑے گا، یہاں تمہاری مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں ہوگی۔ کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔" برکھا سن ہوکر رہ گئی۔

☆☆☆

عبید بھرپور جذبے اور جوش سے فوجیوں کے ساتھ مل کر متاثرین کی مدد کر رہا تھا۔ مونا اور رمیز نے شہر جا کر ادویات کی پہلی کھیپ روانہ کردی تھی جو اس وقت بہت کام آرہی تھی۔ وہ بچہ ابھی تک اس کے ساتھ تھا۔ اس بچے کے والدین کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔ اس نے اپنے باپ کا نام کالو ماچھی بتایا تھا جبکہ وہ اپنی ماں کا نام نہیں جانتا تھا۔ اس کا اپنا نام بادل تھا۔ عبید کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اب اس بچے کا کیا کرے۔ اگر اس کے والدین نہیں ملے تو پھر وہ اسے کہاں لے جائے گا۔ کس کے پاس لے جائے گا۔

ایک اور حل اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ اس بچے کو شہر منتقل کردے۔ جہاں اس کی دیکھ بھال ہو ہی جاتی۔ اس کیمپ کا ڈاکٹر مسرور کیپٹن ۔۔ رینک کا ایک ملنسار اور انتہائی شفیق انسان تھا۔

عبید نے محسوس کیا کہ مسرور دوسروں سے کہیں زیادہ کام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دو ڈاکٹرز اور بھی تھے۔ باری باری جن کی ڈیوٹیز ہوتیں۔ ایک ڈیوٹی پر ہوتا تو دوسرا آرام کے لیے چلا جاتا لیکن کیپٹن مسرور ان تھک کام کرتا تھا۔ اس کے ساتھی ڈاکٹرز بڑی مشکلوں سے اسے آرام کے لیے آمادہ کر پاتے۔ عبید کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

"عبید صاحب۔ میں اپنا کفارہ ادا کر رہا ہوں۔"

"کس بات کا کفارہ؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" مسرور نے ایک گہری سانس لی۔

"کوئی بات نہیں، ہمارے پاس سننے کے لیے کافی وقت ہے۔" عبید نے کہا۔ اس وقت وہ دونوں کیمپ سے فاصلے پر تھکن دور کرنے کے لیے چائے پی رہے تھے۔

"عبید، یہ میری سوہنی کی بستی ہے۔" مسرور نے ڈوبی ہوئی بستی کی طرف اشارہ کیا۔ "شاید تمہیں یہ نہ معلوم ہو کہ میرا تعلق اسی بستی سے ہے۔ میں یہیں پیدا ہوا اور اس بستی کی ایک لڑکی سے میں نے محبت کی۔ اس کا نام بھی سوہنی تھا۔ بستی کی سب سے خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی تھی۔"

"تم اسے تھی کیوں کہہ رہے ہو؟" عبید نے پوچھا۔

"اس لیے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔" مسرور نے بتایا۔ "میری آنکھوں کے سامنے ڈوب کر مری ہے اور میں اسے بچا نہیں پایا۔"

"کیا؟" عبید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں بھئی۔ میری سوہنی کو دریا عبور کرنے کے لیے کچا گھڑا بھی نصیب نہیں ہوا اور وہ مرگئی۔ سیلاب کی خبر سنتے ہی میں اس علاقے میں آ گیا تھا۔ سوچا تھا کہ پوری بستی کو یہاں سے نکال لے جاؤں گا لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ سیلاب اتنا خطرناک ہے اور اس کی رفتار اتنی تیز بھی ہوسکتی ہے۔ میں جب پہنچا تو سوہنی اور اس کے گھر والے ڈوب رہے تھے۔ قسمت دیکھو کہ اس کے گھر والے بچ گئے اور وہ خود ڈوب گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکا پھر میرا یونٹ بھی امداد لے کر یہاں آ گیا اور میں اپنے یونٹ کے ساتھ تمہارے سامنے اس کیمپ میں بیٹھا مریضوں کو دیکھ رہا ہوں۔"

"اور تمہارے گھر والے؟" عبید نے پوچھا۔

"وہ تو شہر میں رہتے ہیں اور سب خیریت سے ہیں۔ صرف میں خیریت سے نہیں ہوں کیونکہ میری محبت ڈوب چکی ہے۔ میری زندگی سے محبت کی کہانی ختم ہوچکی ہے۔"

"کیپٹن، تم واقعی بہت حوصلے والے انسان ہو۔" عبید نے کہا۔ "اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو شاید پاگل ہوچکا ہوتا۔"

"کیا فائدہ ہوتا۔" مسرور نے ایک گہری سانس لی۔ "میں نے یہ سوچا کہ میری سوہنی تو ڈوب چکی ہے۔ میں کسی اور کی سوہنی کو تو بچا سکتا ہوں نا۔ یہ سوچ ہی مجھے ثابت قدم رکھتی ہے۔ ورنہ میں اندر سے ٹوٹ چکا ہوں۔"

دو آدمی ان کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ ان دونوں کا تعلق میڈیا سے تھا۔ ان میں سے ایک اینکر پرسن تھا اور دوسرے نے کیمرا سنبھال رکھا تھا اور اس سے پہلے کہ اینکر پرسن کچھ کہتا۔ مسرور نے کہا۔ "بھائی۔ میں ذاتی اور انفرادی طور پر تم میڈیا والوں کو سیلوٹ کرتا ہوں۔ تم لوگوں نے جس فرض شناسی اور ذمے داری سے سیلاب زدگان کی کوریج کی ہے اس پر مجھے اپنے میڈیا پر فخر ہے۔"

"شکریہ جناب۔" اینکر پرسن نے کہا۔ "یہ معاملہ

صرف سیلاب زدگان کا نہیں بلکہ ہم سب کا ہے۔ ہم سب اس سیلاب میں گھر گئے ہیں...... جو گھروں میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔ وہ بھی اس آفت کا ایک حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔''

''اس میں کوئی شک نہیں ہے۔'' عبید نے کہا۔''اس وقت پورا ملک گھر چکا ہے۔''

''خدا کی پناہ، کیسے کیسے مناظر دیکھنے کو ملے ہیں۔ کہیں باپ اپنی اولاد کو ڈھونڈ رہا ہے تو کہیں اولاد باپ کو رو رہی ہے۔ پچھلے کیمپ میں تو ایک ایسا آدمی بھی ملا جو اپنی بیوی کے بارے میں کچھ بتاتے بتاتے رہ گیا۔''

''کیا بتا رہا تھا؟'' عبید نے پوچھا۔

''پتا نہیں کیوں یہ کہہ رہا تھا کہ اچھا ہوا اس کی بیوی ڈوب گئی، ورنہ اس کے ساتھ اور برا ہوتا۔''

''اس کی کہانی یقیناً سننے والی ہوگی۔'' عبید نے کہا۔

''لگتا ہے وہ بے چارہ انسانوں کا ستایا ہوا ہے۔ نام کیا ہے اس کا؟''

''شاید کالو نام بتایا ہے اس نے۔'' اینکر پرسن نے کہا۔''اگر آپ اس کی کہانی معلوم کرسکیں تو وہ ہمارے لیے بھی دلچسپ چیز ہوگی۔''

''میں جاؤں گا اس کے پاس۔'' عبید نے کہا۔ ''دیکھوں تو سہی، اس بے چارے پر کیا گزری ہے۔''

☆☆☆

فضل داد کی حویلی محفوظ تھی۔ ویسے تو اس کی زمینوں کو نقصان پہنچا تھا۔ فصلیں تباہ ہوگئی تھیں لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ اس کا سرمایہ محفوظ تھا۔

وہ ہر سال اپنی فصلوں کا انشورنس کروا لیتا تھا۔ اس بار وہ انشورنس اس کے کام آنے والا تھا۔ اس نے اپنا حساب کتاب بھی مکمل کرلیا تھا۔ پانچ گنا زیادہ کا کلیم تیار تھا۔ اس لیے اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔

اس کی حویلی اونچی جگہ پر تھی اور اس کی دیواریں بھی بہت اونچی تھیں۔ یہاں تک سیلاب کے آنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ اپنی بیٹھک میں تھا کہ ملازم نے آکر اطلاع دی۔''سردار، وہ قاسم آیا ہے۔ آپ سے ملنے کے لیے۔''

''کون قاسم، وہ اپنا ڈاکو؟''

''جی سرکار۔''

''بھیجو اسے، لگتا ہے پانی نے اس کا بھی بیڑہ غرق کردیا ہے۔'' قاسم اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

''کیا حال ہے قاسم تیرا؟'' فضل داد نے پوچھا۔

"سیلاب کی شکایت لے کر آیا ہے کیا؟"

"نہیں سرکار۔ شکایت تو نہیں لایا لیکن معاملہ سیلاب ہی کا ہے۔"

"اچھا، وہ کیا معاملہ ہے؟"

"سرکار! سیلاب میں ایک عورت بہتی ہوئی ہماری طرف آ نکلی تھی۔ اب اس کے خاوند کی تلاش ہے۔"

"اوہو۔" فضل داد ہنس دیا۔ "تو، تو اس سیلاب میں نیکی کرنے نکلا ہے۔ تو جاؤ بابا، دیکھو کہاں ہے اس کا شوہر؟"

"وہ سب لوگ تو ادھر ادھر ہو گئے ہیں سرکار۔" قاسم نے بتایا۔ "آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ شاید آپ کو اس کے خاوند کا کچھ پتا ہو۔"

"کیسی بات کرتے ہو بابا۔ کیا ہم نے پورے گاؤں کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔"

"وہ اس گاؤں کی ہے سرکار۔"

"کیا نام ہے اس کے خاوند کا؟"

"کالو ماچھی اور اس کا نام برکھا ہے۔" قاسم نے بتایا۔

"بابا۔ کیا وہ عورت زندہ ہے۔" فضل داد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ قاسم کی اس خبر نے اسے نہال کر دیا تھا۔

"ہاں سرکار، وہ زندہ ہے۔"

"ارے بابا، کالو ماچھی تو ہمارا خاص آدمی ہے۔" فضل داد نے کہا "ہم تو دونوں میاں بیوی کو خود تلاش کر رہے تھے۔ چلو دونوں میں سے ایک تو مل گیا۔ اس کے تو دو بچے بھی تھے۔"

"ہاں سرکار، وہ بتاتی ہے کہ دونوں بچوں اور خاوند کا ساتھ چھوٹ گیا ہے۔" قاسم نے بتایا۔

"ارے بابا تو لے آ اس کو۔ وہ ہماری مہمان ہے۔ کہاں رکھا ہے اس کو؟"

"اسے میں اپنے ساتھ ہی لایا ہوں سرکار۔"

"یہ تم نے نیکی کا کام کیا ہے۔" فضل داد خوش ہو رہا تھا پھر اس نے اپنے ملازم کی طرف دیکھا۔ "جا، دیکھ قاسم کے ساتھ کوئی مہمان آئی ہے۔ اس کو عزت سے میرے پاس لے آ۔"

"جی سرکار۔" قاسم کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ شاید اس نے یہاں آ کر غلطی کی۔ وہ فضل داد کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ایک ہوس زدہ انسان ہے۔ برکھا کا نام سن کر اس کے چہرے پر چمک آ گئی تھی۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو وہ اس عورت کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اسی وقت ملازم گھبرایا ہوا داخل ہوا۔

"سرکار، وہ عورت تو بھاگ گئی۔"

"بھاگ گئی۔" فضل داد اور قاسم دونوں اچھل پڑے۔

"جی سردار، ہم دور دور تک دیکھ آئے ہیں۔ اس کا کوئی پتا نہیں ہے۔" فضل داد کی حالت چاہے جو بھی ہو لیکن قاسم نے اس وقت سکون محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

برکھا کمر تک پانی میں جا رہی تھی۔ اب تک وہ ایک بے حسی کے عالم میں تھی لیکن فضل داد کی حویلی میں داخل ہوتے ہی اسے جیسے ہوش آ گیا تھا۔ یہ قاسم اسے یہاں کیوں لے آیا تھا۔ اس وڈیرے سے اس کا بس ایک دو بار ہی سامنا ہوا تھا لیکن اس کی ہوس بھری نگاہوں نے اسے بہت کچھ احساس دلا دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے فضل داد کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اسی لیے قاسم جیسے ہی اسے حویلی میں لے کر آیا، اسی وقت اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ یا تو اپنی جان دے دے گی یا کسی طرح یہاں سے نکل جائے گی اور اسے نکل بھاگنے کا موقع مل گیا۔

اس موقع سے اس نے پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ اونچی حویلی کی اونچائی سے نیچے کمر تک پانی ہی پانی تھا لیکن وہ اس پانی میں دوڑتی چلی جا رہی تھی۔

اس کے چاروں طرف تباہی تھی۔ ٹوٹے ہوئے گھر، اکھڑے ہوئے درخت، پانی کے ساتھ بہتے ہوئے ڈھور ڈنگر اور کہیں انسانی لاش۔

پانی کا بہاؤ بھی بہت تیز تھا۔ اسے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کے ذہن پر بس یہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح بھی ہو، اسے فضل داد کے علاقے سے دور نکل جانا چاہیے۔

جب ہر طرف پانی ہی پانی ہو تو پھر علاقہ نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کوئی سمت نہیں ہوتی۔ صرف پانی ہوتا ہے۔ جس طرح دور دور تک پھیلے ہوئے ریگستان میں ہوا کرتا ہے۔

یہاں بھی صرف پانی تھا اور وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اسے تیرنا نہیں آتا تھا لیکن خطرے کے احساس نے اسے تیرنا سکھا دیا۔

اس نے قاسم ڈاکو سے خوف محسوس نہیں کیا لیکن اسے فضل داد سے ڈر لگ رہا تھا۔ بے چارے قاسم کا سلوک تو اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ ڈاکو ہونے کے باوجود اور برکھا پر پوری طرح حاوی ہونے کے باوجود اس نے برکھا کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی تھی۔

اس کی کمر تک پانی تھا۔ ہاتھ اب شل ہونے لگے تھے۔ وہ حویلی سے بہت دور آ چکی تھی لیکن خطرہ اب تک برقرار تھا۔ فضل داد نے اس کی تلاش شروع کر دی ہوگی۔

اچانک اس نے موٹر بوٹ کی آواز سنی۔ یہ آواز اس کے قریب سے آ رہی تھی پھر ایک موٹر بوٹ اس کے سامنے آ گئی۔ برکھا کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس میں دو فوجی بیٹھے ہیں جنہوں نے اس کی طرف اپنے ہاتھ بڑھا دیے۔

"آؤ، ہاتھ پکڑ لو جلدی۔" برکھا کو موٹر بوٹ پر کھینچ لیا گیا پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ وہ بے سدھ ہوتی چلی گئی۔

نہ جانے کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا تھا۔ کوئی عورت ہی اسے آواز دے رہی تھی۔

"اٹھ جا، خدا کا شکر ہے۔ تجھے ہوش آ گیا۔ لے پہلے دودھ پی لے۔ بدن میں جان آ جائے گی۔" وہ عورت دودھ کا گلاس اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔ اس نے کانپتے ہوئے گلاس تھام لیا۔ وہ اب پوری طرح اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس کے آس پاس بہت سی عورتیں اور مرد تھے۔ سب اسی کی طرح بے حال تھے۔ آس پاس کی بستیوں کے لوگ۔ جو جانے کہاں کہاں سے ہوتے ہوئے اس کیمپ میں آ کر جمع ہو گئے تھے۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" برکھا نے دودھ کا خالی گلاس واپس کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ایک کیمپ ہے۔ فوجیوں نے لگایا ہے۔" اس عورت نے بتایا۔ "میں اودے پور میرس کی رہنے والی ہوں اور تم..... تم کون ہو؟"

"برکھا نام ہے میرا۔" برکھا نے بتایا۔ "میرا خاوند اور دو بچے یا تو ڈوب کر مر گئے یا خدا جانے پانی میں بہتے ہوئے کہاں چلے گئے۔ ایک میں بدنصیب زندہ ہوں۔"

"یہاں ہم سب کی ایک ہی کہانی ہے۔" زینت نے کہا۔ "بہت برا حال ہے۔ بہت بڑی تباہی آئی ہے۔ اس کیمپ میں تم جیسی عورتیں اور مرد جمع ہو گئے ہیں۔ کوئی بیمار ہے۔ کوئی کمزور ہے اور کوئی بوڑھا ہے۔ ان سب کی دیکھ بھال بہت ضروری ہے۔ میں تھوڑی پڑھی لکھی ہوں۔ اس لیے ان لوگوں کا ہاتھ بٹا رہی ہوں۔ اگر تم چاہو تو تم بھی یہ کام کر سکتی ہو۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ میرا بھی دل لگا رہے گا۔" برکھا نے کہا۔

"تمہارے ساتھ کون کون تھا؟" برکھا نے اسے پوری کہانی سنا دی۔ سیلاب کے آنے سے لے کر قاسم کے اڈے تک اور وہاں سے فضل داد کی حویلی اور فرار ہو کر یہاں تک پہنچنا۔ اس نے سب کچھ بتا دیا۔

"خدا غارت کرے ان لوگوں کو۔" زینت دانت پیس کر بولی۔ "یہ خدا کے قہر سے بھی نہیں ڈرتے۔ خیر، خدا نے چاہا تو تمہیں تمہارا شوہر اور دونوں بچے ضرور مل جائیں گے۔"

"میں تو ان کی طرف سے مایوس ہو گئی ہوں۔" برکھا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"نہیں، مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" زینت نے کہا۔ "چلو میں تمہیں عبید صاحب سے ملوا دوں۔"

"یہ کون ہے؟"

"یہ شہر سے آیا ہوا ایک آدمی ہے۔ اس کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ سب آدمی فضل داد جیسے نہیں ہوتے۔ عبید جیسے بھی ہوتے ہیں جو دن رات غریبوں کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔" زینت برکھا کو عبید کے سامنے لے آئی۔ عبید اس وقت کیمپ سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ برکھا کو وہ بس دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ اس نے ایسا حسن اور ایسی معصومیت کم ہی دیکھی تھی۔

"عبید بھائی، یہ برکھا ہے۔" زینت نے بتایا۔ "اسے موٹر بوٹ کے ذریعے بچایا گیا ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ ہمارے ساتھ مل کر کام کرے۔"

"ضرور، ضرور۔" عبید جلدی سے بولا۔ "اگر تم پہلے آ جاتیں تو شیراز کی دیکھ بھال تمہارے حوالے کر دیتا۔"

"کون شیراز؟" برکھا نے پوچھا۔

"ایک پیارا سا بچہ ہے۔ مجھے یہیں ملا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ نام تو اس کا کچھ اور ہے لیکن میں نے اس کا نام شیراز رکھ دیا ہے۔"

"کہاں ہے وہ۔ میں اس کی دیکھ بھال کروں گی۔"

"وہی تو بتا رہا ہوں کہ کچھ دیر پہلے آ جاتیں تو اسے تمہارے حوالے کر دیتا۔ اب تو میں نے اسے اپنے ایک دوست کے پاس شہر بھیج دیا ہے۔ وہ وہاں پرورش پا رہا ہے۔"

☆☆☆

کالو ماچھی کے پاس اب صرف یادیں رہ گئی تھیں۔ اپنی بیوی کی یادیں۔ اپنے ایک بچے کی یادیں۔ بے رحم پانی نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ کسی باپ کو اس کے سہارے سے جدا کر رہا ہے۔ اب وہ بہت زیادہ دکھی ہو رہا تھا۔

بلھل نے اسے جو کچھ بتایا تھا، اس نے اس کی روح تک میں زخم ڈال دیے تھے۔ مجروح کر دیا تھا اس کو۔ فضل داد نے اس کی بیوی پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ اسے اٹھانے کے

لیے بند بے بھیجے تھے لیکن موت اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ کالو جانتا تھا کہ موت نے برکھا کی حفاظت کی ہے ورنہ وہ سسک سسک کر ساری زندگی جانے کتنی بار مرتی۔ فضل داد کی ایسی ہی کہانیاں تھیں۔

کیمپ میں اس کی چوتھی رات تھی جب اس نے فضل داد کو کیمپ میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ بڑی شان کے ساتھ اپنی گاڑی سے اترا تھا۔ اس کے مسلح محافظ اس کے ساتھ تھے۔

وہ غریبوں میں تقسیم کرنے کے لیے ایک ٹرک پر بہت سا سامان لے کر آیا تھا۔ اس وقت کالو ماچھی چونکہ اندھیرے کی آڑ میں تھا اس لیے فضل داد اسے نہیں دیکھ سکا اور دیکھ بھی لیتا تو کیا فرق پڑ جاتا۔

فضل داد کے لیے کالو کی اہمیت ہی کیا تھی۔ وہ شاید کالو ماچھی کو پہچانتا بھی نہیں ہوگا۔ فضل داد کالو ماچھی کو تو نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اس نے بٹھل کو دیکھ لیا تھا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے بٹھل کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ کالو ماچھی کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بٹھل ہاتھ جوڑے ہوئے اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا ہے۔

''بٹھل تو یہاں کیا کر رہا ہے؟'' فضل داد نے پوچھا۔

''مائی باپ، یہاں پناہ کے لیے آیا ہوں۔'' بٹھل نے بتایا۔

''ہماری حویلی نہیں آ سکتا تھا؟''

''آیا تھا سائیں لیکن آپ نے دھیان ہی نہیں دیا۔'' بٹھل نے دبی زبان سے گلہ کیا۔

''چل کوئی بات نہیں۔'' فضل داد نے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ''ایک کام کر۔''

''حکم کرو مائی باپ۔''

''دیکھ وہ عورت زندہ ہے ابھی۔ وہی جس کو تو لینے گیا تھا۔''

''کیا.....؟'' بٹھل چونک گیا۔ ''وہ زندہ ہے......؟''

یہ بات کالو ماچھی نے بھی سن لی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ کیسی خبر ملی تھی اس کو۔ اس کی برکھا زندہ ہے۔

''وہ ڈاکو قاسم ہے نا۔ وہ اسے میرے پاس لے کر آیا تھا۔'' فضل داد بتا رہا تھا۔ ''لیکن وہ حویلی سے بھاگ نکلی۔ ہو سکتا ہے وہ آس پاس کے کسی کیمپ میں ہو یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود قاسم نے اسے بھگا دیا ہو۔''

''سرکار جب وہ خود ہی لے کر آیا تھا تو پھر بھگایا کیوں ہوگا؟''

''مجھے نہیں معلوم یہ لوگ ایک نمبر کے بدمعاش ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو مجھے خوش کرنے کے لیے وہ اسے میرے پاس لے کر آیا ہوگا، دوسری طرف اسے بھگا دیا ہوگا۔''

''پھر سرکار میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''تلاش کر اس کو وہ آس پاس کے کسی کیمپ میں ہو گی۔'' فضل داد نے کہا۔ ''تو فکر مت کر۔ تجھے اتنا انعام دوں گا کہ خوش ہو جائے گا تو اب بھی میرا خاص آدمی ہے۔''

''بڑی مہربانی سرکار۔ بڑی مہربانی۔'' بٹھل نے اس کے پاؤں چھو لیے۔

کالو ماچھی کو اس پر حیرت ہونے لگی۔ ایک طرف تو اس کی فضل داد کے خلاف بلند باتیں تھیں لیکن جب فضل داد اس کے سامنے آیا تو موم بن کر رہ گیا۔ شاید بٹھل کے خون میں غلامی لکھی ہوئی تھی۔

فضل داد جتنی شان کے ساتھ آیا تھا وہ اسی طرح واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کالو ماچھی اندھیرے سے نکل کر بٹھل کے سامنے آ گیا۔

''کالو مبارک ہو تیری بیوی ابھی زندہ ہے۔'' بٹھل نے بتایا۔

''ہاں میں نے فضل داد کی ساری باتیں سن لی ہیں۔'' کالو ماچھی نے کہا۔ ''اور اس کے سامنے تجھے بھی دیکھ لیا ہے۔''

''پاگل ہے تو۔'' بٹھل جلدی سے بولا۔ ''میں اس وقت اس کے سامنے کچھ نہیں کر سکتا تھا اسی لیے میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ تو نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں دوبارہ حیوان بننے جا رہا ہوں۔ نہیں کالو۔ اس سیلاب نے مجھے جو روشنی دی ہے وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی۔ مجھے پتا چل گیا ہے کہ زندگی کی کیا حقیقت ہے۔''

''تو سچ کہہ رہا ہے یار؟''

''ہاں بھئی اب ہم دونوں مل کر تیری بیوی کو تلاش کریں گے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ تجھے مل جائے گی۔''

☆☆☆

برکھا چلی گئی تھی اور قاسم اسے پاگلوں کی طرح تلاش کر رہا تھا۔ اس نے آس پاس کے کیمپوں میں اپنے آدمی پھیلا دیے تھے۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اگر بچ نکلی ہو گی تو زیادہ دور نہیں گئی ہو گی۔ آس پاس ہی ہو گی کسی نہ کسی کیمپ میں۔

ایسی بے قراری اس نے کبھی پہلے محسوس نہیں کی تھی۔ برکھا نے اس کے دل و دماغ کے جانے کون سے نرم جذبوں کو بیدار کر دیا تھا کہ وہ اس کے لیے ہمدردی محسوس کرنے لگا تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر برکھا مل گئی تو وہ اسے پوری عزت اور مان کے ساتھ اپنے اڈے پر لے آئے گا۔ اس کا دل جیتنے کی کوشش کرے گا۔ اس پر کوئی زور زبردستی نہیں کرے گا۔

اس کے آدمی آس پاس کے کیمپوں میں برکھا کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ قاسم کو یقین تھا کہ اس کے آدمی اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور ایک دن اس کے ایک آدمی نے قاسم کو خبر دی۔

''سردار! میں نے اس عورت کو تلاش کرلیا ہے۔''

''اچھا۔'' قاسم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بہت دنوں کے بعد اسے ایک اچھی خبر سننے کو ملی تھی۔ ''کہاں ہے وہ؟''

''کیمپ نمبر سولہ میں۔'' اس آدمی نے بتایا۔ ''میں خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ جلدی سے تمہیں خوش خبری سنادوں۔''

''چل میں چلتا ہوں تیرے ساتھ۔''

''نہیں سردار، تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''کیوں ٹھیک نہیں ہوگا؟''

''تم کو پولیس بھی تلاش کرتی پھر رہی ہے، رینجرز اور آرمی والے بھی تمہارے پیچھے ہیں۔ تم اس طرح کسی کیمپ میں پہنچ جاؤ گے تو مصیبت ہو جائے گی۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔'' قاسم نے کہا۔ ''میں اپنے چہرے کو چھپائے رکھوں گا پھر دوسری بات یہ ہے کہ وہ تم لوگوں کے ساتھ نہیں آئے گی۔ اس کے پاس میرا جانا بہت ضروری ہے۔''

''سوچ لو استاد کہیں نقصان نہ ہو جائے۔''

''ہونے دے نقصان۔''

''ایک بات تو بتاؤ سردار آخر اس عورت نے تم پر کون سا جادو کر دیا ہے کہ تم اس کے لیے اپنی قربانی دینے کو بھی تیار ہو۔ تم حکم دو تو ہم اس کو ویسے ہی اٹھا کر لے آئیں۔''

''نہیں ہرگز نہیں۔'' قاسم غصے سے بولا۔ ''وہ کوئی عام عورت نہیں ہے، بہت خاص ہے۔'' قاسم کی اس بات کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''چلو کشتی تیار کرو۔'' قاسم نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''مجھے اسی وقت کیمپ نمبر سولہ میں جانا ہے۔''

''سردار کیا ہو گیا ہے تمہیں۔'' ایک نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''اس وقت رات ہو رہی ہے۔ دریا کے تیور تو دیکھ رہے ہو۔ خطرناک سے خطرناک ہوتا جارہا ہے۔ ایسے میں کشتی کا سفر مناسب نہیں ہوگا۔'' قاسم نے اس آدمی کا مشورہ قبول کرلیا۔

''ٹھیک ہے، تو کہتا ہے تو نہیں جارہے۔ کل صبح جائیں گے۔''

☆☆☆

برکھا کو وہ شریف آدمی بہت اچھا لگ رہا تھا جس کا نام عبید تھا۔ وہ برکھا کا بہت خیال رکھ رہا تھا پورے کیمپ میں وہ فرصت کے اوقات میں صرف اسی سے باتیں کرتا۔ اس نے اپنے بارے میں برکھا کو سب کچھ بتا دیا تھا۔

اپنی پسند، ناپسند، اپنی زندگی، اپنا بزنس، اپنا خاندان اور کاروباری پس منظر جبکہ برکھا کے پاس بتانے کے لیے کچھ۔ نہیں تھا۔

عبید کے لیے بھی برکھا ایک نیا تجربہ بن چکی تھی۔ ایک خوشگوار تجربہ۔ یہ سیدھی سادی معصوم خوبصورت سی عورت جانے کس طرح اس کے دل کے کسی گوشے میں گھر کر چکی تھی۔ حالانکہ وہ ایک ان پڑھ، دیہات کی رہنے والی اور دو بچوں کی ماں تھی۔ اس کے باوجود اس نے عبید کے دل میں گھر کرلیا تھا۔ ایک بے رحم سی خواہش عبید کو پریشان کرنے لگی تھی۔ وہ خواہش یہ تھی کہ کاش اس عورت کو اس کا کھویا ہوا شوہر کبھی نہ مل سکے۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں خود غرضی کا یہ خیال آیا پھر وہ اپنے ذہن سے پوری قوت سے اس خیال کو جھٹک دیتا۔

دوسری طرف خود برکھا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ شہری بابو اسے اچانک اتنا اچھا کیوں لگنے لگا ہے؟ اس نے تو اپنی زندگی میں سوائے اپنے مرد کالو ماچھی کے کسی اور کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے گاؤں میں کچھ نگاہیں اس پر جم تو جاتیں لیکن اس نے کبھی کسی اور پر دھیان نہیں دیا تھا۔

اس کے لیے اس کی دنیا سوائے کالو ماچھی کے اور کچھ بھی نہیں تھی پھر وہ اس شخص کے لیے ایسا کیوں سوچنے لگی تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی عورت تھی اسی لیے اس نے عبید سے کہہ بھی دیا۔

''عبید صاحب! ایک بات بتاؤ۔ آپ کو دیکھ کر مجھے ایسا کیوں ہونے لگا ہے؟''

''کیا ہونے لگا ہے برکھا؟''

''پتا نہیں جی۔ میں تو خود کچھ نہیں جانتی بس ایسا لگتا ہے جیسے پوری دنیا میں سوائے تمہارے اور کوئی بھی نہ ہو اور تم میرا سب سے بڑے سہارا ہو۔ ایسا کیوں ہوتا ہے جی؟''

''اب اس جذبے کے بارے میں کیا بتاؤں برکھا۔''

عبید گہری سانس لیتا۔

''یہ کوئی گناہ تو نہیں ہے نا جی؟''

''نہیں برکھا یہ کوئی گناہ نہیں ہے کیونکہ تم جو کچھ بھی کر رہی ہو یہ ایک بے اختیار جذبہ ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔'' برکھا جیسے مطمئن ہو گئی تھی۔ اطمینان کے اس احساس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر شرم کے رنگ دوڑ گئے۔ اس وقت وہ دونوں کیمپ سے کچھ فاصلے پر ایک جگہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب ایک سائے نے ان دونوں کو گھیر لیا۔ یہ ایک تیم شیم انسان تھا جس نے اپنے چہرے پر نقاب باندھ رکھی تھی۔

''برکھا' میں تجھے لینے آیا ہوں تو میرے ساتھ چلے گی؟'' اس شخص نے کہا۔

''کون ہو تم؟'' عبید نے پوچھا۔

''بابو تو چپ چاپ بیٹھا رہ۔'' اس نے عبید کو جھڑک دیا۔ ''یہ تیرا معاملہ نہیں ہے' میں برکھا سے بات کر رہا ہوں۔''

''تم...... تم کون ہو؟'' برکھا نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''قاسم۔'' اس آدمی نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دی تھی۔ ''تجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔''

برکھا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ عبید نے بھی قاسم ڈاکو کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ خود برکھا نے اس کی کہانی سنائی تھی اور اب وہی قاسم ڈاکو برکھا کو اپنے ساتھ لے جانے کے ارادے سے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

''قاسم، تم مجھے کیوں لے جانا چاہتے ہو؟'' برکھا نے پوچھا۔

''یہ سب مت پوچھ۔ اب تیرے لیے میرے علاوہ اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے تو اطمینان رکھ تیرے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہیں ہو گی جس طرح پہلے نہیں ہوئی تھی۔''

''لیکن میں یہاں بڑے سکون سے ہوں قاسم۔''

''کوئی سکون نہیں ہے۔'' قاسم غرایا پھر اس نے عبید کی طرف دیکھا۔ ''شاید یہ تمہاری وجہ سے نہیں جا رہی ہے۔''

''نہیں' یہ اپنی مرضی سے نہیں جا رہی ہے۔'' عبید نے کہا۔ ''اور تم اسے اس کیمپ سے زبردستی نہیں لے جا سکتے۔''

''اوہ۔'' قاسم مسکرا دیا۔ ''شاید تو مجھے نہیں جانتا۔''

''جانتا ہوں میں۔'' عبید نے کہا۔ ''لیکن میں برکھا پر زیادتی نہیں ہونے دوں گا۔ بہتر یہی ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔''

''تو بہت طرف داری کر رہا ہے اس کی، آخر بات کیا ہے؟''

''کوئی بات نہیں ہے۔ میں یہ سب انسانیت کے ناتے کر رہا ہوں۔'' عبید نے کہا۔

قاسم کو آہستہ آہستہ غصہ آنے لگا۔ اس علاقے میں کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے اور یہاں شہر کا ایک نوجوان اس کے راستے کی رکاوٹ بنتا جا رہا تھا۔

''قاسم تم جاؤ یہاں سے۔'' عبید نے کہا۔ ''تم زیادہ سے زیادہ یہی کرو گے نا کہ گولیاں برسا دو گے۔ چلاؤ گولی لیکن یاد رکھو یہ ایک فوجی کیمپ ہے۔ چاروں طرف فوجی بکھرے ہوئے ہیں۔ تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔'' قاسم کو بھی اپنی پوزیشن اور صورت حال کا اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ یہاں واقعی کچھ نہیں کر سکے گا۔ اس کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اس وقت یہاں سے واپس چلا جائے اور کسی مناسب موقع کا انتظار کرے۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے گہری سانس لے کر برکھا کی طرف دیکھا۔ ''میں اس وقت تو جا رہا ہوں لیکن تجھے اس شہری کے ساتھ رہنے نہیں دوں گا۔ میں نے تجھے اپنا مقدر بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور قاسم جو کہتا ہے وہ کر کے رہتا ہے۔''

☆☆☆

فضل داد بہت تلملایا ہوا تھا۔ پہلا موقع تھا کہ کوئی عورت اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی بلکہ اس کی حویلی سے نکل بھاگی تھی۔ سیلاب کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی کچھ زمینیں بھی اس کی لپیٹ میں آ چکی تھیں لیکن اسے اپنی زمینوں سے زیادہ برکھا کی فکر تھی۔ اس کا مزاج ہی یہی تھا جو چیز اس کی دسترس سے دور ہوتی اس کے لیے اس کی بے قراری بڑھ جاتی۔ اسے ایک طرح کی ضد ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کے خادم نے آ کر بتایا۔

''سرکار مائی باپ میں نے اس عورت کا پتا چلا لیا ہے۔''

''کس عورت کا؟''

''وہی کالو ماچھی کی بیوی کا۔ وہ کیمپ نمبر سولہ میں ہے مائی باپ۔''

''اگر یہ سچ ہے تو میں تجھے انعام دوں گا۔''

''آپ سے کون جھوٹ بول سکتا ہے؟''

''تو پھر سوچنے والی کیا بات ہے جا اٹھا کر لے آ۔''

''ایک پریشانی ہے مائی باپ۔ وہ فوجیوں کا کیمپ

ہے۔'' اس آدمی نے بتایا۔'' فوجی آسانی سے اسے اٹھانے نہیں دیں گے۔ اس کے لیے بہت جنگ کرنا ہوگی۔''

''اوہ۔'' فضل داد بجھ کر رہ گیا۔'' وہ کم بخت فوجیوں کے کیمپ میں کیسے چلی گئی ہے' پھر کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔'' ہاں ایک کام ہوسکتا ہے۔ جا قاسم کو بلا کر لے آ۔ اس سے کہنا کہ فضل داد تجھے ابھی بلا رہا ہے۔''

''قاسم سے کیا ہوگا مائی باپ؟''

''تو نہیں جانتا یہ کام وہی کر سکتا ہے۔'' فضل داد نے کہا۔'' اس کے ساتھ تربیت یافتہ بندے بھی ہیں' اسے فوجیوں سے نمٹنے کا تجربہ بھی ہے۔ ہمارے آدمی کچے پڑ جائیں گے لیکن ابھی اسے کچھ مت بتانا۔ بس اس سے کہنا کہ میں اس کی حاضری چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے سرکار۔'' اس شام کو قاسم اس کے سامنے حاضر ہوگیا۔

''قاسم! میں نے تیری ایک مشکل آسان کر دی ہے۔'' فضل داد نے کہا۔

''کیسی مشکل سرکار؟''

''جو عورت تیرے چنگل سے نکل بھاگی تھی' ہم نے اس کا پتا چلا لیا ہے۔'' قاسم نے کچھ نہیں کہا۔'' اور اب تجھے میرے لیے ایک کام کرنا ہے۔''

''حکم دیں سرکار۔''

''اس عورت کو کیمپ سے اٹھا کر یہاں پہنچانا ہے۔'' فضل داد نے کہا۔

قاسم کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ یہ ایک نیا کھیل شروع ہونے جا رہا تھا۔ جس عورت کو اٹھانے کے لیے وہ خود گیا تھا فضل داد بھی اسی کو اٹھانے کی بات کر رہا تھا۔

''سرکار! اس علاقے میں فوجیوں نے کیمپ لگائے ہوئے ہیں۔'' قاسم نے کہا۔'' کسی کو اٹھانا آسان نہیں ہوگا۔''

''میں نہیں جانتا۔ تجھے اسی لیے بلایا ہے۔ کوئی بھی راستہ نکال اور پیسوں کی فکر مت کر۔ جتنا چاہیے مجھ سے لے لے لیکن یہ کام ہر حال میں ہونا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔''

''کوشش نہیں میں تجھے کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں۔'' فضل داد نے کہا۔'' اب جا اور مجھے جلدی خوش خبری سنا۔''

☆☆☆

قاسم کا خیال تھا کہ یہ کام بہت مشکل ہوگا لیکن یہ تو بہت آسان ثابت ہوا تھا۔ اس نے اپنے دو تجربہ کار آدمیوں کو اس کیمپ کی طرف بھیجا تھا اور وہ دونوں رات کے اندھیرے میں بہت خاموشی سے برکھا کو اٹھا کر لے آئے تھے۔ کشتی فاصلے پر کھڑی کی گئی تھی۔ کیمپ والوں پر اس وقت نیند طاری تھی۔ عورتیں ایک طرف سو رہی تھیں، مرد ایک طرف تھے جبکہ فوجی کیمپ سے کچھ فاصلے پر پہرا دے رہے تھے۔

فوجیوں کو بڑھتے ہوئے پانی کی طرف سے خطرہ تھا۔ انسانوں کی طرف سے نہیں اس لیے انہوں نے اپنے کیمپ کی پشت پر پہرے کا کوئی بندوبست نہیں کیا تھا۔ قاسم کے تجربہ کار ساتھیوں نے اسی غفلت اور اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر برکھا کو کیمپ سے اٹھا لیا۔ برکھا کو پستول دکھا کر خاموش کر دیا گیا تھا۔ وہ دونوں برکھا کو قاسم کے اڈے پر لے کر آگئے تھے۔ وہ رات اور بھی بھیانک تھی۔

پانی اور زیادہ بپھرا ہوا تھا۔ اونچے ٹیلے پر قاسم کے اڈے پر لالٹینیں جل رہی تھیں جن کی کمزور روشنیوں نے ماحول کو اور بھی پراسرار اور سوگوار بنا دیا تھا۔ برکھا کو پھر وہیں لایا گیا تھا جہاں وہ پہلے آچکی تھی۔ فرق یہ تھا کہ پہلے پانی کی بے رحم موجیں اسے اپنے ساتھ اٹھا کر یہاں تک لے آئی تھیں اور اس بار قاسم کے ساتھی اسے اٹھا کر لے آئے تھے۔ دونوں ہی بار یہاں آنے میں اس کی اپنی مرضی نہیں تھی۔

وہ ایک بار پھر قاسم کے سامنے کھڑی تھی۔ اس قاسم کے سامنے جس کے ساتھ آنے سے اس نے انکار کر دیا تھا۔

''دیکھ تو آخر آ گئی نا میرے پاس۔'' قاسم نے کہا۔ برکھا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں ادھر سے ادھر پھر رہی ہوں' کبھی فضل داد کی بری نگاہوں کا سامنا کرتی ہوں تو کبھی تم اٹھا کر لے آتے ہو۔ صرف اسی لیے نا کہ میں بدنصیبی سے خوبصورت ہوں۔''

قاسم ہونٹ بھینچے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ برکھا ایک جنونی کیفیت میں بولے چلی جا رہی تھی۔

''تم بتاؤ میرا کیا قصور ہے تم تو بہت طاقت والے آدمی ہو۔ قاسم! بتاؤ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ ایک طرف تو میرا شوہر مجھ سے جدا ہوگیا ہے۔ پانی کھا گیا ہے اس کو میرے دو بیٹے ڈوب کر مر گئے اور دوسری طرف تم نے ظلم کر رکھا ہے۔ چلو جیسے تمہاری مرضی۔ میں اب تمہارے قابو میں ہوں۔ تم جو چاہو وہ کر سکتے ہو۔ میں تو بس ایک لاش بن کر رہ گئی ہوں چلتی پھرتی لاش جواب خود کچھ نہیں کر سکتی ...... کچھ نہیں کر سکتی۔'' اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ اس کے آنسوؤں نے قاسم

کاٹ کر رکھ دو یا پہلے بھی برکھا کے آنسو اس کے دل پر گرے تھے اور آج بھی وہی حال تھا۔

برکھا روئے جا رہی تھی اور اسی وقت ایک ڈاکو نے اطلاع دی کہ فضل داد اپنی موٹر بوٹ پر آ پہنچا ہے۔ جانے کس طرح فضل داد کو یہ خبر مل گئی تھی کہ قاسم برکھا کو اٹھا کر لے آنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر قاسم کے اڈے تک پہنچ گیا تھا۔

''شاباش قاسم، شاباش۔'' فضل داد نے برکھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آخر تو نے یہ کام کر دکھایا۔''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا سائیں؟''

''ارے پورے کیمپ میں اس کی تلاش ہو رہی ہے۔'' فضل داد نے بتایا۔ ''اس کے غائب ہونے کی خبر سنتے ہی میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ سوائے تیرے اور کوئی مائی کا لال اتنی ہمت نہیں کر سکتا۔ اب میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ تیرا انعام تجھے مل جائے گا۔''

برکھا نے اس وقت کچھ ایسی نگاہوں سے قاسم کی طرف دیکھا کہ قاسم نے بوکھلا کر اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ برکھا کی ان نگاہوں میں بہت کچھ تھا۔ شکوہ، فریاد... بے بسی، غصہ۔ وہ نگاہیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ قاسم میں ان نگاہوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

''چل آ میرے ساتھ۔'' فضل داد نے برکھا کا ہاتھ تھام لیا۔ ''تجھے میں رانی بنا کر رکھوں گا۔''

''ٹھہر جائیں سرکار۔'' قاسم اچانک بول اٹھا۔

''کیوں......؟''

''میں نے سوچا ہے کہ اسے کیمپ لے جا کر واپس کر دوں گا۔'' قاسم نے کہا۔

''تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے۔ اتنی مشکل سے تو اسے اٹھا کر لایا ہے اور اب واپس کرنے کی سوچ رہا ہے۔''

''حکم دیں سرکار تو ایک درجن کو اٹھا کر لے آؤں گا لیکن یہ واپس جائے گی۔''

''ہٹ سامنے سے میں اسے لے جا رہا ہوں۔''

''یہ نہیں جائے گی سرکار۔'' قاسم نے پستول نکال لیا۔

''تیری یہ ہمت۔'' فضل داد بپھر اٹھا۔ ''تو کس طرح روکے گا مجھے؟''

''اس طرح۔'' قاسم نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈال دیا۔ یکے بعد دیگرے کئی گولیاں فضل داد کے بدن میں اتر گئیں۔

پانی کے شور کے باوجود گولیوں کی آوازیں دور دور تک پھیلتی چلی گئیں۔

☆☆☆

بٹھل کی تلاش کامیاب رہی تھی۔ اسے برکھا کے بارے میں پتا چل گیا تھا کہ وہ کس کیمپ میں ہے۔ اس نے سب سے پہلے یہ خبر کالو کو سنائی۔

''کالو تیرے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔''

''اب میرے لیے کیا خوش خبری رہ گئی ہے؟''

''ہے خوش خبری۔ تیری بیوی کا پتا چل گیا ہے۔'' بٹھل نے بتایا۔ ''وہ کیمپ نمبر سولہ میں ہے۔''

''کیوں بہلاوے دیتا ہے بھائی۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ جلدی چل۔'' بٹھل نے کہا۔ ''میں نے کشتی کا بندوبست کر لیا ہے۔ اپنے بچے کو ساتھ لے لے۔''

''بٹھل، میں تیرا کس طرح شکریہ ادا کروں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے شکریے کی۔ ایک اچھے کام کا موقع مل رہا ہے مجھے۔ اس سے پہلے کہ اس بدمعاش فضل داد کو

سنہری باتیں

☆ اچھے وقت سے زیادہ اچھے دوست کو عزیز رکھا کرو کیونکہ اچھا دوست برے وقت کو بھی اچھا بنا دیتا ہے۔

☆ احمق لوگوں سے کبھی بحث نہ کرو کیونکہ وہ آپ کو اپنی سطح پر کھینچ لائیں گے اور اپنے تجربے کی بنا پر آپ کو شکست دے دیں گے۔

☆ اگر آپ کسی کو کوئی تحفہ دینا چاہتے ہیں تو اسے عزت، توجہ اور محبت دیجیے کیونکہ کوئی بھی اس سے زیادہ کی توقع آپ سے نہیں کرتا۔

☆ اگر آپ کبھی کسی غلط انسان کا انتخاب کر لیتے ہیں تو اس پر پریشان یا پچھتائیں مت۔ کیونکہ ان کے انتخاب کے بغیر آپ اچھے لوگوں کی قدر و منزلت نہ جان پائیں گے۔

☆ حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا کہ کیسے پتہ چلے کہ انسان پر آنے والی مصیبت سزا ہے یا آزمائش۔ آپؓ نے فرمایا۔ ''جو مصیبت اللہ سے دور کر دے وہ سزا اور جو مصیبت اللہ کے نزدیک کر دے۔ وہ آزمائش ہے......''

مرسلہ۔ اختر شاہ عارف، جہلم

اس کی خبر ہو۔ ہمیں اس تک پہنچ جانا چاہیے۔"

"میرے تو ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں بھائی۔"

"حوصلہ رکھ یار جب خوشی مل رہی ہے تو کانپے جا رہا ہے۔" کالو ماچھی نے اپنے بیٹے کو اٹھایا اور کشتی کی طرف چل پڑا۔ اس وقت اس کے پاؤں جیسے ایک ایک من کے ہو رہے تھے۔ اس کی برکھا زندہ تھی۔ وہ برکھا جس سے اس نے محبت کی تھی، جو اس کے دکھوں کی ساتھی تھی، جو ظالم فضل داد اور قاسم کے اڈے سے نکل بھاگی تھی اور شھل جسے تلاش کر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"شھل۔" اس نے کشتی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "تجھے یقین ہے کہ تو نے جس کو دیکھا ہے وہ برکھا ہی ہے؟"

"کس بات کا شک ہے تجھ کو کیا میں پاگل ہو رہا ہوں جو کسی اور کو دیکھ آیا ہوں. تو نے فضل داد کی باتیں تو سن ہی لی تھیں اس نے بھی تو یہی بتایا ہے۔"

"ہاں یار یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ سب جھوٹ ہو۔ میں اپنی برکھا سے کبھی نہیں مل سکوں گا۔"

"پاگل مت بن یار۔ منزل سامنے ہو تو پھر ایسی بدشگونی نہیں کرتے۔"

صبح ہو گئی تھی۔ دور دور تک پھیلے ہوئے پانی میں ابتدائی سورج کی نرم کرنیں جگمگا رہی تھیں۔ راستے میں بھینسیں اور دوسرے ڈنگر پانی کے بہاؤ کے ساتھ جانے کہاں جا رہے تھے۔ جس وقت یہ مویشی زندہ تھے اس وقت ان کی کتنی خاطر ہوتی تھی۔ ان غریبوں کے لیے یہ مویشی ہی سب کچھ تھے۔ ان ہی سے ان کی روزی چلتی تھی لیکن اب ان ہی مویشیوں کو پانی نے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ اس علاقے کے بہت سے لوگوں نے صرف اس لیے اپنا علاقہ چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ اپنے مویشیوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

کالو نے اپنے بیٹے کو بھی بتا دیا کہ وہ اس کی ماں سے ملنے کے لیے جا رہے ہیں۔ اس کی خوشی بھی دیکھنے کے قابل تھی۔

☆☆☆

عبید سناٹے میں رہ گیا۔ شاید کسی عورت نے برکھا کو اغوا ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ خوف سے بہت دیر تک خاموش رہی تھی پھر اس نے اٹھ کر واویلا شروع کر دیا۔

"ارے لے گئے' اس کو لے گئے۔ دو آدمی تھے۔" ذرا سی دیر میں پورے کیمپ کو پتا چل گیا کہ برکھا کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ عبید جانتا تھا کہ یہ کام سوائے قاسم کے کسی اور کا نہیں ہو سکتا اس لیے کیمپ کے انچارج سے بات کی۔

"سر، ہمیں فوری طور پر اس عورت کو بچانے کے لیے جانا چاہیے۔"

"یہ واقعی بہت برا ہوا ہے۔" انچارج نے کہا۔ "لیکن اس وقت ہم مجبور ہیں۔ اس کی مدد نہیں کر سکیں گے۔"

"وہ کیوں سر؟"

"مسٹر عبید! یہ معاملہ انفرادی ہے جبکہ ہم سیلاب کی اجتماعی مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ قاسم ڈاکو کے اڈے کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ وہ کس طرف ہے۔ ہماری ایک بوٹ اور کچھ آدمی اس چکر میں انوالو ہو جائیں گے۔"

"تو سر کیا ایک مظلوم عورت کو اس طرح ایک ڈاکو کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے گا؟"

"آپ خود بتائیں۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟" عبید نے پھر زیادہ ضد نہیں کی۔

وہ ان لوگوں کی مجبوری سے بھی واقف تھا۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ کسی ایک عورت کی بازیابی کے لیے ایک بوٹ اور لوگوں کو واقعی روانہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہر طرف ایمرجنسی کی صورت حال تھی۔

سوائے صبر کے اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا لیکن عبید کو سکون نہیں مل رہا تھا۔ اس نے جھلا کر سوچا کہ آخر کیوں وہ ایک عورت کے لیے .... اتنا پاگل ہو رہا ہے۔ اس سے کیا رشتہ ہے اس کا۔

اس کے لیے تو اور بھی بے شمار مسائل ہیں' وہ کن چکروں میں پھنس گیا ہے لیکن وہ اپنے دل کو کیسے سمجھاتا۔ اسے برکھا کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کا چہرہ نگاہوں کے سامنے تھا۔

کیسی بدنصیب عورت تھی۔ زندگی اس کے ساتھ کیسا کیسا سلوک کر رہی تھی۔ صرف اس لیے کہ خدا نے اسے خوبصورتی سے نوازا تھا اور یہ خوبصورتی اس کا سب سے بڑا جرم بن گئی تھی۔ وہ مایوس ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

اس کے کرنے کے لیے ابھی کیمپ میں بہت کچھ تھا لیکن اب کسی کام میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب وحشت سی صورت ہو رہی تھی۔

اسے قاسم کا چہرہ یاد آ رہا تھا۔ ایک خطرناک انسان جو انتہائی دلیری اور بے باکی کے ساتھ برکھا کو اٹھا لے جانے کی دھمکی دے کر گیا تھا اور اٹھا کر لے بھی گیا تھا اور

کوئی اس کا راستہ نہیں روک پایا تھا۔

وہ تھکا ہارا ایک طرف آ کر بیٹھ گیا۔ کیمپ کا ڈاکٹر بھی اس کے پاس آ گیا۔ اس کی نگاہیں بپھرے ہوئے پانی پر لگی ہوئی تھیں۔

”آخر چلی گئی نا تمہاری سوہنی۔“

”نہیں ڈاکٹر، وہ میری سوہنی نہیں تھی۔“ عبید نے کہا۔

”تمہاری آنکھیں جھوٹ نہیں بولتیں مسٹر عبید۔ یہ سچ کہہ رہی ہیں۔ وہ سوہنی تھی تمہاری سوہنی...... اور سوہنی کا کام چلے جانا ہے۔ کبھی کوئی دریا میں ڈوب کر چلی جاتی ہے اور کبھی کسی کو کوئی ڈاکو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ انجام ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ جدائی...... صرف جدائی۔“ عبید نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن اسی وقت کیمپ کی طرف سے کسی مرد کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ چیخ چیخ کر کچھ بولتا جا رہا تھا۔

”چلو دیکھتے ہیں کیا معاملہ ہے۔“ ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ دو آدمی تھے جن میں سے ایک آدمی بلک بلک کر رو رہا تھا جب کہ دوسرا آدمی اس کی ہمت بندھا رہا تھا۔ رونے والے شخص کے پاس ایک بچہ بھی کھڑا تھا۔

”عبید صاحب، یہ آدمی برکھا کا شوہر ہے۔“ کسی نے عبید کو بتایا۔

”کون ہو تم......؟“ عبید نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”کالو ماچھی جناب۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔

”مجھے یہ پتا چلا تھا کہ میری بیوی اسی کیمپ میں ہے لیکن یہاں آ کر پتا چلا کہ اس کو قاسم ڈاکو کے آدمی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ پتا نہیں اس بدنصیب کے مقدر میں کیا لکھا ہے۔“ عبید نے دیکھا کہ اس کے ساتھ کھڑا ہوا بچہ بہت روئے جا رہا تھا۔

”یہ بچہ کون ہے؟“ عبید نے پوچھا۔

”ہمارا بیٹا ہے جی۔“ کالو ماچھی نے بتایا۔ ”دو بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک ڈوب گیا۔ یہ دوسرا میرے ساتھ ہے۔“ پھر اس نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے آدمی سے کہا۔ ”وٹھل تو مجھے قاسم کے پاس لے چل، میں اس کے آگے ہاتھ جوڑ لوں گا۔ اس کے پیروں میں سر رکھ دوں گا۔ میں اس سے اپنی برکھا کی بھیک مانگ لوں گا۔“

”ہاں چل میرے ساتھ، میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ملتا ہے۔“ وٹھل نے کہا پھر عبید کی طرف دیکھا۔

”صاحب جی، ہم اس بچے کو آپ کے حوالے کر کے جا رہے ہیں، آپ اس کا خیال رکھیے گا۔“

☆☆☆

فضل داد کے انجام پر برکھا گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ کیسا ڈاکو تھا جس نے برکھا کو بچانے کے لیے ایک بڑے وڈیرے کا خون کر دیا تھا۔ آخر کیوں...... قاسم کو اس سے کیا لینا دینا تھا؟

قاسم کا چہرہ اس وقت پتھر سے تراشا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ فضل داد کی لاش اس نے پانی میں پھنکوا دی تھی پھر اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کے ساتھیوں کو اس کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی ہے۔

”یہ تم نے کیا کر دیا سردار۔“ ایک نے اظہار بھی کر دیا۔ ”ایک عورت کے لیے فضل داد کا خون کر دیا۔“

”تو نے دیکھا نہیں کہ وہ اس عورت کو زبردستی ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔“

”تو اس سے کیا ہو گیا۔ تم تو خود اپنے ہاتھوں سے کئی عورتوں کو اس کے حوالے کر چکے ہو پھر اس میں ایسی کون سی بات ہے؟“

”اچھا بس اب چپ ہو جا۔ میرا دماغ مت خراب کر۔“ وہ ڈاکو خاموش تو ہو گیا لیکن اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اس کے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ صرف وہی نہیں بلکہ دوسرے ڈاکوؤں کو بھی قاسم کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی تھی۔

قاسم کے لیے اس صورتِ حال کو سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا۔ اس نے برکھا کو ایک جھونپڑی میں بھجوا دیا۔ اسے کسی طرح رات گزارنی تھی اور صبح ہی اسے واپس بھیج دینا تھا۔ برکھا کا یہاں رہنا خود برکھا اور اس کے لیے بھی خطرناک ہو سکتا تھا۔

وہ رات اس نے بہت ہوشیار ہو کر گزاری تھی۔ صبح ہوتے ہی اس نے ایک ایسے ڈاکو کو اپنے پاس بلایا جو اس کا خاص اعتماد کا بندہ تھا۔

”بجو دیکھ۔ میں برکھا کو کیمپ تک پہنچانے جا رہا ہوں۔“

”نہیں سردار، تم مت جاؤ تمہارے لیے خطرہ ہے۔“

”کاکے میں یہاں تیرے علاوہ کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا تو سب کے تیور دیکھ رہا ہے۔“ قاسم نے کہا۔ ”میرے جانے کے بعد تو یہاں کے معاملات سنبھال لینا۔ میں اس کو پہنچا کر واپس آ جاؤں گا۔“

”سوچ لو سردار۔“

”ہاں یار، سوچ لیا ہے۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“ قاسم نے کہا۔ ”میں لے جا رہا ہوں اس کو۔“

"ٹھیک ہے، بڑوار لے جاؤ اور یہاں کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ میں سنبھال لوں گا۔" کاکے نے کہا۔

قاسم نے جب برکھا کو جا کر بتایا کہ وہ جلدی سے تیار ہو جائے کہ وہ اسے کیمپ پہنچانے جا رہا ہے تو برکھا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے بے ساختہ آگے بڑھ کر قاسم کے ہاتھ چوم لیے۔

"ارے یہ کیا کرتی ہے کیوں گناہ گار کرتی ہے مجھ کو۔"

"قاسم خدا کی قسم تم لاکھوں شریف لوگوں سے بہتر ہو۔" برکھا نے کہا۔ "میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

قاسم نے اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

☆☆☆

عبید کیمپ سے کچھ فاصلے پر تھا جب اسے ایک کشتی اسی طرف آتی ہوئی دکھائی دے گئی۔

اس کشتی میں صرف دو افراد تھے۔ ایک عورت اور ایک مرد۔ کشتی قریب آ گئی..... اور قریب آئی تو اس بار اس نے ان دونوں کو پہچان لیا۔

عورت برکھا تھی اور وہ شخص سوائے قاسم کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ قاسم ڈاکو جس کی دور دور تک دہشت تھی جو پولیس اور فوج دونوں ہی کو مطلوب تھا۔ کشتی اور قریب آ گئی۔

اب دونوں بالکل واضح ہو گئے تھے۔ برکھا واپس آ رہی تھی جب کہ اس کا شوہر کالو ماچھی اس کی تلاش میں قاسم کے اڈے کی طرف گیا تھا۔ پتا نہیں قسمت کا کیسا الٹ پھیر تھا۔

"یہ دونوں۔" اس کے قریب کھڑے ہوئے ڈاکٹر نے کشتی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تو وہی عورت ہے برکھا اور یہ آدمی کون ہے؟"

"قاسم ڈاکو۔" عبید نے بتایا۔

"کیا.....؟" ڈاکٹر کے اندر کا فوجی ایک دم الرٹ ہو گیا۔

کشتی کنارے سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئی۔ برکھا پانی میں اتر گئی۔ اس نے قاسم سے کچھ کہا اور چھپ چھپ کرتی ہوئی کیمپ کی طرف آنے لگی۔

اس دوران میں قاسم نے کشتی کا رخ موڑ لیا۔ وہ واپس جا رہا تھا لیکن وہ زیادہ دور نہیں جا سکا۔ کیمپ کی طرف سے فوجیوں کی چلائی ہوئی گولیاں اسے چھیدتی ہوئی نکل گئیں۔

☆☆☆

"تیز چل بھٹل اور تیز۔" کالو ماچھی نے کہا۔

"چل رہا ہوں بھائی۔ دیکھ نہیں رہا پانی کا بہاؤ کتنا تیز ہے۔ ذرا سا زور لگاؤں گا تو کشتی الٹ جائے گی۔"

"بھٹل میری برکھا مجھے نہیں مل سکے گی۔"

"فکر مت کر۔ وہ قاسم کے اڈے پر ہو گی۔"

"بھائی کشتی تیز کر۔"

"اچھا رک، سنبھل کر بیٹھ جا۔" اچانک کشتی کی راہ میں ایک بہت بڑا ریلا آ گیا۔

اس ریلے نے کشتی کو گھما کر رکھ دیا تھا۔ بھٹل نے بچانے کی کوشش کی لیکن کشتی بری طرح ڈولنے لگی... پھر اس کا ایک کنارہ ترچھا ہوا اور وہ الٹ گئی۔

بھٹل تو بچ گیا لیکن کالو ماچھی پانی میں ڈوبتا چلا گیا... اپنی جان بچانے کی کوشش میں تیرتے بھٹل کو کالو ماچھی کی بات یاد آ رہی تھی۔

"تو دیکھ لینا یار میں اب اس سے کبھی نہیں مل سکوں گا..... کبھی نہیں۔"

☆☆☆

سیلاب تو اتر چکا ہے لیکن برکھا کی برکھا رت ختم نہیں ہوئی۔ وہ ہر وقت روتی رہتی ہے۔ اس کا بیٹا اس کے ساتھ تھا اور کالو ماچھی کی لاش دوسرے دن مل گئی تھی۔ اسے بڑے اہتمام کے ساتھ دفن کر دیا گیا تھا۔ عبید نے اس سے کہا کہ وہ شہر جا کر اس بچے کی دیکھ بھال کرے جس کا نام اس نے شیراز رکھا تھا اور شہر آ کر برکھا کو پتا چلا کہ شیراز تو اسی کا بیٹا تھا۔

قدرت نے اگر خاوند کو الگ کر دیا تو دوسری طرف اس کے دونوں بچے اس کے حوالے کر دیے تھے۔ نہ جانے یہ کیسی کہانی تھی..... یہ کیسا کھیل تھا۔

عبید نے اسے شہر میں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اپنی زمین، اپنی مٹی کی طرف واپس جانا چاہتی تھی۔ وہ زمین جس کو ایک بار پانی کی چادر نے پوری طرح ڈھانپ لیا تھا۔

اس نے عبید سے کہا تھا۔ "عبید صاحب، میرے لیے شہر مناسب نہیں ہے۔ مجھے وہیں جانے دیں جہاں کالو ڈوب کر مر گیا ہے اور جہاں قاسم ڈاکو جیسے اچھے لوگ رہتے ہیں۔ ایک سیلاب تو آ کر چلا گیا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ پھر کوئی سیلاب آ جائے۔ میں نے کیمپ میں رہ کر بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ میں اپنے گاؤں جا کر دوسری عورتوں کو تربیت دوں گی تاکہ وہ آنے والے ہر سیلاب، ہر طوفان کا مقابلہ کر سکیں۔"

